شاداں

Price Rs. 6-00

شاداب

سال مبارک ہو

جلد (۹) شمارہ (۱)

جنوری ۱۹۹۲ء حیدرآباد

قیمت =/6 روپے

فون 229161

زرِ تعاون

...دوستان	←	سالانہ	65 روپے	۲ سال کیلئے	120 روپے	تاحیات	1500 روپے
...ممالک	←	"	200	"	360	"	3700 "
...ریکہ	←	"	40 ڈالر	"	70 ڈالر	"	700 ڈالر
...گلستان	←	"	25 پونڈ	"	45 پونڈ	"	400 پونڈ
...تان	←	"	175 پاکستانی روپے	"	300 پاکستانی روپے	"	3000 پاکستانی روپے

ترسیلِ زر کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لئے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ "شاداب" 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 4 سے جاری کیا۔

فہرست

احمد عروج قادری — قسط نمبر ۱۶

اسلامی تصوّف

گناہ کی دو قسمیں ہیں، کبیرہ اور صغیرہ

قرآن اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں، بڑے گناہ جنھیں کبائر کہا جاتا ہے اور چھوٹے گناہ جنھیں صغائر کہا جاتا ہے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا (النساء ع ۵)

اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمھیں منع کیا جا رہا ہے تو تمھاری چھوٹی موٹی برائیوں کو ہم حساب سے ساقط کر دیں گے اور تم کو عزت کی جگہ داخل کریں گے۔

سورہ النجم رکوع ۲ میں اسی طرح کی آیت ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

جو لوگ بچتے ہیں بڑے گناہوں سے مگر کچھ آلودگی، بیشک تیرا رب بڑی وسیع بخشش والا ہے"

ان دونوں آیتوں میں صراحت کے ساتھ بعض گناہوں کو بڑے گناہ (کبائر) قرار دیا گیا۔ انھیں آیتوں سے کبیرہ گناہ کی اصطلاح اخذ کی گئی ہے جب بعض گناہوں کو کبائر کہا تو بعض دوسرے یقیناً صغائر یعنی چھوٹے گناہ ہوں گے۔ جن احادیث میں "کبائر" استعمال کیا گیا ہے ان میں دو حدیثوں کے ترجمے یہ ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پنج وقتہ نمازیں اور جمعہ سے جمعہ تک کفارہ ہیں ان خطاؤں کے لیے جو

ایک گناہِ کبیرہ کا تعلق تمام بدن سے ہے: عقوق الوالدین، یعنی ماں باپ کی نا
ان کے حقوق ادا نہ کرنا یا انھیں سخت بات کہنا یا مارنا اور اس طرح کی دوسری بدسلو
ان سب کا مجموعہ ۱۷ ہوا۔ ؎

(؎ احیاء علوم الدین ج ۴ ص ۱۲ مطبع مجتبائی میرٹھ)

ابوطالب مکیؒ کا قول نقل کرنے کے بعد امام غزالیؒ نے ثابت کیا ہے کہ گناہِ کبیرہ کی کو
ایسی تعریف ممکن نہیں ہے جو تمام کبائر کی جامع اور اس پر حاوی ہو اس لیئے کہ نبی صلی
علیہ وسلم سے اس کی کوئی ایسی تعریف یا تعین ثابت نہیں ہے شارع نے اس کو مبہم رکھا
تاکہ اللہ کے بندے ہر گناہ سے بچنے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد انہوں نے ایک قاعد
کلیہ مرتب کر کے کبائر کو صغائر سے الگ کرنے کے لیئے ایک لمبی گفتگو کی ہے۔

اس مسئلے میں راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ شیخ ابوطالب مکیؒ نے احادیث اور اقوا
صحابہؓ سے بڑے گناہوں کی جو تعداد جمع کی ہے ان کے کبائر ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہے ا
کے بعد ایک قاعدہ کے طور پر ان لوگوں کی رائے دل کو لگتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہر وہ گنا
گناہ کبیرہ ہے جس پر قرآن یا صحیح احادیث میں عذابِ آخرت کی کوئی وعید ہو یا دنیا میں
کی کوئی سزا مقرر کی گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ جو گناہ ایسا ہو اس کو صغیرہ نہیں کہا جا سکتا کیو
چھوٹے گناہ پر عذاب آخرت کی وعید نہیں دی گئی ہے اور نہ دنیا میں اس کے لیے حد
مقرر کی گئی ہے عذابِ آخرت کی وعید یا حد و تعزیر اس کے کبیرہ ہونے کی دلیل ہے اب
ایسے گناہوں کی ایک فہرست مرتب کی جائے تو یہ فہرست خاصی لمبی ہوگی۔ گناہِ کبیرہ و
کی بحث کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ ہر مومن کو بالعموم اور ان مومنوں کو بالخصوص ج
بارگاہِ الٰہی میں تقرب اور اللہ تعالیٰ کی بیش از بیش خوشنودی کے آرزومند ہو
ہر گناہ سے بچنے کی پوری سعی کرنی چاہیئے اور تمام کبائر و صغائر سے استغفار کرتے

مر صدیقی
ا-۵-۱۱ ریڈ ہلز
یدرآباد ۴

عُمرہ اور میں

میں اور خط وصل خدا ساز بات تھی

جان نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

کس نے مجھے پکارا ؟ سنو ! ایک بے آب وگیاہ وادی سے اٹھی ہوئی صدیوں سے گونجتی
ی ایک سُریلی آواز میں مجھے کوئی پکار رہا ہے۔ کون پکارے گا مجھے ؟ جب کہ میں خود گوش
ت نیوش کے لیئے ایک آواز بن کر رہ گیا ہوں۔

اک فریب خیال تھا یا لاشعور میں کسی گوشہ نے کروٹ بدلی تھی اک تصور تھا آیا اور گزر
اور روشنی سے زیادہ تیز رفتار سے گزرنے والا وقت گزرتا رہا۔

برس ہا برس سے کویت میں مقیم صاحبزادے علی احمد صدیقی سلمہ کا خط ملا ! لکھا تھا۔
"میں آرہا ہوں آپ حضرات کے لیئے عمرے کا انتظام کرلیا گیا ہے" آپ، امی، بہن
بیں اور آپ کی بہو ۔ پانچ ٹکٹوں کا انتظام ہو گیا ہے۔" خط پہچانتا ہوں سواد خط
سے بھی واقف ہوں برسوں سے خط وکتابت ہو رہی ہے۔ پھر یقین کیوں نہیں آتا ۔۔
سیوں دلائل ہیں جن کی روشنی میں یقین مشکل ہو گیا ہے۔ ایک مجرم، باغی، مفرور کے لیئے ایسے
ظیم انعام کا اعلان ؟ آخر یاور آئے تو کیونکر آئے ۔
بہر حال دل ودماغ میں ایک کشمکش برپا تھی۔
کبھی لاشعور کے دھندلکوں سے آواز آتی ۔ دیوانے سنا نہیں۔ سلطانوں اور شاہنشاہوں کی

عادت رہی ہے کہ کبھی سلام کرو تو غضبناک ہوجاتے ہیں اور کبھی گالیاں کھا کر انعام سے نواز دیتے ہیں اور یہ تو اُس سلطان کا معاملہ ہے جس کی سلطانی میں رحمتوں اور بخششوں کے لازوال خزانے موجود ہیں رحمتیں، عفو، کرم، عنایات والطاف آخر کس کے لیئے ہیں دیکھتا نہیں ایک چرواہا اپنی سینکڑوں بکریوں کو چھوڑ کر اس ایک بکری کے پیچھے دوڑتا ہے جو باغی ہوکر ریوڑ سے بھاگ نکلتی ہے۔ شاید کہ بُلا بھیجیں! ـــــ اور پھر اپنی دھندلکوں میں میں کھوجاتا ہوں۔

دن کتنے گزرے کیسے گزرے نہیں معلوم ۔ وہی لیل و نہار ۔ وہی شام و سحر، شکوک اندیشے، ایسے میں ' فرزندم علی' آموجود ہوئے ۔ عمرے کے لیئے پانچ آدمیوں کے ٹکٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیئے گئے ۔ علی سلمہ نے اپنی دانست میں یہ سمجھ کر پروگرام بنایا اور رخصت حاصل کی کہ حج کے ختم ہوتے ہی عمرے کے ویزے اجراء ہونے لگتے ہیں لہٰذا انہوں نے ستمبر ۱۹۸۹ء میں رخصت حاصل کی اور حیدرآباد چلے آئے۔

ہمارا لڑکا کویت سے آیا ہوا ہے اور ہم سب عمرے کے لیئے جانے والے ہیں یہ بات پھیلنے لگی۔ شدہ شدہ احباب و اقارب میں چرچے ہونے لگے ہمدردوں کی طرف سے نیک تمناؤں اور خود غرضوں کی طرف سے طعن و طنز کی سوغاتیں وصول ہونے لگیں! اسی اثناء میں، میں نے اپنے چھوٹے بھائی حیدر صدیقی مقیم جدہ کو بھی اطلاع دے دی کہ ہم سب بعزم عمرہ آرہے ہیں پھر ہم سب مل کر حصول ویزا و دیگر امور کی تکمیل کے لیئے بمبئی پہنچے ۔ سعودی عرب ایمبیسی سے ربط پیدا کیا تو معلوم ہوا کہ نومبر ۱۹۸۹ء سے ویزے جاری ہوں گے ۔

اسی اثناء میں، میں اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا کہ پیشی ہوگی اصالتاً حاضر ہونا پڑے گا ۔ عجیب منظر ہوگا، اک سراپا خطاکار و گنہگار کے ہاتھ ہوں گے اور کبھی بیت الحرام کا سنگ اسود ہوگا تو کبھی رحمتِ عالم کے بارگاہ عالی کی جالی مُبارک۔

ویزے بند ہیں ـــ اور میرا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا ع
اُلٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ بھی نہ دوا نے کام دیا

ل، دماغ، اعضاء جوارح غرض کہ سارے حواس گویا معطل ہو گئے تھے مایوسی، الجھن اور
ناکامیوں کے سمندر میں ڈوبتا ابھرتا میں بھنور کی طرف جا رہا تھا یا ساحل کی طرف اس کا بھی ہوش
نہ تھا۔

ایسے میں کسی نے جھنجوڑ کر پکارا۔ سنو! میں تمہارا ماضی بول رہا ہوں دیکھ لیا نا۔ اپنے
کرتوتوں کا نتیجہ۔ سات سو چوہے کھا کر بلی حج کو چلی تھی۔

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن ۔ آخری عمر میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

تم کہاں سے چلے تھے کہاں پہنچے۔ ذرا سوچو تمہارا ماضی، تمہاری عمر گذشتہ کی تاریخ ہے۔
تم حال پر بھروسہ کیئے ہوئے ہو جبکہ حال ایک دھوکا اور ایک فریب کے سوا کچھ نہیں، ایک لفظ
ہے بے معنی ایک لمحے اور ایک پل کے لیئے بھی جسے قرار نہیں، ماضی کی تاریخ کی روشنی میں مستقبل
کی فکر کرو مستقبل میں سب کچھ ہے۔

میں مغموم ہوں یا مسرور، مطمئن ہوں یا مضطرب؟ مجھے کچھ نہیں معلوم میں سب کچھ بھول
جانا چاہتا ہوں۔ گذشتہ کی یادیں آج کے حالات مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ بس اک گونہ بے خودی
مجھے دن رات چاہیئے۔

کہتے ہیں کہ بھول بھی ایک انعام ہے ورنہ کچھ حادثے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کی یاد قائم
رہ جائے تو آدمی کا جینا محال ہو جائے۔

آہستہ آہستہ ناکامیوں کے بادل چھٹ رہے تھے اور حالات اعتدال پر آنے لگے تھے کہ میرے
چھوٹے بھائی حیدر صدیقی چیف آرکیٹکر حکومت کشمیر جو پنشن کے بعد جدہ میں مقیم تھے جنھوں میں
نے اطلاع دی تھی کہ ہم لوگ بعزم عمرہ آنے والے ہیں لیکن شاید وہ اُن دنوں اپنے بچوں کے
پاس امریکہ گئے ہوئے تھے امریکہ سے وہ سیدھے حیدرآباد پہنچے۔ یہاں بھی اُن کا لڑکا رہتا ہے
مجھ سے ملنے آئے تو کہنے لگے۔ وہ آپ کے عمرے کا کیا ہوا؟ یا کچھ ایسی قسم کا فقرہ تھا مجھے ان
کی باتوں میں ایک قسم کا طنزیہ انداز نظر آیا جیسے کہ وہ مجھے میرے اعمال کا آئینہ دکھا رہے ہوں اور
زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں کہ "یہ منہ اور مسور کی دال" میں ان کا یہ طرز برداشت نہ کر سکا وہ

دولت، عہدے اور شہرت کے اعتبار سے بہت بڑے آدمی ہیں پھر بھی مجھ سے چھوٹے ہی نہیں بلکہ "چھوٹا بھائی" ہے میرے سینے کے داغ تازہ ہو گئے تھے میں نے تلخ لہجہ میں جواب دیا کہ اس معاملہ میں آپ گفتگو نہ کریں وہ عذر خواہی کرنے لگا لیکن میری آخری بات یہی تھی کہ میں اس موضوع پر کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔ بہرحال چند دنوں قیام کے بعد وہ جدہ واپس ہو گئے پھر وہاں سے انہوں نے لکھا کہ میں آمادہ ہو جاؤں تو وہ عمرے کے تمام انتظامات کر دیں گے میری انانیت کو انہوں نے پھر چھیڑا تھا میں نے وہی جواب دیا جو بالمشافہ اُن سے کہہ چکا تھا۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ حیدر کا چھوٹا لڑکا جو حیدرآباد ہی میں رہتا ہے میرے ہاں آیا اور بصد اصرار میرا پاسپورٹ وغیرہ لے کر چلا گیا ہفتہ عشرہ گزرا ہوگا کہ پھر آیا اور کہنے لگا کہ تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں دو ایک روز میں بمبئی چلنا ہوگا میں خود بھی ساتھ رہوں گا آپ کو ہوائی جہاز میں سوار کرا کے واپس ہوں گا جدہ ایرپورٹ پر ابا اور امی آپ کے استقبال کے لئے موجود رہیں گے۔

کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں کیا ماضی مجھے ایک اور ٹھوکر لگانا چاہتا ہے۔ نہیں معلوم۔

بھتیجے نے کہہ دیا تھا کہ آپ کو کچھ بھی کرنا نہیں ہے صرف چلنے کے لئے آمادہ رہیئے میں کل گاڑی لے کر آ رہا ہوں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میرے بھائی حیدر کو جب میری ناراضگی اور خفگی کا پتہ ہوا تو انہوں نے طے کر لیا کہ بہرحال وہ میری ٹوٹی ہوئی امیدوں کو بارآور کر کے رہیں گے چنانچہ انہوں نے حیدرآباد میں مقیم اپنے فرزند کو لکھا کہ خرچ و اخراجات کا لحاظ کیئے بغیر جلد سے جلد اپنے تایا حضرت کے عمرے کا انتظام کر کے انہیں بمبئی تک اپنے ساتھ لا کر ہوائی جہاز پر سوار کر کے مجھے ذریعہ ٹرنک کال اطلاع دی جائے۔

چنانچہ اس بچے نے مکمل انتظامات کر کے مجھے ہر طرح کے آرام و آسائش کے ساتھ بمبئی اور وہاں سے جہاز پر سوار کر کے رخصت ہوا۔ جدہ ایرپورٹ سے باہر آتے ہی حیدر اور اس کی بیوی اپنی کار لیئے ہوئے موجود تھے۔ جدہ کے مشہور محلہ الحمرا میں حیدر کا مکان تھا۔ ہم مکان پہنچے حیدر اور ان کی بیوی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہر دو میری خاطر و مدارات میں ایک دوسرے پر سبقت

لے جانا چاہتے ہیں گھر سے قریب ہی جدہ کی مشہور مسجد الحمرا واقع تھی وہیں نمازیں ہونے لگیں۔

ایک دو روز آرام لے کر ہم نے حرم شریف کا احرام باندھا اور چل پڑے ۔ بھائی حیدر اور ان کی بیوی دونوں ساتھ تھے ۔ حیدر کی بیوی ایک عرصہ سے حجاز میں رہتے ہوئے حج اور عمرہ وغیرہ کے احکام سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی چنانچہ راستہ تمام مجھے گائیڈ کرتی رہی حرم کے قریب پہنچے تو کہا کہ جوں ہی خانہ کعبہ پہ نظر پڑے دعا کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔ ہماری موٹر کی اسٹنڈ کا گھر سامنے تھا ۔ بھاوج نے کہا۔ یہ باب الاسلام ہے۔

مجھے دعا کرنا ہے ۔ لیکن ۔ کیسی دعا۔ کس کے لیے ؟ اپنے گناہوں کی مغفرت کے لیے اپنے بھائی بھاوج کے لیے ، اپنے ماں باپ اور اہل و عیال کے لیے ۔۔ ماضی کی داستانوں سے بھرپور ایک پورا دفتر میرے دل و دماغ میں طوفان بپا کیے ہوئے ہے ۔ آخر میں کیا کروں۔ کس سے کہوں ؟ اس سے جو سب کچھ جانتا ہے جو لطیف و خبیر ہے۔ میری دعائیں ۔ میری آرزوئیں۔ میری تمنائیں ، گناہوں کا اعتراف ، توبہ ، استغفار و ندامت کے سارے جذبات جب ایک نقطہ پر مرکوز ہو گئے تو دل ٹوٹ گیا اور آنکھیں پھوٹ بہیں ۔۔

میں رو رہا تھا اور میرے ساتھ سبھی رو رہے تھے نجانے کیوں مجھے اُمنڈ اُمنڈ کر بہتے ہوئے آنسوؤں میں ایک عجیب سا کیف ۔ ایک ناقابلِ بیان لذت محسوس ہو رہی تھی جی چاہ رہا تھا ۔ میں روتا رہوں ، روتا رہوں اور زندگی تمام ہو جائے ۔ فضاؤں میں ایک آواز گونجی ۔ ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے (اقبال)

لبیک اللّٰھم لبیک ۔

میں کبھی گھوم رہا تھا ۔ کبھی دوڑ رہا تھا ۔

ایک عالم بے خودی میں جو کچھ مجھ سے کرایا گیا ۔ میں کرتا رہا ۔۔ معلوم ہوا کہ عمرہ ختم ہوا۔

پروفیسر عنوان چشتی
بی۔ ۱۱۷ جامعہ نگر۔ دہلی ۲۵

سراج اورنگ آبادی کا ایک شعر

سراج اورنگ آبادی اردو کے ممتاز اور منفرد شاعر ہیں۔ ان کے کئی اشعار ضرب المثل ہ
یہ شعر تو آپ نے سنا ہوگا۔ دورنگی خوب نئیں یک رنگ ہو جا
سراپا موم ہو یا سنگ ہو جا

اور یہ غزل تو زبان زد ہو چکی ہے۔

خبرِ تحیرِ عشق سُن، نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تُو رہا نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی
شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
کبھی سمتِ غیب سے کیا ہوا کہ چمن ظہور کا جل گیا
مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

دراصل سراج اورنگ آبادی کی مقبولیت کا راز ان کے شعری مزاج میں پوشیدہ ہے جب
نغمگی، سرمستی، زندگی کی گہری بصیرت اور حکیمانہ افکار کے ساتھ اظہار کی سادگی اور سلاست بھ
شامل ہیں اب آپ سراج اورنگ آبادی کا ایک شعر سنیئے جو نسبتاً کم مشہور ہے لیکن سراج
کا نمائندہ شعر کہا جا سکتا ہے۔

گلشنِ شوق میں ہوں مستِ مئے یک رنگی
پھول کوں ساغرِ مے، سرو کو مینا سمجھوں

عری میں فنکار کے داخلی، جمالیاتی اور تخلیقی تجربے کا اظہار لسانی اور فنی انداز میں تا ہے اس لیئے شعر کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے یا اس کے اندر جھانک کر شاہدِ معنی نظارہ کرنے کے لیے شعر کی لسانی، فنی اور عروضی تہوں کو کھولنا ہوگا۔ اس دائرے میں بان کی مجازی، جمالیاتی اور تخلیقی صورتیں نیز اوزان و بحور کا معنی آفریں آہنگ شامل ہے ں کے علاوہ جمالیاتی شادابی ان سب پر محیط ہے۔

شاعر نے اپنے داخلی، رومانی اور تخلیقی تجربے کی نقش گری کے لیئے خارجی زندگی سے ستعارے اخذ کیئے ہیں یعنی گلشن اور میخانے سے۔ شاعر نے گلشن سے رنگ / رنگی، پھول اور سرو الفاظ بطورِ استعارہ لیئے ہیں اور میخانے سے مست، مے، ساغر اور مینا۔ شاعر نے شنِ شوق کو وجود یا کائنات کا، پھول کو ساغر کا اور سرو کو مینا کا استعارہ بنایا ہے چونکہ شاعر کائنات میں بادۂ توحید یا مئے وحدت سے سرشار ہے اس لیئے عالمِ کیف و مستی میں اس کو ر پھول ایک ساغر اور ہر سرو ایک مینا دکھائی دیتا ہے۔

بظاہر یہ بات محال نظر آتی ہے کہ ایک نوع کی چیزوں پر دوسری نوع کی چیزوں کا گمان ہو یا الکل بے تعلق اور انمل چیزوں کو ایک دوسرے کا نعم البدل تصور کیا جائے لیکن ایک تو فنِ خارجی منطق کا پابند نہیں ہوتا۔ دوسرے انسان کی جیسی نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے اس کو دوسرے افراد اور اشیا بھی ویسی ہی نظر آتی ہیں چونکہ شاعر بادۂ وحدت یا مئے حبِ الٰہی سے سرشار ہے اس لیئے اس کو کائنات کی ہر شئے اپنی نفسیاتی کیفیت کے تحت بدلی ہوئی حالت میں نظر آ رہی ہے اور وہ بے خودی و سرمستی کی ارفع حالت میں پھول کو ساغر اور سرو کو مینا تصور کر رہا ہے۔ یعنی کائنات کی ہر شئے اس کے ذوق و شوق اور بے خودی و سرمستی میں اضافہ کر رہی ہے۔

شاعر نے اپنے شعر میں ایک مخصوص رومانی تجربے کا اظہار کیا ہے چونکہ شاعر مئے وحدت یا بادۂ توحید سے سرشار ہے اس لیئے اس کو کثرت میں وحدت اور پردے میں جلوہ دکھائی دے رہا ہے شاعر کے رومانی تجربے کے پسِ پردہ یہ خیال بھی کارفرما ہے کہ وجود اور موجود یعنی ذاتِ اعلیٰ اور کائنات میں غیریت کا نہیں بلکہ عینیت کا رشتہ ہے جو کچھ ہے حق ہے اور

ہندوستان کے قدیم کتب خانے

کتب خانے کی داستان تہذیبِ انسانی کے سفر کی داستان ہے نوعِ انسانی کی اپنے فکری سرمائے کو محفوظ رکھنے کی داستان ہے کتب خانے ایک نسل کی علمی کامیابیوں کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ کتاب اپنی ہئیت و شکل و صورت بدلتی رہتی ہے لیکن اپنے تحفظ اور اپنے قاری تک پہنچنے کے لئے کتب خانوں پر انحصار کرتی ہے۔ مٹی کی تختیوں سے شروع ہو کر مائیکرو چپس تک پہنچنے میں کتاب نے ایک لمبا سفر صدیوں میں جا کر طے کیا ہے لیکن اس کی وجہ سے کتب خانوں کی ضرورت یا اہمیت پر کوئی فرق نہیں پڑا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ کتاب کی بدلتی ہوئی ہئیت کے ساتھ کتب خانوں نے اپنے دائرہ اور طریقہ کار میں تبدیلی ضروری ہے اور اور اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ دن دور نہیں جب وہ ایک بھولی بسری تہذیب کی نشان دہی کرنے والے کھنڈر بن کر رہ جائیں گے۔

ہندوستان میں کتب خانے کی ابتداء کا سراغ زمانہ قبل مسیح سے ملتا ہے لیکن یہ سراغ آثارِ قدیمہ اور ادبی شواہد کا محتاج ہے تحریری شکل میں کتب خانوں کا ذکر ہمیں چوتھی صدی تا ساتویں صدی عیسوی کے درمیان ہندوستان آنے والے چینی سیاحوں کے سفر ناموں سے ملتا ہے۔ اس میں فاہیان کا نام سرفہرست ہے فاہیان نے ملک میں موجود اہم مہایان عبادت گاہوں کے کتب خانوں کا ذکر کیا ہے خود فاہیان نے پاٹلی پتر کے کتب خانہ سے "ابھیدھرم" کے اقتباسات لیئے جو چھ ہزار پیراگراف پر مشتمل تھے۔ ہیون سانگ جو فاہیان کے بعد دوسرا مشہور چینی سیاح ہے ہندوستان میں ساتویں صدی عیسوی میں موجود کتب خانوں سے استفادہ کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اس کا بیان ہے

ہر کے راجہ نے اپنے کتب خانہ سے کتابوں کی نقلیں تیار کرنے کے لئے اسے بیس نقل نویس دے

اور واپسی میں وہ ۵۲۰ صندوقوں میں کتابیں اپنے ساتھ لے گیا۔

چینی سیاحوں نے جن تعلیمی مراکز کے کتب خانوں کا ذکر کیا ہے ان میں نالندہ، وکرم سلا،

دنتاپوری، جگدل اور سوماپوری قابلِ ذکر ہے۔ نالندہ میں واقع کتب خانہ کو دھرم گنج کہا جاتا

اس میں تین بڑی عمارتیں شامل تھیں۔ رتن ساگر، رتن دادھی اور رتن رنجکا، رتن دادھی

ب نو منزلہ عمارت تھی جو مقدس مخطوطات کے تحفظ کے واسطے مخصوص کردی گئی تھی۔

مشرقی ہندوستان جہاں بودھی تہذیب کا مرکز تھا وہاں مغربی ہندوستان میں جین مت

مراکز تھے۔ جین مت کے مندروں میں موجود کتب خانوں کو گیان بھنڈار کے نام سے موسوم کیا

تا تھا۔ زمانے کی دستبرد نے ان میں سے بیشتر کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا۔ لیکن پٹن کے مقام

ح بھی ان کے نشان ملتے ہیں۔

جنوبی ہند میں کتب خانے عموماً ہندو مٹھ یا مندروں میں ہوتے تھے جنھیں سرسوتی بھنڈار

ہا جاتا تھا۔ آثارِ قدیمہ کے کتب خانوں اور ادبی حوالوں اور کتبوں کے حوالے سے نہ صرف ان

تب خانوں کے نام معلوم ہوتے ہیں بلکہ ان کی تنظیم اور ان کے لئے وقف کی گئی املاک کا

ی پتہ چلتا ہے۔

تیرھویں صدی سے ہندوستان پر ترک اور افغان بادشاہوں کی حکومت کا دور شروع

ا اور اب ہمیں درباری تاریخ نویسوں کے واسطے سے شاہی کتب خانوں کی واضح تفصیل

شروع ہوتی ہے چنانچہ فیروزشاہ کے دور کا ذکر کرتے ہوئے مشہور مورخ سراج عفیف

جن محکموں کا ذکر کیا ہے ان میں کتب خانہ بھی شامل ہے جس کے سربراہ کو کتاب دار یا مصحف بردار

تا تھا۔ خلجی خاندان کے بانی جلال الدین خلجی نے شاہی کتب خانہ کی سربراہی کے لئے مشہور صوفی

امیر خسرو کو منتخب کیا۔ سلطان امیر خسرو کی کتنی قدر و منزلت کرتا تھا اس کا اندازہ اس

سے ہوتا ہے کہ انہیں دربار میں سفید لباس پہننے کی اجازت تھی۔

خیار الاخیار" میں حضرت عبدالحق محدث دہلوی، مشہور صوفی بزرگ حضرت نظام الدین اولیاءؒ

سا داب حیدرآباد

کے کتب، خانہ کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت نظام الدین اولیاء کے ایک خلیفہ شیخ سراج عثمان جو مقدم سراج الدین کے نام سے معروف ہیں، اپنے پیر کی وفات پر جب لکھنؤ جانے لگے تو اپنے ساتھ کتب خانہ سے کتابیں بھی لے گئے۔

تغلق سلاطین میں فیروز شاہ تغلق کی علم دوستی مشہور ہے اس کے درباریوں میں تاتار خاں بھی شامل تھا جس نے اپنے دور کی فقہ کی معروف کتاب فتاوی تاتارخانی تیس ۳۰ جلدوں میں مرتب کی۔ اتنے بڑے علمی کام کو کسی کتب خانہ سے استفادہ کے بغیر تکمیل کو پہونچانا ممکن نہیں۔ لودھی خاندان میں سکندر لودھی کے دور کے مخطوطے ہندوستان میں عربی خطاطی کی ایک خاص طرز کے عکاس ہیں۔ سلاطین کے علاوہ درباری امراء کے کتب خانے عام تھے چنانچہ تزک بابری میں ایک مقام پر بابر نے لکھا ہے

"پیر کے روز قلعہ میں ٹہلتے ہوئے میں غازی خان کی لائبریری میں پہونچا۔"

علم کی سرپرستی اور کتب خانوں کے قیام کا شوق سلاطینِ دہلی تک ہی نہیں محدود تھا کشمیر اور گجرات کے سلاطین نیز جنوبی ہند کے حکمراں بھی کتب خانوں کی سرپرستی میں پیش پیش رہتے تھے کشمیر کے سلطان زین العابدین نے فن کتب سازی کو فروغ دینے کی غرض سے تکنیکی اسکول قائم کیئے جہاں لوگوں کو کاغذسازی، جلدسازی اور دوسرے متعلقہ فنون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ گجرات کے سلاطین میں سلطان محمد بیگڑھ کا نام سر فہرست ہے۔ سلطان کے ذاتی کتب خانہ کی نگرانی سید عثمان کے جنھیں شمع برھانی کے نام سے بھی جانتے ہیں سپرد تھی۔

مغلوں کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ساتھ علم و ہنر کی ملک میں قدردانی اور سرپرستی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے چنانچہ بابر نے جب غازی خاں کے کتب خانہ کو دیکھا تو بہت خوش ہوا لیکن بعد میں اسے جو مایوسی ہوئی اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے۔

"مجموعی طور پر مجھے اس میں بیشتر اہم کتابیں نہیں ملیں حالانکہ سرسری طور پر اس لائبریری کو دیکھ کر بادی النظر میں مجھے اس سے بڑی توقعات تھیں۔"

ہمایوں کو کتابوں کا شوق ورثہ میں ملا تھا اس کے کتب بینی کے شوق کا یہ عالم تھا کہ

گجرات اور بنگال کی مہمات میں بھی کتابیں اس کے ساتھ تھیں اور جب شیر شاہ سے شکست کھا کر وہ جنگلوں میں پناہ تلاش کر رہا تھا تو اس کی بہت سی کتابیں ضائع ہو گئیں۔ جیسا یہ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ:

"بہت سی نادر کتابیں جو اس کی حقیقی ساتھی تھیں اور جو بادشاہ کے قبضہ میں رہتی تھیں کھو گئیں۔"

اپنے جلاوطنی کے دن ہمایوں نے ایران میں شاہ طہماسپ کے دربار میں گزارے شاہ طہماسپ کو مصور کتابیں تیار کرانے کا بہت شوق تھا اور اس کام کے لیئے اس نے اپنے دربار میں ملک بھر سے ماہرین کو اکٹھا کر لیا تھا ہمایوں پر طہماسپ کی صحبت کا بڑا اثر ہوا اور جب اپنی عمر کے آخری دنوں میں شاہ طہماسپ مصوروں کی جانب سے سرد ہو گئے تو ہمایوں نے ان کے درباری مصوروں میں سے میر سید علی اور عبدالصمد کو ہندوستان اپنے دربار میں بلا لیا۔

مغل حکمرانوں بالخصوص اکبر اور جہانگیر نے نہ صرف کتابیں جمع کیں بلکہ ہندوستان کی تمام مذہبی کتابوں کو سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرایا اور ان کی تزئین کاری اور تصویر کاری کا کام کرایا۔ اکبر نے کتابوں کی تیاری کے واسطے ایک اسٹوڈیو قائم کیا جس کے منتظم اعلیٰ سید علی تھے۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں اس اسٹوڈیو کی تفصیل بڑے دلچسپ انداز سے تحریر کی ہے اس دور کی سب سے پہلی کتاب "طوطی نامہ" ہے جو آج کل کلیولینڈ کے میوزیم میں موجود ہے۔ طوطی نامہ کے بعد دوسرا مصور مخطوطہ "حمزہ نامہ" تیار ہونا شروع ہوا جس کی تکمیل ۱۴ جلدوں پر ہوتی اور جس میں ہر جلد میں ایک سو تصاویر ہوتیں۔ بدقسمتی سے ہم تک اس بڑے منصوبہ کی شکل سو تصاویر پہونچ سکی ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق اکبر کے کتب خانہ میں تو ئیس ہزار کتابیں تھیں جن میں مخطوطات کے ساتھ ساتھ مطبوعات کی بڑی تعداد تھی جو اسے عیسائی پادریوں نے پیش کی تھیں اکبر عیسائی پادریوں کو اپنے کتب خانہ سے کتابیں مستعار لینے کی اجازت دے دیتا تھا وہ ان سے وقتاً فوقتاً کتابوں کی فرمائش بھی کرتا رہتا تھا۔[44]

مغل سلاطین کے درباری امراء اپنے علمی شوق میں کسی سے پیچھے نہ تھے چنانچہ فیضی کے کتب خانہ کی کتابیں اس کے انتقال پر شاہی کُتب خانہ میں شامل کی گئیں۔ عبدالرحیم خان خاناں کی ذاتی لائبریری اتنی بڑی تھی کہ اس میں ۹۵ ملازمین کا عملہ کام کرتا تھا۔ کتب خانہ میں بڑی تعداد ایسی کتابوں کی تھی جو خود مصنفین کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی۔

اس عہد کے دوسرے کتب خانوں میں مہاراجہ میسور چیکا دیو رایہ اور مہاراجہ جے پور سوائے سنگھ ثانی کے کتب خانے قابلِ ذکر ہیں اس کے علاوہ بنگال، گجرات، جون پور، خاندیش کے کتب خانے بھی اپنے مخطوطات اور نایاب کتابوں کے لیے مشہور تھے مغل سلطنت کے زوال اور انگریزی تسلط کے قیام کے درمیان کے سالوں میں جن کُتب خانوں کا ذکر ملتا ہے ان میں نوابینِ اودھ اور ٹیپو سلطان کے کتب خانے سرِ فہرست ہیں۔ اودھ کے کتب خانہ کا ایک کیٹلاگ مشہور جرمن مستشرق اور قدیم دلی کالج کے پرنسپل اسپرنگر نے مرتب کیا تھا اور ٹیپو سلطان کے کتب خانہ کا کیٹلاگ میجر اسٹوارٹ نے ۱۹۰۳ء میں شائع کیا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد یہاں کئی نادر کُتب خانے وجود میں آئے۔ جن کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہے۔

(سلسلہ صفحہ ۱۳ سے آگے)

حق کے سوا کچھ نہیں ہے سری شنکر آچاریہ نے یہی بات اپنی شبدوں کے حوالے سے اصول کی شکل میں اس طرح کہی تھی "ایکو برہم دوتی نا ستی" یعنی نظر آنے والا عالم ایک دھوکہ ہے اور اصل وجود صرف برہم یعنی (اللہ) کا ہے ابن عربی نے کہا تھا لاموجود الا اللہ یعنی خدا کے سوا کوئی اور موجود نہیں ہے سراج اورنگ آبادی نے اپنے روحانی تجربے کو صوفیانہ فکر سے ہم آہنگ کر کے جس شعری جمال کے ساتھ پیش کیا ہے وہ اُنہی کا حصہ ہے سراج نے اپنے اعلیٰ تجربے کی نقش گری کے لئے بحرِ رمل مثمن سالم کے جس وزن یعنی فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن کا انتخاب کیا ہے وہ شاعر کے ذہین، نازک گہرے اور سنجیدہ افکار و تجربات کے اظہار کیلئے زیادہ موزوں ہے مجموعی طور پر یہ شعر سراج کے فکر و فن کی نمائندگی کرتا ہے۔
گلشنِ شوق میں ہوں مست مئے یک رنگی ۔ پھول کو ساغرِ مے سرو کو مینا سمجھوں

مترجم: عبدالغنی فاروقی

میں مسلمان کیوں ہوئی ؟

ایک امریکی نو مسلمہ ثریا سے ایک انٹرویو

جناب ریحان خان امریکہ کی ایسٹرن مشی گن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں' ان کی ایک سفید فام شاگرد ثریا نے حال میں اسلام قبول کیا ہے اور اپنے آپ کو اسلامی لباس سمیت' دینی تقاضوں سے ہم آہنگ کر لیا ہے ریحان خان صاحب اس لڑکی کے لباس اور باوقار اطوار سے بہت متاثر ہوئے۔ اس سے انٹرویو کی صورت میں گفتگو کی اور شمالی امریکہ میں مسلمانوں کے ایک ماہوار جریدہ UNITY TIMES (شمارہ مارچ ۱۹۹۰ء) میں شائع کرا دیا۔

سوال: قبول اسلام سے قبل آپ کے مذہبی رجحانات کیا تھے ؟

جواب: میرا تعلق ایک پروٹسٹنٹ عیسائی خاندان سے ہے جس کے سب افراد مذہب سے بے نیاز ہیں لیکن میں بچپن ہی سے مذہب کی جانب رجحان رکھتی تھی۔ چنانچہ میری عمر دس سال تھی جب میں نے اپنے پڑوسیوں سے فرمائش کی کہ وہ اتوار کو چرچ جایا کریں تو مجھے بھی ساتھ لے جایا کریں۔ چنانچہ میں وقتاً فوقتاً ان کے ساتھ گرجا جانے لگی اور جب ہائی اسکول میں پہونچی تو عیسائیت کی مختلف شاخوں اور فرقوں کے بارے میں علم حاصل کرنے لگی اس سلسلے میں' میں نے کیتھولک مذہب کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا اور PRESTERIAN- WITNESS JEHORAHS' MOTHODIET, MORNOS جیسے مذاہب کے بارے میں بھی مطالعہ کیا لیکن افسوس کہ میری روح پیاسی کی پیاسی ہی رہی میرا وجدان جو کچھ طلب کرتا تھا وہ کہیں نہ ملا۔ مثال کے طور پر میرا ضمیر کہتا تھا کہ اس کائنات کا خالق و مالک وحدہٗ لاشریک

ہے جبکہ عیسائیت میں سب فرقے ابہام کے شکار ہیں۔

تاداب، حیدرآباد

سوال : اس صورتحال میں دین اسلام سے آپ کا تعارف کیسے اور کب ہوا۔

جواب : میں ہائی اسکول ہی میں پڑھ رہی تھی جب مجھے مشرق وسطیٰ کے بارے میں خا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرنے کا موقع ملا اور اسی حوالے سے پہلے پہل "اسلام اور مسلم" کے الفا میری شناسائی ہوئی مگر اسکول کے زمانے میں میری معلومات کا دائرہ بس یہیں تک محدود رہا۔ کالج میں پہونچی تو خوش قسمتی سے وہاں مشرق وسطیٰ سے تعلق رکھنے والے طلبا بھی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ان سے ملاقاتیں ہوئیں تو اسلام سے تعارف حاصل ہوا میں اس مذہب کے پہلو سے بہت متاثر ہوئی کہ یہ عیسائیت اور یہودیت کی طر جزوقتی PART TIME مذہب نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہے اسلام چوں کہ د رات کے ایک ایک لمحے میں رہنمائی کرتا ہے اور عیسائیت کی مانند اس کی رفاقت کا دا ایک ہفتہ میں محض ایک گھنٹہ تک محدود نہیں رہتا اس لیے جب ایک شخص اسے عملی طور اختیار کرتا ہے تو اس کی زندگی میں نظم و ضبط، سلیقہ اور استحکام پیدا ہو جاتا ہے اسلام کی یہ دوسری خوبی تھی جس نے مجھے متاثر کیا مجھے یقین ہو گیا کہ اسلام ایک مکمل دین اور فطرت کے عین مطابق ہے چنانچہ میں نے اسے دل و جان سے قبول کیا۔

سوال : اور اس کا ردعمل آپ کے خاندان پر کیا ہوا ؟

جواب : خاندان کے ہر فرد کا ردعمل مختلف نوعیت کا تھا میرے والد کا سلوک مجھ بہت مشفقانہ رہا ہے چنانچہ اگر میں نے اسلام قبول کرنے کے ساتھ اپنا لباس بھی تبدیل کر اور عام طرز زندگی کو یکسر نیا رنگ دے ڈالا مگر ان کی محبت اور سلوک میں کوئی فرق نہ پڑا بلکہ ایسا ہوا کہ ایک بار میری پھوپھی آئی اور اس نے مجھے بہت برا بھلا کہا۔ مجھے سنگی الل قنوطی کے طعنے دیئے تو میرے والد نے میری مدافعت کی تاہم میری والدہ کا طرز عمل خوشگوار اور میری زندگی کے انقلاب پر قطعی خوش نہ ہوئیں لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض ذ کے باوجود میں خوش نصیب ہوں کہ اپنے والدین کے ساتھ رہ رہی ہوں اور مجھے پریشانی

نہیں پڑا جس کی عموماً توقع کی جاتی ہے ۔

وال : میں حیران ہوں کہ آپ کے اندر اتنا بڑا اقدام کرنے کی جرأت کیسے پیدا ہوگئی ؟

ب : آپ کی بات درست ہے کہ امریکہ کے اس ماحول میں جہاں مادیت کا دور ہے اور عیش پرستی اور تفریح پسندی ہی کو زندگی کی معراج سمجھا جاتا ہے وہاں اسلام اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنا بے حد مشکل کام ہے چنانچہ یہ فیصلہ کرنے سے پہلے میں سوچا کہ میرے والدین مجھ سے کیا سلوک کریں گے ؟ میری تعلیم کا کیا بنے گا ؟ اور حلقہ احباب میں کیسے زندہ رہوں گی ؟ چنانچہ اس نوعیت کے خدشات نے مجھے ت پریشان کیئے رکھا مگر طویل اور گہرے غور و فکر کے بعد میں جو اسلام قبول کرنے یں پیش آسکتی تھی مسلمان نہ ہونے کے نتائج ذہنی اور روحانی اعتبار سے زیادہ سکتے ہیں، چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے خوب دعائیں کیں کہ اس نے مدد اور اعانت ی اور واقعی اللہ نے میری دعائیں سن لیں اور حیرت انگیز طور پر مجھے وہ ہمت اور طا ہوا کہ میں اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے قابل ہوگئی ۔

سوال : آپ تو ابھی نوعمر ہیں آپ کا کیا خیال ہے کہ آپ واقعی اس فیصلہ پر مستقل قائم رہیں گی ؟

اب : مجھے یقین ہے کہ میں نے یہ فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے اور اس میں کوئی پیدا نہیں ہوگی اندازہ کریں کہ جب میں اسلام قبول کرنے کے لیئے ایک مسجد میں گئی تو خطیب اور امام صاحب نے ذرا بھی مجھ پر زور نہ ڈالا بلکہ مشورہ دیا کہ میں پہلے کے بارے میں خوب مطالعہ کروں اور اگر اس کے بارے میں کوئی معمولی سا بھی اعتراض الات کر کے اسے رفع کر لوں پھر اسلام قبول کروں اس کے برعکس جن دنوں میں کیتھولک کا مطالعہ کر رہی تھی ایک مرتبہ میں کیتھولک چرچ میں گئی تو میرے جاننے والوں نے صرار کیا کہ میں اس مذہب کو قبول کر لوں ۔

اس امر کا بھی اعتماد ہے کہ چونکہ میں نے بہت سے مذاہب کا مطالعہ کیا ہے اور

میرے شعور نے انھیں مسترد کیا ہے اس لیئے میں نے جس مذہب کا انتخاب کیا ہے وہ ہر لحاظ سے بہترین اور عقل کے عین مطابق ہے اسی طرح یہ بھی بتاتی چلوں کہ میں نے دو سال سے زائد عرصے تک خوب جم کر اسلام اور اس کی تعلیمات کا مطالعہ کیا ہے اور بہت سے لوگوں اس کے بارے میں گفتگو بھی کی ہیں اس لیئے یہ سمجھ لیجئے کہ اسلام قبول کرنے میں نہ تو کسی جذباتیت اور عجلت پسندی کا عمل دخل ہے اور نہ ہی اس سے کوئی دنیاوی مفاد وابستہ ہے میں نے یہ فیصلہ خوب سمجھ کر کیا ہے اور انشاء اللہ اس پر عمر بھر ثابت قدم رہوں گی۔

سوال: آپ نے اسلام قبول کر کے کیا حاصل کیا ہے؟

جواب: اعداد و شمار کے حوالے سے یا دو اور دو چار کے انداز میں یہ بتانا کہ مسلمان ہوکر میں نے یہ اور یہ کچھ حاصل کیا ہے خاصا مشکل ہے تاہم اسلام قبول کر کے سب سے بڑی کامیابی یہ ملی ہے کہ زندگی میں وقار اور ڈسپلن کا چلن پیدا ہوا شب و روز کو مقصدیت نصیب ہوئی اور وہ جو خلا کی ایک کیفیت دل و دماغ پر چھائی رہتی ہے پھر یہ نعمت بھی کچھ کم نہیں کہ اللہ تعالٰی پر ایمان اور اس کی اطاعت انسان کے اندرون کو سکون اور تزکیہ سے مالا مال کرتے ہیں روح میں رفعت اور مقاصد میں بلندی کا احساس پیدا ہوتا ہے اور انسان سخت سے سخت حالات میں پریشانی اور مایوسی سے محفوظ رہتا ہے۔

اللہ تعالٰی کا احسان ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل نے میری زندگی کے ہر پہلو کو مثبت طور پر عمل کیا ان میں سے بعض تبدیلیاں واضح اور انقلابی نوعیت کی ہیں جبکہ بعض کا تعلق ذہن اور ارادے سے ہے اور وہ اسی نسبت سے لطیف اور غیر نمایاں ہیں۔

سوال: آپ نے اپنے بالوں کو ڈھانپا ہوا ہے امریکہ کے عریاں ماحول میں آپ کو کیا لگتا ہے؟

جواب: اس ضمن میں میرے وہی احساسات ہیں جو ایک باعمل مسلمان عورت کے ہو سکتے ہیں میں نے اپنا سر ڈھانپ کر دراصل اس ماحول کی آلودگیوں کے خلاف تحفظ حاصل کیا ہے اور عام عورت نیم برہنگی کی وجہ سے جس خوف اور سراسیمگی کی کیفیت میں مبتلا رہتی ہے اس سے خاصی حد تک

نجات پالی ہے پھر میرا سر دُعا ہے اپنا ایک قسم کا اعلان بھی ہے کہ میں مسلمان ہوں اور سب سے
اہم بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں اللہ نے جو حکم دیا ہے میں اس کی پیروی کر رہا ہوں۔

سوال: آپ کے نزدیک اس کا سبب کیا ہے کہ امریکہ میں جو لوگ اپنا مذہب تبدیل
کرتے ہیں ان کی غالب اکثریت اسلام کی آغوش میں آتی ہے؟

جواب: میرا یقین ہے کہ جو بے شمار لوگ اسلام کی طرف لپکے چلے آرہے ہیں انہیں اس
بات کا احساس ہو گیا ہے کہ موجودہ مغربی طرزِ زندگی نہ تو اخلاقی قدروں کی پرورش کرتا ہے نہ کسی
افکار اور صاف ستھرے اسلوب حیات کو پروان چڑھاتا ہے جبکہ اس کے برعکس اسلام کی تعلیمات
وہ ایسی صداقت سے بہرہ ور ہوتے ہیں جو انھیں بلند ترین اخلاقی معیارات عطا کرتی
اور ان معیارات کو حاصل کرنے کا مطمع نظر کرتی ہے جو حقیقت پسندی پر مبنی ہے
بھی ہے اور با وقار بھی، خاص اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اسلام مغرب کی تنگ نظری
سے بہت بلند و بالا ہے اور انسانوں کی عاریت اور نسل پرستی سے ہٹا کر خالص انسانی
شرف کی بنا پر مخاطب کرتا ہے۔

سوال: امریکہ میں اسلام قبول کرنے والوں کی اکثریت سیاہ فاموں پر مشتمل ہے۔ آپ
کے خیال میں مبارک پیغام سفید فاموں تک رسائی حاصل کرنے میں کیوں کامیاب نہیں ہو سکا؟

جواب: اس معاملے میں میں کوئی ماہرانہ رائے تو نہیں دے سکتی تاہم میرا ایک نقطۂ نظر
ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ اسلام قبول کرتے ہیں وہ بالعموم موجودہ نظام کے ستم زدہ ہوتے ہیں اور
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امریکہ میں بے چارے سیاہ فام بڑے ہی مظلوم ہیں اور جب وہ دائرہ
اسلام میں آتے ہیں تو انہیں حقارت اور ظلم و جور کی بجائے محبت، مساوات اور احترام
ملتا ہے تو ان کی پریشان اور افسردہ روحوں کو سکون و قرار مل جاتا ہے سیاہ فاموں کے
اسلام کی طرف لپکنے کا ایک سبب اور بھی ہے وہ جان گئے ہیں کہ افریقہ میں ان کے آباؤ اجداد
کا مذہب اسلام تھا اور جب انھیں زبردستی اغوا کر کے امریکہ لایا گیا تو ان سے یہ نعمت چھین
لی گئی چنانچہ اسلام قبول کر کے دراصل وہ اپنے اصل دین کی طرف لوٹتے ہیں۔

سوال: امریکہ کے اخبارات و دیگر ذرائع ابلاغ یہ واویلا کرتے نہیں تھکتے کہ اسلام کا رویہ عورت کے معاملے میں غیر مناسب ہے آپ ایک تعلیم یافتہ سفید فام خاتون ہیں اس کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے ؟

جواب: اس سوال کا جواب اتنے تھوڑے سے وقت میں نہیں دیا جاسکتا یہ موضوع تو ایک کتاب کا متقاضی ہے مختصراً کہوں گی کہ یہ بات حقیقت کے برعکس ہے اور یہ الزام عموماً ان لوگوں کی طرف سے دہرایا جاسکتا ہے جو اسلامی تعلیمات سے یکسر بے خبر ہیں وہ فرض کرلیتے ہیں کہ جب اسلامی معاشرت میں مرد اور عورت کا میدان الگ الگ ہے تو لازماً عورت ظلم کا شکار ہوتی ہے حالانکہ معاملہ ہرگز ایسا نہیں ہے اس کے برعکس میں اپنے ملک کی صورتحال پیش کرتی ہوں۔ یہاں (امریکہ میں) برابری اور مساوات کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ معاشرے میں عورت وہ سب کچھ کرے جو مرد کرتا ہے لیکن عملاً یہ ہوتا ہے کہ عورت مرد کی طرح کماتی بھی ہے اور گھر کا بھی سارا کام کرتی ہے جہاں مرد اس کے ساتھ شرکت نہیں کرتا' پھر ظاہر ہے مساوات کہاں رہی ؟ اور جن گھرانوں میں ماں اور باپ دونوں کام کرتے ہیں وہاں بچوں کا جو حال ہوتا ہے وہ ظلم اور استحصال کی ایک افسوسناک مثال ہے اس معاملہ کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے یورپ کے ذرائع ابلاغ اور اخبارات عام طور پر عالم اسلام کی حکومتوں کے طرز عمل اور مختلف افراد کے ذاتی رویے سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہی کچھ اسلام کی تعلیم ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے ان دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے چنانچہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات پر اس کی صحیح روح کے ساتھ عمل کریں اور غیر مسلموں کے سامنے اسلام کے سچے ترجمان بنیں۔

(بشکریہ "النور" کشمیر)

کارم غازی الدین کمال کریم نگری
۲ شاستری روڈ کریم نگر ۵۰۵۰۰۱

نیند اور موت

قرآن اور سائنس کی روشنی میں

قرآن اللہ کا کلام ہے، جو خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ یہ اسلام کا دستور ہے، منشور ہے اور مسلمانوں کا لائحہ عمل ہے قرآن ایک خاص مذہبی اب ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں ابتدائے آفرینش سے لے کر رحمتہ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم تک کے واقعات، حالات اور تاریخی حقائق حسبِ ضرورت ان کیے گئے ہیں قرآن کا مرکزی موضوع یہی ہے کہ انسان بلالحاظِ حقیقت یہ جان سکے کہ اس کی ...ش کی غرض وغایت کیا ہے؟ اسے کیسی زندگی گزارنی چاہیئے؟ اس کی فلاح، بہبودی اور ...دے کن چیزوں میں ہیں اور کن باتوں سے اسے نقصان پہونچتا ہے؟ قرآن دراصل دعوت و ...ت کی کتاب ہے، جس کے ذریعے انسانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ خدا کی ہدایات اور ...ے احکام کی روشنی میں اپنی زندگی کا نظام قائم کریں اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا کی اصلاح کے ...ی من دھن سے کوشش کریں۔ قرآن میں مختلف علوم وفنون کا سرسری طور پر ذکر کیا گیا ہے ...وص سائنسی علوم کے بارے میں بھی تذکرہ موجود ہے اس کے باوجود قرآنی آیتوں کو ...نس کے ساتھ جوڑنا مناسب نہیں۔ کیونکہ سائنسی علم، جن چیزوں کے بارے میں جیسے عناصر ...یں؟ پانی اور ہوا کیسے بنتے ہیں؟ نور کیا ہے؟ زمین کی گردش سے کیا نتائج برآمد ...ے ہیں، تفصیلات پیش کرتا ہے، مذہب کو ان باتوں سے کوئی سروکار یا تعلق نہیں ہوتا۔

مذہب جن باتوں کے تعلق سے بحث کرتا ہے وہ بالکل جداگانہ ہیں۔

بقول علامہ شبلی نعمانی۔ "حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور سائنس کے حدود بالکل الگ الگ ہیں سائنس کا جو موضوع ہے مذہب کو اس سے کچھ واسطہ نہیں اور مذہب کو جن چیزوں سے بحث ہے سائنس کو ان سے کچھ غرض نہیں۔"

قرآن کے موضوع اور مدعا کے بارے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں۔

"بنیادی اُمور کو ذہن میں رکھ کر کوئی شخص قرآن کو دیکھے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ یہ کتاب اپنے موضوع اور مدعا اور مرکزی مضمون سے بال برابر نہیں ہٹی ہے۔ اول سے لے کر آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے ایک ہار کے چھوٹے بڑے رنگ برنگ جواہر ہار کے رشتے سے منسلک ہوتے ہیں وہ زمین کی ساخت پر، انسان کی خلقت پر، آثارِ کائنات کے مشاہدات اور گزری ہوئی قوموں کے واقعات پر گفتگو کرتا ہے، مختلف قوموں کے عقائد و اخلاق اور اعمال پر تنقید کرتا ہے مابعد الطبعی اُمور و مسائل کی تشریح کرتا ہے اور بہت سی دوسری چیزوں کا ذکر بھی کرتا ہے، مگر اس لئے نہیں کہ اسے طبیعات یا تاریخ یا فلسفے یا کسی اور فن کی تعلیم دینی ہے بلکہ اس لئے کہ اسے حقیقت نفس الامری کے متعلق انسان کی غلط فہمیاں دور کرنی ہے اصل حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی ہے خلافِ حقیقت رویہ کی غلطی و بد انجامی واضح کرنی ہے اور اُس رویہ کی طرف دعوت دینی ہے جو مطابقِ حقیقت اور خوش انجام ہے یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز کا ذکر صرف اُس حد تک اور اُس انداز میں کرتا ہے جو اس کے مدعا کے لئے ضروری ہے ہمیشہ ان چیزوں کا ذکر بقدرِ ضرورت کرنے کے بعد غیر متعلق تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے مقصد اور مرکزی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کا سارا بیان انتہائی یکسانی کے ساتھ "دعوت" کے محور پر گھومتا رہتا ہے۔"

اس کے باوجود چند مفسرین اور علماء نے قرآنی آیات کی تفسیر و تشریح سائنسی علم کی بنیاد

پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے کچھ شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں اور ان شکوک و شبہات کی کوکھ سے ایک ایسا فلسفہ جنم لیتا ہے جو انسانوں کو مذہب سے دور کرنے کا موجب بنتا ہے اور انسانوں کے مذہبی ایقان کو متزلزل کرتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمتہ اللہ علیہ کا ایک مضمون "موت اور نیند" کے عنوان سے ماہنامہ "شاداب" حیدرآباد کے اکتوبر ۱۹۸۷ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے اس مضمون میں انھوں نے سورۃ زمر کی آیت سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نیند اور موت دراصل ایک ہی عمل کا حصہ ہیں۔

سورۃ زمر کی آیت:۔

" اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰٓى اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ط اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ٥

ترجمہ : اللہ ہی قبض (یعنی معطل) کرتا ہے اُن جانوں کو اُن کی موت کے وقت اور ان جانوں کو بھی جن کی موت نہیں آئی، اُن کے سونے کے وقت، پھر ان جانوں کو تو روک لیتا ہے جن پر موت کا حکم فرما چکا ہے اور باقی جانوں کو ایک میعادِ معین تک کے لیے رہا کر دیتا ہے، اس میں ان لوگوں کے لیے جو کہ سوچنے کے عادی ہیں، دلائل ہیں۔"

اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں۔

تفسیر : اللہ تعالیٰ ہی قبض (یعنی معطل) کرتا ہے اُن جانوں کو (جن کا وقت موت آ پہنچا ہے) ان کی موت کے وقت (مکمل طور پر زندگی بالکل ختم ہو جائے) اور اُن جانوں کو بھی جن کو موت نہیں آئی ان کے سونے کے وقت (یہ تعطل بالکلیہ نہیں ہوتا ایک حیثیت حیات کی رہ جاتی ہے مگر ادراک نہیں رہتا اور موت کی صورت میں نہ ادراک رہتا ہے نہ حیات) اس کو معطل کرنے کے بعد) ان جانوں کو تو (بدن کی طرف عود کرنے سے) روک لیتا ہے، جن پر موت کا حکم فرما چکا ہے اور باقی جانوں کو (جو نیند کی وجہ سے معطل ہو گئی تھیں اور ابھی ان کی موت

کا وقت نہیں آیا) ایک میعادِ معین (یعنی مدت) تک کے لئے آزاد کر دیتا ہے (کہ پھر واپس جاکر بدن میں بدستور سابق تصرفات کرنے لگے) اس (مجموعہ تصرفاتِ الٰہیہ) میں اُن لوگوں کے لئے جو سوچنے کے عادی ہیں (خدا تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور بلا شرکتِ غیرے تمام عالم کے انتظامات کرنے پر) دلائل ہیں (جن سے اللہ تعالیٰ کی توحید پر استدلال کرتے ہیں)۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اسی مضمون میں معارف و مسائل کے عنوان سے موت اور نیند کے وقت قبضِ روح کے فرق کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا

توفّی کے لفظی معنیٰ لے لینے اور قبض کر لینے کے ہیں۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ بتلایا ہے کہ جانداروں کی ارواح ہر حال، ہر وقت اللہ تعالیٰ کے زیرِ تصرف ہیں وہ جب چاہے ان کو قبض کر سکتا ہے اور واپس لے سکتا ہے اور اس تصرفِ خداوندی کا مظاہرہ تو ہر جاندار روز دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ نیند کے وقت اس کی روح ایک حیثیت سے قبض ہو جاتی ہے، پھر بیداری کے بعد واپس مل جاتی ہے اور آخر کار ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ بالکل قبض ہو جائے گی پھر واپس نہ ملے گی۔"

اسی مضمون میں ایک حوالہ دیتے ہوئے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں کہ،

" تفسیر مظہری میں ہے کہ قبضِ روح کے معنی اس کا تعلق بدنِ انسانی سے قطع کر دینے کے ہیں کبھی یہ ظاہراً و باطناً بالکل منقطع کر دیا جاتا ہے اسی کا نام موت ہے اور کبھی ظاہراً منقطع کیا جاتا ہے باطناً باقی رہتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ صرف حس اور حرکتِ ارادیہ جو ظاہری علامتِ زندگی ہے وہ منقطع کر دی جاتی ہے اور باطناً تعلق روح کا جسم کے ساتھ باقی رہتا ہے جس سے وہ سانس لیتا ہے اور زندہ رہتا ہے جس سے وہ سانس لیتا ہے اور زندہ رہتا ہے اور صورت اس کی یہ ہوتی ہے کہ روحِ انسانی کو عالمِ مثال کے مطالعہ کی طرف متوجہ کر کے اس عالم سے غافل اور معطل کر دیا جاتا ہے تاکہ انسان مکمل آرام پا سکے اور کبھی یہ باطنی تعلق بھی منقطع کر دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے جسم کی حیات بالکل ختم ہو جاتی ہے۔"

آیتِ مذکور میں لفظِ توفی بمعنی قبض بطورِ عموم مجاز کے دونوں معنوں پر حاوی ہے موت اور نیند دونوں میں قبضِ روح کا یہ فرق جو اُوپر بیان کیا گیا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک قول سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے انھوں نے فرمایا کہ سوتے کے وقت انسان کی روح اس کے بدن سے نکل جاتی ہے مگر ایک شعاع روح کی بدن میں رہتی ہے جس سے وہ زندہ رہتا ہے اور اسی رابطۂ شعاعی سے وہ خواب دیکھتا ہے پھر یہ خواب اگر روح کے عالمِ مثال کی طرف متوجہ رہنے کی حالت میں دیکھا گیا تو وہ سچا خواب ہوتا ہے اور اگر اس طرف سے بدن کی طرف واپسی کی حالت میں دیکھا تو اس میں شیطانی تصرفات ہو جاتے ہیں وہ رویائے صادقہ نہیں رہتا اور فرمایا کہ نیند کی حالت میں جو روحِ انسانی اس کے بدن سے نکلتی ہے تو بیداری کے وقت آنکھ جھپکنے سے بھی کم مقدار وقت میں بدن میں واپس آجاتی ہے۔"

ماہنامہ "شاداب" حیدرآباد کے اکتوبر ۱۹۸۷ء کے شمارے میں ایک اور مضمون "ڈاکٹر عبداللہ الیمن، اسلام کی آغوش میں" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اس مضمون میں کہا گیا ہے کہ :-

"قاہرہ کانفرنس کے لیے مقالہ تیار کرتے وقت سورہ زمر کی چند آیات نے ڈاکٹر الیمن کو بہت متاثر کیا۔ مزید غور و فکر کے لیے ڈاکٹر الیمن نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر یحییٰ المشرقی کے ساتھ تحقیق شروع کی۔ اس تحقیق سے وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ سائنٹفک شہادات و دلائل بھی قرآن کے اس انکشاف کی تصدیق کرتے ہیں کہ نیند اور موت دراصل ایک ہی عمل کا حصہ ہیں۔"

اسی مضمون میں ایک اور جگہ یہ درج ہے کہ :-

"انھوں (ڈاکٹر الیمن) نے کہا ہے کہ ان کے تجربات نے بھی اس بات کی تصدیق کی کہ جب انسان سوجاتا ہے تو اس کے جسم سے کوئی چیز نکل جاتی ہے اور جب وہ دوبارہ جسم میں داخل ہوتی ہے تو آدمی جاگ اٹھتا ہے، لیکن موت کے بعد "وہ چیز" انسانی بدن میں دوبارہ داخل نہیں ہوتی ہے یہی وہ بات ہے جسے سورہ زمر میں بیان کیا گیا ہے"

(اُردو نیوز جدہ)

برکت اللہ ایم ڈی، شعبہ معالجات
اجمل خاں طبیہ کالج۔ اے ایم یو علیگڈھ

شفاء الملک عبداللطیف فلسفی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک دور وہ تھا جب ۱۹۳۴ء میں سر راس مسعود مرحوم اس کے وائس چانسلر تھے اور بہت سے نابغہ روزگار اساتذہ و ماہرین فن ملک کے گوشے گوشے سے یہاں جمع تھے۔

اسی دور کی مایہ ناز شخصیتوں میں ایک حکیم عبداللطیف فلسفی کا نام نامی لیا جاتا ہے جو اجمل خاں طبیہ کالج پر افق پر نمودار ہوئے اور اپنی گوناگوں علمی صلاحیتوں اور طبی خدمات سے دنیائے طب میں چار چاند لگائے۔

آپ ہندوستان میں طب کے دو اہم خانوادوں خاندان شریفی اور خاندان عزیزی میں سے خاندان عزیزی کے چشم و چراغ تھے اور حکیم عبدالمعید کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کی پیدائش لکھنؤ کے مشہور محلہ جھوائی ٹولہ میں ۱۰ محرم الحرام ۱۳۱۷ھ / ۲۹ اپریل ۱۹۰۰ء کو بعد نماز جمعہ ہوئی۔ پیدائش کے دو ہی سال بعد والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کے چچا اور بڑے بھائی نے تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالی۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ فرقانیہ میں حاصل کی اور مدرسہ عالیہ رام پور سے معقولات کا درس حاصل کیا وہاں آپ نے مولوی فضل حق رام پوری سے خصوصی استفادہ کیا۔

فن طب کی تکمیل لکھنؤ کے تکمیل الطب کالج سے کی اور چند سال اسی کالج میں درس و تدریس کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ۱۹۲۷ء میں طبیہ کالج علیگڑھ میں لیکچرر مقرر ہوئے

یہیں سے آپ کی طبی زندگی کے اہم باب کا آغاز ہوا۔ جہاں آپ نے طب مستقہ
مختلف مضامین و مقالات لکھے جو متعدد کتب و میگزین میں شائع ہوتے رہے
آپ نے فن طب کی تجدید و ترقی میں خصوصی دلچسپی لی۔ اس لحاظ سے آپ کی
تصنیفات و مقالات زیادہ اہمیت کی حامل ہیں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ نے خود
فن طب کی ترقی و طب کے لئے وقف کر دیا۔ خصوصاً طبیہ کالج علی گڑھ سے خاص شغف
اس کی فروغ و ترقی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے ۱۹۴۹ء میں پرنسپل کے عہدے پر
فائز ہوئے تو نشر و اشاعت کے ساتھ دواخانہ طبیہ کالج کی طرف خاص توجہ فرمائی اور
شعبۂ ریسرچ و تحقیقات سے تعلق بھی قائم کیا۔ نیز بہت سی جڑی بوٹیوں کے
پودے لگوائے جس سے دوا کی شناخت و ماہیت اور اس کی اصلیت سے بخوبی
واقف ہوا جا سکے۔ آپ ڈین فیکلٹی آف میڈیسن کے عہدے پر فائز رہے۔ آل
انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے وائس پریسیڈنٹ کے فرائض کو بھی بھی انجام دیا۔ آپ
کی علاج و معالجہ و طبی خدمات کی بنا پر گورنمنٹ آف انڈیا نے "شفاء الملک" کا خطاب
عطا کیا۔ ۲ ستمبر ۱۹۶۱ء میں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں جامعہ
طبیہ دہلی کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ اسی دوران آپ کو قلب کا عارضہ لاحق ہوا جس کی وجہ
سے ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے آبائی وطن لکھنؤ منتقل ہو گئے وہاں پہونچ کر لکھنو
کے جھوائی ٹولہ میں مطب شروع کیا اور ایک دار المجربات بھی قائم کیا۔ آخری ایام میں
عارضۂ قلب کا دوبارہ و سہ بارہ حملہ ہوا اور ڈاکٹر فریدی مرحوم کے مشورے پر لکھنؤ
میڈیکل کالج اسپتال میں داخل کر دیئے گئے۔ بالآخر ۱۴ نومبر ۱۹۷۰ء کی درمیانی شب
دو بجے جان جان آفریں کو سپرد کر دی۔ اس طرح علم طب کا یہ روشن ستارہ ہمیشہ کے
لئے غروب ہو گیا۔

مرحوم نے تصنیفات و تحقیقات کے میدان میں علم طب، مذہب و فلسفہ کے مختلف
عنوانوں پر خامہ فرسائی کی۔ آپ کی تصنیفات طب کے میدان میں بہت اہم جن میں مندرجہ

ذیل کتب قابل ذکر ہیں:

۱۔ تحقیق المقال فی تعریف الاعتدال (۲) التحقیق المطلوب فی المار المشر

۳۔ ہماری سائنٹفک طب یونانی (۴) تاریخ طب

۵۔ مختصر تاریخ قدیم تشریح و منافع الاعضاء و علم الجراحت

۶۔ ہماری طب میں ہندوؤں کا ساجھا (۷) طب اور سائنس

۸۔ نبض (۹) ترجمہ و شرح ادویہ قلبیہ

مذہبی اور دینی کتابوں میں

۱۔ مذہب اور لامذہبیت (۲) فلسفۂ نبوت (۳) راعنیہ مرو

قابل ذکر ہیں۔

مریضوں کے دیکھنے اور علاج و معالجے میں آپ کا طریقہ مطب نرالا تھا۔ اگر کو نہ بیان کیا جائے تو ان کی زندگی کا ایک اہم حصہ نامکمل رہے گا۔ آپ کے نسخوں قدیم روایات کے ساتھ جدّت و ذہانت کا اثر خوب خوب پایا جاتا تھا۔ اکثر طویل دشوار طب نسخوں سے گریز فرماتے۔ دوران مطب سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ظریف غیر سنجیدہ بھی نظر آتے تھے جس کی جھلک آپ کے مطب میں نمایاں ہوتی۔ بقول پروف حکیم محمد طیب صاحب:

"میں نے ایسے افراد کم دیکھے ہیں جو اپنی زندگی میں سنجیدہ بھی اتنے ہی پائے جا سکیں جتنا کہ وہ ظریف اور غیر سنجیدہ بھی نظر آتے رہے ہوں، دور کی کوڑی لانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ انھیں عام روش پر۔ اور تکے بند ھے راستوں پر چلنا بھی پسند نہ تھا۔ چنانچہ ان کے مطب میں اجتہاد کی شان نمایاں رہتی تھی۔"

(مقدمہ مطب لطیف ص ۵)

آپ علاج و معالجہ میں بے جا نا کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے بلکہ بسا اوقات مریض مالی امداد بھی فرماتے تھے خصوصاً وہ مریض جو اپنی غربت و افلاس کی بنا پر دوا نہیں خو

سکتا۔ بجاطور پر ان کا یہ عمل آج کے اطباء و حکماء کے لیے قابل تقلید و قابل رشک ہے۔

بقول حکیم محمد مختار اصلاحی

"ایک اچھے معالج کے تمام اوصاف ان میں موجود تھے ان کا نسخہ منفرد اور طرحدار تھا۔"

(اطباء اور ان کی مسیحائی)

آپ کی وفات سے طب کا ایک زریں عہد ختم ہو گیا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

مراجع :- ۱۔ مطب لطیف۔ سید کمال الدین حسین ہمدانی الجلالی
۲۔ شفاء الملک حکیم عبداللطیف کے نقوش و تاثرات : محمد اسلم
۳۔ اطباء اور ان کی مسیحائی۔ از محمد مختار اصلاحی ص ۱۶۰
۴۔ تاریخ خاندان عزیزی۔ سید ظل الرحمٰن

(باقی سلسلہ ص ۲۷ سے آگے)

صنعت اس کا فائدہ اٹھا سکے۔ ضوابط کی تشکیل اور اعلامیوں کا اجراء جلد ہونا چاہیئے تاکہ یہ پالیسی عملی شکل اختیار کر سکے۔

اس پالیسی پر مناسب طور پر عمل درآمد ہوا تو اس کے اثرات دو تین برس بعد ہی محسوس ہوں گے۔ اس بات کا شک ہے کہ مفاد پرست عناصر اس کے نفاذ کی راہ میں حائل ہونے کے نئے طریقے نکال لیں۔ لیکن حکومت جس عزم اور رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے وہ اُمید افزا ہے۔

دیہی صنعتوں کا فروغ

عالمی بنک نے دیہی ترقی کا عام فہم الفاظ میں جو تشریح کی ہے اس کا مطلب ایک حکمت عملی سے ہے جو گاؤں میں رہنے والوں کی معاشرتی زندگی اور اقتصادی حالت بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہو یہ اسی وقت ممکن ہے جب پیداوار اور پیداوار میں اضافہ ہو اشیائے خوردنی کی بہتر فراہمی کو یقینی بنایا جائے اور تغذیہ بخش خوراک دستیاب ہو اس کے علاوہ حالت بہتر بنانے اور معیار زندگی کو بہتر بنانے کی غرض سے اچھی صحت اور تعلیم کی سہولیات ہونا بھی ضروری ہے اس مقصد کے حصول کے لیئے دیہی خواتین نے ترقیاتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا ہے حکومت اور دوسری تنظیموں نیز دوسرے اداروں کی طرف شروع کیئے گئے مختلف دیہی پروگراموں کی وجہ سے جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں دیہی خواتین کے رہن سہن کے حالات سے اُس کا اظہار ہوتا ہے زیادہ سے زیادہ خواتین آمدنی بڑھانے کے لیئے کل وقتی یا جُز وقتی کام دھندوں میں دلچسپی لے رہی ہیں یہاں پر یہ ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ کسی بھی معاشرے کے نظام کی ترقی کے لیئے افرادی قوت زبردست اہمیت کی حامل ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی بھی پروگرام نظام یا اسکیم کی کامیابی کا انحصار افرادی قوت پر ہوتا ہے ۔ ماضی قریب میں صنعتی ترقی کے پروگرام شروع کر کے افرادی قوت کو ہنر مند بنا کر ایک بڑی کامیابی حاصل کی گئی ہے اس طرح کے پروگرام دیہی علاقوں میں خواتین کے لیئے بھی شروع کر کے افرادی قوت کو ہنر مند بنا کر ایک بڑی کامیابی حاصل کی گئی اس طرح پروگرام دیہی علاقوں میں خواتین کے لیئے شروع کیئے گئے تھے۔

حکومت کرناٹک نے بین الاقوامی مالی اور ترقیاتی ادارے سے قائم کرنے کے ساتھ

۱۹۷۷ء میں کرناٹک کی تکنیکی مشاورتی خدمات سے متعلق ایک تنظیم ٹیک سوک نے قائم کی تھی یہ تنظیم ضلع، تعلقہ اور گاؤں کی سطح پر محنتی صنعت کاروں کے لیئے ترقیاتی پروگراموں کا اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ صنعت کاروں کو مناسب خرچ پر مشاورتی خدمات بھی مہیا کرتی ہے تکنیکی مشاورتی خدمات سے متعلق تنظیم (ٹیک سوک) اب تک محض خواتین کے لیئے ہی ۴۴ ترقیاتی پروگراموں کا اہتمام کر چکی ہے اور اس تنظیم نے اپنا کاروبار چلانے کی ۹۰ سے زیادہ صنعت کاروں کو تربیت دی ہے۔

کرناٹک میں ایسی بہت سی صنعتیں ہیں جہاں خواتین برسر روزگار ہیں ان میں دست کاری، بیڑی اور اگربتی وغیرہ بنانے کی صنعتیں قابلِ ذکر ہیں ان کام دھندوں میں جس ہنرمندی اور کاریگری کی ضرورت ہے اُسے طور طریقوں، پلانٹ اور مشینری وغیرہ میں بہتری لاکر زیادہ عمدہ بنایا جاسکتا ہے علاوہ ازیں ہنرمند خواتین کی اس بات کے لیئے بھی حوصلہ افزائی کی جاسکتی ہے کہ وہ بنکوں یا دیگر مالی اداروں سے امداد لے کر خود اپنے کام دھندے شروع کریں۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ٹیک سوک تنظیم نے ان خواتین کی مہارت میں بہتری لانے کی غرض سے کچھ مخصوص پروگراموں کا اہتمام کیا تھا ٹیک سوک نے پہلی مرتبہ ریشم سازی، جلدسازی، دست کاریوں، مٹی کے برتن بنانے، اگربتی کی تیاری اور فیشن کے ملبوسات کی تیاری میں خواتین کی مہارت اور ہنرمندی میں بہتری لانے کے لیئے مختلف پروگراموں کا اہتمام کیا۔ گاؤں میں اس طرح کے پروگرام کی بدولت جو نتیجہ اخذ کیا گیا وہ مندرجہ ذیل ہے۔

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ صنعتی فروغ کے لیئے تین باتیں بہت اہم ہیں۔ رغبت، معاونت اور پھر حاصل کردہ کامیابی کی برقراری، تربیت دہندہ کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دیہی سطح پر صنعتی ترقی کے عمل میں ربط ضبط پیدا کرے کیونکہ وسائل کو بروئے کار لانے کے لیئے بہتر تربیت اور مختلف ادارہ جاتی تنظیموں کے درمیان اشتراک اشد ضروری ہے مال کی فروخت میں اشتراک بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

ابتدا میں منتخبہ دیہی علاقوں میں یہ دیکھنے کے لئے کہ کس مال کی زیادہ کھپت ہے اور کون کون سی صنعتوں کو خواتین چلا سکتی ہیں ۔ یہ بات سامنے آئی کہ روایتی موجودہ سرگرمیوں کی بدولت گاوؤں میں صنعتی ماحول کو فروغ دینے میں مدد ملی ہے کسی نئے نظریئے کو شروع کرنے کے مقابلے میں موجودہ سرگرمیوں سے اس طرح فائدہ اٹھانا آسا تھا اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ٹیک سوک نے ریشم سازی کے کام میں مصروف دیہی خواتین کی مدد کے لئے خاص پروگرام شروع کئے تاکہ وہ اپنے کام میں مہارت حاصل کریں ۔

کرناٹک کے متعدد دیہات میں ریشم سازی کا کام ہوتا ہے اور اس میں مزدوروں کی بھی زیادہ کھپت ہوتی ہے میسور، کولار اور بنگلور اضلاع میں بطور خاص یہ کام ہوتا ہے اس د دُنیا میں ہندوستان دوسرا ایسا بڑا ملک ہے جہاں سب سے زیادہ ریشم تیار کیا جاتا ہے کرناٹک کو ریشم کا گڑھ کہا جاتا ہے کیونکہ ۶۰ فیصدی ریشم اس ہی ریاست سے حاصل ہوتا اس وقت کرناٹک کے ۱۴۷۰۰ دیہات میں اس کام کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے اور ۸۸-۱۹۸۷ میں ۹۷۰۰ ٹن ریشم تیار کیا گیا تھا ۔ بیشتر دیہی خواتین ریشم کو چرخہ پر چڑھانے کا کام کرتی ہیں یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ بیشتر خواتین اپنے کنبہ کی آمدنی میں ۱۰ سے ۱۵ روپے یومیہ کا اضافہ کرتی ہیں البتہ یہ ضروری ہے کہ اُنھیں اپنے گھر یا گاؤں سے جانا پڑتا ہے جائزے کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ غیر روایتی کنبوں کی خواتین نے بھی اسے ذاتی کام دھندے کے طور پر شروع کرنے میں دلچ کا اظہار کیا ہے اسے دیکھتے ہوئے ٹیک سوک نے مرکزی سلک بورڈ ریشم سازی کے شع مالی اداروں اور ریشم کی ٹکنالوجی سے متعلق مرکزی ادارے کے تعاون سے اس خواتین کے خصوصی پروگراموں کا اہتمام کیا اور اُنھیں اس کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کیا اس طر کے پروگراموں کی کامیابی میں صحیح اور ہونہار اُمیدواروں کا انتخاب بڑی اہمیت رکھتا ٹیک سوک کی خاتون افسروں نے ایک روزہ کیمپ لگا کر دیہی خواتین کے انٹرویو لیئے ۔ ا کے علاوہ دیگر خانہ دار خواتین بھی اس کیمپ میں آئیں اور اُنھیں ان کے کنبے کے بارے میں

ورہ وغیرہ دیا گیا اس کیمپ کے دوران یہ بات بھی سامنے آئی کہ اپنے گاؤں سے نے اور دور افتادہ مقامات پر تربیتی نصاب کے لئے جانے پر آمادہ نہیں ہیں جبکہ یم سازی سے متعلق محکمے نے مطلوبہ تربیت فراہم کرنے کی غرض سے بنیادی ڈھانچہ کا نظام کیا ہے۔ امیدوار اپنے گاؤں سے دور تربیت کے لئے نہ جانے کی مندرجہ ذیل وجوہات تے ہیں۔

الف۔ ان کی گھریلو ذمہ داریوں سے انھیں اتنا وقت ہی نہیں مل پاتا کہ وہ اپنے گھروں سے دور زیادہ عرصہ تک تربیت کے لئے چلے جائیں۔

ب۔ انھیں اپنی دہاڑی سے محروم ہونا پڑے گا۔

ج۔ وہ دور دراز جانے کے اخراجات اور تربیت کے دوران التعاقیہ اخراجات کو برداشت نہیں کر سکتے۔

د۔ خواتین تربیت کے لئے اپنے گھر سے باہر کئی روز رہنے کے لئے تیار نہیں ہیں

مذکورہ بالا نکات کے مدنظر رکھتے ہوئے ٹیک سوک نے کولار تعلقہ میں ہوسنگن ہالی دیون ہالی تعلقہ میں دجینئے پور میں شرکا کے فائدے کے لئے تربیتی پروگراموں کا اہتمام کیونکہ ان ہی دیہات میں جائزے کا کام ہوا تھا۔

آمادگی سے متعلق سرگرمیاں —— پرچار تشہیر، انٹرویو، جگہ کی دستیابی کی یق کے لئے گھروں کا دورہ، کینہ سے متعلق صلاح ومشورہ، عملی کام کاج کا مظاہرہ، ئف کا انتظام، زیر تربیت افراد کے لئے سفر کے اخراجات فراہم کرنا، پروگرام کے لئے ت کی نشاندہی، تاکہ زیر تربیت افراد بآسانی آجا سکیں۔ زیر تربیت افراد کی ضروریات طابق پروگرام میں ردوبدل کی گنجائش۔

ایک کمیٹی نے امیدواروں کا انتخاب کیا اور انتخاب کرتے وقت یہ بات مدنظر رکھی کہ آیا وار تربیت کے بعد اپنے گھروں / احاطوں میں ریشم چرخوں پر چڑھانے کی گنجائش رکھتے یا نہیں۔

معاونت ہے ۔ بہتر چرخوں پر چار ہفتے کی عملی تربیت، ایس ایس آئی کے تحت اکائیوں کا اندراج، منصوبے کی تفصیلی رپورٹ کی تیاری، منڈی اور کرناٹک ریشم ساز بورڈ میں ربط، ریشم کے شعبے کی جانب سے مطلوبہ لائسنس کا اجراء، منصوبے کے لیئے مالی اداروں سے امداد حاصل کرنے میں ہاتھ بٹانا، آزمائشی طور پر مال کی تیاری کے لیئے مشینوں کی فراہمی / تنصیب ۔

تربیتی نصاب ۔۔ تربیت دیتے وقت ریشم کے چرخوں پر چڑھانے سے متعلق تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے یعنی خام مال کی خریداری سے لے کر تیار مال کی منافع بخش قیمت پر فروخت تک کے سبھی مراحل میں شامل ہیں پانچ ہفتے کے طویل پروگرام میں صنعتی خام مال کی ترتیب بنک کاری کی سرگرمیوں (بنکوں میں جا کر عملی مظاہرہ کیا جاتا ہے) ریشم سازی کے کارخانوں اور منڈی وغیرہ کے سلسلے میں تمام معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ عملی تربیت کے دوران گروپ بنا دیئے جاتے ہیں اور ہر گروپ کے لیڈر کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ تمام شرکا کو مساوی تجربہ حاصل ہو ان لوگوں کو یا مارکٹ بھیجا جاتا ہے تاکہ یہ وہاں کے کام کاج کو سمجھ سکیں ۔ تربیت کے بعد بھی باقاعدگی سے مشق جاری رہتی ہے ٹیک سوک صنعتوں کے لیئے مالی امداد دلانے میں بھی مدد کرتی ہے خواتین صنعت کاروں کی اس بات کے لیئے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ اپنے گھروں پر اس طرح کے چرخے لگائیں اس طرح سرمایہ کی بھی کم ضرورت ہوگی اور دورہ جانے کے اخراجات میں بھی کمی آئے گی۔

برقراری ۔۔ پروگرام کے بعد میں بھی گہری نظر ڈالی جاتی ہے، زیر تربیت افراد امداد کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں، منڈی سے ربط، ٹکنالوجی کی جانکاری، بینک کی ادائیگی ۔

اگرچہ پروگرام کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گیا ہے تاہم ٹیک سوک کو منصوبوں کے لیئے بنکوں سے مالی امداد دلانے کے لیئے بھی محنت کرنی ہوگی ۔ ٹیک سوک مسلسل درخواست اور پیروی کرنے کے نتیجے میں لینڈ بنک (LAND BANK) سے دس منصوبوں کے لئے امداد حاصل

میں کامیاب ہو گئی ہے۔

کرناٹک سلک مارکیٹنگ بورڈ کے تعاون سے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ یہ منڈی میں صنعت کار مالیت کا خام مال خرید سکیں جتنا کہ سلک فروخت ہوا ہو۔ مگر اس کے لیے شرط ہے کہ فروخت کا پیسہ ان صنعت کاری، ترغیبی، اخلاقی اور صفائی، سمتراتی وغیرہ جیسے ؤں پر بھی برابر توجہ دی جا رہی ہے تاکہ دیہی خواتین کی ذاتی زندگی اور ان کے رہن سہن حالات میں بھی بہتری آ سکے۔ انگوٹھے لگانے کے بجائے اب خواتین دستخط کرنے لگی ہیں، الفاظ کی بھی پہچان کرائی جا رہی ہے اور ایک سو تک گنتی بھی سکھائی جا رہی ہے تاکہ کتاب میں آسانی ہو سکے۔

ٹیک سوک سلک کے پیشے کو فروغ کے لیے مرکزی سلک بورڈ اور ریشم سازی کے محکمے ون کر رہی ہے تاکہ ریاست میں ریشم کے کام کو فروغ اور توسیع دی جا سکے۔ ہندوستان کے ترقیاتی بینک نے ریشم سازی کے ریاستی شعبے میں اور مرکزی ریشم بورڈ کے تعاون سے ایک سکیم شروع کیا ہے۔

عالمی بینک کی امداد سے کرناٹک میں ریشم کے کیڑے پالنے کے ایک قومی منصوبے پر عمل ہے اس پروگرام کا مقصد کچے ریشم کی تیاری کو ۰۰۰۶ ٹن سے بڑھا کر ۱۵۰۰۰ ٹن کرنا ہے ہے کہ کیڑوں کے زیادہ پیداوار سے ریشم کی تیاری بڑھ کر ۱۵۰۰۰ ٹن ہو جائے گی۔ مستقبل ن پروگراموں کا یہ نتیجہ ہو گا کہ صنعتی ماحول بن جانے پر دیہی خواتین کی اور زیادہ تعداد ریشم اور اس سے متعلقہ کاموں میں حصہ لینے کی حوصلہ افزائی ہو گی۔ اس سے نہ صرف ان کی بڑھے گی بلکہ ریاست میں کچے ریشم کی بھی زیادہ پیداوار ہو گی۔

اردو کے فروغ کے لئے اردو لکھیئے، اردو پڑھیئے اور اردو بولیئے

ڈاکٹر بلنتا موہن

غذائی اجناس کی پیداوار میں اضافہ

اس صدی کے ختم تک ملک میں ۲۲۵ ملین ٹن غذائی اجناس کی پیداوار ہو گ تاکہ بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی ضرورتوں کی تکمیل کی جا سکے غذائی اجناس کے مو کو بہتر بنانے کے لیے زرعی سرگرمیوں کو تیز تر اور معیاری بنانا ہوگا۔ ظاہر کہ اچھی کاشت کے لئے معیاری کھادوں کا استعمال بھی ضروری ہے

ہندوستانی کھادوں کی صنعت نے کئی برسوں سے ملک کے زراعتی نظام انتہائی اہم رول ادا کیا ہے ملک میں کھادوں کا پہلا یونٹ ۱۹۰۶ء میں قائم کیا تھا جس نے صرف سوپر فاسفیٹ تیار کیا تھا، ۱۹۴۴ء میں کیرالا میں نائٹروجن فرٹیلائزرس کا وسیع پلانٹ قائم کیا گیا جہاں اموینیم سلفیٹ تیار کیا جاتا ہے اس بعد ۱۹۵۱ء میں سندری میں کھادوں کا پلانٹ قائم ہوا۔ یہ پلانٹ ملک میں عوا شعبہ کا پہلا ادارہ تھا۔

ان معمولی شروعات کے ذریعہ ہندوستان نے ترقی کی منزلیں طئے کیں اور آج دنیا بھر میں کھاد پیدا کرنے کے سلسلہ میں چوتھا بڑا ملک قرار دیا گیا ہے دیگر تین مم میں امریکہ، روس، چین ہیں ملک میں ہر سال ۱۱ ملین ٹن کھاد پیدا کی جاتی ہے

ملک میں عوامی خانگی اور امداد باہمی کے شعبوں نے کھاد کی پیداوار کے ذریعہ ملک

ترقی کو نئی جہت دی ہے ان شعبوں میں ۲۷ فیصد نائیٹروجن اور اہم
سفیٹی کھاد تیار کی جاتی ہے اس وقت ہندوستان میں ۵۵ بڑے فرٹیلائیزر
کام کر رہے ہیں جہاں سب ہی طرح کی کھادیں تیار ہوتی ہیں دیگر ۹۰ یونٹس
سوپر فاسفیٹ تیار کی جاتی ہے۔ مزید کئی نئے یونٹس قائم کیئے جا رہے ہیں
۱۲،۵۴ ملین ٹن کھاد کی پیداواری صلاحیت کے حامل ہوں گے ان میں
ملین ٹن نائٹروجن اور ۳،۱۸ ملین ٹن فاسفیٹ کھاد ہوگی۔

۱۹۹۰ء کے مالی سال کے دوران ۷ ملین ٹن نائیٹروجن اور ۲،۵ ملین
سفیٹ کھاد پیدا کی گئی جبکہ گزشتہ سال ۶،۷۵ ملین ٹن نائیٹروجن اور ۱،۸
فاسفیٹ کھاد کی پیداوار ہوئی۔ اسی سال کے دوران ۱۳ فرٹیلائیزر پلانٹس
پیداواری حدود کو متجاوز کر لیا۔ اترپردیش کے جگدیش پور پلانٹ میں
ت کے ہزیرہ پلانٹ میں زبردست پیداوار ہوئی اور ۲،۱۷ لاکھ میٹرک
ریا پیدا کیا گیا۔ پیداوار کی یہ ترقی دراصل اعلیٰ درجہ کی نگرانی، عصری،
کا استعمال اور کام کرنے والوں کی بہتر کارکردگی کا نتیجہ ہے ان پلانٹس کے
میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ توانائی کی بچت ہو اس کے لیے عصری طریقے
کیئے گئے۔

شتہ تین دہوں میں ملک کے اندر کھادوں کی بہتر پیداوار نے ہمارے زراعتی
خود انحصاری کا اہل بنا دیا۔ زرعی اراضیات میں ملک کی تیار کردہ ان عصری
کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں اوسطاً فی ہیکٹر زمین پر ۴،۵۷
کھاد استعمال کی جاتی تھی آج یہ اوسط بڑھ کر ۶۰ کلوگرام ہو چکا ہے بعض ریاستوں
یہ اور بھی زیادہ ہے اگر آبپاشی اور دیگر سہولتوں میں اضافہ ہو جائے تو
کے استعمال کی رفتار میں مزید بہتری پیدا ہو سکے گی۔

ں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ملک میں استعمال کی جانے والی ۸۲ فیصد کھادیں

اندرون ملک ہی تیار ہوتی ہیں صرف پوٹاش کھادیں بیرونی ملکوں سے درآمد کی جاتی ہیں کیونکہ ہمارے یہاں ان کی پیداوار نہیں ہے دیسی کھادوں کے استعمال کے نتیجہ میں ہماری درآمدات میں بڑی حد تک کمی ہوئی ہے۔

فرٹیلائیزر پلانٹس کے قائم کرنے میں بھی ہم نے نمایاں اقدامات کیئے ہیں اب ایسے پلانٹس قائم ہونے لگے ہیں جن کی پیداواری صلاحیت ہماری توقعات توقعات سے زیادہ ہیں ہمارا برسوں کا تجربہ اور مسلسل محنت اور لگن نے ہمارے فرٹیلائیزر پراجکٹس کو ایک متاثر کن صورتحال سے ہمکنار کیا ہے فرٹیلائزر پلانٹس کیلئے زیادہ سے زیادہ مشنری اندرون ملک ہی تیار کی جاتی ہے ملک میں اب ان پلانٹ کے لئے درکار ۷۰ فیصد سامان و آلات دیسی ساختہ ہیں اس کے علاوہ دیگر مشنری بھی ملک کے اندر ہی تیار کی جارہی ہے اس صورتحال کے نتیجہ میں نہ صرف بیرونی زرمبادلہ کے اصراف میں کمی آئی ہے بلکہ ہماری خود کی صلاحیتوں میں بھی اضافہ کرنے کا موقعہ ملا حال ہی میں بہار کے امجوہرے میں ایک فرٹیلائزر پلانٹ قائم کیا گیا اس کے علاوہ کوچین، پردیپ اور تھال میں بھی کھاد کے پلانٹس قائم کیئے گئے۔ آندھرا پردیش میں کاکناڈا ضلع میں گیس پر مبنی یوریا پراجکٹس کے قیام کی منظوری دے دی گئی ہے اسی طرح تین پراجکٹس راجستھان، شاہجہاں پور اور بابرلا میں بھی قائم ہوں گے۔

آٹھویں اور نویں پانچسالہ منصوبوں میں خانگی، عوامی اور امداد باہمی کے شعبوں میں نائیٹروجن اور فاسفیٹ کھادوں کی تیاری کے سلسلہ میں پیداواری صلاحیت میں اضافہ کی تجویز ہے۔ اس سلسلہ میں بعض پرانے یونٹوں کا از سر نو احیاء کیا جائے گا اور ان کی کارکردگی میں بھی اضافہ ہوگا۔

کھادوں کی قیمتوں میں اضافہ اس قدر تشویشناک نہیں ہے جتنا کہ ان کا بہتر اور مناسب استعمال ہے۔

لیانی شنکر



نئی صنعتی پالیسی

ئی صنعتی پالیسی کا اعلان ایک بر وقت اقدام ہے برسوں میں بہت سے ماہرین
ریعہ کئے گئے مطالعات میں بنیادی اصلاحات کی مانگ کی جا رہی تھی اور خود
بھی معیشت کو پابندیوں سے آزاد کرنے کی مانگ کر رہی تھی۔ اس پالیسی میں
صلاحات کو شامل کیا گیا ہے وہ نئی نہیں ہیں۔ جو چیز حیرت انگیز ہے وہ یہ ہے
اصلاحات کو ایک ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ماضی میں ممکنہ غیر ملکی خطرے سے
ادملک کو محفوظ رکھنے کے لئے یہاں کی صنعت پر پابندیاں عائد کرنا ضروری سمجھا
ا پچھلے ۴۰ برسوں میں بھارتی صنعت اتنی مضبوط ہو گئی ہے کہ اس میں مقابلہ
حیت پیدا ہو گئی ہے۔ صنعتی پالیسی کی از سر نو تشکیل کا کام جو وزیر اعظم کے الفاظ
ل کے ساتھ تبدیلی کا عمل ہے لائق ستائش اقدام ہے ورنہ بھارت ان تبدیلیوں
وم رہ جاتا جو سوویت یونین اور مشرقی یوروپ کے ممالک سمیت ساری دنیا میں
ہو رہی ہیں۔

س پالیسی کا مقصد ایسے اقدامات کرنا ہے جو بھارتی صنعت کو افسر شاہی کے جال
سکے یہ اقدامات حکومت کے ان اقدامات کی تکمیل میں معاون ہوں گے جو تجارتی
رمبادلہ کی شرحوں میں تبدیلی، مالی پالیسی، مالی شعبوں میں اصلاحات اور دیگر کلی
معاشی انتظام کے شعبہ میں کئے گئے ہیں۔

اگر اس پالیسی پر مناسب طور پر عمل درآمد کیا گیا تو اس سے بھارت کو بین الاقوامی معیشت میں صحیح جگہ مل سکے گی۔ پھر بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس پالیسی کی رو سے ہونے والی زبردست تبدیلیوں سے ہر شخص متفق ہو۔ ملک میں ایسی سیاسی قوتیں ہیں جن کا پختہ یقین ہے کہ ملک کو سماج وادی ہونا چاہیئے اور سرکاری سیکٹر کو سبقت حاصل ہونی چاہیئے ہر چند کہ سوویت یونین سمیت ساری دنیا میں ان خیالات کو رد کیا جا رہا ہے۔

شاید اسی امر کو مد نظر رکھتے ہوئے وزیر خزانہ نے کہا تھا کہ بنیادی پالیسی کو تبدیل نہیں کیا جائے گا روزگار کے مواقع پیدا کرتے اور مزدوروں کی فلاح و بہبود کو اعلیٰ ترین ترجیح دی جا رہی ہے لیکن اس نئی پالیسی میں بہت سی بنیادی تجاویز بھی ہیں۔ جن میں سے بعض اہم تجاویز مندرجہ ذیل ہیں۔

چند امور کو چھوڑ کر سب چیزوں کے لئے لائسنس کا خاتمہ، اجارہ داری اور محدود تجارتی سرگرمیوں (ایم آر ٹی پی) کا خاتمہ، غیر ملکی شراکت کی حد کو بڑھا کر ۵۱ فیصد کرنا، دس صنعتی میدان میں پرائیوٹ سیکٹر کو سرمایہ کاری کی اجازت دینا جو اب تک سرکاری سیکٹر کے لئے محفوظ تھے۔

سرکاری سیکٹر میں بھی بنیادی تبدیلیاں لانے کی تجویز ہے جن میں خستہ حال صنعتوں کو بند کرنا شامل ہے۔

نئی پالیسی پر تنقید کرنے والوں نے حکومت پر الزام عائد کیا ہے کہ وہ بین الاقوامی دباؤ کے آگے جھک رہی ہے حکومت نے یہ واضح کیا ہے کہ ان تمام اقدامات کا مقصد یہ ہے کہ بھارت دنیا کے ساتھ ہم قدم رہے اور صنعت کو بین الاقوامی مقابلے لائق بنانے کے لئے یہ اقدامات اشد ضروری ہیں۔

اس نئی پالیسی میں خاص زور غیر ملکی سرمایہ کاری پر ہے ۵۱ فی صد تک غیر ملکی سرمایہ لگانے کی اجازت دینا ساتویں اور آٹھویں دہائیوں کی پالیسی سے یقینی طور پر الگ

۔ لیکن وزیر خزانہ نے واضح کیا ہے کہ ۴۰ برس کی منصوبہ بندی اور صنعت کاری
بعد ہم ترقی کی اس سطح پر پہنچ گئے ہیں جہاں غیر ملکی سرمائے کا خیر مقدم کیا جا سکتا
اور اس وضاحت کی روشنی میں غیر ملکی سرمایہ کاری کا خیر مقدم کرنا ضروری ہو گیا
ہمارے نئے صنعت کار کسی سے کم نہیں ہیں۔ ہماری صنعت ترقی یافتہ ہے براہ
ت غیر ملکی سرمایہ کاری سے سرمایہ کاری ٹکنالوجی اور منڈیوں تک رسائی حاصل ہو گی
سے ہمارے صنعتی سیکٹر کو غیر ممالک میں مقابلے میں بتدریج شرکت کا موقع ملے گا
۔ اچھی کارکردگی اور معیار جیسے امور پر خاص توجہ دی جائے گی۔

سرمایہ کاری کی حد کو بڑھا کر ۵۱ فیصدی کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غیر ملکی
یہ دار ہندوستان میں کشش محسوس کریں۔ بھارتی صنعت غیر ملکیوں کے ساتھ مل
مشترکہ صنعتیں قائم کرنے اور غیر ملکی زر مبادلہ اور ترقی یافتہ انتظامی مہارت
لوجی سے متعلق عملی واقفیت، فروخت کے نظام اور بین الاقوامی اثر و رسوخ کے
ر سے کثیر قومی کمپنیاں برآمدات کو فروغ دینے اور غیر ملکی زر مبادلہ کمانے میں
رول ادا کریں گی اس حقیقت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہ حکومت کثیر قومی کمپنیوں
مد کے معاملوں میں انفرادی طور پر مطالعہ کرنے کے لیئے ایک اعلیٰ اختیاری بورڈ
ل کرے گی غیر ملکی سرمایہ کاری کے معاملے میں آزادانہ طریقہ کار کے ناجائز
مال کا خیال غلط ہے۔

غیر ملکی ٹکنالوجی سے متعلق معاہدوں کو منظوری دینا بھی ایک باہمت قدم ہے
سے ہمیں اعلیٰ ٹکنالوجی حاصل ہو گی۔ غیر ملکی سرمائے کی آمد کو آسان بنانے
لیئے دفاع سے متعلق ۱۸ اور دیگر اہم سیکٹروں کے علاوہ تمام سیکٹروں کے لیئے
ی لائسنس ختم کر دیئے گئے ہیں ان معاملوں کو خود بخود منظوری مل جائے گی
غیر ملکی سرمایہ کاری کے ذریعہ غیر ملکی زر مبادلہ ملے گا۔ تکنیکی ترقی کے ڈائرکٹوریٹ
کا خاتمہ ایک اور اہم قدم ہے جس سے پابندیوں کا خاتمہ ہو گا۔ نئے تجارتی گھرانوں

کو اب صرف نئے پروجیکٹوں کے بارے میں اطلاعات کا بھوزنڈم داخل کرنا ہوگا۔

اس پالیسی میں سرکاری سیکٹر سے متعلق صرف ایک خاکہ ہے۔ ظاہر ہے کہ سرکاری سیکٹر کی صنعتوں میں لگی ہوئی حکومت کی رقومات کو واپس نکالنے کے بارے میں تفصیلات ابھی طے کی جانی ہیں خستہ حالی صنعتوں کو بند کرنے کا سخت فیصلہ حکومت نے لیا ہے مالی اور صنعتی بورڈ تعمیرِ نو کے بورڈ کے سپرد کی جانے والی کمپنیوں کے بارے میں تفصیلات طے کی جا رہی ہیں۔ حکومت کو سرکاری سیکٹر کی صنعتوں میں لگی اپنی رقم کو مالی اداروں اور عوام کے حق میں واپس لینے سے ۲۵۰۰ کروڑ روپے بچا لینے کی توقع ہے وزیر خزانہ نے اس سلسلے میں متاثرہ مزدوروں کی بہبود کے لیئے ایک فنڈ قائم کرنے کا اعلان کیا ہے جس کے لیئے مرکزی حکومت ۲۰۰ کروڑ روپے دے گی۔ اس کے علاوہ اس میں ریاستوں اور کمپنیوں کا بھی حصہ ہوگا۔ حکومت خستہ حال صنعتوں کو بند کرنے سے کافی عرصہ سے احتراز کر رہی تھی حکومت نے سرکاری سیکٹر میں ایک لاکھ کروڑ روپیہ لگایا ہے لیکن اس رقم سے واپسی نہیں ہو رہی۔ اس سیکٹر کو بہت مہنگا سیکٹر یعنی سفید ہاتھی کہا جاتا لیکن حکومت نے مستقبل میں صرف ترجیحی میدانوں میں ہی سرمایہ کاری کرنے کا فیصلہ کیا۔ نئے اقدامات کا حوصلہ افزا پہلو اجارہ داریوں اور بڑی تجارتی سرگرمیوں کے قانون میں مجوزہ ترمیم ہے۔ ترقی کی آخری حد طے کرنے کے بجائے اسٹاکس کمیشن کو مستحکم کر غلط تجارتی سرگرمیوں پر روک لگانے پر زور دیا جائے گا۔

صنعت کو یہ جان کر خوش گوار حیرت ہوئی کہ ایم آر ٹی پی کمپنیوں کی اثاثوں کی متو حد کو ختم کو دیا گیا ہے کیونکہ صنعت اس حد کو محض ۵۰۰ کروڑ روپے کرنے کا مطالبہ کر رہی تھی۔

تجارت و صنعت کو اعلیٰ تنظیموں مثلاً انجینئرنگ صنعت کی کنفیڈریشن فکی اور ایسوچیم سبھی نے اس پالیسی کا خیر مقدم کیا ہے لیکن حکومت کو ان اقدامات کو موثر کے لیئے کام کرنا ہوگا۔ فیرا اور ایم آر ٹی پی قوانین میں ترامیم جلد ہونی چاہیئے تاکہ

غزلیں

...عبدالرحمٰن خان منشا
...سٹارکی ٹاؤن ۔ اچپور

...کے منہ میں زباں ہوتی نہیں ٭ جو گذرتی ہے بیاں ہوتی نہیں
...ر ہوتی نہیں رمز آشنا ٭ ہر زباں گوہر فشاں ہوتی نہیں
...ب کسی شئے تمنائے نمود ٭ یہ نہاں ہو کر نہاں ہوتی نہیں
...یں سوزِ دل کے چٹخارے نہ ہوں ٭ وہ ہماری داستاں ہوتی نہیں
...ہ خندہ پیشانی کا ہے ٭ شدتِ غم کچھ عیاں ہوتی نہیں
...ں الفت کے جہاں کھلتے نہ ہوں ٭ وہ زمیں جنت نشاں ہوتی نہیں
...ہوتیں یہ ہوس سامانیاں ٭ زندگی اتنی گراں ہوتی نہیں
...و ہے تخلیقِ فن، امرِ محال ٭ جب تلک طبع رواں ہوتی نہیں

...ت یاسمین
...اسکالر پی ایچ ڈی
...ٹی آف حیدرآباد

...ی حادثوں کا خوبصورت نام ہے ٭ یہ وہ افسانہ ہے جس کا المیہ انجام ہے
...پوشیدہ ہزاروں آرزوؤں کا ہجوم ٭ ہر تمنا کا مقدر حسرتِ ناکام ہے
...ں پائمالی، بے بسی، بے چارگی ٭ وائے حسرت زندگی شاید اسی کا نام ہے
...پیہم گذرتے جا رہے ہیں روز و شب ٭ لاکھ امیدوں کا حاصل ایک غم کی شام ہے
...ست و گریباں ہوں گے یوں اہلِ وطن ٭ اتحادِ باہمی اب رفت کا پیغام ہے
...و کبھی جو یاد بھی کر لیں ذرا ٭ ہم پہ اک ماضی پرستی کا نیا الزام ہے
...ت جو کل اب ہیں گدائے بے نوا ٭ وقت کی نیرنگیاں ہیں گردشِ ایام ہے

روزنامہ خیابان نکہتِ اردو ۔ ۱۹/۲۰۰۲ ۔ ۱ ۔ ۹ رسالہ بازار ۔ گولکنڈہ ۔ حیدرآباد

آپ اپنے سے دوستی قبلہ — بند آ گئے ہے یہ گلی قبلہ
خام پرواز و رنگِ خام کا نام — ایک تتلی بچی کچھی قبلہ
کب کبوتر کو راس آتی ہے — ان عقابوں کی دوستی قبلہ
میرے اندر بھی بھیڑیا ہے کوئی — ہے اگر تم میں لومڑی قبلہ
دھیرے دھیرے مگر بیا کی طرح — گھر بناتی ہے بد ظنی قبلہ
آخرش دھوپ سو گئی تھک کر — شام تک ساتھ ساتھ تھی قبلہ
زندگی دلفریب گڑیا ہے — وہ بھی بارود کی بنی قبلہ
راکھ میں ڈھونڈتی ہے چنگاری — کیا غضب ہے یہ آس بھی قبلہ
اپنے ہونے کا کچھ یقین آئے — خط تو لکھیئے کبھی کبھی قبلہ
ہم پہ ٹوٹا عذابِ سکوتی — پھر حکومت میں آپ کی قبلہ
کوچۂ فن میں ہو نہیں سکتا — کوئی فنکار آخری قبلہ
خسبجر درسِ عروض دیتے ہیں — کر کے لے بحر شاعری قبلہ

پروفیسر ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجد، آرٹس و کامرس ڈگری کالج بیاول (جلگاؤں)

ہر صدا با اثر نہیں ہوتی .. ہر نظر منتظر نہیں ہوتی
زندگی حادثوں کا مرکز ہے ۔ ایک سی تو بسر نہیں ہوتی
درد ہی سے نکھار ہے ورنہ ۔ زندگی خوب تر نہیں ہوتی
ساتھ جب سے جنوں کا پایا ہے .. ہم کو اپنی خبر نہیں ہوتی
یا ترا راستہ نہیں ملتا .. یا تری رہگذر نہیں ہوتی
اک مسلسل ہے سوز سینے میں .. زندگی مختصر نہیں ہوتی
تیری محفل سے اٹھ چلا ساجد .. اور کسی کو خبر نہ

غزل

ڈاکٹر ایم ایم خادم، پروفیسر و صدر شعبۂ انگریزی
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج
چھندواڑہ۔ ایم پی

ان دو آنکھوں کا خمار کیا کم ہے
میکدہ اک نظر میں ضم ہے
خواہ کتنے ہی جام بھر نہ دے ساقی
ہوش کس کو کہ وہ آنکھ پُرنم ہے
خوف کیا نہ دہ خمِ ہستی کا
ہم نے دیکھا وہ ابروئے خم ہے
ہم تو جیتے ہیں ہے کرم اُس کا
زندگی کا وبال ورنہ کیا کم ہے
راس آئے تو زندگی شیریں
اور بگڑے تو تیغ دو دم ہے
کیا کرے گا دلوں کی عکاسی
آئینہ اک کھلا بھرم ہے
سانس لیتے ہو جس زمانہ میں
زندگی موت کی شریک و ہمدم ہے
اب کچھ مطلب سمجھ میں آتا ہے
کس لیے خلیفۃ الارض آدم ہے

شوخیٔ رنگ ہے مزاج میں منصور
وہ ؟ پگھلے گداز شبنم سے تھا

ومن خان شوق
رف ولا سلے بلی حیدرآباد

ں قیامت کا سلسلہ دیکھیے
د تے روز تماشا دیکھیے"
بے کردار کو یاں کیا دیکھوں؟
ت تب ہے کہ دوسرا دیکھیے
ے کہانی سنائے خاموشی
ں طرح آنکھ خواب سا دیکھیے
ستو یں غبار ہے اتنا
س کو فرصت کہ آئینہ دیکھیے
ں کو لذت خوشی کی ہے حاصل
مون کا بھی ذائقہ دیکھیے

نے والا عنقریب آئے گا
ق بقول آپ راستہ دیکھیے۔

غزل

شیخ سعد حسین سعد صدیقی
حیدرآباد

تری ادائیں بھی میرے بانکپن میں ر
کمالِ فن میرا بس تیری انجمن میں
وہ حسن جو نہ کبھی لالہ و سمن میں ر
وہ حسن کیسے نہ جانے ترے بدن میں ر
تصورات میں، خوابوں میں، آرزوؤں میں
ترے حضور میں تیری ہی انجمن میں ر
نہ پوچھ کیسی قیامت ہے نیش غم کی کسک
وہ درد جو نہ کسی خار کی چبھن میں ر
رہا ہے عشق ہمیشہ رہینِ رنج و الم
سدا محو مگر حسن بانکپن میں ر
وفا کا درس ملا ہے قدم قدم پہ مجھے
تمام عمر میں تحصیلِ علم و فن میں ر
مخالفین بھی جھٹلا سکے نہ مجھ کو کبھی
خلوصِ دل میرا شامل مرے سخن میں ر
کبھی تو جھلکا ہے پھولوں میں میرے خون کا رنگ
کبھی شفق میں کبھی صبح کی کرن میں ر
نہ سنگِ راہ نہ خاروں نے راستہ روکا
ملی بس اس کو ہی منزل جو اس لگن میں ر
تمھاری بزم میں رنگینیاں تھیں خوابوں کی
تمام رات میں تاروں کی انجمن میں ر

شرابِ تلخیٔ غم ہم نے اتنی پی لی سعد
سرور اب نہ کسی بادۂ کہن میں رہا

...ن خاں شوق

...ف ولا۔ ملے پلی
...حیدرآباد

ہماری ادبی سرگرمیاں

یکم ڈسمبر ۹۱ء بزمِ فردوسِ ادب کے زیر اہتمام طرحی مشاعرہ زیر صدارت جناب ابوالفاروق شعور ...د ہوا۔ مسز محمود شرفی، سرور عابدی اور عابد قادری نے نعتیہ کلام سنایا۔ جناب سرور عابدی ...امت کے فرائض ادا کیئے۔ مسز رومی قادری، داؤد نصیب، ابراہیم علی حاجی، حبیب گوندیا ...ظہیر، راحت عزمی، اسمٰعیل ظریف، رؤف رحیم، ڈاکٹر غیاث عارف، الطاف صمدانی، محمود ...محمود، عتیق موسوی، حسن شکارپوری، مظہر محی الدین مظہر، ساغر باقری، ممتاز دانش ...، حسن محمد اور عزیز ناگپوری نے کلام پیش کیا اور داد و تحسین حاصل کی۔

۲ ڈسمبر ۹۱ء شام چھ بجے اردو مجلس کا ادبی اجلاس بمقام اردو ہال حمایت نگر منعقد ہوا ...ی صدارت ڈاکٹر مجاور حسین رضوی نے کی معتمدی کے فرائض قدیر انصاری نے انجام دیئے ...جلاس میں پاکستان سے آئے ہوئے مہمان شعراء جناب صہبا اختر، محترمہ گلناز آفرین ... فاروق عابدی اور ملک زادہ منظور احمد کا خیر مقدم کیا گیا۔ ابتداء میں ڈاکٹر مجاور حسین ...نے تعارفی تقریر کی۔ پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ اردو زبان کی نئی نسل کو ...رابطہ پیدا کرنا چاہیئے اور عام لوگوں کو بھی اردو تحریک میں شامل کرنا چاہیئے۔ جن کی زبان اردو ہے اردو عوام کا مسئلہ یہ ہے کہ کسی دفتر کا نام کیا ہے۔ منی آرڈر پر کہاں اور کہاں پانے والے کا نام لکھنا چاہیئے ان مسئلوں کا حل اکیڈیمیوں میں نہیں ہے۔ ...ن سے آئے ہوئے مہمان شعراء نے غزلیں اور نظمیں سنا کر بے پناہ داد حاصل کی، انھیں ...پسند کیا گیا۔ جناب ملک زادہ منظور احمد نے بھی غزل اور ایک نظم سنائی۔

میں مسز امیر احمد خسرو، ڈاکٹر ضیاث صدیقی، نظیر علی عدیل، خورشید جنیدی، منظور احمد
راز عابدی، ڈاکٹر صادق نقوی، سوز عابدی، محمود شرفی، اثر غوری، غیاث عارف
بے ہوش محبوبنگری، داؤد نصیب، ساغر حیدرآبادی، مراغب فاروقی، انور سلیم، اعظم
اعظم، کمال حیدرآبادی اور محمد نجم الدین کے علاوہ مہمان شاعر جناب خاکر خوندمیری نے نعت
پیش کیا۔ صدر استقبالیہ بانی و صدر ادارہ محمد نجم الدین نجم نے مہمانوں کا استقبال کیا اور جناب
نے شکریہ ادا کیا۔

★ ۱۴ ر ڈسمبر۔ اسی دن ادارۂ ادب اسلامی کا ادبی اجلاس ڈاکٹر حسن الدین احمد صد
کمیشن کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صدر اجلاس نے کہا کہ اُردو ادب میں اسلامی ادب کے سا
انصاف نہیں ہوا ہے اُردو لٹریچر کے شہ پاروں کی علاقائی زبانوں میں منتقلی کی ضرورت
اس موقع پر ڈاکٹر بیگ احساس نے "برزخ" کے عنوان پر موثر افسانہ سنایا۔ جناب مسعود جاوید
اور جناب رؤف خیر نے حفیظ میرٹھی کی شاعری اور ادب کی دنیا میں ان کی بلند پروازی پر مضامین
سنائے۔ جناب ابوالنعیم وحید علی خان نے تہذیبی بحران اور ادب پر مقالہ سنایا۔ جناب طاہر
آبادی، مسز شمیم نصرت، عبدالباسط انور، قمر رفعانے خاکے اور افسانے سنائے۔ جناب سید
احسن ہاشمی نے افتتاحی کلمات کے ذریعہ ادب اسلامی کی سرگرمیوں کا مختصر تعارف کروایا۔ جناب
مسعود جاوید ہاشمی نے کنوینر کے فرائض انجام دیئے۔

★ ۱۴ ر ڈسمبر ۱۹۹۱ء بجے دن محفل خواتین کا خصوصی اجلاس بصدارت محترمہ آربا نو صاحبہ منع
اس اجلاس کی خصوصیت یہ تھی کہ پریسیڈنٹ ایوارڈ یافتہ حیدرآباد کی مایہ ناز خواتین پروفیسر
اکبر حسن اور پدم شری پروفیسر شریف النساء صاحبہ کو خراج تحسین پیش کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔
زیب حیدر نے اپنی استاد ڈاکٹر رضیہ اکبر حسن کو خراج پیش کیا اور کہا کہ رضیہ آپا کا شمار روایا
سے بغاوت کرنے والی اولین لڑکیوں میں ہوتا ہے ہر دلعزیز استادوں میں آپ کا شمار ہے
اور آپ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ کئی کتابوں کے تراجم بھی کیئے۔ پروفیسر رفیق فاطمہ صا
(صدر شعبۂ فارسی جامعہ عثمانیہ) نے پروفیسر شریف النساء صاحبہ کے فن و شخصیت پر روشنی ڈا

ہوئے کہا کہ جس لگن سے انہوں نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا اختتام تک کوئی فرق نہیں آنے دیا اور پیشۂ تدریس سے وابستہ ہوتیں تو تشنگانِ علم کی پیاس بجھاتی رہیں۔ صدر جلسہ محترمہ آر بانو نے کہا کہ محفل خواتین ایک معیاری محفل ہے جہاں معیاری تخلیقات پیش کی جاتی ہیں محفل شعر کی ابتداء مظفر النساء ناز کی غزل سے ہوئی۔ ان کے علاوہ فاطمہ تاج، سلطانہ شرف الدین ڈاکٹر بانو، طاہرہ سعید، نایاب سلطانہ، عزیز النساء صبا، خورشید حمید پاشاہ نے کلام سنایا اور داد وتحسین پائی۔

★ ۱۴ ڈسمبر ساڑھے چھ بجے شام مرکز ادب حیدرآباد کا ماہانہ غیر طرحی مشاعرہ بمکان مومن خان شوق (اشرف ولا) ملے پلی منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید صاحبہ نے کی۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب محمد فصیح الدین صدیقی (جدہ) شریک تھے جناب عزیز بھارتی نے استقبال کیا۔ مومن خان شوق نے مشاعرہ کی نظامت کی۔ جناب فصیح الدین صدیقی نے کہا کہ اس محفلِ شعر میں اکثر شعراء نے نئی فکر اور نئے لب ولہجے کے شعر سنائے جو قابلِ ستائش اور وقت کی اہم ضرورت ہے اس مشاعرہ میں صدر مشاعرہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، مسرز صلاح الدین نیر، داود نصیب مسعود جاوید ہاشمی، منظور احمد منظور، عزیز بھارتی، مومن خان شوق، محمود شریف محمود، ڈاکٹر سید حسن منان منظور، ابوالفاروق شعور، حلیم رضا، بے حس الہ آبادی، طاہر گلشن آبادی، قمر رضا، دلاور حزین باسط حیدرآبادی، محمود شرفی نے کلام سنایا اور داد وتحسین پائی۔ محمود شریف محمود کے شکریہ پر اس خوشگوار محفل کا اختتام ہوا۔

★ ۱۵ ڈسمبر ۱۹۹۱ء ایک دن ماہ امن تقاریب کا اختتامی جلسہ و مشاعرہ زیر صدارت نواب میر احمد علی خان بمقام اعظم فنکشن ہال، مغل پورہ منعقد ہوا۔ ڈپٹی کمشنر مسٹر ایم رتن کے علاوہ مسرز ایم بالیا، منوہر راج سکینہ، ٹھاکر بھردے ناتھ سنگھ چیرمن اقل ترین اجرت بورڈ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ ابتداء میں جنرل سکریٹری تقاریب جناب غلام صادق الدین نے خیر مقدمی و تعارفی تقریر کی۔ دیگر تقریروں کے بعد مشاعرہ منعقد ہوا۔ مشاعرہ کے معتمد جناب صلاح الدین نیر تھے مشاعرہ میں مسرز رحمٰن جامی، رئیس اختر، صلاح الدین نیر، منظور احمد منظور، مومن خان شوق، عزیز بھارتی،

صادق نویدؔ، ساجد منظور، ڈاکٹر منیر الزماں منیرؔ، محب کوثر اور وقار ریاض (گلبرگہ) نے اپنا کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ جناب صلاح الدین نیرؔ نے شکریہ ادا کیا۔

★ ۵ ار ڈسمبر ۱۹۹۱ء ۳ بجے دن ادارہ ادب اسلامی حیدرآباد کا سالانہ غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا حضرت فضل اللہ قریشی آر موری نے صدارت کی۔ ابو الفاروق شعورؔ نے نظامت کے فرائض انجام دیئے جناب سید محی الدین سیف اللہ کی تلاوت و ترجمانی قرآن کے بعد جناب ناصر الدین خالد نے حمد باری تعالیٰ اور جناب عابد قادری اور جناب محبوب علی منصور نے نعتیہ کلام سنایا۔ اس مشاعرہ میں مہمانانِ خصوصی اور دیگر شعراء اکرام کو حروف تہجی کے اعتبار سے دعوت سخن دی گئی۔ مسرز نظیر علی عدیلؔ، خواجہ شوقؔ، سعید شہیدیؔ، روحی قادری اور خورشید جنیدی نے بہ حیثیت مہمانانِ خصوصی شرکت کی اور کلام سنایا۔

★ ۱۵ ار ڈسمبر ۱۹۹۱ء ۴ بجے شام اردو گھر مغل پورہ میں الحاج جناب انور ہاشمی مدیر شاہکار کی ۳۵ سالہ گرانقدر خدمات کے سلسلہ میں ایک یادگار تقریب منعقد کی گئی۔ تقریب کی صدارت جناب ...ے جا کر ...یڈی سابق وزیر اعلیٰ نے کی مہمانِ خصوصی جناب معین فاروقی ایڈیٹر نگار سے سردار راجندر سنگھ نائب صدر استقبالیہ نے مہمانوں کی گلپوشی کی۔ معتمد عمومی جناب ایس اے باسط نے انور ہاشمی کی گلپوشی کر کے شال پیش کی۔ بزرگ شاعر رازؔ عابدی اور اقبال جہاں قدیر نے منظوم خراج تحسین پیش کی۔ قاری مصطفیٰ کے تلاوت کلام پاک سے جلسہ کا آغاز کیا۔ اس موقع پر جناب کے ...ے جاکر ریڈی صدر جلسہ نے ۲۵ ہزار روپیہ کا نقد رجناب انور ہاشمی مدیر شاہکار کے خدمات کے نذر میں دیا۔ ادارہ شاہکار کی جانب سے جناب ابراہیم جے موسیٰ، جناب معین فاروقی، جناب غیاث الدین درویش، جناب ابو الحسن تبریزی، جناب رازؔ عابدی، سردار راجندر سنگھ، اقبال جہاں قدیر، ایم اے رحیم، ڈاکٹر سید حیدر علی رضوی اور دوسروں کو بھی شال اور سرٹیفکیٹ پیش کیئے گئے اس موقع پر صدر تیاری کمیٹی جناب سید رحمت علی سابق ایم پی نے اپنی موثر تقریر کی۔

★ ۱۵ ار ڈسمبر ۱۹۹۱ء ۹ بجے شب انڈو عرب اسلامک یوتھ اسوسی ایشن کے زیر اہتمام کل ہند مشاعرہ منعقد کیا گیا مشاعرہ کی صدارت پروفیسر اشرف رفیع نے کی۔ ڈاکٹر و پروفیسر زینت ساجدہ صدر شعبہ

لامک اسٹیڈیز عثمانیہ یونیورسٹی، ڈاکٹر شوکت علی اور مسٹر سیچر جنرل سکریٹری ہریانہ کانگریس کمیٹی
ان خصوصی تھے۔ ابتدا میں مسٹر ایس اے شکور جنرل سکریٹری انڈو عرب اسلامک یوتھ
ی ایشن نے خیر مقدمی تعارفی تقریر کی۔ اس نمائندہ مشاعرہ میں حیدرآباد کرناٹک (گلبرگہ) کے
، مسرز محب کوثر، وقار ریاض اور محترمہ صغریٰ عالم نے اپنے بہترین کلام سے محظوظ کیا شہر کے
شاعر مسرز سعید شہیدی، ڈاکٹر علی احمد جلیلی، امیر احمد خسرو، خواجہ شوق، صلاح الدین نیر، رئیس اختر
جامی، ڈاکٹر صادق نقوی، گیان سنگھ شاطر، فیض الحسن خیال، صادق نوید، منظور احمد منظور،
ز بجا ساتی، علی الدین نوید، منان منظور، مومن خان شوق، ڈاکٹر منیر الزماں منیر، ثاقب
آبادی، سعید جاوید اور ڈاکٹر شمع پروین نے کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ حاضرین کی خاصی
ادنے شرکت کی تھی جناب صلاح الدین نیر نے نظامت کے فرائض انجام دیئے اور شکریہ ادا کیا۔

★ ۱۵ ار ڈسمبر ۱۹۹۱ء ۹ بجے شب بمقام جمالِ رحمت اسلامیہ ماڈل اسکول کوچہ جمعہ جراح چھوٹی
، بیدر واڑی انجمن بقائے ادب کے زیر اہتمام غیر طرحی نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ حیدرآباد کے
نعت گو شاعر جناب عبدالقادر بے ہوش محبوب نگری نے اس مشاعرہ کی نگرانی کی۔ مہمان شاعر
ناصر خطیب لاتوری کا خیر مقدم کیا گیا۔ محمد ضیا عرفان حسامی معتمد انجمن نے کہا کہ محبوب نگر کے
رحلیم بابر جن کا مجموعہ کلام "وابستگی" جو زیر طبع ہے ماہ فبروری میں حیدرآباد میں اس کی رسم اجرا
میں آئے گی۔ انجمن نے یہ طے کیا کہ اضلاع کے شعراء کی حیدرآباد میں آمد کے موقع پر ان کے اعزاز
دبی نشستوں کا اہتمام کیا جائے گا اور ان کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ رحمت کوثر، بشیر امجد
گونڈیاوی، ڈاکٹر غیاث عارف مہمان شاعر سید ناصر خطیب، محمد ابراہیم مدہوش، باسط
آبادی، الطاف صمدانی، محمد ضیا عرفان حسامی، الف شرمی، ایوب سکندر، بے ہوش محبوب نگری
پنا کلام سنایا۔

★ ۱۸ ڈسمبر ۱۹۹۱ء ۶ بجے شام انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ منعقد ہوا۔
ن کی صدارت جناب ریاست علی تاج نے کی جناب عزیز ابرار نے مقالہ "شگوفہ کی خدمات
تفصیلی جائزہ لیا۔ مباحث میں صلاح الدین نیر، راشد آذر، رئیس اختر، رشید الدین، حسن فرخ نے

حصہ لیا۔ صدر جلسہ جناب ریاست علی تاج نے ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کو خراج پیش کیا کہ ۲۳ سال مزاحیہ ادب کی ترویج و اشاعت میں مصروف ہیں عزیز ابرار نے شگوفہ میں لکھنے والوں تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اس بات کی بھی نشان دہی کی ہے یہ رسالہ اس طرح ارتقائی منز طے کرے گا۔ ادبی اجلاس کا ایک حصہ مشاعرہ میں تھا۔ مسرز ریاست علی تاج، راشد آذر صلاح الدین نیر، رئیس اختر، منظور احمد منظور، گیان سنگھ شاطر، حسن فرخ، ذکی شاداب، مومن خا شوق، قدیر انصاری، محمود حامد، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی مجز صلاح الدین نیر نے اجلاس و مشاعرہ کی کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

★ ۲۲؍ ڈسمبر ۹۱ء ۲:۳۰ ساعت دن پاسبانِ ادب کا طرحی مشاعرہ زیر صدارت محمد قمر الدین صابری ایڈیٹر شاداب "بمقام احمد منزل" اندرون درگاہ حضرت شاہ خاموش واقع نامپلی منعقد ہوا۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے حضرت نظیر علی عدیل، عزیز بھارتی اور محمد ضیاء عرفان حامی نے شرکت کی۔ جناب سلیم عابدی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ مشاعرہ میں صدر مشاعرہ جناب محمد قمر الدین صابری، مسرز حضرت نظیر علی عدیل، عزیز بھارتی، محمد ضیاء الدین عرفان حامی، داؤد نصیب، فضل الرحمٰن فضل، محمود شرفی، ساغر گولکنڈوی، باسط حیدرآبادی الفت شرفی، مومن خاں شوق، سلیم عابدی، آرزو حیدرآبادی، عباس علی عباس، عزیز ناگپوری، فکر گولکنڈوی، گھامڑ گولکنڈوی، رؤف رحیم، محمود فریدی، بے حس الہ آبادی، محمد مظہر محی الدین مظہر، حلیم بابر، نذیر احمد خان نیر، حبیب گوندیاوی، لطیف الدین لطیف ابراہیم مدہوش، داؤد مومن، بشیر امجد نے طرحی کلام سنایا اور داد و تحسین پائی۔

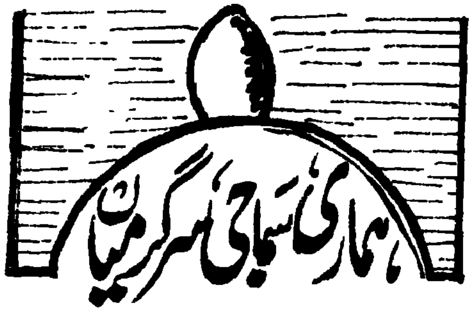
★ ۲۴؍ ڈسمبر ۹۱ء اردو کے ممتاز محقق و دانشور ڈاکٹر حسینی شاہد کے انتقال پر ملال پر ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں منعقدہ ایک تقریب میں گہرے رنج و ملال کا اظہار کیا گیا۔ یادِ ادیب کے سلسلہ میں منعقدہ اس تقریب اردو والوں کی جانب سے ایک تعزیتی قرارداد پیش کی گئی اور پسماندگان سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا۔ جناب عابد علی خاں نے کہا کہ کسی معاوضہ یا اعزاز کے بغیر مرحوم نے اردو کی خدمت کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا تھا اور تدریس

میں بھی نمایاں خدمات انجام دی۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے انجمن کے جنرل سکریٹری اور اردو کاز کے سپاہی ڈاکٹر حسینی شاہد کے انتقال پر اظہار تعزیت کیا اور کہا کہ مرحوم نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے ذریعہ اردو اسکالروں کی صف میں اپنے لیئے جگہ بنائی تھی۔ بحیثیت پرنسپل اردو آرٹس (ایوننگ) کالج مرحوم کی خدمات ناقابل فراموش ہیں اُن کی موت سے جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا ممکن نہیں۔

★ ۲۴ دسمبر ۹۱ء شام ابوالکلام آزاد اورینٹل انسٹی ٹیوٹ ماہنامہ "شگوفہ" کے زیر اہتمام یادِ اریب کی یادگار تعزیتی منعقد کی گئی تھی سارا ہال اریب کے دوستوں اور مداحوں کچا کچ بھرا تھا جلسہ میں جناب عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ سیاست، جناب عزیز قیسی (بمبئی) جناب مجتبیٰ حسین، جناب مخمور سعیدی (دہلی) ڈاکٹر انور معظم، اقبال متین شریک تھے۔ جناب عابد علی خاں نے کہا کہ اریب نے ماہنامہ صبا کے ذریعہ اردو کی شاندار خدمت کی ہے اور اُس کا معیار اس وقت کے دوسرے پرچوں کے مقابلہ میں کم نہیں تھا اریب کو بہترین خراج یہی ہوگا کہ ان کے دوست احباب ان کے ادبی رسالہ "صبا" کو دوبارہ شائع کرنے پر غور کریں۔ جناب عزیز قیسی نے اریب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ پانچویں اور چھٹی دہائی اریب کے نام معنون ہے وہ بے پناہ صلاحیت کے تھے اور بذات خود قلندر مزاج تھے جناب مخمور سعیدی نے اپنے مضمون میں اریب کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا۔ پروفیسر انور معظم نے اریب کے ساتھ اپنی دیرینہ رفاقت کا ذکر کرتے ہوئے مختلف واقعات سُنائے اور کہا کہ اریب کی یاد کے ساتھ ہی حیدرآباد کا زرین دور یاد آجاتا ہے مرحوم کو شاعری سے لگاؤ کے ساتھ ساتھ اردو کی فضا کو قائم کرنے سے بھی گہری دلچسپی تھی جناب مجتبیٰ حسین نے اریب کی زندگی اور ان کی زندہ دلی کے پُر مزاح پہلوؤں کو پیش کیا۔ جناب اقبال متین نے اریب کی زندگی کو افسانوی انداز میں پیش کیا۔ ڈاکٹر یوسف کمال نے کارروائی چلائی۔ جناب مصطفےٰ کمال مدیر شگوفہ نے شکریہ ادا کیا بعد میں ایک محفل شعر جناب عزیز قیسی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ نظامت کے فرائض جناب صلاح الدین نیر نے ادا کیئے جناب عزیز قیسی نے غیر طرحی غزل سنائی۔ سرز سعید شہیدی، صلاح الدین نیر، اکمل حیدرآبادی،

رئیس اختر، عزیز بھارتی، صادق نوید، حسن فرخ، رؤف خیر، فیض الحسن خیال، علی الدین
نوید، بے حس الٰہ آبادی، محمود شریف محمود اور ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے کلام سنایا۔ ڈاکٹر مصطفٰے
کمال نے شکریہ ادا کیا۔

★ ۲۵ دسمبر ۹۱ء شام ۵ بجے مرکز ادب حیدرآباد کے زیر اہتمام ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید
کے افسانوں کے مجموعے "پنچھی باورا" کی رسم اجراء تقریب بمکان محمد قمرالدین صابری مُدیر ماہنامہ شاداب
ریڈ ہلز منعقد ہوئی۔ اس جلسہ کی صدارت جناب منظور احمد منظور نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب
صلاح الدین نیّر اور ڈاکٹر مصطفٰے کمال مُدیر شگوفہ شریک تھے۔ ابتداء میں جناب عزیز بھارتی
صدر ادارہ کی خیر مقدمی تقریر کے بعد جلسے کے آغاز سے قبل ڈاکٹر حسینی شاہد کے سانحۂ ارتحال پر
ادارہ کی جانب سے جناب محمد قمرالدین صابری نے قرارداد تعزیت پیش کی۔ جناب گیان سنگھ شاطر
صاحب کے ہاتھوں "پنچھی باورا" کی رسم اجراء عمل میں آئی۔ اس موقع پر ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید اور
صدر جلسہ جناب منظور احمد منظور کی ادارہ کی جانب سے گلپوشی کی گئی۔ اس موقع پر اُتر پردیش
اردو اکیڈیمی کی جانب سے ڈاکٹر مصطفٰے کمال اور جناب صلاح الدین نیّر کی مطبوعات پر انعامات ملنے
کی مسرت میں ادارہ کی جانب سے گلپوشی کی گئی اس کے علاوہ آنچل حیدرآبادی نے بھی مہمانان
خصوصی کی گلپوشی کی۔ محترمہ قمر جمالی نے ڈاکٹر صاحبہ کی گل پوشی کی۔ جلسہ کی کارروائی ادارہ کے معتمد عمومی
مومن خان شوق نے چلائی۔ جناب گیان سنگھ شاطر اپنے خطاب میں ڈاکٹر صاحبہ کو مبارکباد پیش
کرتے ہوئے ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں کو غور و فکر کی بھرپور باتیں بتائیں۔ جناب
محمد قمرالدین صابری نے کہا کہ یہ ڈاکٹر صاحبہ کا مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے مگر خوب ہے تمام افسانوں پر
سیر حاصل تبصرہ کیا۔ محترمہ قمر جمالی صاحبہ نے بانو طاہرہ سعید صاحبہ کو مبارکباد دیتے ہوئے "پنچھی باورا" کا جائزہ
لیا۔ جناب عاتق شاہ صاحب نے کہا کہ ڈاکٹر صاحبہ ہمیشہ ادب کی روشن قدروں کو پیش کرتی ہیں
اور اُن پر اپنی مضبوط گرفت رکھتی ہیں جو بڑی اچھی بات ہے ڈاکٹر مصطفٰے کمال اور جناب صلاح
الدین نیّر نے بھی ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید صاحبہ کے فن کو خراج پیش کیا۔ آخر میں صدر جلسہ جناب
منظور احمد منظور صاحب نے ادارہ مرکز ادب کے ارباب مجاز اور ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید صاحبہ کو مبارکباد دی



مصطفیٰ اشروانی
۳-۶-۶-۲ حمایت نگر
حیدرآباد

فرخندہ بنیاد حیدرآباد کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں کے متعدد ادارے ہر جہت قومی سماجی معاشرتی اہمیت کو اجاگر کرنے کی متواتر سعی کرتے رہتے ہیں ساتھ ہی نوجوان طبقہ کو بہتر مستقبل کی نشوونما میں مثبت رول ادا کرنے کی جانب بھی راغب کرتے رہتے ہیں۔

ایک ایسا ہی ادارہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بائیز اسوسی ایشن شاخ آندھرا پردیش کے زیر نگرانی ALIGARH COACHING CENTRE FOR MINORITIES قائم ہے جو امیدواروں کو اہم خدمات کے لئے مسابقتی امتحانات کے لیئے تربیت دینے کا اقدام کر رہا ہے ۱۸ نومبر ۹۱ء کو علیگڈھ کلب میں انکم ٹیکس اور مرکزی اکسائیز انسپکٹروں کے کورس کی افتتاحی تقریب بصدارت جناب مہدی علی صاحب نائب صدر ادارہ منعقد ہوئی۔ افتتاحی جلسہ کا آغاز ایک طالب علم جناب محمد تحسین کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ اپنی تعارفی اور خیر مقدمی تقریر میں ادارہ کے اعزازی ڈائرکٹر جناب محمد خواجہ معین الدین صاحب نے کوچنگ سنٹر کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ جناب شمس الدین باوخان صاحب سابق وزیر اور جناب خواجہ حمید اللہ جن کمشنر اسمال سیونگ آندھرا پردیش حکومت نے مسابقتی امتحانات کی اہمیت پر زور دیا۔ جناب شیخ سعد حسین سعد اسپیشل آفیسر آندھرا پردیش وقف بورڈ نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ بہت ضروری ہے کہ مسلم طلباء اپنے اندر مسابقتی جذبہ پیدا کریں اور سخت محنت کریں۔ جناب مصطفیٰ اشروانی نے مسلم امیدواروں کو انتھک کوشش اور محنت شاقہ کی ہدایت کی۔ صدر جلسہ جناب مہدی علی صاحب نے طلباء کو مسابقتی امتحانات کی تیاری کے لیئے مفید مشورے دیئے۔

• ۲۴ نومبر ۱۹۹۱ء کو مدینہ منشن میں اقبال اکیڈیمی کی جانب سے "مجلس اقبال" کا انعقاد بعد

جناب ظہیر الدین احمد صاحب نائب صدر اقبال اکیڈیمی نے اقبال اور حیدرآباد کے موضوع پر معلوماتی مواد سے حاضرین کو مستفید فرمایا۔ مصطفیٰ شروانی نے استفسار کیا کہ فاضل مقرر نے اپنے عالمانہ مقالہ میں علامہ اقبال کی اس نظم کا تذکرہ نہیں فرمایا جو "ارمغانِ حجاز" کے آخر میں سراکبر حیدری صدر اعظم کے نام یوم اقبال کے موقع پر توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے جو صاحب صدر اعظم کے ماتحت ہے ایک ہزار روپیہ کا چک بطور تواضع موصول ہونے پر "اقبال نے بھیجی جس کا آخری شعر تھا ؎

غیرت فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول
جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

پوری نظم "کلیات اقبال" میں شامل ہے جو ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڈھ نے ۱۹۸۲ء میں شائع کیا۔ جناب ظہیر الدین احمد نے وضاحت فرمائی کہ حیدرآباد کے اس دور میں جو توتیں کارفرما تھیں وہ علامہ اقبال کو شاید اس ذہنی عروج پر نہیں دیکھ پاسکتے تھے جو اقبال کے فکر و خیال کا مرکز تھا ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی نے "اقبال اور مشرقی روایت میں انقلاب کے موضوع پر عالمانہ خطاب میں اقبال نے اُردو شاعری کی روایات کی توسیع بھی کی اور روایت سازی بھی۔ ڈاکٹر یوسف کمال نے پیش کردہ نکات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بتایا کہ اقبال زمانہ ساز سے زیادہ مجتہد اور تخلیقی قوت سے بھر پور نظر آتے ہیں۔ جناب پروفیسر سراج الدین نے اپنی صدارتی تقریر میں مضامین پر تبصرہ فرمایا جناب علی ظہیر صاحب نے نظامت کے فرائض انجام دیئے اور شکریہ ادا کیا۔

● ۲۹ نومبر ۹۱ء کو ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ باغ عامہ حیدرآباد میں سالار جنگ میوزیم سے وابستہ جناب خواجہ اویس قرنی کی۔ ہم سالہ جشن حیدرآباد کے سلسلہ میں شائع کردہ اہم تصنیف QARNI SKETCHES OF HYDERABAD کی رسم اجرا کی تقریب منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت جناب جسٹس سردار علی خاں صاحب جج حیدرآباد ہائیکورٹ اور عالیہ کارگذار چیف جسٹس آندھرا پردیش نے فرمائی۔ ڈاکٹر پرمود ایس شنڈے ڈائرکٹر اسکول آف آرکیٹکچر نے اپنے خطاب میں خواجہ اویس قرنی کی تصنیف کے قدو خال بیان کیئے جناب مصطفیٰ شروانی نے اس تصنیف کو سرسید احمد خاں بانی مدرستہ العلوم علیگڈھ جو بعد کو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کا باعث ہوا ان کی

ے "آثار الصنادید" شائع کردہ سنہ ۱۸۴۷ء کے مماثل قرار دیتے ہوئے حاضرین کو بتایا کہ سرسید نے
ی تمام تاریخی عمارتوں کے چربے اپنے قلم سے "آثار" سے نقش کیے اسی طرح جناب خواجہ ادلیس قرنی
ے موقلم کے کمالات دکھانے میں ایک طرح سرسید علیہ الرحمۃ سے سبقت لے گئے ہیں اس لیے کہ
بہ ادلیس قرانی نے نہ صرف حیدرآباد کی تاریخی عمارات کو اپنے قلمی فن کے ذریعہ اس تصنیف
ایش کیا ہے بلکہ تاریخی سکوں، ڈاک ٹکٹ اور حیدرآباد کے اکابرین قطب شاہی اور آصف جاہی
الطین کی مہروں کو بھی اپنے موقلم سے پیش کیا ہے محترمہ مسز روڈا مستری صاحبہ سابق وزیر
دھراپردیش و سابق ایم پی نے اس تصنیف کی رسم اجرا انجام دیتے ہوئے فاضل مصنف
مبارکباد دی۔ اپنی صدارتی تقریر میں جناب جسٹس سردار علی خان صاحب نے اپنی صدارتی تقریر
جناب خواجہ ادلیس قرنی کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے سرونسٹن چرچل اور
سوی پینٹنگ کے سلسلہ میں دلچسپ انکشافات فرمائے۔ جناب خواجہ ادلیس قرنی کے شکریہ پر
ں کا اختتام عمل میں آیا۔

● یکم ڈسمبر ۱۹۹۱ء کو جوبلی ہال باغ عامہ میں انڈو عرب لیگ حیدرآباد کی جانب سے مسئلہ
سطین کے ساتھ عالمی یکجہتی کے عنوان سے ایک اہم جلسہ کا انعقاد عمل میں آیا جس میں عرب اور فلسطین
سفیر کے علاوہ سفیر سوڈان نے بھی شرکت فرمائی۔ جناب پی راجیندر را ریڈی وزیر برائے بھاری
نت حکومت آندھراپردیش نے صدارت فرمائی۔ جناب سید وقار الدین صدر نشین انڈو عرب
ب اور مدیر اعلیٰ روزنامہ رہنمائے دکن نے اپنی تعارفی تقریر میں فلسطین کے مسئلہ کے حل میں
معمولی تاخیر پر اظہار حیرت و رنج کیا۔ جناب کے ایل مہندرا، جناب بشیر الدین بابو خان اور
ز شرکاء نے فلسطین کے مسئلہ کو جلد حل کرنے میں عالمی امن و امان کی برقراری کا ضامن قرار
۔ عرب سفراء نے اور سفیر سوڈان نے مسئلہ فلسطین کے قابل قبول حل کے لیئے اپنی انتھک
شش و کاوش جاری رکھنے کے عہد کا اعادہ کیا۔ جناب حسین فاروقی صاحب ایڈیٹر انگارے
شکریہ پر جلسہ کا اختتام عمل میں آیا۔

۸۔ ۹ ڈسمبر ۱۹۹۱ء کو علیگڈھ کلب میں حامد علی ایجوکیشنل وقف کی جانب سے امتیازی کامیابی حاصل کرنے والی طالبات اور طلباء میں تقریباً ۷۵ ہزار روپیہ کے وظائف کی تقسیم کا جلسہ بطور تہنیت، جناب محمد عبدالرب صاحب چیف انجینئر موظف، بصدارت ڈاکٹر عقیل ہاشمی ریڈر جامعہ عثمانیہ منعقد ہوا۔ کمسن طالب علم مسٹر شاہد لطیف کی قرارتِ کلام پاک سے جلسہ کا آغاز ہوا جناب الحاج محمد عبدالرب نے اپنی تقریر میں ... کو مفید مشوروں سے مستفید کیا۔ مہمانانِ خصوصی جناب شاہ عزیز آصف علی صاحب و مصطفیٰ ... نے مخاطب کیا۔ مصطفیٰ شروانی نے حیدرآباد کی ... سو سالہ تاریخ میں باہمی رواداری، مکمل ہم آہنگی اور باہمی یکجہتی کا تذکرہ کیا۔ جناب حامد لطیف ملتانی صاحب نے حامد علی ایجوکیشنل وقف کے اغراض و مقاصد اور وقف کے موجودہ مالی موقف کا تذکرہ فرمایا۔ صدر جلسہ ڈاکٹر عقیل ہاشمی صاحب اپنی تقریر میں جن طالبات اور طلباء کو اس محفل میں وظائف دیئے گئے اپنی آئندہ بھی سخت محنت اور عزم و استقلال کی تلقین کی۔ جلسہ کے بعد ایک مختصر محفلِ شعر منعقد ہوئی اور مہمانوں کی پُر تکلف ایٹ ہوم سے تواضع کی گئی جناب شاہ عزیز آصف علی صاحب کے شکریہ پر جلسہ کا اختتام عمل میں آیا۔

"شاداب" میں اشاعت کے لئے تخلیقات کا
طلبیدہ ہونا ضروری نہیں ہے

"شاداب" کو اپنے حلقۂ احباب میں
متعارف کروائیے

"شاداب" کی سالانہ خریداری قبول فرماتے ہوئے
اپنی اردو دوستی کا ثبوت دیجئے!

جلد (۹) فروری ۱۹۹۲ء

شمارہ (۲) قیمت 6/= روپے

فون 229161

زرِ تعاون

وستان	سالانہ	65 روپے	۲ سال	120 روپے	تاحیات	1500 روپے
ی ممالک	"	200	"	360	"	3700 "
ستان	"	175 پاکستانی روپے	"	300 پاکستانی روپے	"	3000 پاکستانی روپے
ریکہ	"	40 ڈالر	"	70 ڈالر	"	700 ڈالر
ستان	"	25 پونڈ	"	45 پونڈ	"	400 پونڈ

ترسیل کا پتہ

ماہنامہ "شاداب" 11-5-147 ریڈ ہلز - حیدرآباد

*** ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کے لیے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر شاداب 11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد

[illegible]

فہرست

(یہ شمارہ صرف ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے)

ید بدرالحسن زیدی

حضرت علی (رض)
مفکرینِ عالم کی نظر میں

دُنیا کی بعض ہستیاں تاریخ کے صفحات پر محض اِس لیئے زندہ ہیں کہ مورخین نے ان کے نام وحالات تاریخ کے صفحوں پر جگہ دے کر اُن کو زندگی بخشی ہے لیکن تاریخ عالم کی بعض ہستیاں ایسی ہیں جن کارناموں نے تاریخ بنائی ہے اور اگر اُن کے حالات اور درخشاں کردار کو تاریخ میں شامل نہ کیا ئے تو تاریخ تاریخ نہ رہے گی۔

اسلام اگرچہ حضرت ابراہیم السلام کا دین ہے لیکن اب اس دین کے نام کے ساتھ ختم المرسلین ہت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِسم مبارک لیا جاتا ہے کیونکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والا ات ہی ہے جس نے صحرائے عرب کے غیر مہذب اور جاہل قبائل کو اپنے ذاتی کردار سے ۲۳ سال مختصر سی مدت میں ایسی مہذب اور متمدّن قوم بنا دیا کہ وہ فاتحِ عالم بن گئے اور اپنے علم کی روشنی تینوں معلوم براعظموں کو منور کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کو قانونِ الٰہی کا سر تا پا نمونہ کر شرق و غرب عالم پر ثابت کر دیا کہ اسلام ایک دینِ فطرت ہے اور ہر قوم و نسل کے افراد کی لحاظِ زمان و مکان نہ صرف اُن کی ہر ضرورت کے لئے کافی ہے بلکہ اُن کو ایک قابلِ فخر اور مثالی سان بنا کر دنیا میں عزت کا اور آخرت میں عافیت کا مقام عطا کر سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ یہ وسلم کی مبارک ہستی گذشتہ چودہ سو سال سے تاریخ عالم پر چھائی ہوئی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال شخصیت اور لامحدود و پاکیزہ کردار کی آغوش اور سایہ میں ے اور بہشتی قرآنی علوم و معرفت سے آراستہ ہو کر ایک مثالی انسانِ کامل کی حیثیت سے دُنیا کے

سامنے آتی ہے جس پر گذشتہ چودہ صدیوں میں بے شمار علماء و مفکرین نے توصیف و منقبت کے نذرانے کے وہ گوہر ہائے آبدار کی بارش کی ہے جن کا احاطہ ہزاروں کتابیں بھی نہیں کر سکی ہیں وہ ہستی ہے حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جاں نثار چچا حضرت ابوطالب رضؓ کے فرزند حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کی۔ جن کے بارے میں حکیم مشرق علامہ اقبالؒ نے بھی اپنی مشہور فارسی مجموعہ" اسرار و رموز" میں ایک طویل منقبتی نظم لکھی ہے جن کے چند شعر یہ ہیں

مسلم اول شیرِ مرداں علیؓ — عشق را سرمایۂ ایماں علیؓ
از رخ او فال پیغمبر ﷺ گرفت — ملتِ حق از شکوہش فر گرفت
مرسلِ حق کرد نامش بو تراب — حق یداللہ گفت در امّ الکتاب
زیرِ پا این جا شکوہِ خیبر است — دستِ اُو آنجا قسیم کوثر است
از ولائے دودمانش زندہ ام — در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام
قوتِ دینِ مبین فرمودہ اش — کائنات آئین پذیر از دودہ اش
ہر کہ در آفاق گردد بوتراب — باز گرداند ز مغرب آفتاب
از خود آگاہی یداللّٰہی کند — از یداللّٰہی شہنشاہی کند

یعنی پہلے مسلم، مردانِ حق کے بادشاہ اور عشقِ الٰہی کے لئے سرمایۂ ایمان علیؓ ہیں میں ان کی عزت کی محبت میں زندہ ہوں۔ اس لئے اس دنیا میں گوہرِ آبدار کی طرح رہ ہوں۔ ان کے رخِ روشن سے حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم فال لیا کرتے تھے اور ملت نے ان کے شکوہ سے بلندی حاصل کی۔ ان ہی کے ارشادات سے دینِ حق نے قوت حاصل کی او کی عزت ہی کائنات کے نظام کی بنیاد ہے۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ ابوتراب کہہ کر پکارا اور رب العزت نے قرآنِ کریم میں آپ کو ید اللہ کا نام دیا۔ جو اس دنیا ابوتراب بن جاتا ہے تو وہ آفتاب کو بھی (معجزۂ ردّ الشمس میں) واپس لے آتا ہے یہاں دُ ان کے قدموں کے نیچے قلعۂ خیبر کی شان و شوکت ہے اور آخرت میں ان ہی کے ہاتھوں سے آبِ کوثر ملے گا جس کو اپنی معرفتِ تامہ حاصل ہو جائے وہ یداللہ بن جاتا ہے اور یداللہ،

شہنشاہی کرتا ہے۔"

جامعۂ فواد الاوّل مصر کے پروفیسر الاستاد عبدالوہاب حمودہ "رسالۃ الاسلام" کی ماہ رمضان المبارک ۱۳۷۰ھ کی اشاعت میں لکھتے ہیں۔

"حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان سے کتاب نہج البلاغہ میں تن تنہا وہ تمام چیزیں جمع ہوگئی ہیں جو اکابر علماء، یکتائے روزگار فلاسفر اور سربرآوردہ علمائے ربانیین سے مجموعی طور پر یکجا کی جاسکتی ہیں۔ بلند حکمت کی نشانیاں اور صحیح سیاست کے قواعد اور ہر طرح کا حیرت انگیز موعظہ، موثر استدلال اور اجتماعی تصورات یہ سب امام کی فضیلت اور کارگزاری کا بیّن ثبوت ہیں۔"

اب غیر مسلم مفکرین کے افکار و اقوال پر نظر ڈالیئے۔ شہرۂ آفاق عیسائی مورخ و ادیب خلیل جبران رقم طراز ہیں۔

"میرا عقیدہ ہے کہ فرزند ابوطالب وہ پہلے عرب ہیں جنھوں نے الوہیت کی ہمسائیگی اختیار کی اور اُس کے ہمراز و دمساز ہوگئے۔ وہ پہلے عرب ہیں جن کے دونوں لبوں نے ترانۂ الوہیت کی آواز اُن انسانی کانوں تک پہنچائی جنھوں نے اس سے قبل سنا ہی نہ تھا۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اس حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ تسبیح سجدہ آپؓ کے لبوں پر تھی مگر اہل عرب نے آپ کے مقام و رتبہ اور شرف و منزلت کو نہیں پہچانا۔"

دوسرے عیسائی مورخ جارج جرورق لکھتے ہیں۔

"تاریخ کے نزدیک ــ خواہ تم جانو خواہ نہ پہچانو، نامور شہید، شہداء کے پدر بزرگوار عدالتِ انسانی کی آواز اور مشرق کی جاوداں شخصیت علیؓ ابن ابی طالب ہیں یہ علیؓ ابن ابی طالب ہی تھے جن کے نزدیک جہاد و قتال کی غرض و غائت دوسری تھی انھوں نے زہد اور تقویٰ کے ساتھ جہاد کیا، عاجزوں، بیچاروں اور مجبوروں کے لئے قلوں کو فتح کیا، انھوں نے دشمنانِ عدل و انصاف کے عزائم کو خاک میں ملادیا وہ

انسانی اخلاقِ کریمہ اور صفاتِ عالیہ میں بلندی و کمال کی حد پر فائز تھے۔"

مشہور انگریز مورخ اور فلسفی ٹامس کارلائل لکھتا ہے

"لیکن علیؓ..... ہمارے لیئے اِس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم انھیں دوست رکھیں اور اُن سے عشق کی حد تک محبت کریں کیونکہ وہ ایسے عالی مرتبہ اور عظیم الشان جواں مرد تھے جن کے سرچشمۂ وجود سے نیکیاں، اچھائیاں اور خوبیاں جوش مارتی اور اُبلتی تھیں اُن کے دل سے شجاعت کے شعلے بُلند ہوتے تھے آپ کی شجاعت، مہربانی اور پاکیزگی اور انسانی شفقت و مروت و رحم دلی سے معمور تھی۔"

مشہور فرانسیسی مورخ و محقق گابریل دانگیری لکھتا ہے

"علیؓ زبردست خطیب، قادرالکلام انشاء پرداز اور عظیم المرتبہ قاضی تھے جو نظریات کے مؤسس اور بنیاد رکھنے والوں میں بہت بُلند مقام رکھتے تھے جس نظریہ کی آپ نے بنیاد رکھی وہ اپنی صراحت و استحکام کے لحاظ سے ترقی و تجدد اور حرکت و بیداری کی طرف اپنے میلان و رجحان کے لحاظ سے ایک فوق العادت امتیاز رکھتا ہے۔ علیؓ شجاعت اور امامت دونوں کے حامل تھے۔ وہ ناقابلِ شکست و ہزیمت سپہ سالار تھے وہیں علوم الہٰی کے زبردست عالم و دانشمند اور صدرِ اسلام کے فصیح ترین خطیبوں میں تھے۔"

عبدالمسیح انطاکی جریدۃ العمران مصر میں تحریر کرتے ہیں۔

"اس میں کوئی کلام نہیں کہ سیدنا علی امیرالمومنین فصیحوں کے امام اور بلیغوں کے اُستاد اور عربی زبان میں خطابت کرنے والوں میں سب سے زیادہ عظیم المرتبت ہیں اُن کا کلام وہ ہے جس کے بارے میں بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ یہ کلام مخلوق سے بالاتر اور کلام الخالق سے نیچے ہے اور یہ ہر اس شخص کا قول ہوگا جس نے انشاء پردازی فنون سے واقفیت حاصل کی ہو اور تحریر کا مشغلہ رکھا ہو آپ بلاشبہ تمام عرب انشاء پرداز کے اُستاد اور معلّم ہیں۔ کوئی ادیب ایسا نہیں ہے جو تحریر کے فن میں کمال حاصل کرنا

ہا ہے مگر یہ کہ اُس کے سامنے قرآن ہوگا اور نہج البلاغہ کہ ایک خالق کا کلام ہے
ر دوسرا اشرف المخلوقین کا اور انھیں ان ہی پر اعتماد کرنا پڑے گا۔"
یروت کے مشہور مسیحی ادیب و شاعر پولس سلامہ نے اپنی کتاب" اول ملحمۃ العربیۃ"
ہے۔

" نہج البلاغہ مشہور ترین کتاب ہے جس سے امام علیؑ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور
س کتاب سے بالاتر سوا قرآن کے اور کسی کتاب کی بلاغت نہیں آتی " (اس کے بعد
ن کے اشعار ہیں جن کا ترجمہ ہے) یہ معارف و علوم کا مرکز اور اسرار و رموز کا کھلا
ہوا دروازہ ہے ایک روشن کتاب ہے اور بکھرے ہوئے موتی، چنے ہوئے
پھولوں کا باغ ہے جس میں پھولوں کی لطافت، چشموں کی صفائی اور آبِ کوثر کی
تروتازگی ہے جس کی وسعت اور کنارے تو آنکھوں سے نظر آتے ہیں مگر تہ تک نظریں
پہنچنے سے قاصر ہیں۔ امیر المومنین علیؑ نے انسانوں کو اپنی ولادت، حیات اور شہادت
کے ذریعہ رزم، عزم، علم و حکمت، مجاہدہ شہادت کا وہ سبق سکھایا جو بشری زندگی کے
نشیب و فراز سے پُر تاریخ میں ہمیشہ باقی رہے گا۔"

ب اُس ہستی کے کلام کے چند حصوں کا ترجمہ بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے جس کو غیروں نے بھی نیکیوں
منبع شجاعت، مہربانی، پاکیزگی اور انسانی شفقت سے معمور، زبردست خطیب، قادر الکلام
پرداز، ناقابلِ شکست سپہ سالار، علومِ الٰہی کا زبردست عالم، صدر اسلام کا فصیح ترین
، معارف و علوم کا مرکز اور اسرار و رموز کا دروازہ قرار دیا ہے اور جن کے کلام کو بلند حکمت
بیاں، حیرت انگیز موعظہ، صرف کلامِ خالق سے نیچے اور تمام مخلوق کے کلام سے بالاتر قرار دیا ہے
و حید باری تعالیٰ کے بارے میں فرماتے ہیں۔ " تمام حمد اس اللہ کے لیئے ہے جس کی مدح
بولنے والوں کی رسائی نہیں، جس کی نعمتوں کا شمار ناممکن، کوشش کرنے والے اس کا حق ادا نہیں
، نہ بلند پرواز ہمتیں اُسے پا سکتی ہیں نہ عقل و فہم کی گہرائیاں اس تک پہنچ سکتی ہیں نہ
کے کمال ذات کی کوئی حد ہے اور نہ اس کے لیئے توصیفی الفاظ نہ اس کی ابتداء کے لیئے کوئی وقت

ہے اور نہ اس کے لئے کوئی مدت ہے جو ختم ہو جائے۔ دین کی ابتدا اس کی معرفت ہے، کمالِ معرفت اُس کی تصدیق ہے، کمالِ تصدیق توحید ہے۔ کمالِ توحید تنزیہ اخلاص ہے کمالِ تنزیہ اخلاص یہ ہے کہ اُس سے صفتوں کی نفی کی جائے کیونکہ ہر صفت شاہد ہے اپنے موصوف کی غیر ہے اور ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ صفت کے علاوہ کوئی چیز ہے لہذا ج ذاتِ الہیٰ کے علاوہ صفت مانے اُس نے ذات کا ایک دوسرا ساتھی مان لیا اور جس نے اس ذات کا کوئی اور ساتھی مانا اُس نے دوئی پیدا کی اور جس نے دوئی پیدا کی اُس نے اُس کے ل بنا ڈالا اور جو اُس کے لئے جز کا قائل ہوا وہ اُس سے بے خبر رہا اور اُسے قابل اشارہ سمجھ لیا جس نے اُسے قابل اشارہ سمجھ لیا اُس نے اُس کی حد بندی کر دی اور جو اُسے محدود سمجھا وہ اُسے د چیزوں کی قطار میں لے آیا۔ اور جس نے یہ کہا کہ وہ کس چیز پر ہے اُس نے دو جگہیں اس خالی سمجھ لیں۔ وہ ہے ہوا نہیں۔ موجود ہے مگر عدم سے وجود میں نہیں آیا۔ وہ ہر شئے ہے مگر جسمانی اتصال کی طرح نہیں، وہ ہر چیز سے علیحدہ ہے مگر جسمانی دوری کے طور پر نہیں، ا ہے لیکن حرکات و سکنات کا محتاج نہیں۔ وہ اُس وقت بھی دیکھنے والا تھا جبکہ مخلوق میں کوئی چیز دینے والی نہ تھی۔ وہ یگانہ ہے اس لئے کہ کوئی اُس کا ساتھی ہی نہیں ہے کہ جس سے وہ مانوس اُسے کھو کر پریشان ہو جائے۔ اُس نے خلق کو پہلے پہل پیدا کیا بغیر کسی فکر کی جولانی کے او کسی تجربہ کے کہ جس سے فائدہ اُٹھانے کی اُسے ضرورت پڑی ہو اور بغیر کسی حرکت کے کہ جسے اُس پیدا کیا ہو اور بغیر کسی ولولہ اور جوش کے کہ جس سے وہ بے تاب ہوا ہو۔ اُس نے ہر چیز کو وقت کے حوالہ کیا۔ بے جوڑ چیزوں میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کی۔ ہر چیز کو جداگانہ طب مزاج کا حامل بنایا اور اُن طبیعتوں کے لئے مناسب صورتیں ضروری قرار دیں۔ وہ اِن چیزو اِن کے وجود میں آنے سے پہلے سے جانتا تھا۔ اُن کے حدود نہایت پر احاطہ کئے ہوئے تھا ا کے نفوس و اعضاء کو پہچانتا تھا۔"

تخلیق کائنات کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"اُس نے مخلوقات کو اپنی قدرت سے پیدا کیا، اپنی رحمتوں سے ہواؤں کو چلایا، تھ

ہوئی زمین پر پہاڑوں کی میخیں گاڑیں (اس سے قبل) اس نے کشادہ فضا، وسیع اطراف و اکناف اور خلاء کی وسعتیں خلق کیں اور ان میں ایسا پانی بہایا جس کے دریائے مواج کی لہریں طوفانی اور بحرِ ذخار کی موجیں تہ بہ تہ تھیں۔ اسے تیز ہوا اور تند آندھی کی پشت پر لادا پھر اسے پانی کے پلٹانے کا حکم دیا اور اسے اس کے پابند رکھنے پر قابو دیا اور اسے پانی کی سرحد سے ملا دیا، اس کے نیچے ہوا دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھی اور اوپر پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا پھر اللہ سبحانہ نے اس پانی کے اندر ایک ہوا خلق کی جس کا چلنا بے ثمر تھا اور اسے اس کے مرکز پر برقرار رکھا، اس کے جھونکے تیز کر دیئے اور اس کے چلنے کی جگہ دُور دراز تک پھیلا دی پھر اس ہوا کو مامور کیا کہ وہ پانی کے ذخیرے کو تھپیڑے دے اور بحرِ بے کراں کی موجوں کو اچھالے۔ اس ہوا نے پانی کو یوں متھ دیا جس طرح دہی کے مشکیزے کو متھا جاتا ہے اور اسے ڈھکیلتی ہوئی تیزی سے چلی جس طرح خالی فضا میں چلتی ہے اور پانی کے ابتدائی حصے پر اور ٹھہرے ہوئے کو چلتے ہوئے پانی کو پلٹانے لگی یہاں تک کہ اس متلاطم پانی کی سطح بلند ہو گئی اور وہ تہ بہ تہ پانی جھاگ دینے لگا۔ اللہ نے وہ جھاگ کھلی ہوا اور کشادہ فضا کی طرف اٹھائی اور اس سے ساتوں آسمان پیدا کیے نیچے والے آسمان کو رکی ہوئی موج کی طرح بنایا اور اوپر والے آسمان کو محفوظ چھت اور بلند عمارت کی صورت میں اس طرح قائم کیا کہ نہ ستونوں کے سہارے کی حاجت اور نہ بندھنوں سے جوڑنے کی ضرورت تھی۔"

باب العلم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تخلیقِ کائنات سے متعلق جو کچھ فرمایا ہے وہ درحقیقت قرآنِ حکیم کی مختلف آیات کی تفسیر ہے سورۂ ہود کی آیت ۷ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ (اس کا عرش پانی پر تھا) سورۂ حم سجدہ کی آیت ۱۱ میں ارشاد ہوتا ہے ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ (پھر وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا جو اس وقت محض دھواں تھے) سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۰ میں ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَىْءٍ حَىٍّ (اور ہم نے پانی سے ہر جاندار شے کو

پیدا کیا ہے۔ ان آیاتِ قرآنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ تخلیقِ کائنات کی ابتدا میں ہر طرف پانی ہی پانی تھا پھر وہ دھویں یا گیس میں تبدیل ہوا۔ اور پانی اور گیس کے امتزاج سے کائنات کی تخلیق ہوئی۔ سائنس کی تحقیقات اب تک جو معلوم کر سکی ہیں اُن سے بھی بڑی حد اس کی تائید ہوتی ہے۔ مغرب کے مشہور سائنس دان موریس بوکیلے اپنی مشہورِ عالم کتاب "بائبل، قرآن اور سائنس" میں لکھتے ہیں کہ "کائنات کی تشکیل ایک ایسے گیسی مادہ سے ہوئی جو ہائیڈروجن اور ہیلیم کی کچھ مقدار سے مرکب تھا اور آہستہ آہستہ گردش کر رہا تھا یہ سلیم انجامِ کار متعدد ٹکڑوں میں بٹ گیا جن کی لمبائی، چوڑائی اور مقدارِ مادہ بہت زیادہ تھا کہ سورج کے موجودہ مادہ سے ایک کھرب گنا تک اندازہ لگایا گیا ہے اس سے ابتدائی گیسی مقدار کے اُن ٹکڑوں کے عظیم مجموعوں کا کچھ تصور کیا جا سکتا ہے جس سے یہ عظیم کہکشائیں پیدا ہوئیں۔۔ علم افلاک کے ماہرین نے نظامِ شمسی کی تشکیل سے متعلق بڑی حد تک صحیح معلومات حاصل کر لی ہیں کہ گردش کرتے ہوئے گیسی مادہ کا انجماد اُس کا سکڑنا پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سورج اور سیاروں کی شکل اختیار کر لینا جس میں ایک ہماری زمین بھی ہے۔"

مشہور حدیث نبوی اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا (میں شہرِ علم ہوں اور علیؓ اُس کا دروازہ ہیں) کی صداقت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ سائنس خلقتِ کائنات کے رازوں سے واقف ہونے میں اب تک جس قدر کامیاب ہو سکی ہے اُس سے آپ صلے اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کو چودہ سو برس پہلے ہی واقف کرانے کی کوشش فرمائی تھی اور ان علوم پر غور و فکر ہی نے دوسری صدی ہجری میں ابن مقنہ، ابو نصر فارابی اور جابر ابن حیّان جیسے سائنس دان پیدا کیے تھے جن کی تحقیقات سے مغرب نے خوب فائدہ اُٹھایا جبکہ ہم اُن سے لاعلم اور خوابِ غفلت میں سوتے رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے جب عربوں کے ان علوم کے خزانوں کو یورپ کی لائبریریوں میں دیکھا تو اُن کو سخت صدمہ پہونچا وہ کہتے ہیں کہ

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھو ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

ید احمد عروج قادری قسط ۱۷

اسلامی تصوّف

ہوں کی تقسیم حق اللہ اور
العباد کی نسبت سے

حقوق کی اصلاً دو ہی قسمیں ہیں اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق۔ ان کی نسبت سے گناہوں کی بھی دو قسمیں ہو جاتی ہیں ایک جس
لق حقوق اللہ سے ہو اور دوسری وہ جس کا تعلق حقوق العباد سے ہو، گناہ کوئی بھی ہو اس
سی نہ کسی کی حق تلفی یا اس پر زیادتی ضرور ہوتی ہے اسی گناہ کے لیے ظلم کا لفظ بھی استعمال کیا
ہے اور اسی لیے سب سے بڑے گناہ، شرک کو قرآن میں ظلم عظیم کہا گیا ہے۔ حضرت لقمان
پنے بیٹے کو سب سے پہلی نصیحت یہ کی تھی۔

ـنَیَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۚ اِنَّ
رْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝ (لقمان ع ۲)

اے بیٹے، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرانا، بے شک شرک بڑا ظلم ہے

توحید یعنی اللہ تعالیٰ کو لاشریک لہ ماننا صرف اسی کا حق ہے اس لیے کوئی شخص اگر
ہ شرک میں مبتلا ہے تو وہ اللہ کی حق تلفی اور اس کی شان میں گستاخی کر رہا ہے اور
حق تلفی و گستاخی وہ گناہ ہے جس کے بارے میں اس نے اعلان کر دیا ہے کہ میں اسے معاف
یں کروں گا اور اگر اس گناہ کے ساتھ کوئی شخص مر گیا تو وہ لازماً ہمیشہ جہنم میں جلتا رہے گا
ی طرح نماز اور روزہ خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے اب اگر کوئی مسلمان صوم و صلوٰۃ ترک
ے ہوئے ہے تو وہ ایسے گناہ میں مبتلا ہے جس کا تعلق اللہ کے حق سے ہے

کسی بندے کی حق تلفی اور اس پر زیادتی کا تعلق یا تو اس کے جسم و جان سے ہوتا ہے یا
ل سے یا عزت و آبرو سے یا دین و مذہب سے یا جاہ و مرتبہ سے — کسی کو ناحق قتل کر دینا

یا اس پر ایسا اتہام لگانا جس سے اس کی عزت و آبرو پر حرف آتا ہو یا ایسی کوئی ناجائز
اختیار کرنا جس سے اس کی جاہ و مرتبہ میں کمی واقع ہوتی ہو۔ ایسے گناہ ہیں جن کا تعلق حقو
سے ہے اب ایک ایسا گناہ رہ گیا جس کا تعلق کسی کے دین و مذہب سے ہو۔ امام غزالی
نے احیاء العلوم میں اس کی ایسی مثالیں دی ہیں جو اب تک نظر سے اوجھل تھیں وہ کہتے ہیں
کہ اگر کوئی شخص کسی صحیح العقیدہ اور متبع سنت مسلمان کو گمراہی یا بدعت کی طرف د
دے رہا ہے یا اُسے گناہوں کی ترغیب دے رہا ہے تو یہ اس کے دین پر حملہ، اس کی
تلفی اور اس پر زیادتی ہے، اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ آج کل بعض واعظ
اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال اور اس سے خوف و خشیت کے پہلو کو دبا کر اس کی رحمت و مغ
کے پہلو کو ابھار دیتے ہیں جس کے نتیجے میں لوگوں کے اندر معصیت کی جرأت پیدا ہوتی
یہ بھی درحقیقت بندوں کی حق تلفی میں داخل ہے ۔

جن گناہوں کا تعلق حق تعالیٰ سے ان میں سے کفر و شرک کے بارے میں اس نے بتا
ہے کہ معاف نہیں کرے گا باقی اس سے نیچے درجہ کے گناہ اس کی مشیت پر موقوف ہیں وہ چا
تو انھیں معاف بھی کر سکتا ہے باقی رہے وہ گناہ جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے وہ اس وقت
تک معاف نہیں ہو سکتے جب تک وہی لوگ معاف نہ کریں جن کی حق تلفی کی گئی ہو، اس
بارے میں امام غزالیؒ نے یہ جچی تلی بات لکھی ہے کہ دفاتر گناہ تین قسم کے ہیں۔

دیوان یغفر و دیوان لا یغفر و دیوان لا یترک ۔ (احیاء العلوم ج ۴ باب التوبہ ص ۱۱)

ایک دفتر ایسا ہے جو بخشا جا سکتا ہے، ایک ایسا ہے جو بخشا نہیں جا سکتا اور ایک ایسا ہے جسے ترک نہیں کیا جا سکتا ۔

کفر و شرک سے نیچے درجے کے گناہوں کا دفتر بخشا جا سکتا ہے اور ناقابلِ معافی کفر
شرک کا دفتر ہے اور بندوں کے حقوق اور ان پر زیادتیوں کا دفتر وہ ہے جسے چھوڑا
جا سکتا، یعنی یہ حقوق اسی وقت معاف ہو سکتے ہیں جب بندے خود معاف کر دیں
سلسلے سے متعلق متعدد صحیح احادیث پیش کی جا سکتی ہیں

ن میں بخوفِ طوالت صرف ایک حدیث کا ترجمہ یہاں پیش کرتا ہوں۔

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تمھیں معلوم ہے کہ مفلس کون ہے؟ صحابہ رضؓ نے جواب دیا ہم میں مفلس وہ ہوتا ہے جس کے پاس نہ درہم ہوں اور نہ ساز و سامان۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری اُمت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت میں نماز، روزے اور زکوٰۃ لے کر آئے گا لیکن اس کے ساتھ اس نے کسی کو گالی دی ہو گی، کسی پہ اتہام لگایا ہوگا، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا اور کسی کو مارا ہوگا تو ان میں سے ہر ایک کو اس کی دس نیکیاں ختم ہوجائیں گی اور اگر تمام مطالبات پورے ہونے سے پہلے اس کی نیکیاں ختم ہوجائیں گی تو ان لوگوں کے گناہ جن کے حقوق اس نے تلف کئے تھے اس پر ڈال دیئے جائیں گے اور پھر اسے جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ (۱)"

یہ حدیث مسلمانوں کو متنبہ کرتی ہے کہ وہ بندوں کے حقوق تلف کرنے اور ان پر زیادتیاں کرنے سے بچیں اور اگر کوئی حق تلفی و زیادتی ہوگئی ہو تو اسی دُنیا میں اسے معاف کرانے اور اس کی تلافی کی کوشش کریں، کیونکہ قیامت کا دن ایسا ہولناک ہوگا کہ کوئی شخص اپنا حق معاف کرنے پر تیار نہ ہوگا۔

توبہ کی ترغیب اور اس کے فضائل : اب تک جو لکھا جاچکا ہے اس سے معلوم ہوا کہ توبۂ نصوح کے بغیر آخرت کی نجات ہی خطرے میں ہے بارگاہِ الٰہی میں تقرّب اور درجات کی بلندی کا کیا سوال ہے؟ اس لیے ہر اس شخص کو جسے آخرت پر ایمان اور جنت و دوزخ پر یقین ہو توبہ کرنا ہی چاہیئے۔ یہ اس کی اپنی نجات کا مسئلہ ہے لیکن

اللہ تعالیٰ کا بے پایاں کرم یہ ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو مختلف انداز میں توبہ کی تر
دی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ جو ماں باپ سے زیادہ ہم پر مہربان ہے
سزا دینا نہیں چاہتا بلکہ ہمیں بخشنا اور اپنی رحمت سے نوازنا چاہتا ہے یہ ہم ہی
جو اس سے بے رخی برت کر اس کے غضب کو دعوت دیتے رہتے ہیں قرآن وحد
میں توبہ و استغفار کی ترغیبات و فضائل پر بہت کچھ ہے ہم چند آیات واحادیث
پیش کرتے ہیں۔

۱) اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ٥ — بے شک اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے

(البقرہ ع ۲۸)

امام قشیریؒ نے اپنے رسالے میں اور امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اسی آیت پر ا
کیا ہے۔ بلاشبہ اس آیت میں توبہ یعنی باطنی طہارت اور تطہیر یعنی ظاہری طہارت کی بڑ
فضیلت موجود ہے ایک مومن کے لیے اس سے بڑی ترغیب اور کیا ہوگی کہ توبہ کر
میں صرف گناہ ہی معاف نہ ہوں گے بلکہ اسے اپنے مالک کی محبت بھی نصیب ہوگی۔ ؟
صلے اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ وضو کے بعد یہ دعا مانگیں ۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ

(اے اللہ مجھے توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی حاصل کرنے والوں کے گروہ میں داخل کر دے)

۲) سورۃ الزمر رکوع ۶ میں ہے :

" اے نبی کہہ دو کہ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی
ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، یقیناً اللہ سارے گناہ معاف
کر دیتا ہے وہ تو غفور و رحیم ہے ۔"

(باقی آئندہ)

ابوالمکارم غازی الدین کمال کریم نگری
مانیراشاعت گھر ۱۱-۱-۲
شاستری روڈ۔ کریم نگر ۱

(قسط دوم)

نیند اور موت
قرآن اور سائنس کی روشنی میں

حیرت اس بات پر ہے کہ اس مضمون میں ڈاکٹر الیمن کے سائینسی مشاہدات، تجربات اور دلائل کیا تھے؟ اس تعلق سے کچھ بھی نہیں کہا گیا ہے۔

ان اقتباسات سے یہ واضح ہوجاتی ہے کہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور ڈاکٹر الیمن دونوں نے سورہ زمر کی آیت کو سائینسی جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے حالانکہ سائینس کے نقطۂ نظر سے نیند اور موت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس فرق کو ظاہر کرنے سے پہلے امام رازی کے اس قول سے مضمون کو سمجھنے میں یقیناً مدد ملے گی کہ:۔

"قرآن ایسی کتاب ہے جس میں خاص وعام سب کو حق کی طرف دعوت دی گئی ہے اور عوام کا یہ حال ہے کہ اُن کی طبیعت اکثر اُمور میں حقائق کے ادراک سے انکار کرتی ہے۔ اس لئے مصلحت یہی تھی کہ ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا جائے جو عوام کے خیالات اور تصورات کے ساتھ کچھ مناسبت رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ حقیقت واقعی بھی ملحوظ ہو"

سورۂ انعام کی یہ آیت:

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ۖ ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ

ترجمہ : وہی ہے جو رات کو تمھاری روحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے پھر دوسرے روز تمھیں اس کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے تاکہ زندگی کی مقرر مدت پوری ہو۔ آخر کار اسی کی طرف تمھاری واپسی ہے پھر وہ تمھیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔"

اِس آیت کی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے تفہیم القرآن کی فہرستِ موضوعات میں یہ عنوان دیا ہے کہ :

"حیات بعد الموت کی مثال رات کو سوکر صبح جاگنے کی سی ہے"۔ اور یہ بات صد فی صد صحیح ہے اور نہ اس آیت کا یہ مطلب لیا جائے کہ ، "نیند اور موت دراصل ایک ہی عمل کا حصہ ہیں"۔

تو پھر یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ سورہ الانعام کی اس آیت میں رات کا ذکر کیا گیا ہے اور نیند تو رات کے علاوہ دن میں بھی آسکتی ہے۔ ظاہر ہے خالقِ کائنات اس بات سے ناواقف نہیں ۔

سورہ الانعام کی ایک اور آیت ہے:

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ط

ترجمہ : کیا وہ شخص جو پہلے مُردہ تھا پھر ہم نے اسے زندگی بخشی اور اس کو وہ روشنی عطا کی اُجالے میں وہ لوگوں کے درمیان زندگی کی راہ طے کرتا ہے اُس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہوا ہو اور کسی طرح اُن سے نہ نکلتا ہو۔"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اس کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:
یہاں موت سے مُراد جہالت و بے شعوری کی حالت ہے اور زندگی سے مُراد علم و ادراک اور حقیقت شناسی کی حالت۔ جس شخص کو صحیح اور غلط کی تمیز نہیں اور جسے معلوم نہیں کہ راست کیا ہے وہ طبیعیات کے نقطۂ نظر سے چاہے ذی حیات ہو مگر حقیقت

کے اعتبار سے اس کو انسانیت کی زندگی میسّر نہیں۔ وہ زندہ حیوان تو ضرور ہے مگر زندہ انسان نہیں۔ زندہ انسان درحقیقت صرف وہ شخص ہے جسے حق اور باطل، نیکی اور بدی، راستی اور ناراستی کا شعور ہو۔ یعنی تم کس طرح یہ توقع کر سکتے ہو کہ جس انسان کو انسانیت کا شعور نصیب ہو چکا ہے اور جو علم کی روشنی میں ٹیڑھے راستوں کے درمیان حق کی سیدھی راہ کو دیکھ رہا ہے وہ اُن بے شعور لوگوں کی طرح دنیا میں زندگی بسر کرے گا جو نادانی و جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔"

سورۂ الرعد کی یہ آیات:

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ
هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۔

ترجمہ: "اگر تمھیں تعجب کرنا ہے تو تعجب کے قابل لوگوں کا یہ قول ہے کہ ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہم نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب سے کفر کیا ہے یہ وہ لوگ ہیں جن کی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے ہیں، یہ جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔"

اس کی تشریح کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ:

"گردن میں طوق پڑا ہونا قیدی کی علامت ہے ان کی گردنوں میں طوق پڑے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اپنی جہالت کے، اپنی ہٹ دھرمی کے، اپنی خواہشاتِ نفس کے اسلاف پرستی آباواجداد کی اندھی تقلید کے اسیر بنے ہوئے ہیں یہ آزادانہ غور و فکر نہیں کر سکتے۔ انھیں ان کے تعصبات نے ایسا جکڑ رکھا ہے کہ یہ آخرت کو نہیں مان سکتے اگرچہ اس کا ماننا سراسر معقول ہے اور انکارِ حقیقت پر جمے ہوئے ہیں اگرچہ وہ سراسر نامعقول ہے۔"

سورہ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں پھر اوپر کی طرف توجہ فرمائی اور سات آسمان استوار کیے۔ اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سات آسمانوں کی حقیقت کیا ہے اس کا تعین مشکل ہے انسان ہر زمانے میں آسمان یا بالفاظِ دیگر ماورائے زمین کے متعلق اپنے اقتباسات یا مشاہدات کے مطابق مختلف تصورات قائم کرتا رہا ہے جو برابر بدلتے رہے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی تصور کو بنیاد قرار دے کر قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعین کرنا صحیح نہ ہوگا بس مجملاً اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ یا تو اس سے مراد یہ ہے کہ زمین سے ماوراء جس قدر کائنات ہے، اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقے میں واقع ہے، وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔"

ان چند آیات سے اس بات کی تشریح ہو جاتی ہے کہ قرآنی آیات میں اکثر مقامات مرادی معنی لیے گئے ہیں یا انھیں مثال کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

چنانچہ جناب قاری محمد عبدالباری صاحب استاذِ عربی جامعہ نظامیہ وقاری نشرگاہ حیدرآباد دکن (موجودہ نام آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد) نے "قرآنِ مجید مع عام فہم ترجمہ و مختصر تفسیر" میں سورہ زمر کی مذکورہ آیت کا ترجمہ اور اس کی تفسیر کچھ اس طرح بیان فرمائی ہے:

ترجمہ: اللہ لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرتے نہیں ان کی روحیں سوتے میں قبض کر لیتا ہے، پھر ان روحوں کو ایک مقررہ

نت تک کے لئے چھوڑ دیتا ہے ۔ بلا شبہ اس میں ان لوگوں کے لئے سوچ
نور و فکر کرتے ہیں، اللہ کی قدرت کی نشانیاں ہیں ۔"

" جس شخص کی زندگی ختم ہو چکی ہے اور موت کا وقت آگیا ہے اس کی
وح اللہ تعالیٰ پوری طرح قبض کر لیتا ہے، لیکن سونے والوں کی روح طرح
ض نہیں کرتا ۔ اس لئے زندگی باقی رہتی ہے مگر اس کے ہوش و حواس
معطل ہو جاتے ہیں اور وہ نیم مردہ ہو کر پڑ جاتا ہے، پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہے
ر کام کاج کرنے لگتا ہے ۔

ں حالت پر لوگوں کو غور کرنا چاہیئے، اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ لوگوں
ں اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اگر چاہے تو کسی کی روح نیند ہی میں قبض
ر وہ سوتا ہی رہ جائے ۔ چنانچہ کبھی کبھی ایسے واقعات سننے میں آتے ہیں ۔
سری بات یہ کہ جس طرح بے ہوش پڑا سونے والا آدمی اچانک اٹھ کھڑا ہوتا
رح اللہ کے حکم سے مردے بھی اٹھ کھڑے ہوں گے ۔ لہٰذا اس حالت پر غور کر کے
ندہ ہونے پر یقین رکھنا چاہیئے ۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

نوٹ :۔

زیر نظر شمارے میں عدم گنجائش کے سبب
جناب مومن خان شوق کی " ادبی سرگرمیاں " اور جناب
مر ملیح شروانی کی " سماجی سرگرمیاں " شائع نہیں کی جا رہی ہیں ۔

محمد طاہر صدیقی
ایم اے (عثمانیہ)
حال مقیم شکاگو۔

خاص برائے "شاداب"

زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

حیدرآباد فرخندہ بنیاد ہمیشہ سے علوم و فنون کا گہوارا رہا ہے۔ اس سرزمین میں بڑے بڑے بزرگ اور اہلِ اللہ بھی پیدا ہوئے جنھوں نے ملت کی ڈوبتی ناؤ کو کنارے تک پہنچانے کے انتظامات کئے ہیں حال ہی میں صوفی کانفرنس کے انعقاد کے ذریعہ کوشش کی گئی کہ ہماری دکھتی رگوں پر انگلی رکھ کر صحیح تشخیص کرلی جائے۔

صوفیائے کرام نے سابق میں جو ملی خدمات انجام دی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مخلوق کو خالقِ حقیقی سے جوڑ دیا جائے۔ اسباب ظاہری سے نظر ہٹا کر مسبب حقیقی سے جوڑ دیا جائے اسباب ظاہری سے نظر ہٹا کر مسببِ حقیقی کی طرف متوجہ کردیا جائے اور مصائب آلام کے آنے پر اپنے اعمال کی جانب نگاہ ڈالی جائے نہ کہ ظاہری اسبابِ تباہی کا رونا رو جائے۔ اس سلسلہ میں اس عظیم صوفی شاعر کا مصرعہ پیش کرتا ہوں جو نادرشاہ کے حملے کے وقت دہلی میں کہا گیا تھا کہ ؎

"شامتِ اعمال ما صورت نادر گرفت"

یہاں شکوہ کیا گیا تو اپنی بداعمالی کا نہ کہ نادرشاہ کے لائے ہوئے مظالم کا تاکہ ملت کی آنکھیں کھلیں اور ملت رجوع الی اللہ ہو جائے۔ بداعمالیوں پر تائب ہو کر اصلاح عمل کرے اور پھر اپنے کو خدائے تعالیٰ کی رحمتوں اور عطیات کا مستحق بنا کر انعامات سے نواز دی

اسی سلسلہ میں وہ واقعہ بھی یاد آتا ہے جس کا تعلق حضرت شاہ دولی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ کہ آپ کے مقام قیام پر دریا کی طغیانی شدید ہو گئی۔ پوری بستی غرقابی کے قریب تھی لوگ خدمتِ اقدس میں دوڑے اور دُعا کی درخواست کی آپ نے چند معتقد لوگوں کو بلوایا اور ساتھ لیا خود بھی کُدال ہاتھ میں لے کر آگے بڑھے اور رہے سہے بندھ کو بھی توڑنا شروع کیا اور فرمایا۔ " جدھر مولیٰ اُدھر شاہ دولیٰ "

مطلب یہی کہ اس وقت اللہ کی مرضی یہی ہے کہ اس وقت تباہی آ جائے۔ قوم نے عرض کیا حضرت پھر ہم کیا کریں ــ فرمایا توبہ کرو ــ گریہ وزاری کرو ــ شائد مالک کو رحم آ جائے۔ اس وقت پوری قوم حضرت کے ہاتھ پر تائب ہوئی اور دیکھتے دیکھتے حالات بدل گئے۔ وہی دریا جو تباہی و بربادی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ شہر اور دیہات اس کی زد میں آ چکے تھے اور قریب تھا کہ سب بہہ جائے وہ آہستہ آہستہ سکون کی کیفیت میں آ گیا اور لوگوں کی جانوں میں جان آ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اکثر اوقات پُرسکون حالات اور کشمکش رزق انسان کو غفلتوں کی اندھیریوں میں ڈھکیل دیتے ہیں اسی لئے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب کہا کہ

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے .. شمشیر و سنان اول طاؤس و رباب آخر

اسی میں تقدیرِ اُمم کا رازِ حقیقی بیان کر دیا گیا ہے۔ اب ہمارے دانشوروں کا یہ فرض بنتا ہے کہ مردہ دلوں کی صحیح تشخیص کر کے ان میں روحِ حقیقی کو بیدار کر دیں۔ لیکن صحیح وقت پر اگر بیداری کا کام انجام نہ پایا تو پھر یہ مرض کہیں لاعلاج نہ ہو جائے بقول شاعرِ مشرق

تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں پر۔

بس ایک ہی راہِ نجات ہے ــ درِ فیضِ محمدؐ وا ہے آئے جس کا جی چاہے
نہ آئے شوق سے دوزخ میں جائے جس کا جی چاہے

بس دامنِ محمدیؐ کو مکمل طور پر تھام لیا جائے ▲▲

ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خاں منشاؔ
اسٹارکی ٹاؤن
ناگپور

سرورِ کونین

کفر و بدعت کے اندھیروں کو مٹانے والا
نور ہی نور ہے وہ نور لٹانے والا

لقبِ سرورِ کونین کا حامل ٹھہرا
اک چٹائی پہ وہ دربار سجانے والا

فیضِ قدرت نے بنایا اسے نبیوں کا امام
سب سے اول رہا وہ بعد میں آنے والا

حق میں بندوں کے یقیناً ہے وہ محسنِ خاص
ایک معبود کی پہچان بتانے والا

درحقیقت ہے یہی راہ نمائے کامل
بھٹکے لوگوں کو رہِ راست پہ لانے والا

حُسنِ کردار و عمل میں تھا بڑا لاثانی
جینے اور مرنے کے آداب سکھانے والا

اللہ، اللہ یہ شان کہ اُمّی ہو کر
علم و حکمت کا ہے وہ درس پڑھانے والا

اس کے جیسا نہ کہیں ہو گا کوئی صاحبِ دل
وہ غریبوں کو کلیجے سے لگانے والا

کوئی بتلائے ذرا ہوگا وہ کیسا انساں
بگڑے انسانوں کو انسان بنانے والا

سچ تو یہ ہے کہ دل و جان سے پیارا ہے ہمیں
شمعِ ایمان دل و جاں میں جلانے والا

یاد آتا ہی رہے گا کسی عنواں ہر دم
سوئی تقدیرِ زمانہ کو جگانے والا

پاس اللہ نے خود اس کو بُلایا منشاؔ
کیا بشر ہو گا سرِ عرش وہ جانے والا

جمیل نظام آبادی
2/35-1-4 اعظم روڈ
نظام آباد

غزل

جس کو دنیا یہ سمجھتی ہے محبت میری
اور کیا ہوگی الگ اس سے عبادت میری

تم ذرا پڑھ کے تو دیکھو مرے اشعار کبھی
حرف در حرف ابھر آئے گی چاہت میری

تیرا دیوانہ ہوں سودائی ہوں شیدائی ہوں
تیرے در تک مجھے لائی ہے محبت میری

جانے کب تک یہ زمانہ مجھے ٹھکرائے گا
جانے کب تک نہ عیاں ہوگی حقیقت میری

ظلمتِ دہر میں مشعل کی طرح جلتا ہوں
ہے یقیں مجھ کو چلے گی یہ روایت میری

تو بھی اک روز مرے در پہ صدا دے گا ضرور
تجھ کو اے وقت کبھی ہوگی ضرورت میری

ترے قربان جمیل حزیں اے اردو زبان
تری الفت سے زمانے میں ہے شہرت میری

محمد عبدالحفیظ انجم
7-2-555 کشمیر گڈہ ضلع کریم نگر

دعا

دینے والے وہ شادمانی دے
اپنے دل پر بھی حکمرانی دے

ساری دنیا سما سکے دل میں
اتنی وسعت دے بیکرانی دے

کانپ اٹھیں جس سے کفر کے ایواں
نوجوانوں میں وہ جوانی دے

تیرگی ڈس رہی ہے شام و سحر
التجا ہے کہ ضو فشانی دے

دین و دنیا مرے سنور جائیں
مجھ کو ایسی ہی زندگانی دے

امتی ہوں حضورِ اکرمؐ کا
اس وسیلے سے کامرانی دے

تیرا بندہ ہے یہ حفیظ انجم
دین و دنیا میں کامرانی دے

غزلیں

اسحاق ملک

سکوں زاہد کو اب پیہم نہیں ہے
ـرے پازیب کی چھَم چھَم نہیں ہے
مانت کی طرح رکھوں گا دل میں!
ـراغم ہے یہ میرا غم نہیں ہے
ـہاں جاتے ہیں سارے دَم کے ساتھ
ـدمِ آخر کوئی ہمدم نہیں ہے
ـہ منظر کیا پسِ منظر بھی دیکھے
ـظر کا ایک ہی عالم نہیں ہے
ـذرا سہہ لو تو میٹھی بھی بنے گی
ـزباں کڑوی ہے لیکن سَم نہیں ہے
ـسافر کیوں نہیں بڑھتے ہیں آگے
ـزائم میں تو زیر و بم نہیں ہے

ـک دُنیا کو پھر بھی دیکھتا ہوں
ـمیرے قبضے میں جامِ جم نہیں ہے

عرفان پربھنوی

[illegible] رکھ دو میرے آگے نہ سمندر رکھ دو
کچھ نہیں یارو فقط پیار کی گاگر رکھ دو
خوں جم جائے رگوں میں نہ کہیں برف کی طرح
آگ تھوڑی سی مرے جسم کے اندر رکھ دو
روشنی دے نہیں سکتے جو کسی کو یارو
ایسے ناکارہ چراغوں کو بُجھا کر رکھ دو
جن کی پرواز میں آ جائے نظر کوتاہی
بال و پَر ایسے پرندوں کے کتر کر رکھ دو
روشنی سارے آنگن میں بِکھر جائے گی
کاٹ کر گھر کی منڈیر پہ میرا سر رکھ دو

گِر نہ جائے کہیں ہمسائے کی دیوار عرفاںؔ
اپنے ہمسائے کی دیوار پہ چھپّر رکھ دو

کالی داس کاشیکر
شاہ علی بنڈہ - حیدرآباد

خدائی خدمتگار سرحدی گاندھیؒ بادشاہ خان

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی اس حکومت کے خلاف ہندوستانیوں سب سے پہلے ۱۸۵۷ء میں آواز اٹھائی جس کی چنگاریاں مسلسل سلگتی رہیں نتیجتاً ۱۸۸۵ء میں کانگریس اور دیگر سماجی تنظیموں کے عوام نے متحد ہو کر ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء یعنی ہندوستان کی آزادی تک جد و جہد جاری رکھی۔ یہ جد و جہد کئی لحاظ سے زلزلہ خیز ثابت ہوئی جس نے ہما قومی ہستی کی بنیادوں کو اسی طرح ہلا دیا جیسے زلزلہ زمین کو تہ و بالا کر دیتا ہے صدیوں کے تنا اور قوت و اقتدار کی عمارتیں اگر گری نہیں تو ان کی بنیادیں ضرور متزلزل ہو گئیں اور کا نقشہ اسی طرح بدل گیا جیسے قدرتی زلزلے سے سطح زمین کا نقشہ بدل جاتا ہے ہندوستان جنگ آزادی کی تاریخ لکھنے والوں نے جلیان والا باغ، بارڈولی اور چورا چوری اور اسی کے کئی مقامات کا ذکر کیا جس میں پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں صوبہ سرحد منظر عام پر آیا۔ لوگ صرف اتنا جانتے تھے کہ سرحد ایک ملک ہے جہاں پر پٹھانوں کی آبادی رہتی ہے جنہیں حکومت برطانیہ رقم دیتی ہے تاکہ سرحد پر وہ امن قائم رکھ سکیں۔ تاریخ نے کروٹ بدلی۔ لیکن ۳۲-۱۹۳۱ء واقعات نے یہ دکھا دیا کہ صوبہ سرحد میں بھی ایسے لوگ رہتے ہیں جو ہماری طرح سوچتے اور

ہیں جنھوں نے آزادی کی جنگ میں اتنا ہی حصہ لیا جتنا دوسرے صوبوں کے باشندوں نے بلکہ ان سے زیادہ مصیبتیں برداشت کیں اور ان سے زیادہ قربانیاں دیں۔ ۱۹۳۱ء میں کراچی کا کانگریس سیشن ہو رہا تھا جس میں پہلی بار خان عبدالغفار خاں (بادشاہ خاں) جنھیں بابائے قوم مہاتما گاندھی نے "سرحدی گاندھی" کا خطاب دیا تھا، شرکت کی۔ سرحدی گاندھی کی شرکت سے عوام کو حیرت ہوئی کہ سیدھے سادے آسانی سے مشتعل ہو جانے والے قوی ہیکل پٹھان بھی ایک ایسی جماعت کے رکن ہو سکتے ہیں جو عدم تشدد کی پابند ہو یعنی وہ انتہائی تشدد کے باوجود اپنی سرگرمیاں پُرامن طریقے سے جاری رکھ سکتے ہیں اس پُرامن جنگ کے دوران ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں جن سے عظمت، شجاعت عیاں ہوتی ہے ایسے عظیم خدائی خدمت گار، بھارت رتن سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کی پیدائش فرنٹ ایر اسپیکس (FRIONTER SPEAKS) کے مصنف محمد یونس کے مطابق دسمبر ۱۸۹۰ء یا جنوری ۱۸۹۱ء مانی ہوگی۔ مہادیو بھائی بابائے قوم کے سکریٹری نے بھی انہی تاریخوں کی طرف اشارہ کیا۔ خان بادشاہ محمد زئی پٹھان تھے جن کے لفظی معنی نسل سے گویا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کس نسل سے ہیں۔ خاں کے معنی سردار کے ہوتے ہیں ان کے پڑ دادا سیف اللہ ممتاز مجاہد آزادی تھے اور والدِ ماجد بیرم خان مذہبی خیالات کے حامل تھے جن کا اثر بادشاہ خاں پر بھی پڑا۔ چنانچہ زندگی کی آخری سانس تک وہ باپو کے اہنسا اور عدم تشدد کے راستے پر عمل کرتے رہے۔ بادشاہ خان کی ابتدائی تعلیم پشاور کے ایک مقامی اسکول میں ہوئی۔ اس کے بعد بڑی مشکل سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی چونکہ ان کا رجحان سماجی اور مذہبی سرگرمیوں کی طرف زیادہ تھا چنانچہ ۱۹۱۶ء میں ہندوستان میں جنگِ آزادی کے آغاز پر تعلیم کو خیرآباد کر کے جدوجہدِ آزادی میں بابائے قوم مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مہادیو بھائی دیسائی (باپو کے سکریٹری) ڈاکٹر راجن بابو، مولانا آزاد کے ہمراہ نمایاں رول ادا کیا۔ اس زمانے میں برٹش سرکار نے انھیں گرفتار کیا۔ جیل سے رہائی کے بعد بادشاہ خاں نے ۱۹۲۴ء میں "خدائی خدمت گار" ادارہ کو قائم کیا۔ ہم خدا کے بندے ہیں دولت یا موت کی ہمیں قدر اور فکر نہیں خدا ہی ہمارا بادشاہ ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ

۲۳/ اپریل ۱۹۳۰ء کے جلیانوالا باغ تحریک میں بادشاہ خان نے نمایاں دلچسپی لی تھی جس کے پیش نظر
انہیں گرفتار کیا گیا۔ یہی واقعہ ہے بابائے قوم نے انہیں "سرحدی گاندھی" کا نام دیا۔ جیسے ہی
جیل سے رہا ہوئے تو وہ سیدھے وردھا بابائے قوم گاندھی جی کے آشرم میں بابا ونت ونو
کے ساتھ رہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیئے کہ بادشاہ خان نے اپنے جیل کے زمانہ
میں ہی قرآن شریف، شریمد بھگوت گیتا، بائبل اور گرو گرنتھ صاحب جیسی مقدس
کتابوں کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک میں حصہ
لینے پر انہیں جیل کی سزا ہوئی۔ مسلسل جدوجہد کے پیش نظر انگریزوں نے مجبور ہو کر ملک
کے دو حصے کر کے آزادی کی شرط رکھی۔ سیاسی حالات کے پیش نظر قومی رہنماؤں نے مجبور
ہو کر ہندوستان؛ پاکستان کی تقسیم کو تسلیم کر لیا۔ ملک کی تقسیم سے بابائے قوم مہاتما گاندھی
اور سرحدی گاندھی و دیگر رہنما بھی سخت ناراض تھے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد بادشاہ خان
نے عدم تشدد کے طریقہ پر پٹھانوں کے لئے پختونستان کی مانگ کی جس کے لیئے بادشاہ خان کو کئی
ایک مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں یہ بات ذہن نشین ہونا چاہیئے کہ بادشاہ خان کو ہندوستان
کے عوام سے بے پناہ محبت تھی چنانچہ ۱۹۶۹ء میں بابائے قوم مہاتما گاندھی کی یوم پیدائش صد
تقاریب کے موقع پر انھوں نے سرکاری سطح پر ہندوستان کے سبھی ریاستوں کا دورہ کیا۔ گاندھی
صدی تقریبات کے موقع پر سرحدی گاندھی نے ریاست آندھرا کا بھی دورہ کیا۔ اس موقع پر
یونائیٹڈ ہندو مسلم فرنٹ تنظیم' حیدرآباد کی جانب سے گورنر کھنڈو بھائی دیسائی نے بادشاہ
کو قومی خدمات کے پیش نظر ہندو مسلم اتحاد کا خصوصی ایوارڈ عطا کیا۔ اپنی تقریر میں حیدرآباد
کے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ آج ہندوستان ایک آزاد اور جمہوریہ ملک بن چکا
اس عظیم ملک کی ہمہ جہتی ترقی کے لیئے ہندوؤں اور مسلمانوں کو کندھے سے کندھا ملا کر محنت
کرنے کی سخت ضرورت ہے آج بابائے قوم ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی گرانقدر اہنسا
عدم تشدد، قومی یکجہتی کی قیمتی نصیحتیں تو ہیں جو ہم بھولے بھٹکے لوگوں کو راستہ تو دکھلاتی رہیں گی
یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بادشاہ خان کو پاکستان کی بہ نسبت ہندوستان سے زیادہ محبت

جب وہ بیمار ہوئے تو انھوں نے اپنے علاج کے لئے ہندوستان کو ترجیح دی۔

بادشاہ خان کی گرانقدر قومی خدمات کے پیشِ نظر بھارت سرکار کے وزیراعظموں پنڈت جواہر لال نہرو۔ اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی نے سرکاری طور پر بادشاہ خاں کے علاج کے لئے کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

۱۵راگست ۱۹۸۷ء کو یوم آزادیٔ ہند کی ۴۰ویں سالگرہ پر حکومتِ ہند کی طرف سے ملک کے سب سے بڑے اعزاز "بھارت رتن" کو بعد از مرگ ان کے بیٹے خان عبدالولی خان نے صدر جمہوریہ مسٹر آر وینکٹ رامن کے دستِ مبارک سے حاصل کرتے ہوئے حکومتِ ہند کا شکریہ ادا کیا۔ آخری زمانے میں بادشاہ خان نے حکومتِ ہند سے اپنے آبائی وطن پشاور بھیجنے کی خواہش کی۔ بادشاہ خاں کی خواہش کے مطابق انہیں ان کے آبائی وطن بھیج دیا گیا۔ اپنے آبائی وطن میں ہی بادشاہ خان ۲۰ر جنوری ۱۹۸۸ء کو وفات کر گئے۔ ان کی آخری رسومات میں ہندوستان کے عوام کی جانب سے وزیراعظم راجیو گاندھی نے نمائندگی کرتے ہوئے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ہندو مسلم اتحاد، خدائی خدمت گار، بھارت رتن بادشاہ خاں آج اس دُنیا میں نہیں ہیں مگر انھوں نے ہندوستان کی آزادی اور عوام کی بھلائی کے لئے جو کام کئے ہیں وہ ناقابلِ فراموش اور عصرِ حاضر کے لئے مینارِ نور ہے۔ ◢

(سلسلہ ص ۲۳ سے آگے) یقیناً مکمل تبدیلی محض ایک ہفتے کے اندر نہیں لائی جاسکتی بلکہ یہ تبدیلی برسوں باقاعدگی اور استحکام کے ساتھ جدوجہد کرنے سے رونما ہوگی تاہم قومی کتب ہفتہ ان تمام افراد کے لئے ایک نادر موقع ہے جو کتابیں اور مطالعے کی عادت کو فروغ دینے میں دلچسپی رکھتے ہیں مذکورہ لوگ یہ کام موجودہ صورتحال کی عکاسی کرتے عملی حکمت عملیوں کے بارے میں اپنے خیالات کرتے اور انہیں قطعی شکل دینے ملک بھر کے مختلف اداروں میں اساتذہ اور طلباء تک پہونچنے اور اس بات کا مظاہرہ کرنے کیلئے ترغیبی اقدامات کرکے انجام دے سکتے ہیں کہ مطالعہ سے کام کاج کرنے کی صلاحیتوں میں کس طرح اضافہ ہوتا ہے اور معیار زندگی کس طرح بہتر ہوتا ہے ◢

(پی آئی بی)

کتابیں

سماجی تبدیلی کا ایک ذریعہ

دُنیا بھر میں علم کے ہر ایک شعبے میں تیز رفتار ترقی عمل میں آرہی ہے اس ترقی کی تشہیر زیادہ تر تحریروں کے ذریعے ہورہی ہے کتابیں جدید ترین علم حاصل کرنے کی کلید ہیں۔ ٹیلی ویژن اور ویڈیو جیسی سمعی و بصری ایجادات کی بڑے پیمانے پر دستیابی کے باوجود بھی کتابیں کسی شخص کی صلاحیتوں کو اُجاگر کرتے اور اس میں اضافہ کرتے نیز جمہوری خطوط پر پائیدار، اقتصادی، سماجی، ثقافتی اور سیاسی ترقی و فروغ کے سلسلے میں علمی بنیاد فراہم کرنے کے لئے نہایت اہم ہیں۔

بھارت میں آج سے پانچ ہزار برس قبل ویدوں کے زمانے سے لکھنے اور پڑھنے کی روایت رہی ہے۔ اس کا سنسکرت کا ادب تقریباً ۳۵۰۰ برس قدیم ہے۔ آج چونکہ خواندگی ملک کا اہم موضوع ہے اس لئے کتابوں کی اہمیت میں کئی گنا اضافہ ہوگیا ہے چونکہ ہماری آبادی کا ایک بڑا حصہ خواندگی کی سمت پیش رفت کررہا ہے اس لئے ایسے مواد کے لئے مانگ میں اضافہ ہورہا ہے جو ان کے لئے موزوں ہے۔ لوگوں میں اس وقت تک مطالعے کی عادت، خواہ وہ تفریح اور شوق کے لئے ہو یا کام کاج کی صلاحیتوں میں اضافے کرنے کے لئے ہو، پیدا کرنا ممکن نہیں ہوگا جب تک کہ پڑھنے کے مواد کو تازہ ترین اور دلچسپ نہیں بنایا جاتا۔

نو خواندہ اور نو خواندہ افراد میں مطالعہ کو رواج ۔ ۔ ۔

لئے کہ ان کی پڑھنے کی صلاحیت مطلوبہ قابلیت، کتابوں کی عدم موجودگی کی
سے ختم نہ ہونے لگے۔ حکومتوں، ماہرین تعلیم، مصنفین، ناشروں، سماجی
ں اور اچھے شہریوں کو مل جل کر کوشش کرنی ہوں گی۔ اس سلسلے میں نیشنل
رسٹ (این بی ٹی) نے ایک اچھی شروعات کی ہے۔ یہ ٹرسٹ ہر برس ۱۴ نومبر
نومبر تک قومی کتب ہفتہ کا اہتمام کرتا ہے پہلا قومی کتب ہفتہ ۱۹۸۲ء میں نیشنل
ٹرسٹ کی سلور جوبلی کے موقع پر منایا گیا تھا۔

کتب ہفتے کا بنیادی مقصد کتابوں کے بارے میں بیداری پیدا کرنے کا کام انجام دینا ہے
بنیادی کام کے علاوہ ٹرسٹ پچاس ہزار سے زیادہ تنظیموں اور اداروں سے اس
کے دوران مختلف سرگرمیاں کرنے کی اپیل کرتا ہے ٹرسٹ اسکولوں، کالجوں،
سٹیوں، پبلک لائبریریوں، کتاب فروشوں، ناشروں اور اسی طرح کی دیگر تنظیمو
ٹر اور ترقیاتی مواد بذریعے ڈاک بھیجتا ہے ٹرسٹ کتب ہفتے کی تشہیر کے لئے
ر، پوسٹر، پلاسٹک کے بلّے، گتے کی ٹوپیاں اور بیانر وغیرہ بھی تقسیم کرتا ہے۔
ہفتے کے دوران یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہزاروں تعلیمی اداروں اور لائبریریوں میں
کے کلب سمیت کتابوں سے متعلق مختلف سرگرمیوں کا اہتمام کیا جائے گا نیز کتب
ں اور ناشروں کی مختلف انجمنوں اور فیڈریشنوں کی سرپرستی میں کتابوں کی ۲۰۰
ہ نمائشوں کا اہتمام کیا جائے گا۔ کتب ہفتے کے افتتاح کے لئے ریاستی حکومتوں اور
اداروں کے اشتراک عمل سے بنگلور، بمبئی، کلکتہ اور دہلی نیز دیگر ریاستوں کی
ماتیوں میں ۱۴ نومبر کو تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔

پانچویں کتب ہفتے کے دوران شروع کئے گئے قارئین کے کلب کے انوکھے نظریہ پر
خصوصی توجہ دی جائے گی۔ کلب کے اہم مقاصد ہیں۔ اسکول لائبریریوں میں دستیاب
کتابوں سے اساتذہ اور طلباء کو روشناس کرانا۔ ان میں مطالعے کی عادت کو فروغ
دینا کہ پیر یڈ میں لائبریری میں یا لائبریری سے کتابیں گھر لے جا کر گھر پر خالی

وقت میں جہاں تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ کتابیں پڑھنے کے لئے طلبا کی حوصلہ افزائی کرنا نیز قارئین کے کلب کے اراکین نے جو کتابیں پڑھی ہیں ان کے مواد اور خصوصیات کے بارے میں تبادلہ خیالات کرنے کے لئے قارئین کے کلب کے اراکین کو مواقع فراہم کرنا اور اس طرح دیگر نصب العین کے علاوہ عوام میں تقریر کرنے بہتر طریقے سے اپنی بات کہنے اور لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ قارئین کے کلب کے اراکین میں غیر رسمی اور رضا کارانہ بنیاد پر کتابوں کے آپس میں تبادلے کرنے کو فروغ دینا۔ لائبریریوں اور گھروں میں کتابوں کی دستیابی کو یقینی بنانا قارئین سے رائیں رائے فراہم کرکے اسکول کی لائبریری کے لئے زیادہ موزوں کتابیں خریدنے میں اسکولوں میں کتابوں کا انتخاب کرنے والی کمیٹی کی مدد کرنا نیز اپنے لئے کتابیں خریدنے اور اپنے دوستوں کو تحفے میں کتابیں دینے کے سلسلے میں بچوں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

اسکولوں میں قارئین کلب قائم کرنے کے لئے پرنسپل اور اساتذہ کو اس سلسلے میں تبادلۂ خیال کرنا چاہیئے اور کلب قائم کرنے کے بارے میں فیصلہ کرنا چاہیئے۔ اس نظریئے کے لئے ان میں جوش و خروش اور کلبوں کی کامیابی کے لئے ذاتی عزم مصمم کی ضرورت ہے۔ اس لئے ایسے اساتذہ کی نشاندہی کرنا ضروری ہوگا جو جوش و خروش کے ساتھ ایک ذاتی مشن قاری ہیں اور جو قارئین کے کلب کو جوش و خروش کے ساتھ ایک ذاتی مشن کے طور پر چلا سکیں۔ کتابوں میں گہری دلچسپی رکھنے والے طلبا کو قارئین کے کلب کی تشکیل کے لئے یکجا کیا جا سکتا ہے۔

اسکولوں کے مقابلہ جاتی ماحول میں قارئین کے کلب کے لئے کچھ فنڈ کا اہتمام بہت مفید ثابت ہوگا۔ ان فنڈز کا استعمال کتابیں پڑھنے کے ایسے مقابلوں اور کتابوں کے بارے میں ایسے کوئز وغیرہ کا اہتمام کرنے کے سلسلے میں کیا جا سکتا ہے جن میں کتابوں کی شکل میں یا کتابوں کے کوپن کی شکل میں انعام دیئے جائیں۔

ملک کے مختلف اضلاع میں تمام ۲۶۱ نوودیہ ودیالیوں میں قارئین کے کلب قائم کئے

گئے ہیں۔ کتب ہفتے کے دوران نوودیہ ودیالیوں میں قائم قارئین کے کلب ہر اس علاقے میں قارئین کا ایک کلب قائم کریں گے جہاں یہ اسکول واقع ہیں نوودیہ ودیالیوں میں قائم قارئین کے کلبوں اور عوام کے لئے قائم قارئین کے کلبوں کے درمیان یہ تال میل پورے برس محض پڑھنے کے لئے کتابیں دینے تک ہی محدود نہیں رہے گا بلکہ ان لوگوں کے لئے کتابیں پڑھنے کے سلسلے میں طلبار کی خدمات فراہم کرنے کے لئے بھی ہوگا جو خود نہیں پڑھ سکتے۔ علاوہ ازیں نوودیہ ودیالیئے طلبا اور شاعروں کے ذریعہ کوئی سمیلنوں، طلبار کے مسودات کی نمائش جیسی سرگرمیوں کا اہتمام بھی کریں گے۔

اس سال دہلی میں ایک تجرباتی پروجیکٹ شروع کیا گیا تھا ان اسکولوں کے پرنسپلوں اور اساتذہ کے لئے ماہ مئی میں سہ روزہ تربیتی پروگرام کا اہتمام کیا گیا تھا گزشتہ دو ماہ کے اندر قارئین کے کلبوں کی کارکردگی توقع سے کہیں زیادہ رہی ہے۔ جن اسکولوں میں جگہ کی شدید کمی تھی اور جن کے اسٹور اس سے پہلے دھول مٹی سے اٹے رہتے تھے ان کو اب دلکش کتاب گھروں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔

گزشتہ برس اسکولوں، یونیورسٹیوں اور لائبریریوں میں کتابوں سے متعلق متعدد پروگرام اور مختلف سرگرمیاں منعقد کی گئیں تھیں جن کا اہتمام ساہتیہ اکیڈمی، پبلی کیشن ڈویژن مصنفین کی بھارتی سوسائٹی، ادیبوں کی انجمن جیسی تنظیموں نے کیا تھا کیرالہ شاستر ساہتیہ پریشد نے کیرالا کے اسکولوں میں قارئین کے ... کلب قائم کرنے کی ایک اسکیم شروع کی ہے تعلیم بالغاں کے لئے ریاستی وسائل مراکز نے قومی کتب ہفتے کے دوران جن سرگرمیوں کا اہتمام کیا ہے ان میں ان مراکز کی تیار کردہ کتابوں کی نمائش نیز مصنفین اور ناشروں کے لئے ورکشاپ کا اہتمام کرنا شامل ہے تاکہ وہ نوخواندہ اور درمیان میں ہی اسکولی تعلیم چھوڑ دینے والے طلبار کے لئے مزید کتابیں تیار کریں۔ یہ محض ان سرگرمیوں کا ایک نمائندہ حصہ ہے جس کو کتب ہفتے کے دوران عمل میں آنے کی توقع ہے توقع ہے کہ اور بھی بہت سے پروگراموں کا اہتمام کیا جائے گا اور کتب ہفتہ کا پیدا کردہ جوش و خروش ملک بھر میں پھیلے گا

پروفیسر رشید الدین خاںؔ

مشترکہ تہذیب کی تشکیل میں صوفیوں کا حصّہ

تاریخی اعتبار سے ہندوستان مختلف ثقافتوں، نسلوں اور مذاہب کے باہمی تال میل کے عظیم ترین عمل کا مرکز اور سیکولر طرزِ فکر، زبانوں اور بولیوں کے باہمی ربط اور جذبۂ باہمی کا گہوارہ رہا ہے۔

بہت عرصہ پہلے وسطیٰ، جنوب وسطیٰ اور شمال مشرقی ایشیا کی بعض نسلیں شمالی ہند یا دوآبہ گنگا و جمنا کے میدانوں میں آ کر بس گئیں اور دکن تک بھی پہنچ گئیں جہاں اب تک کی معلومات کے مطابق سب سے قدیم ہندوستانی آباد تھے اس عمل نے انسانی تاریخ میں نسلوں اور تہذیبوں کے باہمی ربط کا سب سے بڑا نظارہ پیش کیا۔

مسلمانوں کے ازبیک، ترکمانی ترک، ایرانی، تورانی افغان اور پٹھان قبیلوں نے عہد وسطیٰ میں ہندوستان کو اپنا وطن بنایا۔ ان مختلف النوع نسلوں کے ساتھ ان کی زبانیں، ان کے عقائد و افکار، سماجی نظام اور اقدار بھی آئے۔ جنھوں نے ہندوستانی ثقافت اور یہاں کے سماج کی گوناگونی کو دوبالا کر دیا اور اس طرح سے آج یہ ملک کی کُل انسانی آبادی کے پانچویں حصے پر مشتمل ہے۔

ثقافتی نقطۂ نگاہ سے اس مخصوص ہندوستانی تہذیب پر دو اثرات بہت گہرے ہیں ایک قدیم ہند آریائی اور دوسرا عہدِ وسطیٰ ہند اسلامی اثر، ہند آریائی لوگوں نے ویدک تہذیب و ثقافت کو پروان چڑھایا جو صدیوں سے اس قدیم سرزمین میں کارفرما تھی۔

عنصر نے نئی ہندوستانی قوم کی تشکیل میں مشترکہ تہذیب کا نیا رنگ بھرا کیونکہ انھوں نے بھگتی کے راستے اسلامی تصوف کی روایتوں سے ایک نیا تانا بانا بُنا۔ ہندوستانی سماج کے طور طریقوں اور رسم و رواج کے ترک و ایرانی روایتوں سے باہمی ربط نے ایک نئی تہذیبی روایت کی بُنیاد ڈالی جس میں انسانی اقدار نے سماجی زندگی کے ایک اہم عنصر کی شکل اختیار کرلی۔

لہٰذا یہ چیز حیرت انگیز نہیں ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی تشکیل کا عمل باہمی رقابت یا چپقلش کے بجائے میل جول اور تعاون کے ماحول میں پروان چڑھا۔

ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا تشکیلی دور تاریخی اعتبار سے ۱۲ ویں سے ۱۶ ویں صدی کے درمیان کا ہے جب دوآبہ گنگ و جمن میں وہ عمل جاری تھا جو عربوں، ایرانیوں اور ہندوستانیوں نیز اسلام زرتشتیت اور ہندو مذہب میں میل ملاپ سے فروغ پارہا تھا۔

موٹے طور پر دیکھا جائے تو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب نے مندرجہ ذیل عناصر کے اثرات قبول کیئے۔

ویدانت کا نظریہ جو مختلف ملکوں کی سچائی کو پانے کے بہت سے ذرائع کے اثرات ... کیئے

بھگوت گیتا کا وہ فلسفہ جس میں انعام کی تمنّا کیئے بغیر فرض کی انجام دہی اور عمل کے ذریعہ ہی مکتی کے حصول پر زور دیا گیا ہے۔

بھگتی کی روایات جو کہ پیار کو زندگی کا مرکزی اصول تسلیم کرتی تھی اور جو خدا اور انسان سے محبت لو امن، خیرسگالی اور نجات کا ذریعہ جانتی ہیں۔

اسلام کے بُنیادی اُصول جو انسانی بھائی چارے اور انصاف کو سماجی اخلاقیات کا محرک مانتے ہیں جن میں غریبوں کی مدد، توحید اور خُدا کو رحمان و رحیم ماننا شامل تھا اور بندوں پر خُدا کی رحمت کو حق العباد کی تکمیل سمجھا جاتا تھا۔

مختلف مُسلم صوفی سلسلوں کا پیغام یہ صوفی عوام میں بہت مقبول ہوئے۔ انہوں نے انسانی بھائی چارے پر زور دیا اور مسلمانوں کے ظلم کی مخالفت کی نیز اس کی خانقاہوں نے غریب و نادار لوگوں کو پناہ دی۔

۱۲ویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں خواجہ معین الدین حسن چشتی (۱۲۳۶ء ۱۱۴۲ء) نے پہلے صوفی سلسلے کی بنیاد ڈالی۔ ان کی پیدائش سیستان میں ہوئی۔ اجمیر اور دہلی کے چوہان بادشاہ رائے پرتھوی راج کے عہد میں ۱۱۹۰ء میں وہ اپنے استاد خواجہ عثمان ہارونی کی ہدایت پر ہندوستان آئے۔ اپنی نوجوانی میں وہ بغداد میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی خانقاہ بھیجے گئے جو قادریہ سلسلے کے بانی تھے یہ صحیح ہے کہ ان سے پہلے بھی کچھ صوفی ہندوستان آئے تھے جن میں لاہور کے شیخ علی ہجویری بھی شامل تھے جنہیں عرف عام میں داتا گنج بخش کہا جاتا تھا۔ ان کے مقبرے میں خواجہ معین الدین چشتی نے عبادت و ریاضت میں کافی وقت گذارا تھا اور بعد میں ۱۱۹۷ء میں وہ اجمیر آگئے اور یہی سرزمین کو اپنی سرگرمی کا مرکز بنالیا۔

۱۰ویں صدی کے اواخر اور ۱۱ویں صدی کی ابتدا میں شمالی ہندوستان میں ملتان، لاہور، بدایوں، قنوج، ناگور وغیرہ شہروں میں صوفیوں کا پیغام فروغ پا رہا تھا۔ تاہم خواجہ اجمیری ہی سلطان الہند اور رسول اللہ فی الہند کا مرتبہ حاصل کر سکے۔ ان کی خاص کوشش یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خیرسگالی پیدا ہو اور توحید، امن اور سماجی اخوت کے پیغام سے سماجی نابرابریوں کا مقابلہ کر لیا جائے۔ ان کی پاکیزگی، سادگی اور دیانت کے سبب بلا تفریق مذہب و ملت بہت سے لوگ ان کے عقیدت مند ہوگئے۔

ابوالفضل نے آئین اکبری میں ۱۴ صوفی سلسلوں کا ذکر کیا ہے جو ۱۶ویں صدی تک ہندوستان میں سرگرم تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہتر نظم و نسق اور عقیدتمندوں کے اعتبار سے صرف ۲ سلسلے ہی زیادہ سرگرم اور باثر تھے۔ ان میں خواجہ اجمیری کے قائم کردہ چشتیہ سلسلے کے ماننے والے مسلمان اور ہندو سب سے زیادہ تھے (گو اس سلسلے کی بنیاد خواجہ ابو... نے ۹۶۶ء میں رکھی تھی) اس سلسلے نے نئی بھگتی تحریک پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اگلے تین سو برس میں ملک کے بیشتر حصوں میں پھیل گیا۔ عہد ولی سلطنت (۱۵۲۶ء) میں جو دوسرا سلسلہ سرگرم تھا وہ تھا سہروردیہ سلسلہ جس کا مرکز ملتان تھا ا...

حضرت شیخ بہاء الدین ذکریا نے رکھی تھی اس کے علاوہ فردوسی، قادریہ، شطاریہ اور نقشبندی سلسلے قابلِ ذکر ہیں۔

ممتاز چشتیہ سلسلے میں خواجہ اجمیری (متوفی ۱۲۳۶) کے بعد صوفیوں کی ایک بڑی تعداد تقریباً بیس برس تک موجود رہی جن کے اسمائے گرامی اب بھی باعثِ عقیدت ہیں اور ان کے گرد انسانی بھائی چارے کی مکمل تحریک کی بنیاد قائم ہوئی۔ یہ عوامی صوفی اپنے پیغام محبت، انسانیت کے تئیں رواداری اور ان سب کے علاوہ ظلم و استبداد سے مردانہ وار انکار لیے، سلطانوں کے زیرِ اقتدار مذہبی امور سے وابستہ عہدوں سے خود کو الگ رکھنے اور جاگیردار حکمرانوں اور متوسط درجے کے امراء کی طرزِ رہائش سے خود کو علاحدہ رکھنے کی وجہ سے عوام میں انتہائی مقبول ہوئے اور عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے گئے۔

خواجہ اجمیری کے اہم دلارثوں میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی (متوفی ۱۲۳۵) نے دہلی میں چشتیہ سلسلہ قائم کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورے مرکزی ایشیا کو منگولوں نے اپنے پے در پے حملوں سے زیر و زبر کر رکھا تھا اور ثقافتی زندگی کے بہت سے مراکز تباہ و برباد ہو چکے تھے اور چہار طرف سے علماء فنکاران اہلِ حرفہ دہلی میں جمع ہو رہے تھے جو تیرہویں صدی کے اواخر میں اسلامی تعلیمات کی ایک بڑی درس گاہ بن گئی تھی سلطان التمش (متوفی ۱۲۳۶) کو خواجہ صاحب سے اس درجہ عقیدت تھی کہ اس نے خواجہ صاحب کی یاد کو ہمیشہ قائم رکھنے کے لئے دہلی میں مشہور قطب مینار تعمیر کرایا۔ تاہم اس کے باوجود بھی اس جلیل القدر بزرگ نے سلطان کی جانب سے شیخ الاسلام کا عہدہ قبول کرنے کی پیش کش قبول نہیں کی۔ یہ وہی صوفی ہیں جنھوں نے اس وقت عالمِ وارفتگی میں انتقال کیا جب قوال نے یہ شعر پڑھا۔ ترجمہ:

"جو لوگ خدا کی رضا کے آگے اپنی ہستی فنا کر دیتے ہیں۔ انہیں ہر زمانے میں ملکِ عدم سے زندگی حاصل ہوتی ہے۔"

اس شعر اور ان بزرگ کے رول کو ذہن میں تازہ کرتے ہوئے ایک عجیب و غریب، پُراسرار یکسانیت سامنے آگئی ہے کہ ۱۹۴۷-۴۸ء میں تقسیمِ ہند کے ہنگاموں میں اپنے قتل

سے مشکل سے ایک ہفتے قبل یا نہیں بزرگ کے مزار پر حاضری دینے گئے تھے۔ اس سانحہ نے اس شعر کو ایک نئے معنی دیئے ہیں اور آج نئے سیکولر تناظر کے ماحول میں بھی یہ شعر گونجتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ گویا زبانِ حال سے یہ کہتا ہے کہ جو انسانیت کی خدمت کرتے ہوئے قتل ہو جاتے ہیں آنے والی نسلیں اُن کی احسان مند رہتی ہیں اور وہ لافانی ہو جاتے ہیں۔

حضرت خواجہ قطب کے نو وارث تھے جن میں سب سے مشہور بابا فرید الدین مسعود گنج شکر (۱۲۶۵ - ۱۱۷۵) تھے جو اجودھن میں جا بسے اور پھر پاک پٹن میں انتقال کیا۔

بابا فرید اپنے گرد بھیڑ بھاڑ اور عوام میں اپنی مقبولیت سے بچتے تھے اور گوشۂ تنہائی اور یادِ الٰہی میں ڈوبے رہنا پسند فرماتے تھے۔ انہوں نے اپنے مریدوں کو بڑی سختی سے تاکید کی تھی۔ خبردار بادشاہوں اور امراء کے ساتھ دوستی نہ بڑھاؤ کیونکہ آپ کے یہاں ان کی آمد روح تک کے لئے مہلک ہے اور جبکہ تاکید یہ جانتے ہوئے بھی کی تھی کہ سلطان بلبن (متوفی ۱۲۸۷) ان سے زبردست عقیدت رکھتا تھا۔ ان کی خانقاہ بشمول علماء کے ہندو یوگیوں اور غرباء و مساکین کی پناہ گاہ بن گئی تھی بھکتی تحریک کے سادھوؤں نے خصوصاً سنت کبیر اور گورونانک جو بعد ازاں بالترتیب کبیر پنتھی اور سکھ مذہب کے بانی ہوئے۔ ان سے بڑا گہرا اثر قبول کیا۔ نانک پر تو ان کا اثر اس قدر گہرا تھا کہ بابا فرید کے اشلوک سکھوں کی مقدس کتاب گرو گرنتھ صاحب میں شامل کئے گئے ہیں اور گوردواروں میں گزشتہ پانچ سو برسوں سے پڑھے جاتے ہیں۔ بابا فرید کو تصوف کا اوّلین پنجابی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے انہوں نے پنجابی اور دیگر مقامی بولیوں کے علاوہ فارسی، عربی میں بھی لکھا ہے۔

دہلی کے شیخ نظام الدین اولیاء (۱۳۲۵ - ۱۲۳۶) لوگ جن کے بڑے مداح ہیں۔ بدایوں میں پیدا ہوئے اور اجودھن میں اپنے استاد کے ساتھ کچھ برس گزارنے کے بعد دہلی واپس آگئے اور تقریباً ۶۰ برسوں کی مدت تک مطلع روحانیت کو جگمگاتے رہے۔ بہت سے لوگ انہیں بھارت کا عظیم ترین صوفی تسلیم کرتے ہیں جنہوں نے شاہی خاندانوں اور سات سلطانوں کا عروج و زوال دیکھا اور کبھی کسی دربار میں حاضری نہیں دی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ

ایسا طرزِ عمل صوفیوں کو زیب نہیں دیتا۔ تاہم وہ صوفیانہ رجحان کے علمبردار امیر خسرو کو بہت پسند کرتے تھے جو بہت ذہین تھے اور رات کو حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں اُن کے مریدوں میں اور دن میں سلطانوں اور امراء کے ساتھ اپنے وقت گزارا کرتے تھے۔

شیخ نظام الدین کے آزادانہ خیالات اور رواداری دقیانوسی مولویوں کو تو پسند نہیں تھی تاہم اِن کی رواداری نے اُن کے پیغام کو ملک گیر شہرت عطا کرنے اور پھیلانے میں بہت مدد دی اور انہیں مقبولِ عام لقب ' محبوبِ الٰہی (اللہ کا چہیتا) کے نام سے جانا جانے لگا۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیاء کے پیروکار ملک بھر میں پھیل گئے ایک ہانسی گئے ' دوسرے گلبرگہ ' تیسرے بنگال اور دو دہلی میں ہی سکونت پذیر رہے۔ ان میں سے شیخ نصیر الدین محمود متوفی ۱۳۵۶) جنھیں بعد ازاں چراغِ دہلی (دہلی کا چراغ) کے نام سے جانا گیا بڑے کراماتی بزرگ تھے۔

چراغ دہلیؒ کے انتقال کے ساتھ چشتیہ سلسلے کا پہلا دور ختم ہوتا ہے ان کے ایک وارث سید محمد گیسو درازؒ (متوفی ۱۴۲۲ء) تھے جو دکن میں کرناٹک ضلع کے شہر گلبرگہ میں سکونت پذیر ہوئے۔ اسی زمانے میں حسن گنگو بہمنی نے ۱۳۴۷ء میں بہمنی سلطنت قائم کی۔ حضرت سید گیسو درازؒ نے تصوف پر تیس سے زائد کتابیں لکھیں۔ غربا اور مساکین بیچاروں کا لگاؤ اور انسانی حقوق کی بقا کے لئے ان کی جد و جہد نے انہیں بندہ نوازؒ کے لقب سے سرفراز کرایا۔ وہ اردو کے قدیم ترین مصنفوں اور شاعروں میں سے ایک تھے اس زبان کے جو فارسی' ترکی اور عربی کے امتزاج سے تشکیل پائی ساتھ ہی اس میں بھارت کی کھڑی بولی برج' پنجابی جیسی بولیوں کا امتزاج بھی شامل ہوا اس کی بنیاد سنسکرت کے جملوں کے ڈھانچے پر ہوئی اور ان کا مشہور شعر جو تصوف اور عملی خیالات کا مظہر ہے اردو شاعری کا پہلا نمونہ ہے اس ابتدائی شعر کا مطلب ہے کفر کا فروں کو مرغوب ہے اور اسلام شیخ کو مگر ہم عاشقوں کو عشق اور ہمارے دلوں میں جو کچھ ہے جو صبر و قناعت اور جو ہم آہنگی ہے وہ ہمیں عزیز ہے۔

کے کے کھلر

عصمت چغتائی

ترقی پسند ادب کا ایک اہم ستون

اُردو افسانے کی تاریخ میں عصمت چغتائی ایک باب نہیں بلکہ ایک پورا عہد ہیں۔ ان کے انقلابی اور بے باک افسانوں نے ایک نئے ادبی رجحان کی بنیاد ڈالی۔ ان کا افسانہ "لحاف" اردو کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے ان کا ناول "ٹیڑھی لکیر" اردو ناول کے نگار خانے میں صفِ اول کی تصاویر میں شامل ہے ان کی فلم "گرم ہوا" ناقابلِ فراموش فلموں میں گنی جاتی ہے فلم "جنون" میں ان کا رول سب سے الگ تھا ترقی پسند تحریک میں وہ ایک ستارے کی طرح ادبی اُفق پر اُبھریں اور پچاس سال اس پر چھائی رہیں۔ انہوں نے ادب کی خدمت اور بے انصافی کے خلاف جد و جہد سے ایک ایسے سماج کا خواب دیکھا تھا جہاں نابرابری اور بربریت نہیں ہے انسان اور انسانی قدریں ہی تہذیب کا معیار ہیں جہاں عورت کا ایک اپنا مقام اور مرتبہ ہے جہاں نہ کوئی گھٹن ہے نہ تاریکی۔ ایک پڑھا لکھا، سیکھنے سکھانے والا تہذیب یافتہ معاشرہ جہاں ہر فرد سر اونچا کر کے چل سکے۔ ایسا ہندوستان جو فسادات اور فرقہ پرستی سے پاک ہو۔ ایک بہتر دُنیا۔ ایک تندرست اور خوبصورت دنیا۔ "فسادات اور ادب" میں عصمت لکھتی ہیں۔

"فسادات کا سیلاب اپنی پوری خباثتوں کے ساتھ آیا اور چلا گیا۔ مگر اپنے پیچھے زندہ مردہ اور سسکتی ہوئی لاشوں کے انبار چھوڑ گیا۔ ملک کے ہی دو ٹکڑے نہیں ہوئے جسموں اور ذہنوں کا بھی بٹوارہ ہو گیا۔ قدریں بکھر گئیں اور انسانیت کی دھجیاں اُڑ گئیں۔ گورنمنٹ

افسر، دفتروں کے کلرک مع میز کرسی، قلم دوات اور رجسٹروں کے مالِ غنیمت کی بانٹ دیئے گئے اور جو کچھ اس بٹوارے کے بعد بچے ان پر فسادات نے دستِ شفقت پھیر دیا۔ جن کے جسم سالم رہ گئے اُن کے دلوں کے حصے بخرے ہو گئے۔ ایک بھائی ہندوستان کے حصے میں آیا تو دوسرا پاکستان کے، ماں ہندوستان میں تو اولاد پاکستان میں۔ میاں ہندوستان میں تو بیوی پاکستان میں، خاندان کا شیرازہ بکھر گیا زندگی کے بندھن تار تار ہو گئے یہاں تک کہ بہت سے جسم تو ہندوستان میں رہ گئے اور روح پاکستان چلی گئی، فسادات اور آزادی کچھ اس طرح گڈ مڈ ہو کر وارد ہوئے کہ یہ قیاس لگانا دشوار ہو گیا کہ کون سی آزادی ہے؟ کون سا فساد؟ ہندا جس کے حصے میں آزادی آئی فساد آگے پیچھے لائی۔ ایک بار ہی طوفان کچھ اس طرح پے درپے وارد ہوا کہ لوگ بستر بوریا بھی نہ سمیٹ سکے۔ پھر جب ذرا ٹھنڈک پڑی تو جملہ حواس جمع کر کے چاروں طرف دیکھنے کا موقع ملا تو پھر ادب جس کا زندگی سے چولی دامن کا رشتہ ہے کہاں تک تر دامنی سے بچ سکتا تھا۔"

فسادات نے ترقی پسند ادب کو ایک نئی تحریک دی جس میں علی سردار جعفری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے نام نمایاں ہیں۔ اس ادب میں کرشن چندر کا "ہم وحشی ہیں" بھی ہے اور منٹو کے "سیاہ حاشیئے" بھی ___ مجروح جعفری اور جوشؔ کی شاعری بھی ہے اور بیدیؔ اور اشکؔ کے افسانے بھی۔ یہ نیا ادب فانی بھی تھا اور غیر فانی بھی ___ عصمت ایم اسلم کے "رقصِ ابلیس" اور رامانند ساگر کے "اور انسان مر گیا" کو ایک ہی زمرے میں رکھتی ہیں۔ ایم اسلم یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے گئے اس کی ذمہ داری ہندوؤں اور سکھوں پر ہے اور رامانند ساگر یہ سمجھتے ہیں کہ جو مظالم ہندوؤں اور سکھوں پر ڈھائے گئے اس کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہے۔ عصمت ان کو ہم خیال دیکھ کے بہت دکھی ہوتی ہیں اور لکھتی ہیں ـ

" ایم اسلم کے ہاں بھی ایک سکھ موجود ہے جو مسلمانوں کی جان بچانے کے لیئے اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے۔ رامانند ساگر کو بھی ایک مسلمان مولانا مل جاتے ہیں جو

یہ خدمت انجام دیتے ہیں۔"

بہرحال حقیقت یہ ہے کہ فسادات نے ایک ایسے ادب کو جنم دیا جو بالکل نیا تھا اس ادب کے بارے میں عصمت رقم طراز ہیں۔

" اب دیکھنا یہ ہے کہ اس میں کیا کچھ غیر فانی بنتا ہے اور کیا کچھ عطار کی دکان پر پڑیاں باندھنے کے کام آتا ہے یہ کہہ دینا یہ سب ہنگامی ادب ہے اور اس ہنگامے کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت اور مقبولیت ختم ہو جائے گی، غلط ہے۔ ہر زمانہ کا ادب ہنگامی ادب ہوتا ہے۔ مولانا حالی نے بھی وقتِ ہنگامہ جو کچھ لکھا وہ غیر فانی صورت اختیار کر چکا ہے۔ گورکی کی تحریر کبھی ماند نہ پڑیں گی۔ حالانکہ جس ہنگامہ کے سلسلے میں اس نے لکھا وہ اس کے ملک میں ختم ہو گیا۔ مگر اس کا ایک ایک حرف اب بھی لوگ سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ تمام جو غلامی کی کریہہ رسم پر لکھا گیا ہنگامی ہوتے ہوئے بھی لافانی بن گیا۔ اسپین کی بغاوت ختم ہو گئی لیکن FOR WHOM THE BILL TOUS کی عظمت قائم ہے لہذا وہ لوگ جو فسادات پر لکھے ہوئے ادب کو ہنگامی اور وقتی پروپگنڈہ کہہ کر اس کی وقعت کم کرنا چاہتے ہیں وہ زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو خود کچھ نہ لکھ سکے یا شاید اس ادب کو اپنے مطلب کے خلاف پا کر اسے گمنامی سے ڈرا کر میدان صاف کرنا چاہتے ہیں۔ ادب کی فنا اور بقاء، نفسِ مضمون اور ادیب کی صلاحیتوں پر منحصر ہے اس ادب کو وقتی ادب کہنا تنگ نظری کی دلیل ہے۔"

لحاف کے تعلق سے منٹو "گنجے فرشتے" میں لکھتا ہے

" اڈلفی چیمبرز کلیر روڈ کے 17 نمبر فلیٹ میں جہاں "مصور" ہفتہ وار کا دفتر تھا شاہد لطیفی اپنی بیوی کے ساتھ داخل ہوا یہ اگست ۱۹۴۲ء کی بات ہے تمام کانگریسی لیڈر مہاتما گاندھی سمیت گرفتار ہو چکے تھے اور شہر میں کافی

گڑبڑ تھی۔ فضا سیاسیات میں بسی ہوئی تھی۔ اس لئے کچھ دیر گفتگو کا موضوع تحریک آزادی رہا۔ اس کے بعد رُخ بدلا اور افسانوں کی باتیں شروع ہوئیں۔

ایک مہینہ پہلے جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا ادبِ لطیف میں عصمت کا "لحاف" شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے یاد ہے میں نے کرشن چندر سے کہا تھا " افسانہ بہت اچھا ہے لیکن آخری جملہ بہت غیر صناعانہ ہے۔ احمد ندیم کی جگہ اگر میں ایڈیٹر ہوتا تو اسے یقیناً حذف کر دیتا۔ چنانچہ جب افسانوں پر باتیں شروع ہوئیں تو میں نے عصمت سے کہا " آپ کا افسانہ لحاف مجھے بہت پسند آیا۔ بیان میں الفاظ کو بقدر کفایت استعمال کرنا آپ کی نمایاں خصوصیت رہی ہے لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس افسانے کے آخر میں آپ نے بیکار سا جملہ لکھ دیا کہ ایک انچ اٹھے ہوئے لحاف میں میں نے کیا دیکھا کوئی مجھے لاکھ روپے بھی دے تو میں کبھی نہیں بتاؤں گی "

عصمت نے کہا" ۔ کیا عیب ہے اس جملے میں ؟"

اس کے جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے عصمت کے چہرے پر وہی سمٹا ہوا حجاب نظر آیا جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہروں پر ناگفتنی شئے کا نام سن کر نمودار ہوا کرتا ہے مجھے سخت ناامیدی ہوئی اس لئے کہ میں " لحاف " کے تمام جزوسیات کے متعلق اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔"

" فحاشی کے الزام میں ایک بار ہم دونوں گرفتار ہوئے ۔ مجھے تو پہلے دو دفعہ تجربہ ہو چکا تھا لیکن عصمت کا پہلا موقعہ تھا اس لئے بہت بھنائی ۔ اتفاق سے گرفتاری غیر قانونی نکلی کیونکہ پنجاب پولیس نے ہمیں بغیر وارنٹ کے پکڑ لیا تھا۔ عصمت بہت خوش ہوئیں لیکن بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی آخر اسے لاہور کی عدالت میں حاضر ہونا ہی پڑا۔

بمبئی سے لاہور تک کافی لمبا سفر ہے لیکن شاہد اور میری بیوی ساتھ تھے سارا وقت خوب ہنگامہ رہا۔ صفیہ اور شاہد ایک طرف ہو گئے اور چڑانے کی خاطر ہم دونوں کی فحش نگاری پر حملے کرتے رہے۔ قید کی صعوبتوں کا نقشہ کھینچا۔ جیل کی زندگی کی جھلکیاں دکھائیں۔ عصمت نے آخر جھلا کر کہا "سولی پر بھی چڑھا دیں لیکن یہاں حلق سے انا الحق ہی نکلے گا۔" اس مقدمے کے سلسلے میں ہم دو دفعہ لاہور ہو گئے۔ دونوں مرتبہ کالجوں کے تماشائی طالب علم مجھے اور عصمت کو دیکھنے کے لیے ٹولیاں باندھ باندھ کر عدالت میں آتے رہے۔ عصمت نے مجھ سے کہا۔

"منٹو بھائی چودھری نذیر سے کہیے کہ ٹکٹ لگا دیں کہ یہاں آنے جانے کا کرایہ بھی نکل آئے گا۔"

ہم دو دفعہ لاہور گئے اور دو ہی دفعہ ہم دونوں نے کرپال شاپ سے مختلف ڈیزائنوں کے دس دس بارہ بارہ جوڑے سینڈلوں اور جوتیوں کے خریدے۔ بمبئی میں کسی نے عصمت سے پوچھا۔

"لاہور میں کیا آپ مقدمے کے سلسلے میں گئے تھے۔"؟

عصمت نے جواب دیا۔

"جی نہیں ـــ جوتے خریدنے گئے تھے۔"

منٹو کی موت کے بعد "نقوش" کے منٹو نمبر میں عصمت لحاف والے قصے کو یوں بیان کرتی ہیں۔

"کھانے کے بیچ گرما گرم مباحثہ چلتا رہا۔ گھوم پھر کر لحاف کے بخیئے ادھیڑنے لگتا، جو ان دنوں میری دکھتی رگ بنا ہوا تھا۔ میں نے بہت ٹالنا چاہا مگر وہ ڈھٹائی سے اڑا رہا اور اس کا ایک ایک تار گھسیٹ ڈالا۔ اسے بڑا دھکا لگا یہ سن کر مجھے "لحاف" لکھنے پر افسوس ہے۔ خوب جلی کٹی سنا ڈالیں اور مجھے نہایت بزدل اور کم نظر کہہ ڈالا۔ میں لحاف کو اپنا شاہکار ماننے کو تیار نہیں

تھی اور منٹو مصر تھا۔ تھوڑی دیر میں لحاف سے بھی بڑھ چڑھ کر ہم نے بحث کر ڈالی۔ نہایت کھل کر اور مجھے تعجب ہوا کہ منٹو گندی سے گندی اور بے ہودہ سے بے ہودہ بات دھڑلے سے اس معقولیت اور بھولپن سے کہہ جاتا ہے کہ ذرا جھجک محسوس نہیں ہوتی یا وہ مہلت دیتا ہی نہیں اس کی باتوں پر ہنسی آتی ہے گھن یا غصہ نہیں آتا۔ "آپ کو صفیہ (منٹو کی بیوی) سے بہت محبت ہے"۔ میں نے راز داری کے انداز میں پوچھا؟"

" محبت "وہ چیخ پڑا جیسے میں نے اسے گالی دی ہو۔ مجھے اس سے قطعی محبت نہیں اس نے کڑوا منہ بنا کر بڑی بڑی تیلیاں گھمائیں۔

" میں محبت کا قائل نہیں۔"

" ارے آپ نے کبھی کسی سے محبت ہی نہیں کی"۔ میں نے مصنوعی حیرت سے کہا

"نہیں"

اور آپ کو گلسوئے میں نہیں نکلے۔ خسرہ بھی نہیں ہوئی۔ مگر کالی کھانسی تو ضرور ہوئی ہوگی۔ وہ ہنس پڑا۔

آگے چل کر عصمت لکھتی ہیں۔

" میں اور منٹو اگر پانچ منٹ کے ارادے سے ملتے تو پانچ گھنٹے کا پروگرام ہو جاتا۔ منٹو سے بحث کر کے ایسا معلوم ہوتا جیسے ذہنی قوتوں پہ دھار رکھی جا رہی ہے۔ جالا صاف ہو رہا ہے۔ دماغ میں جھاڑو سی دی جا رہی ہے اور بعض اوقات بحثیں اتنی طویل ہو جاتیں کہ ایسا معلوم ہوتا بہت سے کچے سوت کی پونیاں اُلجھ گئی ہیں۔۔ اور منٹو بھنّا کر چلا جاتا۔۔۔

اور شاہد مجھ سے لڑتے کہ تم میرے دوستوں سے اتنی بدتمیزی سے کیوں باتیں کرتی ہو۔ منٹو آج خفا ہو کر گیا ہے اب وہ ہمارے ہاں نہیں آئے گا اور نہ میری ہمت ہے کہ میں اس کے ہاں جاؤں۔ وہ بدتمیز آدمی ہے کچھ کہہ بیٹھے گا

تو میری اس کی پرانی دوستی ختم ہو جائے گی اور مجھے بھی کبھی محسوس ہوتا کہ واقعی میں نے منٹو کو کڑوی بات کہہ دی ہے ممکن ہے روٹھ جائے اور ہماری اور صفیہ کی دوستی بھی ختم ہو جائے۔ جواب منٹو سے زیادہ گہری اور پائیدار ہو گئی تھی۔"

منٹو پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن عصمت کی تحریر میں دم ہے سچائی ہے۔ بے باکی ہے۔ سارے منٹو نمبر میں عصمت کا مضمون "میرا دوست میرا دشمن" سب سے انوکھا ہے۔

لاہور میں مقدمہ کے بارے میں عصمت لکھتی ہیں۔

"اسی زمانہ میں لاہور گورنمنٹ نے میرے اور منٹو پر مقدمہ چلا دیا۔ منٹو کی دیرینہ آرزو برآئی۔ لاہور میں بھی لطف آ گیا خوب دعوتیں اڑائیں اسی بہانے لاہور کی زیارت ہو گئی۔ زری کے جوتے خریدنے ہم دونوں ساتھ گئے۔ منٹو کے پیر بہت نازک اور سفید تھے جیسے کنول کے پھول۔ زری کے جوتے بہت جچنے لگے

"میرے پیر بڑے بھدے ہیں۔ میں نہیں خریدوں گی اتنے خوبصورت جوتے۔" میں نے کہا

"اور میرے پیر اتنے زنانے ہیں کہ مجھے ان سے شرم آتی ہے۔"

مگر ہم نے کئی جوڑے جوتے خریدے۔

"آپ کے پیر بہت خوبصورت ہیں" میں نے کہا

"بکواس ہیں میرے پیر" لائیے بدل لیں۔"

"بدلنا ہی ہے تو لائیے سر بدل لیں۔" میں نے رائے دی۔

"بخدا مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" منٹو نے جھک کر کہا۔

کسی نقاد نے کبھی یہ کہا تھا کہ عصمت اردو ادب کی جارج الیٹ ہے میرے خیال

یں عصمت چغتائی اُردو کی جارج ایلیٹ نہیں بلکہ صرف عصمت چغتائی ہے اگر ان کا مقابلہ کرنا ہی ہے تو امرتیا پریتم سے کیا جا سکتا ہے جنھوں نے پنجابی ادب میں کم و بیش وہی کام انجام دیا جو عصمت چغتائی نے اُردو ادب میں دیا۔ انہوں نے ان عورتوں کے بارے میں لکھا جن کی ساری زندگی آنگنوں اور دالانوں میں گزر جاتی ہے ان کا ناول "آنگن" اُردو افسانے میں سنگِ میل ہے "چھوٹی موتی" "چوتھی کا جوڑا" "سونے کا انڈا" "کچے دھاگے" "بہو بیٹیاں" "جڑیں" "یہ بچے" "لال چیونٹے" وہ کہانیاں ہیں جن سے ترقی پسند تحریک پروان چڑھی۔ عصمت کے افسانوں میں الفاظ دوڑتے ہیں۔ کہانی آگے ہے اور پڑھنے والا پیچھے۔ ویسے بھی عصمت نے کبھی کسی ایک افسانے پر ایک نشست سے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ "ٹیڑھی لکیر" ایک طویل ناول ہے لیکن عصمت نے زیادہ سے زیادہ اسے نو یا دس نشستوں میں ختم کر دیا۔ عصمت کے افسانوں میں آوازیں ہی آوازیں ہیں۔ وہ آوازیں بیگمات کی ہوں یا نوکرانیوں کی، مغلانی بی کی ہوں یا بھابی جان کی، بھکارنوں کی یا آیاؤں کی۔ ان عورتوں کی بھی آوازیں ہیں جنھوں نے ساری زندگی کسی مرد سے بات نہیں کی۔ "چھوئی موئی" میں لکھتی ہیں کہ "جب بھابی جان دو دفعہ حمل گرنے کے بعد تیسری دفعہ حاملہ ہوئیں تو فیصلہ یہ ہوا کہ زچگی علی گڑھ میں ہوگی۔ سارا کمپارٹمنٹ ریزرو کروایا گیا۔ گاؤ تکیے لگائے گئے۔ بھابی جان تعویذوں سے بسر یہ تھیں جسم پر تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ کئی ٹونے ٹوٹکے کئے گئے تھے۔ بھیڑ کو دیکھ کر دور سے ہی بھابی جان کو چکر آگیا۔ جوں ہی ریل رینگی ڈبہ کا دروازہ کھلا اور ایک کنواری گھسنے لگی۔ قلی نے بہتیرا گھسیٹا مگر وہ چلتی ریل کے پائیدان پر ڈھیٹ چھپکلی کی طرح لٹک گئی اور بی مغلانی کی "ہیں ہیں" کی پرواہ نہ کرتے اندر رینگ آئی اور غسل خانے کے دروازے سے پیٹھ لگا کر ہانپنے لگی۔

"لے ہے موئی تو بہ ہے"۔ بی مغلانی منمنائیں "ارے نگوڑی کیا پورے دن سے ہے؟" ہانپتی ہوئی بے دم عورت نے اپنے پپڑیاں جمے ہونٹوں کو بمشکل مسکراہٹ

میں پھیلایا اور اثبات میں سر ہلایا۔

پھر اس نے بچہ جنا۔ اس کا نال کاٹا اور اس کو چھاتی سے لگایا۔ گاڑی رکی
اس نے ڈبے کا دروازہ کھولا اور جیپر تولتی اتر گئی۔

"بھابی جان کی سسکیاں ایک متلم چیخ میں ابھر آئیں۔"

"ہے ہے مولا خیر تو ہے بیگم دلہن۔ بی مغلانی ان کا متغیر چہرہ دیکھ کر لرزیں۔
اور وہاں خیر غائب تھی۔

اور بھابی جان کے ہونق چہرے پر بھائی جان کی دوسری شادی کے تاشے نئے
خزاں برسانے لگے۔

"نئی روح دنیا میں قدم رکھتے جھجک گئی اور منہ بسور کر لوٹ گئی۔ میری پڑ
بھلاّ رانی نے جو طلسم ہوش ربا قسم کی زچگی دیکھی تو مارے ہیبت کے حمل گر گیا۔

عصمت چغتائی نے اردو ادب میں ان لاکھوں کروڑوں انسانوں خاص کر عو. ت
کے بارے میں لکھا جن کی زندگی ادھوری بلکہ ناکام ہے۔ وہ ایک ایسے سماج
تھیں جو مساوات پر مبنی ہو جہاں تھکن اور مایوسی صرف عورتوں کی وراثت
نے ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو بہتر بنانے کے لئے پچاس سال جد و جہد کی۔ مرنے
بعد بھی آج وہ اپنی تصنیفات میں اپنی جملہ بے باکیوں کے ساتھ زندہ ہیں اور ہمیشہ رہ"

شاداب
میں تبصرے کیلئے کتاب کی دو
جلدیں آنا ضروری ہے
تبصرہ نگار کی رائے سے ایڈیٹر
شاداب کا متفق ہونا ضروری نہیں
ہے

شاداب
اشاعت کیلئے تخلیقات کا طالب ہے
ادب
سب اشاعت ضروری نہیں ہے
تخلیقات کا صاف اور خوشخط ہونا
ضروری ہے

شاداب

جلد (۹) شمارہ (۳)

مارچ ۱۹۹۲ء حیدرآباد

فون : 229161 قیمت 6/= روپے

زرِ تعاون

ہندستان	65 روپے	۲ سال کیلئے 120 روپے	تاحیات 1500 روپے
بیرونی ممالک	200 "	360 "	3700 "
امریکہ	35 ڈالر "	70 ڈالر "	700 ڈالر
انگلستان	25 پونڈ "	45 پونڈ "	400 پونڈ
پاکستان	125 پاکستانی روپے "	300 پاکستانی روپے	3000 پاکستانی روپے

ترسیلِ زر کا پتہ : ماہنامہ 147-5-11 ریڈ ہلز۔ حیدرآباد 500004 ★ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری

نے ۔۔۔ لائن پرنٹنگ پریس گیٹ پیٹ۔۔ سے چھپوا کر دفترِ شاداب، ریڈ ہلز حیدرآباد سے جاری کیا

فہرست

سید احمد عروج قادری قسط (۱۸)

اسلامی تصوف

توبہ کی ترغیب اور اس کے فضائل

(گذشتہ سے آگے)

(۳) بندہ جب خلوصِ دل سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے اور بہت خوش ہوتا ہے اسی خوشی کی تمثیل نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی ہے:

" حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، تم میں کا کوئی شخص اپنے اونٹ پر سوار ایک چٹیل ریگستان سے گزر رہا تھا کہ کسی طرح اس کا اونٹ بھاگ گیا، اسی پر اس کا کھانا اور پانی سب کچھ تھا وہ اونٹ کی واپسی سے مایوس ہو کر ایک درخت کے سائے میں لیٹ گیا، وہ اسی حال میں تھا کہ اچانک اس نے دیکھا کہ اونٹ اس کے پاس کھڑا ہے پھر خوشی کی شدت میں اس کی زبان سے نکلا اے اللہ تو میرا بندہ ہے اور میں تیرا رب ہوں خوشی کی بدحواسی میں اس سے غلطی ہوئی کہنا کچھ چاہتا تھا اور زبان سے کچھ اور نکلا۔ اس شخص کو اپنے بھاگے ہوئے اونٹ کی واپسی سے جتنی خوشی ہوئی، اللہ کو اس سے زیادہ خوشی ہوئی ہے جب اس کا بندہ اس سے توبہ کرتا ہے (لہ)

توبہ کی حقیقت، یہی ہے اللہ سے بھاگا ہوا بندہ اپنے مالک کی طرف واپس آئے اور

لہ ریاض الصالحین بحوالہ بخاری و مسلم

گڑگڑا کر اس سے معافی مانگے۔"

(۴) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا "اللہ تعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے کہ دن کا خطاکار توبہ کرے اور وہ دن کو اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے کہ رات کا خطاکار توبہ کرے اور یہ اس وقت تک ہوتا رہے گا جب آفتاب مغرب سے طلوع کرے" (۱؎)

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ "ہاتھ پھیلانا" طلب توبہ کا کنایہ ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی بے نہایت شفقت کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے خطاکار بندوں کو معاف کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہے۔

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ (گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہیں) ۲؎ کھلی بات ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر ہی یہ فرمایا ہوگا۔ اس سے توبہ کی جو فضیلت ظاہر ہو رہی ہے اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

اَوْبہ و اِنابت

توبہ کے لیے قرآن مجید میں دو اور لفظ استعمال ہوئے ہیں اَوْبہ اور انابت۔

امام قشیریؒ نے اپنے رسالے میں ابوعلی دقاقؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ توبہ کی تین قسمیں ہیں۔ رجوع الی اللہ کا ابتدائی درجہ توبہ ہے اور انتہائی درجہ اوبہ ہے اور درمیانی درجے کا نام انابت ہے لیکن لغتِ عرب اور قرآن و حدیث میں یہ فرق موجود نہیں ہے [illegible] میں ہے۔

الاوب والاياب. والاوبة: الرجوع ـ وناب الى الله: تاب كاناب

۱؎ ریاض الصالحین بحوالہ بخاری و مسلم ۲؎ مشکوٰۃ

اس سے معلوم ہوا کہ یہ تینوں لفظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن میں جس طرح تُوبُوا إِلَى اللّٰهِ کہا گیا ہے اسی طرح سورۂ زمر رکوع ۶ میں وَأَنِيبُوا إِلَى رَبِّكُمْ (اور اپنے رب کی طرف رجوع کرو) فرمایا گیا ہے سورہ ص، رکوع ۲ میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں کہا گیا ہے فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ وَخَرَّ رَاكِعًا وَأَنَابَ (پھر وہ مغفرت چاہنے لگا اور گر پڑا جھک کر اور رجوع ہوا) سورہ ص ہی میں داؤد و سلیمان و ایوب علیہم السلام کو اَوَّاب (یعنی اللہ کی طرف بہت رجوع کرنے والا) کہا گیا ہے ایک دوسرے مقام پر فَإِنَّهُ كَانَ لِلْأَوَّابِينَ غَفُورًا (بنی اسرائیل ع ۳) (بے شک وہ رجوع کرنے والوں کو بخشتا ہے) فرمایا گیا ہے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ یہ تینوں لفظ ایک ہی معنی و مفہوم میں استعمال کیے گئے ہیں۔

شکست توبہ سے مایوس نہ ہونا چاہیئے: اوپر صحتِ توبہ کی چار شرطیں بیان کی گئی ہیں اگر کسی نے ان شرطوں کے مطابق کسی گناہ سے توبہ کی تو ان شاء اللہ اس کی توبہ قبول ہوگی اور وہ اپنی توبہ میں سچا سمجھا جائے گا لیکن شیطان اور نفس انسان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں اس لیے عین ممکن ہے کہ اس کی توبہ ٹوٹ جائے اور پھر اس گناہ کے علاوہ کسی دوسرے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے ایسی صورت میں اسے مایوس نہ ہونا چاہیئے بلکہ ازسرنو پھر توبہ کرنا چاہیئے امام قشیری ایسے شخص کے بارے میں لکھتے ہیں

فهو الموفق صدقا وان	اس کو سچی توبہ نصیب ہوئی تھی
نقض التوبة مرة	اگرچہ اس نے ایک بار یا چند بار
او مرات [1]	اسے توڑ ڈالا ہو۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کو پہلی ہی توبہ کے بعد استقامت حاصل ہو جائے، جس شخص

---

[1] الرسالۃ القشیریہ ج ۲ ص ۱۱۳

کے دل پر غفلت نے قبضہ نہیں کیا ہے وہ توبہ ٹوٹنے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ نادم ہو سکا
اور اس کا تحسر و تاسف اور اس کی دل شکستگی اسے پہلے سے زیادہ بلند مقام تک پہنچا
سچے دل سے استغفار اور گناہ پر اصرار دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے' بندۂ خدا کا ہر استغ
شیطان کے منہ پر ایک طمانچہ ہوتا ہے۔ بخاری و مسلم کی ایک حدیث کا ترجمہ ہم یہاں پیش کر

"حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں نے صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو فرماتے ہوئے
سنا کہ کسی بندے نے ایک گناہ کیا اور اس نے کہا۔ "اے میرے رب میں نے گناہ
کیا ہے تو مجھے بخش دے"۔ اس کے رب نے کہا۔ کیا میرے بندے کو یقین ہے
کہ اس کا ایک رب ہے جو گناہ بخشتا بھی ہے اور اس پر سزا بھی دیتا ہے۔ میں
نے اپنے بندے کو بخش دیا پھر وہ گناہ سے کچھ زمانے تک رکا رہا۔ اس کے بعد
اس نے پھر ایک گناہ کیا اور کہا "اے میرے رب میں نے گناہ کیا تو مجھے بخش دے"
اس کے رب نے کہا " کیا میرے بندے کو یقین ہے کہ اس کا ایک رب ہے جو
گناہ بخشتا بھی ہے اور اس پر سزا بھی دیتا ہے' میں نے اپنے بندے کو بخش
دیا" پھر کچھ زمانے تک وہ گناہ سے رکا رہا اور اس کے بعد اس سے پھر ایک
گناہ ہو گیا۔ تیسری بار بھی اس نے مغفرت چاہی اور اس کے رب نے اس کو
بخش دیا۔"

امام بخاری نے یہ حدیث کتاب التوحید میں اور امام مسلم نے کتاب التوبہ میں روا
کی ہے' میں نے بخاری کے الفاظ کا ترجمہ کیا ہے۔ اس حدیث میں " پھر وہ گناہ سے کچھ زما
تک رکا رہا۔" کا ٹکڑا اس بات کی دلیل ہے کہ اس نے ہر بار سچے دل سے توبہ کی لیکن اغ
شیطان یا غلبۂ نفس کی وجہ سے وہ بار بار کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا ہوتا رہا لیکن اس نے ا
کا دامن نہیں چھوڑا' ہر گناہ کے بعد وہ جو نکھارا اور اپنے مالک کی طرف پلٹتا رہا۔ بعض ا
میں صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ جس نے استغفار کیا اس نے گناہ پر اصرار نہیں کیا۔

مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ ؎

یہی مضمون ہے جسے شاعر نے اپنے اس شعر میں نظم کیا ہے۔

صد بار اگر توبہ شکستی باز آ		ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست

اور شاید یہی بات اقبال نے اپنے اس شعر میں کہی ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

لیکن یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ یہاں اس توبہ و استغفار کا ذکر نہیں ہو رہا ہے جس کا تعلق صرف زبان سے ہوتا ہے اس طرح کی توبہ درحقیقت ایک مذاق ہے جو توبہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ امام قشیری نے بعض بزرگانِ دین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہمیں اپنی توبہ سے توبہ کرنا چاہیئے۔ نظیری نے کس قدر چبھتا ہوا شعر کہا ہے۔

توبہ برلب، سجدہ برکف، دل پُر از شوقِ گناہ
معصیت را خندہ می آید ز استغفارِ ما

یہاں سورۂ آلِ عمران رکوع ۱۴ کی دو آیتوں کا مطالعہ بھی کر لینا چاہیئے۔ اللہ کے متقی بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

"یہ لوگ جب کسی کھلی برائی کا ارتکاب یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہ بخشے اور یہ جانتے بوجھتے اپنے کیئے پر اصرار نہیں کرتے (۱۳۵)
یہ لوگ ہیں کہ ان کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کیا ہی خوب صلہ ہے کام کرنے والوں کے لیئے۔ (۱۳۶)

؎ مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی و ابوداؤد

آیت ۱۳۵ سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔

۱) اگر کبھی غلبۂ نفس یا اغوائے شیطان کے اثر سے کسی چھوٹے یا بڑے گناہ کا ارتکاب ہو جائے تو یہ چیز بندے کو متقین کے گروہ سے خارج نہیں کرتی، شرط صرف یہ ہے کہ وہ فوراً اس کی تلافی اور تدارک میں لگ جائے۔

۲) اللہ کے متقی بندے، دل سے خدا کے فرماں بردار اور اس کی اطاعت میں سرگرم ہیں اس لیے گناہ کا ارتکاب ہوتے ہی جو گنا ہو جاتے ہیں اور ندامت فوراً نفس خدا کی طرف رجوع کر دیتی ہے، وہ اپنے گناہوں کی دل سے معافی مانگتے ہیں اور پھر اللہ کی اطاعت میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ وہ جانتے بوجھتے اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔

۳) اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہ بخشے، اس ٹکڑے میں یہ تنبیہ ہے کہ انبیاء، اولیاء، ملائکہ، جنات اور ارواح غرض کوئی بھی نہیں جس کے ہاتھوں میں گناہوں کی معافی گناہ معاف کرنا، صرف اللہ کے اختیار میں ہے کسی کی سفارش کے بھروسے پر گناہ کیے چلے جانا ایک ایسی حماقت ہے جو انسان کو تباہ کر دیتی ہے۔

آیت ۱۳۶ میں متقی بندوں کا اجر بیان کیا گیا جس میں سب سے پہلی چیز مغفرت ہے

(باقی آئندہ)

سلسلہ صفحہ ۱۶

پسر رسول۔ عزیز سمجھتے ہیں لیکن حسد بھی کرتے ہیں　منافقین مجھے مستند بھی کرتے ہیں

شہباز ندیم ضیائی۔

فاصلوں کے درمیاں گزرا ہے عمروں کا سفر　زندگی تم بھی سمجھ پائے کہاں، میں بھی نہیں

ماجد دیوبندی۔

کیا بتاؤں کہ کیا لیا میں نے　تجھ سے تجھ کو چرا لیا میں نے

بدایونی۔ سیم و زر ہوں پاس تو شمس و قمر مل جائیں گے　تاج سر پہ ہو تو جھکنے والے سر مل جائیں گے

آخر میں ڈاکٹر سجاد سید نے پُر تکلف ضیافت کا اہتمام کیا اور اس طرح بارہ بجے شب بحسن و خوبی مشاعرے کا اختتام عمل میں آیا۔

ابوالمکارم غازی کمال الدین کریم نگری
۲-۱-۱۱ شاستری روڈ - کریم نگر ۵۰۵۰۰۱

تیسری قسط

نیند اور موت

قرآن اور سائینس کی روشنی میں

جناب قاری محمد عبدالباری صاحب " سورہ الانعام " کی مذکورہ آیت کا ترجمہ اور اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ترجمہ، " اور (دیکھو) وہی تو ہے جو رات میں تم پر موت طاری کر دیتا ہے (یعنی سُلا دیتا ہے) اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو وہ اُس کو جانتا ہے پھر دن کے وقت تمھیں اُٹھ کھڑا کرتا ہے تاکہ مقررہ مدت پوری کر دی جائے۔ پھر تم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے، پھر اُس وقت وہ تم کو تمھارے عمل جو کچھ دُنیا میں کرتے رہے ایک ایک کر کے بتا دے گا۔"

تشریح، " اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ کی طرف توجہ دلائی ہے اور نیند کی حالت کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے تاکہ انسان اس پر غور کرے اور سمجھے کہ مرنے کے زندہ ہونے کا عقیدہ برحق ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ لوگو! تم مرنے کے بعد زندہ ہونے کے عقیدے پر تعجب کرتے ہو، حالانکہ تم روزانہ مرتے اور زندہ ہوتے ہو۔ دیکھو اللہ تعالیٰ ایسی قدرت والا ہے کہ ہر رات وہ تم پر ایک حالت طاری کر دیتا ہے جس سے تمھارے ہوش و حواس سب معطل ہو جاتے ہیں۔ غور کرو! کیا یہ حالت موت سے ملتی جلتی نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو تم سوتے

کے سوتے رہ جاؤ۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ ابھی تم کو دن میں بہت کچھ کرنا ہے اس لیے تم کو دن میں اُٹھا کر کھڑا کر دیتا ہے، تاکہ تم اپنی زندگی کی مقررہ مدت پوری کر لو۔ پھر جب تمھاری عمر ختم ہو جائے گی تو وہ تم کو اپنے پاس بلائے گا۔ پھر قیامت کے دن تم کو اُٹھا کر کھڑا کرے گا تمھارے اعمال سے تم کو باخبر کرے گا اور تم کو ٹھیک ٹھیک بدلہ دے گا۔"

ابو داؤد اور ترمذی کی ایک حدیث ملاحظہ فرمائیے۔

"حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے اصحاب کو تعلیم دیتے [redacted] تم میں سے کسی کی صبح ہو تو اُسے (خُدا کے حضور میں) عرض کرنا چاہیئے:"

"اے اللہ تیری مدد سے ہم نے صبح کی اور تیری ہی مدد سے ہم نے شام کی اور تیری ہی مدد سے ہم زندہ ہیں اور تیرے ہی حکم کے تابع ہماری موت ہے اور تیری ہی طرف پہنچنا ہے۔"

اور اسی طرح جب وہ شام کرے تو (خُدا کے حضور میں) عرض کرے:

اے اللہ تیری ہی مدد سے ہم نے شام کی اور تیری ہی مدد سے ہم نے صبح کی اور تیری ہی مدد سے ہم زندہ ہیں اور تیرے ہی فیصلے کے تابع ہماری موت ہے اور تیرے ہی حضور میں پھر اُٹھ کر حاضر ہونا ہے۔"

"کلامِ نبوت" کے مرتب جناب محمد فاروق خاں صاحب نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

"انسانی زندگی میں صبح و شام کی آمد و رفت بڑی نعمت ہے یہ اوقات یہ یک رنگی زندگی کی اُکتاہٹ سے نجات دلاتی ہے۔ انسان کو خُدا کی اس عظیم نعمت کا احساس ہونا چاہیئے۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن کو اس حقیقت کی طرف بھی منتقل ہونا چاہیئے کہ صبح اور شام کی طرح ہماری زندگی کی صبح و شام بھی خُدا کے حکم کی تابع ہے۔ ایک دن ہمیں دُنیا سے رخصت ہونا ہے اور خُدا کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ کہنے کے لیئے تو یہ ایک چھوٹی سی دُعا ہے جسے صبح و شا

پڑھنے کی تعلیم نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے لیکن دیکھئے کس طرح زندگی کی حقیقتوں کو اس میں سمیٹ لیا گیا ہے زندگی کو صحیح رخ پر رکھنے کے لئے اس دعا کا ورد کیا کسی نسخۂ کیمیا سے کم ہے۔ یہی خصوصیت آپ کی تعلیم فرمائی ہوئی تمام دعاؤں میں پائی جاتی ہے۔"

بخاری رض اور مسلم رح کی ایک اور حدیث ہے۔

"حضرت حذیفہ رض کا بیان ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم جب رات کو اپنے بستر پر جاتے تو اپنا ہاتھ رخسار کے نیچے رکھ لیتے، پھر فرماتے:"

اے اللہ! تیرے ہی نام کے ساتھ میری زندگی بھی وابستہ ہے اور موت بھی۔

اور جب سو کر اٹھتے تو عرض کرتے:

حمد و ستائش اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہم پر موت طاری کرنے کے بعد ہمیں زندگی دی اور اسی کی طرف (مرنے کے بعد) دوبارہ اٹھ کر حاضر ہونا ہے:

جناب محمد فاروق خاں صاحب اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یعنی جس طرح اللہ ہمیں خواب سے بیدار کرتا ہے، اسی طرح وہ ہمیں موت کے بعد بھی دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔ آخر کار ہمیں اس کے سامنے اپنے کارنامۂ زندگی کے ساتھ حاضر ہونا ہے چونکہ نیند بڑی حد تک موت سے مشابہ ہے اس لئے اسے موت کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے:"

نیند خدا کی عطا کی ہوئی ایک نعمت عظیم ہے یہ انسان کی اہم ضرورت ہے ہر روز چوبیس گھنٹوں میں چار تا آٹھ گھنٹوں کی نیند سے انسانی صحت برقرار رہتی ہے۔ انسان خود کو چاق و چوبند محسوس کرتا ہے نیند کی آمد عموماً انسان کی مرضی و صوابدید پر منحصر ہے وہ جب چاہے سو سکتا ہے اور جب چاہے بیدار ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھار کام کی زیادتی یا تھکاوٹ کی وجہ سے بغیر اپنی مرضی کے بھی انسان نیند کا شکار ہو جاتا ہے اگر کسی وجہ سے بیماری، کاری زخم ذہنی انتشار، تفکرات یا پریشانیوں کے باعث وہ از خود سو نہیں سکتا تو خواب آور دوائیں

اور گولیوں کا استعمال کرکے نیند کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے

انسانی جسم میں اعصابی نظام کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے جسم کے اندرونی نظام میں اعصاب ایک کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ انہی کے تحت جسم کے اعضاء کی حرکات و سکنات اور افعال وابستہ ہیں خواب آور دواؤں کے ذریعے اعصابی نظام کو کنٹرول کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے انسان سو سکتا ہے نیند کے علاوہ تین اور حالتیں غنودگی، مدہوشی اور بے ہوشی یا غشی ایسی ہیں جن سے انسانی جسم کو آرام و سکون ملتا ہے یا ان سے انسان کو راحت محسوس ہوتی ہے

انسان جب زیادہ کام کرکے تھک جاتا ہے تو اسے آرام کی ضرورت ہوتی ہے بالخصوص نیند سے یہ تھکن دور ہو جاتی ہے مگر کبھی کبھی بہ حالت مجبوری انسان اس وقت سو نہیں سکتا یا اسے سونے کا موقع فراہم نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود اس پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ اونگھنے لگتا ہے، اسی حالت کو غنودگی کہتے ہیں۔ یہ حالت تھوڑے سے وقفے کے لیئے ہوتی ہے اور کبھی کبھی یہ حالت انسان کے بس سے باہر بھی ہوسکتی ہے۔

مختلف پریشانیوں اور تفکرات میں گھر جانے کی وجہ سے بعض افراد کی نیند غائب ہو جاتی ہے وہ خواب آور دوائیں استعمال کرنے کی بجائے نشہ آور اشیاء کا استعمال کرکے آرام و سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو مئے خواری یا نشہ آور اشیاء کے استعمال کے عادی ہو جاتے ہیں، ان کے استعمال کے بغیر سو نہیں سکتے، یہ حالت مدہوشی کی ہے شدید بیماری، کسی خطرناک حادثے یا ماحول کے دباؤ کے بڑھ جانے سے انسان کا اعصابی نظام معطل ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں انسان اپنی سدھ بدھ کھو دیتا ہے اس پر بے ہوشی یا غشی طاری ہوتی ہے بعض صورتوں میں یہ حالت طویل عرصے تک برقرار رہتی ہے اور جان لیوا بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ نیند، غنودگی، مدہوشی اور بے ہوشی یا غشی، ان چار حالتوں میں بھی جسم کا اندرونی نظام ٹھیک طور پر کام کرتا رہتا ہے۔

جناب محمد عبدالباری صاحب فاروقی ایڈوکیٹ کریم نگر، جنھوں نے نیند اور موت پر فنی تحقیق کی ہے اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان "خواب" ہے رقم طراز ہیں۔

"نیند اپنی ایک دُنیا رکھتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دُنیا کے ہنگاموں سے دُور ایک اور آبادی ہے جو تخیل کی حسین فضاؤں میں آباد ہے، جہاں کی ہر چیز پر ایک روپہلا دھندلکا بیدار رہتا ہے۔"

انھوں نے خواب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ "خواب انسانی زندگی کا ایک تجربہ ہے کہ انسان کی آنکھیں بند ہوتی ہیں لیکن وہ دیکھتا ہے، کان بند ہوتے ہیں لیکن وہ سنتا ہے۔ حواس سے چیزوں کو محسوس نہیں کر سکتا لیکن احساس حاصل کرتا اور حظ اٹھاتا ہے۔"

"وہ ایک عجیب آوازوں اور تصویروں کا عالم ہے جو کبھی خوفناک ہوتا ہے اور کبھی خوشگوار ہمارے سپنے خواب و خیال نہیں بلکہ شعور کی ایک دوسری دُنیا کے واقعات ہیں جو بیداری کے عالم میں ہم سے چھپے رہتے ہیں لیکن بالکل اسی طرح حقیقی ہیں، جس طرح بیداری کا عالم ہے۔"

"بیداری کے عالم میں شعور پر ایک احتساب رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ چھپی ہوئی یا دبی ہوئی خواہشیں جنھیں شعور کے باہر پھینک دیا گیا ہے حافظہ میں نہیں آنے پاتیں۔ لیکن نیند کے عالم میں جب شعور کی سدا بندیں ڈھیلی ہونے لگتی ہیں اور شعور کے دروازے پر بیٹھے ہوئے [illegible] اونگھنے لگتے ہیں تو تحت الشعور کی نفس میں چھپے ہوئے قیدی آنکھ بچا کر باہر نکلنے لگتے ہیں اور آزادانہ طور پر گھومنے پھرنے لگتے ہیں۔"

نیند کی حالت میں جسم کے اندرونی نظام میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، قلب کی حرکت نہیں رکتی خون گردش کرتا رہتا ہے ہاضمہ کا عمل جاری رہتا ہے آواز دینے پر سویا ہوا آدمی بیدار ہو جاتا ہے

نیند میں اُسے کوئی کیڑا وغیرہ کاٹ لے تو وہ تکلیف محسوس کر کے اٹھ بیٹھتا ہے۔ شدت کی گرمی ہو تو سوئے ہوئے آدمی کو پسینہ بھی آجاتا ہے سردی ناقابلِ برداشت ہو تو اس کی نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ سخت یا خوفناک آوازوں کی وجہ سے گہری نیند میں سویا ہوا آدمی بھی جاگ اٹھتا ہے نیند کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس سے نہ صرف جسم کو آرام ملتا ہے بلکہ اس سے دل و دماغ اور ذہن بھی سکون حاصل کرتے ہیں جو اشخاص جنون یا پاگل پن کا شکار ہو جاتے ہیں، اُن کے تعلق سے عموماً یہ بات کہی جاتی ہے کہ نیند جیسی نعمت سے محروم ہونے کی وجہ سے انھیں دماغی سکون میسر نہیں ہوتا، اس لیے ان پر دیوانگی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کسی انسان کا دماغ جب ماؤف ہو جاتا ہے تو وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اچھے بُرے کی تمیز تک نہیں کر سکتا۔ اُسے اخلاق و کردار کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔

موت کے تعلق سے ڈاکٹر صابر سنبھلی کہتے ہیں:

قرآنِ کریم ناطق ہے کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْت، گویا عالم میں جو ہے فنا ہونے کے لئے ہے اللہ باقی۔ باقی فانی۔ عالمِ آب و گل میں کتنے ہی حقائق ایسے ہیں جو ناقابلِ تردید ہیں ان کو ہم شب و روز دیکھتے ہیں مگر ان کی طرف سے ایسے بے پرواہ ہیں جیسے کچھ دیکھتے ہی نہیں۔ ایسے تمام حقائق میں سب سے زیادہ یقینی موت ہے۔ یہ سچ ہے کہ موت سے زیادہ یقینی دوسری شئے نہیں ہے ادیانِ عالم نے اس اٹل حقیقت کو تسلیم کیا ہے ہر خطے، ہر زمانے اور ہر طبقے کے حکماء، اطباء اور دانشور اس کے سامنے عاجز رہے ہیں۔ لاریب موت سے زیادہ یقینی کوئی شئے، کوئی حقیقت، کوئی عمل، کوئی فعل نہیں ہو سکتا۔ آپ اس بات پر جتنا غور کرتے جائیں گے یہ بات واضح تر ہوتی جائے گی۔"

"موت کا وقت اور مقام کسی کو معلوم نہیں، کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب اور کہاں مرے گا چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، صبح و شام، گھر سڑک، سفر حضر کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ انسان

لقمۂ اجل بن سکتا ہے اور اب تو موت کے نئے نئے طریقے سُننے میں آ تے ہیں' جن سے انسان آنِ واحد میں بغیر کسی پیشگی علامات کے راہی ملکِ عدم ہو جاتے ہیں۔"

موت ــــ جسم سے روح کے جُدا ہونے کا نام ہے سبھی جانتے ہیں کہ روح یا جان جسم کے کسی ایک عضو میں نہیں رہتی بلکہ اس کا عمل دخل جسم کے ہر حصے میں ہوتا ہے ساں حصوں، رگوں اور نسوں تک میں روح کارفرما رہتی ہے جن کو بغیر آلہ خوردبین کے انسان دیکھ بھی نہیں جاسکتا۔ ان سب سے کھینچ کھینچ کر جان کا نکلنا کتنا تکلیف دہ عمل ہے اس کا صحیح اندازہ تو اُسی شخص کو ہوگا جس پر یہ تکلیف گزری ہوگی مگر افسوس کہ اس مرحلے کے مرحلے کے گزرنے کے بعد وہ کسی کو کچھ بتانے کے قابل ہی نہیں رہتا۔"

"موت میں ایک عمل اور بھی ہوتا ہے اور وہ ہے سانس کا رُک جانا سانس کی آمد و شُد رک جانے میں جو تکلیف ہوتی ہے اس کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جن کو کبھی پانی میں ڈوب جانے یا کاربن ڈائی آکسائیڈ سے بھرے کمرے میں بند ہو جانے کا تجربہ رہا ہو۔ یہ موت کی ابتدائی منزل ہے اس کا اندازہ کرنے کے لئے آپ اپنی سانس کو روک کر دیکھئے' ناک اور مُنہ کو بند کر لینے کے باوجود آپ کی سانس کی آمد و شُد کا سلسلہ کانوں اور مساماتِ جلد سے جاری رہتا ہے مگر دم گھٹنے میں آپ کو کیسی تکلیف ہوتی ہے اس کا اندازہ تو کر ہی سکتے ہیں۔"

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ حضرت امام غزالیؒ کے مطابق موت کی تکلیف اتنی سخت ہوتی ہے کہ جیسے کسی کے جسم پر چار ہزار تلواریں ماری جائیں۔ بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت اس کے مثل ہے جیسے ایک حریر کے کپڑے کو خاردار جھاڑی میں ڈال کر اس بے دردی سے کھینچا جائے کہ وہ تار تار ہو جائے۔ یہ بھی منقول ہے کہ حضرت عیسٰی مسیح علیہ السلام نے جب اپنی اُمت کی مانگ پر کسی قبر سے ایک مردہ کو زندہ کیا تو اس نے خود کو ابنِ نوح بتایا۔ مگر کسی حکیم نے اس پر اعتراض کیا کہ اس کے بال تو کالے تھے تیرے سفید کیوں ہیں ؟ تب اس نے بتایا کہ یہ موت کی شدت تھی جس نے اس کے بالوں کو سیاہ سے سفید کر دیا ـــ"

اِن اقتباسات سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ روح کے جُدا ہوتے وقت انسان کو کافی تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے جبکہ نیند کے وقت انسان کو آرام و سکون نصیب ہوتا ہے۔ نیند میں انسان کے اندرونی جسم میں کسی قسم کا کوئی خلل واقع نہیں ہوتا۔ لیکن روح کے نکل جانے کے بعد انسانی جسم کے تمام اعضاء بے حس و بے حرکت ہو جاتے ہیں۔ نیند کا معاملہ انسان کے بس کا ہے اور موت کے معاملے میں انسان بے بس ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ نیند اور موت دراصل ایک ہی عمل کا حصہ ہیں بلکہ نیند اور موت تو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ قرآن کی سورت الزمر اور الانعام کی مذکورہ آیتوں میں خالقِ کائنات نے صرف اس عمل کی مثال دی ہے کہ انسان کو جیسے نیند سے بیدار کیا جاتا ہے اُسی طرح موت کے بعد پھر اُسے زندہ کیا جائے گا۔ (ختم شد)

ز: غرورِ حسن بکھر لے گا دامن آئے عشق ذرا خود دار تو ہو — خود زخم ہی درماں بن جائے لذت کشِ صد آزار تو ہو
نغماتِ طرب بکھریں نہ اگر اس سازِ طرب سے تب کہنا — تو آج تبسم ریز تو ہو تو آج تکلم بار تو ہو

آفاق دانش:
مجھے زندگی کا ہے آسرا مرے زخم بھرنے پہ آگئے — وہ جو چند ماہ میں چل بسیں وہی پیڑ ہم نے لگائے ہیں
مری شکل سے تو عیاں نہیں کہ ہے میرے دل میں ہجومِ غم — اُنھیں کس طرح یہ پتہ چلا مرے خواب کس نے چرائے ہیں

ساغر خیامی:
مفلسی کے شکار سوتے ہیں — ایک کمبل میں چار سوتے ہیں
کھینچ لے جائے پائجامہ نہ کہیں — سب کے سب ہوشیار سوتے ہیں

ڈاکٹر سجاد سید:
شکستہ پا ہوں تو پھر منزلوں کی چاہت کیا — ہوں پر بریدہ تو پرواز کی ضرورت کیا
مرا اصول ہے سازش بھی، بے ضمیری بھی — میں سرفراز ہوا ہوں تو اس میں حیرت کیا

ڈاکٹر خالد محمود:
تیرے ساتھ چلنے کی فرصت نہیں — ہماری نظر آزمائش ہوا
شکستہ سفینہ مسافر نڈھال — تلاطم، شبِ تار، بارش ہوا

باقی بصفحہ

مل نسیم الدین فریس
لے۔ ایم فل ریسرچ اسکالر

عملی تنقید
ایک مطالعہ

اردو لفظ تنقید عربی مادہ نَقَدُ سے مشتق ہے جس کے معنیٰ کھرے کھوٹے کو الگ رنا ہیں۔ عربی ادب میں قدامہ بن جعفر سے منسوب کتابیں نقد الشعر اور نقد النثر حض عیب چینی کے اصول پر اساس نہیں رکھتی ہیں بلکہ ان میں شعر فہمی اور نثر کے اصول وران کی قدر و قیمت کے معیار بھی بیان کیے گئے ہیں۔

عربی اور فارسی کی کتابوں میں تنقید کے لئے بعض دیگر الفاظ بھی مستعمل رہے ہیں مثلاً موازنہ (دو یا دو سے زائد شاعروں کے کلام کا تقابلی مطالعہ) محاکمہ (یعنی کسی نزاع کی صورت میں شاعروں کے مابین فیصلہ کرنا) اور تقریظ (کسی ادب پارے کی تعریف وتحسین) درحقیقت یہ الفاظ تنقید کے بعض خاص طریقوں کے نام ہیں تنقید کے قائم مقام نہیں۔ انگریزی کا لفظ CRITICISM یونانی لفظ KRIMEIN سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں TO JUDGE یا TO DISCERN ان بنیادی معنوں کے باوجود تنقید کی تعریفیں مختلف ہیں۔ تعریفوں کا یہ اختلاف دراصل تنقید کے طریقۂ کار، شرائط۔ مقصد اور نظریہ ادب کا اختلاف ہے ویبسٹر کی "نیو انٹرنیشنل" میں تنقید کی

تعریف یہ دی گئی ہے ۔

"تنقید کامل بصیرت و علم کے ساتھ موزوں و مناسب طریقے سے کسی ادب پارے یا فن پارے کے معائب و محاسن کی قدر شناسی یا اس کے بارے میں حکم لگانا یا فیصلہ صادر کرنا ہے "۔

"نیو انگلش ڈکشنری" میں تنقید کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"کسی ادب پارے یا فن پارے کے خصائص اور ان کی نوعیت کا تعین کرنا ۔"

آئی ۔ اے رچرڈز کا خیال ہے کہ تنقید کا کام کسی مصنف کے کام کا تجزیہ، اس کی مدلل توضیح اور بالآخر اس کی جمالیاتی قدروں کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا ہے۔

ٹی۔ ایس ایلیٹ کی رائے میں ۔ تنقید فکر کا وہ شعبہ ہے جو یا تو یہ دریافت کرتا ہے شاعری کیا ہے ؟ اس کے فوائد و وظائف کیا ہیں ؟ یہ کن خواہشات کی تسکین کرتی ہے؟ شاعر شاعری کیوں کرتا ہے ؟ اور لوگ اسے کیوں پڑھتے ہیں؟ یا پھر یہ اندازہ لگاتا ہے کہ کوئی شاعری کیا نظم اچھی ہے یا بُری ہے۔

تنقید کے منصب کی وضاحت کرتے ہوئے آل احمد سرور لکھتے ہیں :

"تنقید کا کام فیصلہ ہے ۔ تنقید دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دیتی ہے۔ تنقید وضاحت ہے۔ صراحت ہے ۔ ترجمانی ہے تفسیر ہے۔ تشریح ہے ۔ تحلیل ہے ۔ تجزیہ ہے۔ تنقید قدریں متعین نہیں کرتی ہے اور زندگی کو ایک پیمانہ دیتی ہے۔ تنقید انصاف کرتی ہے ادنیٰ اور اعلیٰ اور جھوٹ اور سچ، پست و بلند کے معیار قائم کرتی ہے۔ تنقید ہر دور کی ابدیت اور ابدیت کی عصریت کی طرف اشارہ کرتی ہے ۔ تنقید ادب میں ایجاد کرنے اور محفوظ رکھنے دونوں کا کام انجام دیتی ہے وہ بت شکنی بھی کرتی ہے اور بت گری بھی۔ تنقید کے بغیر ادب ایک ایسا جنگل ہے جس

...ں پیدا وار کی کثرت ہے ۔ موزونیت اور قرینے کا پتہ نہیں.... ان میں سے کوئی ثابت
...ا نہیں ہے ۔"

...تنقید کے بارے میں ان تمام آرا پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں
...وہ مختصر جملہ جو ان سب خیالات کو ایک قدر مشترک کے ذریعہ جوڑتا بھی اور ان خیالات
...روح بھی اپنے اندر سموتے ہوتے ہے وہ یہ ہے کہ "تنقید کسی ادب پارے کا وہ مطالعہ
...جو ہمیں کسی نتیجے پر پہنچاتا ہے"۔ اس میں تشریح ۔ تجزیہ ۔ توضیح ۔ تصفیہ
...ماہ، تحسین ۔ تقابل ۔ تقدیر (قدر شناسی) ترتیب ۔ تدریج ۔ توسیع ۔ تحقیق اور
...ہمہ سا بست پہلو اور تمام زاویے شامل ہیں ۔

...نقطہ نظر کے اختلاف کی وجہ سے تنقید کے متعدد دبستان وجود میں آئے ہیں
...ان دبستانوں کا مختصر تعارف ذیل میں دیا جاتا ہے ۔

کلاسیکی تحریک } یہ ادب اور تنقید ادب کی قدیم ترین تحریک ہے ۔ اس تحریک کے نقوش قدیم یونان کی ادبیات میں ملتے

...ں یونان کے فلسفیوں اور شاعروں میں ہومر ۔ سقراط ۔ افلاطون اور ارسطو ...
...تب خیال کے اماملین گزرے ہیں جن کی تحریروں میں ہمیں راست یا بالواسطہ طور پر
...تنقید ادب کے رہنمایانہ اصول ملتے ہیں ۔ ان کے علاوہ ہوریس، لونجائنس اور ...
شاعر دانتے کے نام بھی قدما کی دوسری صف میں شامل ہیں ۔

کلاسیکی تحریک کا عہد ... فرانس میں لوئی چہاردہم کا عہد حکومت تھا اس دور
...ادیبوں اور نقادوں میں بوالو ۱۶۳۶ء تا ۱۷۱۱ء اہم اور سب سے بڑا کلاسیکی
ادیب و نقاد گزرا ہے ۔

بوالو کے علاوہ کلاسیکی تحریک کے علمبرداروں میں حسب ذیل ادیبوں کے نام بھی یوسف
حسین خان نے اپنی کتاب "فرانسیسی ادب کی تاریخ" میں گنائے ہیں ۔

مولیئر ۱۶۲۲ء تا ۱۶۸۳ء	راسین ۱۶۳۹ء تا ۱۶۹۹ء
لافونتین ۱۶۲۱ء تا ۱۶۹۵ء	بوسیوے ۱۶۲۷ء تا ۱۷۷۱ء
فینلون ۱۶۵۱ء تا ۱۷۱۵ء	لاروشفوکو ۱۶۱۳ء تا ۱۶۸۰ء
لابرویر ۱۶۴۵ء تا ۱۶۹۶ء	

سترھویں صدی عیسوی کے دوران فرانس میں کلاسیکیت کے یہ سرخیل وزعیم ادیب مشہور فلسفی ڈیکارٹ کے عقلی فلسفے سے بے حد متاثر تھے۔ ادب میں وہ جن اصولوں کے متبع وعلمبردار تھے وہ یہ ہیں۔

۱۔ ادب اور آرٹ میں صرف اس بات کا اظہار کیا جائے جو فطرت اور صداقت پر مبنی ہو۔ یعنی ادیب وہ بات کہے جو واقعیت اور حقیقت پر مبنی ہو اور جسے عقل حقیقت سمجھے۔

۲۔ ادب میں کوئی بات ایسی نہ ہو جو عام اخلاقی معیار کے خلاف ہو۔

۳۔ ادب دلکش اور مفید ہو

۴۔ ہیئت کے آداب کی پابندی کی جائے اور اسلوب فطری اور موزوں ہو۔

۵۔ ڈرامہ میں ارسطو کے پیش کردہ تین تصورات

وحدتِ زماں وحدتِ مکاں اور وحدتِ تاثر کی پابندی کی جائے

رومانی تحریک } کلاسیکی تحریک کی سخت بندشوں اور بے جا عقلیت پرستی کے ردِعمل میں رومانی تحریک نے جنم لیا۔ کلاسیکی اور رومانی تحریک کے درمیان دو اور چھوٹی چھوٹی ادبی تحریکیں ملتی ہیں جن کا ذکر شارب ردولوی نے اپنی تصنیف جدید اردو تنقید اصول ونظریات میں کیا ہے۔ ایک ہے نو کلاسیکی تحریک جس کا نمائندہ انگریز شاعر جان ڈرائڈن گزرا ہے۔ دوسری کلاسیکی حقیقت پسندی اور HUMANIST کی تحریک جس کا بانی جرمن ادیب ونقاد لیسنگ ہوا ہے:

رومانی تحریک کو فکری بنیادیں فرانسیسی فلسفی روسو کی تحریروں نے فراہم کیں۔ اس کے یہاں وہ سب عناصر موجود تھے جو بعد میں رومانیت کی خصوصیت سمجھے گئے۔ یعنی آزادی، انفرادیت پسندی، فطرت اور انسان سے محبت اور جذبے کی قدر افزائی۔

رومانویت کی مدلل حمایت اور فلسفیانہ پس منظر جرمنی میں ملتا ہے۔ ہیگل نے اس کو مادہ پر روح کی فتح بنایا ہے۔ تنقید کا یہ رجحان بہ یک وقت مختلف مقامات پر مختلف نظریات اور رجحانات کا حامل رہا ہے مثلاً جرمنی میں یہ تحریک فلسفیانہ تھی تو فرانس میں سیاسی اور انگلستان میں سماجی۔

فرانس میں رومانیت کے علمبردار ادیبوں اور نقادوں میں مادام دے اسٹیل ۱۷۶۶ء تا ۱۸۱۷ء، شاتو بریاں ۱۷۶۸ء تا ۱۸۴۸ء، لامرتین ۱۷۹۰ء تا ۱۸۶۹ء اور وکٹر ھیوگو ۱۸۰۲ء تا ۱۸۸۵ء اہم ہیں۔ رومانی تنقید کے کوئی خاص اصول نہیں تھے جو فن کاروں کی ہدایت اور رہنمائی کا کام کرتے۔ یہاں تنقید کا انحصار حسن اور جمالیاتی کیف پر تھا۔ رومانی نقادوں کے یہاں عام طور پر انداز بیان پر سب سے زیادہ زور ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ادبی تخلیق میں احساس، وجدان اور جذبے کی اہمیت کے علمبردار بھی ہیں اداسی اور کرب رومانی شاعروں اور ادیبوں کی زندگی اور شخصیت کا جزو بن گئی ہے غم پرستی اور جذباتیت کو رومانی ادیبوں اور شاعروں نے انتہا پسندی تک پہنچا دیا۔ وہ اپنی تصوریت اور ماورائیت کی وجہ سے ہمیشہ ایک اداسی اور کرب سینے میں چھپائے غم محبوب میں لطف لیتے رہتے ہیں۔

جمالیاتی تنقید } انیسویں صدی عیسوی میں تنقید میں بہت سے رجحانات نظر آتے ہیں مثلاً تاریخی تنقید، اخلاقی تنقید اور ٹیکنیکل تنقید وغیرہ۔ بہ حیثیت مجموعی یہ سب چھوٹے چھوٹے دبستان

سائنٹفک تنقید کے ضمن میں آتے ہیں۔ سائنٹفک تنقید کے اصولوں کی بنیا
ہی تنقید کی ایک نئی شاخ جمالیاتی تنقید بھی نکلتی ہے اس نے ادبی تخلیقات میں ج
اقدار پر زور دیا۔

جمالیات کا موضوع حسن اور فنونِ لطیفہ ہے۔ جمالیات کا فلسفیانہ تصو
سب سے پہلے جرمن فلسفی بام گارٹن BAUMGARTAIN نے پیش کیا اس کے ۲۵
ہیگل نے اس لفظ (جمالیات) کو فنونِ لطیفہ کے معنوں میں استعمال کیا۔
افلاطون نے علم کو خیر کہا اور خیر کو حسن قرار دیا۔ ارسطو کے نزدیک تخلیق میں ت
توازن اور توافق حسین ہے ڈیکارٹ کہتا ہے "حسن۔ تناسب پر
ہوتا ہے" برکلے بھی افلاطون کی طرح اخلاقی حسن سے بحث کرتا ہے ا
یہاں نیکی۔ دردمندی۔ اعتدال اور تناسب میں حسن ہے ڈیوڈ ہیوم کے خ
"حسن اشیاء میں ان کی ذات یا صفات میں نہیں بلکہ دیکھنے والے کے قلب میں ہوتا
کانٹ کے خیال میں "حسن حسی ادراک کی تکمیل کا نام ہے"۔ ہیگل کے نزد
تصور کا مادے میں اتر آنا ہی حسن ہے۔

دورِ حاضر میں جمالیات کو سب سے اہم نظریہ کروچے نے دیا ہے اس نے جمالیا
ایک نئی روح پھونک دی اور مابعد الطبیعاتی نظریئے اور فن کو جمالیات بنادیا
فلسفۂ اظہاریت EXPRESSIONISM کا بھی بانی ہے۔ کروچے کے نظریۂ جما
تحت حسن درحقیقت اظہار کا نام ہے عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ حسن ایک صفت ہے
یہ غلط ہے حسن اس کی نگاہ میں انسان کے تجربات ذہنی کی ایک صفت ہے جو
میں خوبصورتی دیکھتا ہے یہ صفت بنیادی طور پر اظہار کی ذہنی فعالیت ہے۔
حسن حظ انگیز ہے کیونکہ یہ ذات کا کامیاب اظہار ہے۔

ادب اور جمالیات میں بہت گہرا تعلق ہے کیونکہ ادب حسن کاری اور اظہا

کا بھی نام ہے۔ جمالیاتی تنقید میں فلسفۂ جمالیات کو ادب کے سمجھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جمالیاتی تنقید کا مقصد ادبی فن پاروں میں مسرت اور حسن کے اجزا تلاش کرنا ہے۔

تاثراتی تنقید جمالیاتی تنقید ہی سے ایک شاخ تاثراتی تنقید IMPRESSRONIOTIC CRITICISM کی بھی نکلتی ہے

تاثراتی تنقید اور جمالیاتی تنقید میں بہت کم فرق ہے اس لیے کہ جمالیاتی تنقید جن چیزوں کا مطالعہ کرتی ہے تاثراتی تنقید میں بھی انھیں کو اہمیت حاصل ہے لیکن دونوں میں ایک نازک اختلاف یہ ہے کہ جمالیاتی تنقید میں جب حد درجہ داخلیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ تاثراتی تنقید بن جاتی ہے۔

تاثراتی دبستان کے نقادوں میں والٹر پیٹر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے معقول نقادوں میں آسکر وائلڈ اور اسپنگارن بھی تاثراتی دبستان انتقاد کے اساطین ہیں۔ اسپنگارن جو امریکہ کا سب سے بڑا تاثراتی نقاد مانا جاتا ہے اپنی تاثراتی تنقید کو نئی تنقید یا تخلیقی تنقید کا بھی نام دیتا ہے کیونکہ اس میں تخلیق سے ذہنوں پر مرتب ہونے والے اثرات خود ایک نئی تخلیق کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

تاثراتی تنقید کی خصوصیات یہ ہیں کہ تنقید نگار صرف ان تاثرات کا اظہار کرتا ہے جو کوئی تخلیق اس کے دل و دماغ پر ثبت کرتی ہے۔ وہ صرف ان نقوش ہی کے پیش کر دینے کو معراج سمجھتا ہے جو کسی فن پارے نے اس کے ذہن پر مرتسم کیے یا سرور و مسرت کی ان لہروں کی تصویر کشی جو فنی تخلیق اس کے جذبات و احساسات میں پیدا کرتی ہے اس کی تنقید کا مقصد ہوتی ہے وہ فن کاروں کی زندگی، ورا س پر اثر انداز ہونے والے سماجی اثرات اور اس کے ماحول کا مطالعہ اس کے اقدار کا

تعین کرنے کے سلسلے میں نہیں کرتا ہے۔

مارکسی تنقید } تہذیب اور فن کے بارے میں مارکسزم کا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ مادی زندگی کا نظام پیداوار انسان کی سماجی سیاسی اور ذہنی کیفیات کا تعین کرتا ہے مارکسی تنقید کی ابتدا مارکس سے ہوتی ہے حالانکہ خاص طور پر ادب کے بارے میں اس نے بہت کم لکھا ہے لیکن اس کی نظریاتی بنیاد ادب اور سماج کے تعلق پر مبنی ہے۔ مارکس کے خیال میں ثقافت کے دوسرے شعبوں کی طرح ادب بھی جدلیاتی عمل اور تفاعل INTERACTION کے ذریعہ پیداوار کے رشتوں کو منسلک کرتا ہے اور ان کی اصلاح کرتا ہے۔

ادب کے بارے میں لینن کا خیال تھا کہ اس کو عام لوگوں کی زندگی سے متعلق حقیقت کا آئینہ دار اور ترقی پسند رجحانات کا ترجمان ہونا چاہیئے۔ اس لیئے کہ وہ سماجی ارتقا کے مطالعہ کا ایک ذریعہ اور معاشرے کی جدوجہد کا کامیاب ہتھیار ہے۔ مارکسی تنقید کے مطابق فن کار کی تخلیق اسی روایت اور اسی سماجی ماحول سے پیدا ہوتی ہے جو انہیں ورثے میں ملتے ہیں اور جن میں ان کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے وہ مسائل فن کاروں اور ادیبوں کو بھی درپیش ہوتے ہیں جو ایک خاص عہد یا موقعہ پر کسی قوم یا طبقے کو عام طور پر پیش ہوتے ہیں اگر کسی قوم میں یا قوم کے بڑے حصے میں بھوک غربت، افلاس یا جہالت پھیلی ہو یا اس کو دوسری قوم نے غلام بنا لیا ہے یا اگر وہ قوم جاہلیت، لوٹ اور غارت گری کا شکار ہو یا بڑے پیمانے پر ہلاکت کا خطرہ درپیش ہو تو ظاہر ہے اس قوم کے ادیبوں پر بھی ان کیفیات کا اثر پڑے گا اور ان کے فن میں بھی اس کی جھلک ہوگی۔

اس طرح یہ ثابت کیا گیا کہ فن کار اپنے طبقے اور اپنے زمانے کا عکاس ہوتا ہے لہذا ادب کو اس کے زمانے کے سماجی، سیاسی اور مادی پس منظر میں جدلیاتی مادیت

اور طبقاتی کشمکش کے شعور کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے مارکسزم کی رو سے اچھا آرٹ وہ ہے جو صداقت کے ساتھ حقیقت کی واضح عکاسی کرے۔

مارکس اور اینگلز کے بعد مارکسی تنقید کے بڑے علمبرداروں میں پلیخنوف PLEKHANOV کرسٹوفر کاڈویل۔ ایلیک ویسٹ، جارج تھامسن اور لوکاس وغیرہ ہیں۔

نفسیاتی تنقید

ادبی اقدار کے تحلیل و تجزیہ میں نفسیاتی تنقید نے ایک نیا شعور انتقاد عطا کیا ہے نفسیاتی تنقید یہ بتلاتی ہے کہ ادبی تخلیق کے پیچھے ایسے شخصی اور اجتماعی محرکات کی ایک وسیع دنیا کارفرما ہوتی ہے جو نوعیت کے اعتبار سے غیر شعوری ہوتے ہیں انہی محرکات و عوامل کی تفہیم ادب کو معنوی حسن اور تاثیر بخشتی ہے نفسیاتی تنقید کے زیر اثر بعض عالمگیر عوامل مثلاً جنس بعض نفسیاتی الجھنیں مثلاً ایڈی پس کامپلکس، احساس کمتری، بعض نفسیاتی گمراہیاں ایذا پرستی یا ایذا دہی وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو ادب میں بالعموم ظاہر ہوتے ہیں۔ اس قسم کے محرکات فن کار کے ذہن میں جو تصویر اختیار کر لیتے ہیں فنی تخلیق اسی تصویر کا داخلی عکس ہوتی ہے اس لیئے تفہیم ادب میں بھی ادیب کے شخصی میلانات، نفسیاتی رجحانات اور مخصوص الجھنوں کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے چنانچہ ادبی تنقید میں تحلیل نفسی کے اصولوں سے کام لینا پڑتا ہے۔

تحلیل نفسی کا بانی فرائڈ ہے اور اس کو وسعت دے کر انسانی معاشرے کے بعض دوسرے پہلوؤں پر حاوی کرنے میں اس کے دو شاگرد اور معاصر ماہرین نفسیات ایڈلر اور یونگ شامل ہیں۔ یونگ نے اجتماعی لاشعور ARCH AE TYPE کا تصور دیا جس میں اس کے خیال کے مطابق انسانیت کے تمام تاریخی تجربات کا حاصل موجود و محفوظ ہوتا ہے اجتماعی لاشعور ARCH AE TYPE کو سمجھنے کا ذریعہ "واہمہ" ہے جس کا اظہار اساطیر

اور پرانی مذہبی روایات میں ملتا ہے فنی تخلیقات میں انفرادی لاشعور کے ساتھ اس اجتماعی لاشعور کی بھی کارفرمائی ہوتی ہے۔

فرائڈ نے انسانی ذہن کو دو طبقوں میں تقسیم کیا اور ایک کو شعور اور دوسرے کو لاشعور کا نام دیا۔ ان دونوں کے درمیان ایک عبوری طبقہ بھی متعین کیا اور اسے تحت الشعور کا نام دیا۔ وہ خواہشات یا نفسی تحریکات جنھیں شعوری سطح پر بعض مروجہ اقدار کی بناء پر ہم قبول نہیں کر سکتے لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہیں۔ یہ خواہشات بالعموم وحشیانہ، غیر مہذب یا شدید طور پر جذباتی اور بے حد خود غرض انداز کی ہوتی ہیں یہ ہر وقت اپنی تسکین کی جستجو میں لگی رہتی ہیں اور ان کی نوعیت جنسی ہوتی ہیں یہ مسلسل شعوری سطح تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتی ہیں لیکن مروجہ اقدار کا شعور و احساس جسے فرائڈ پولیس کانسٹبل سے تشبیہ دیتا ہے انھیں اوپر آنے سے مسلسل روکتا رہتا ہے چنانچہ یہ خواہشات بھیس بدل کر اور بعض نئے عوامل یا مظاہر کے روپ دھار کر ایک ارتفاعی صورت ہی میں سطح پر ظاہر ہو سکتی ہیں یہ ارتفاع یا ترفع ظاہری طور پر اس غیر شعوری خواہش کو اس حد تک بدل دیتا ہے اور اسے بعض ایسے مظاہر سے منسلک کر دیتا ہے کہ اُس کی پہچان ناممکن ہو جاتی ہے۔ فنی تخلیقات میں خواہشات کے اسی ترفع کی کارفرمائی ہوتی ہے فرائڈ کے خیال میں جو خواہشات مسلسل کچلی جاتی ہیں اور ترفع کے ذریعہ اظہار پر قادر نہیں ہو سکیں وہ گھٹ کر نفسیاتی امراض کی شکل اختیار کر لیتی ہیں مثلاً ہسٹریا۔ اعصاب زدگی وغیرہ۔

(باقی آئندہ)

عملی تنقید تصور اور چند نمونے پیش کیے۔

رچرڈز نے ایک اچھے نقاد کی تین خصوصیات بتاتا ہے ایک یہ کہ اس میں کسی مخصوص تجربے تک پہنچنے کی صلاحیت ہو اور اس صلاحیت کو اس نے مشق سے سنوار لیا ہو۔ دوسرے یہ کہ اس میں کسی مختلف تجربات کے درمیان فرق کرنے کی صلاحیت ہو۔ تیسرے یہ کہ نقاد کے پاس مستقل فیصلہ کن اقدار ہوں جن کے حوالے سے وہ کسی نظم کے تجربے کو بیان کر سکے۔ رچرڈز نے اچھے نقاد کی جو خصوصیات گنائی ہیں وہی خصوصیات کسی نظم یا فن پارے کی عملی تحقیق کے اصول۔ طریقہ کار اور مقاصد کا بھی تعین کرتی ہیں۔

رچرڈز کے نظریے کے مطابق ایک نظم ایک تجربہ ہوتی ہے۔ یہ وہ تجربہ ہے جو صحیح قسم کے پڑھنے والے کو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ شعر پڑھتا اور ان پر غور کرتا ہے اس تجربے کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں چاہیئے کہ نظم کو آہستہ آہستہ لیکن بہتر ہے کہ با آواز بلند پڑھیں تاکہ ہر رکن کو اپنا اثر قائم کرنے کا وقت مل جائے پہلے اس نظم کو تجربے کے طور پر پڑھیں اور اپنی آواز کے لہجے کو بدل کر دوبارہ پڑھیں یہاں تک کہ ہمیں یقین ہو جائے کہ ہم نے اس کے وزن اور رنگ کو جس حد تک اپنی گرفت میں لے سکتے تھے پورے طور پر گرفت میں لے لیا ہے ہمیں چاہیئے کہ اس تجربہ کا تجزیہ جو ہمیں نظم پڑھنے سے حاصل ہوا ہم اس کی تہہ کے اندر اتر کر یں اس عمل میں پہلی چیز جو سامنے آئے گی وہ ذہن کے کانوں میں الفاظ کی آواز یا جھنکار ہے اور ساتھ ساتھ ان الفاظ کا احساس ہے جو خیالی طور پر ادا کیئے گئے ہیں یہ دونوں چیزیں مل کر الفاظ کو مکمل جسم عطا کرتی ہیں شاعر محض چھپا ہوئی علامتوں سے نہیں بلکہ الفاظ کے پورے جسم پورے وجود کی مدد ہی سے کام لیتا ہے۔

اس کے بعد دوسری چیز وہ مختلف تصویریں یا پیکر ہیں جو ذہن کی آنکھ میں

اُبھرتے ہیں۔ الفاظ کے نہیں بلکہ ان چیزوں کے جن کا اظہار الفاظ کر رہے ہیں۔ مثلاً وشت۔ دریا۔ مکان۔ دھوپ وغیرہ جب تک ہمارا ذہن الفاظ کی آواز یا چھنکار اور ان کے تمثالی پیکر کا تجربہ نہ کرے سے عملی تنقید کا عمل شروع نہیں ہو سکتا۔

اب ہم عملی تنقید کے ان رہنما یانہ اصولوں سے بحث کرتے ہیں جو مغرب میں رائج ہیں۔

WESTERN METHOD OF ANALYSIS

THEME موضوع مرکزی خیال (رچرڈز کا تصور)

JUNCTURE وقوعہ / محل وقوع

STRESS تصریح (زور + اہمیت)

TUNE آہنگ / ترنم (ناونتی کا تصور)

LEXISS لغات

TONE لہجہ

INTENTION مقصود / عندیہ

DICTION لفظیات / انتخابیت

A = WORDS الفاظ

1) EXTENSION وسعت

2) DEPTH عمق

3) TENSION تناؤ

4) SYNCHRONIC & DIACHRONIC زمانہ (وحدت یا عدم وحدت)

5) ECHO گونج / تھرتھراہٹ

VISUAL IMAGES & OTHER IMAGES (6 بصری پیکر / دیگر پیکر

SENTENCES جملے

ADJUSTABLITY ترتیب / دروبست

مغربی عملی تنقید کے ان رہنما اصولوں میں ہم دو اصولوں کا اضافہ کرتے ہیں۔

1) OSSOCIATION OF IDEES تنظیم خیالات

2) صنفی خصوصیات

مذکورالصدر اصولوں میں جن اصطلاحات پر نشان کوکب (★) لگایا گیا ہے وہ عملی تنقید کے ایک مکتب STRUCTURALIST AND STYLIST نقادوں کے اضافہ کردہ تصورات ہیں۔ ان نقادوں میں COX 4 DYSON نونتی۔ بیٹلے اور پریخت کے نام اہم ہیں۔ ذیل میں محولہ بالا اصطلاحات کی تشریح کی جاتی ہے

THEME : عملی تنقید میں یہ اصطلاح آئی۔ اے رچرڈز نے استعمال کی۔ اس نے SUBJECT کی اصطلاح استعمال نہیں کی۔ اردو میں تھیم کے لئے کوئی موزوں لفظ نہیں ہے۔ موضوع / مرکزی خیال جیسی تراکیب سے اس کی صحیح ترجمانی نہیں ہوتی

عملی تنقید میں فن پارے کی تھیم THEME پر غور کیا جاتا ہے عموماً تھیم قصے یا معنی ہے جس کے گرد پوری نظم گھومتی ہے لیکن رچرڈز کے خیال میں شعری اظہار کا بھی ایک مرکزی موضوع / سبجیکٹ ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم گھومتی ہے عملی تنقید میں اس مرکزی خیال تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے ادب اقدار کی تخلیق کا نام ہے ادیب زندگی کی صداقتوں کا تجربہ کرکے اس کی قدریں تخلیق کرتا ہے نقاد کا کام ان قدروں کو سمجھنا اور ترتیب دینا ہوتا ہے ادب زندگی کا آئینہ ہے زندگی جامد نہیں بلکہ ارتقاء پذیر ہے زندگی کی حرکت سے ادب میں بھی حرکت آتی ہے جہاں حرکت ہوتی ہے وہاں سمت یا جہت کا بھی تصور ہوتا ہے بغیر سمت کے حرکت ناممکن ہے اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ

تفسیرِ حیات ہونے کی حیثیت سے ادب کے ساتھ بھی وہ تمام تصورات وابستہ ہو جاتے ہیں جو زندگی کے ساتھ ہیں یعنی حرکت۔ ارتقاء۔ جہت۔ منصب۔ مقصد وغیرہ۔

ایلیٹ کہتا ہے ادب کا مقصد مسرت، بہم پہنچانا ہے۔ اگر یہ مسرت ہمیں زندگی کی بصیرت نہ دے تو پھر یہ حقیقی مسرت نہیں ہے مادہ پرستی کی وجہ سے مغربی معاشرے میں زندگی کی سمت نہیں رہی بلکہ زندگی بے سمتی کا شکار ہو گئی ہے مشینی نظام کے پابند انسان میں احساس کا وہ گوشہ ختم ہو گیا جہاں دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے زندگی کی معنویت تنہائی۔ اکیلے پن کے حصار۔ غم ذات کے خول اور مٹتی ہوئی اخلاقی قدروں کے ماتم میں کھو گئی۔ اب اگر کوئی اپنی ذات کے حوالے سے باہر کی دنیا کا مطالعہ کرے گا تو زندگی لایعنی معلوم ہوگی جس کے نتیجہ میں ادب بھی لایعنیت ABSURDITY کا شکار ہو جائے گا۔ چنانچہ مغربی زندگی کی بے سمتی اور لایعنیت نے ادب میں بھی ABSURDITY کو جنم دیا ہے مثلاً کامیو CAMUS کا ناول PLAY جس میں یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ زندگی لایعنی اور مہمل ہے اس طرح کسی ادب پارے کی تفہیم کو سمجھنا اور اس کا محاکمہ کرنا عملی تنقید کا پہلا کام ہے۔

JUNCTURE (وقوعہ / محل وقوع) ادب داخلی آئینے میں معروضی حقیقتوں کے اظہار کا نام ہے اور یہ حقیقتیں حادثات اور واقعات کے تسلسل کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ پھر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حادثہ یا وقوعہ زمانی اور مکانی تبدیلی کا مظہر ہوتا ہے۔ زندگی بذات خود حادثہ ہے اور حادثات و تغیرات سے عبارت ہے جو زماں اور مکان کے پردے پر رونما ہوتے ہیں۔

انسان کا شعور اس کے وجود پر اور اس کا وجود زمان اور مکان پر دلالت کرتا ہے عملی تنقید میں کسی ادب پارے کے واقعات کا زمانی و مکانی پہلو زیر بحث لایا جاتا

ے اور یہ سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وقوعہ کس وقت ہوا؟ کس جگہ ہوا؟
ں ہوا؟ اور اس کے محرکات کیا تھے یعنی اس میں واقعات کا زمانی و مکانی
س منظر اور پیش نظر دونوں دیکھے جاتے ہیں۔

STRES } اس میں زور اور اہمیت کا مفہوم شامل ہے۔ یعنی زیر نظر
تصریح } فن پارے میں کس پہلو۔ کس حقیقت یا زندگی کے کس رخ کو
ز کیا گیا ہے کس چیز پر بل دیا گیا ہے اور کس امر کی صراحت کی گئی ہے
لاً اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" کی عملی تنقید کے دوران ہم یہ دیکھتے ہیں اس نظم میں
اعر نے مسجد قرطبہ پر STRESS نہیں دیا ہے بلکہ اس کا STRESS فن
ش پر ہے جس کا ایک مظہر مسجد قرطبہ ہے ۔

TUN } اب تک یہ خیال کیا جاتا تھا آہنگ صرف شعر میں ہوتا ہے
ہنگ / ترنم } لیکن واقعہ یہ ہے کہ آہنگ کا وصف نثر میں بھی ہوتا ہے
لیق کار الفاظ کی نشست کے ذریعہ آہنگ پیدا کرتا ہے اس نشست اور ترتیب
اظ کو قواعد کے اعتبار سے بھی درست ہونا چاہیے۔

شاعر جس طرح کا تاثر پیدا کرنا چاہتا ہے اس تاثر کی مناسبت سے الفاظ کا
تعمال کرنا ضروری ہے۔ مثلاً اقبال کے حسب ذیل اشعار تاثر اور آہنگ کا مرقع ہیں

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغ چمن

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

من کی دنیا؟ من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

آہنگ اوزان بحور۔ قوافی۔ تکرار قوافی۔ صفیری آوازوں، انفی آوازوں مصوتوں اور مصمتوں کے استعمال سے پیدا کیا جاتا ہے۔ منظر۔ موضوع۔ کردار اور جذبات وغیرہ سے آہنگ کا مطابقت رکھنا ضروری ہے۔

LEXICS } قواعد کا علم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کوئی لفظ اسم معرفہ یا نکرہ مضاف ہے یا مضاف الیہ۔ مبتدا ہے یا خبر۔ یا پھر لفظ کی تذکیر و تانیث، واحد و جمع۔ لفظ کی حالتوں فاعلی۔ مفعولی یا اضافی۔ یا پھر زمانے ماضی حال یا مستقبل کا تعین کرتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے قواعد لفظ کے صرفی اور نحوی پہلوؤں سے بحث کرتی ہے۔ لغت الفاظ کے معنی کا تعین کرتی ہے لیکن لفظ میں کتنی وسعت / پھیلاؤ / گہرائی / گیرائی / تاثیر ہے اور الفاظ کا باہمی ربط کیا ہے یہ ہمیں LEXICS سے پتہ چلتا ہے مثلاً

ع غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

رام نرائن موزوں کے اس شعر کو قواعد اور لغت کی روشنی میں جانچیں تو لفظوں میں کوئی تاثیر نظر نہ آئے گی۔ اگر اس کو جنگ پلاسی۔ سراج الدولہ اور میر جعفر وغیرہ کے کردار

اردو لغات کے پس منظر میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہر لفظ لغوی معنوی اور قواعدی تعریفات کے علاوہ کچھ اور معنی رکھتا ہے مجنوں۔ ویرانے اور غزالاں کے استعاروں سے شعر کی ایک خاص داخلی فضا و تیار ہوتی ہے جس میں ہر لفظ اپنی پوری قوت تاثیر اور گہرائی کے ساتھ جلوہ نمائی کرتا ہے۔

TONE : یہ لہجے کے معنوں میں مستعمل اصطلاح ہے اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ادب پارے میں جو لفظ یا الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے کس قسم کا لہجہ ترتیب پاتا ہے۔ لہجہ کئی قسم کا ہوتا ہے جیسے استفہامی / استعجابی / طنزیہ فریادی / اشاراتی / رمزیہ / بیانیہ اور ڈرامائی وغیرہ۔ عملی تنقید میں ہم کسی فن پارے میں فن کار کے لہجے کا بھی تجزیہ کرتے ہیں۔ مثلاً میر کا یہ شعر ہے۔

رات بھر شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

اس شعر میں 'کیا' سے لہجے کا تعین ہوتا ہے کیا میں استعجاب بھی ہو سکتا ہے۔ استفہام بھی۔

INTENSION : کوئی فن پارہ جب پردۂ کتم منصۂ شہود میں آتا ہے تو اس کی تخلیق کے پیچھے خالق کا کوئی نہ کوئی قصد یا INTENSION ضرور ہوتا ہے جس وقت اظہار ہوگا اس میں INTENSION بھی ہوگا اذیت رسانی یا جذبات کو مشتعل کرنا زیادہ اچھا قصد نہیں ہے البتہ جذبات کی تطہیر یا جذبات کا تزکیہ کرنا KATHARSIS اعلیٰ درجے کا قصد ہے۔

DICTION ڈکشن میں شاعر و ادیب کی لفظیات سے بحث کی جاتی ہے

A. WORDS : لفظوں کی انتخابیت DICTOIN کہلاتی ہے اس پر تجسس اور FEELING کا بڑا اثر پڑتا ہے۔

ڈکشن کے ذریعہ ہم معلوم کرسکتے ہیں کہ جس شاعر یا ادیب کا ڈکشن ہے اس کی حس کیسی ہے؟ قوت حاسّہ کتنی تیز ہے؟ لطیف ہے یا کثیف ہے؟ محسوسات کس انداز کے ہیں؟ PERVERTED حس کی انتخابیت بھی PERVERTED ہوتی ہے جس سے اس کی ذہنی کمزوری کا پتہ چل سکتا ہے۔ DICTION میں الفاظ کی انتخابیت کے علاوہ شاعر/ادیب کی لفظیات میں پھیلاؤ EXTENSION عمق DEPTH تناؤ TENTION پیدا کرنے کے طریقوں اور لفظی حالتوں سے بحث کی جاتی ہے ہر لفظ یا تو سکونی حالت SYNCHRONIC ہوگا یا متحرک DIACHRONIC۔ خود اپنی جگہ معنی دیتا ہے یا معنی کے لئے دوسرے لفظ کا محتاج ہے۔

ڈکشن میں یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جو لفظ استعمال ہو رہا ہے وہ تہذیبی اقدار سے ہم آہنگ ہے یا نہیں۔ پھر اس کے ساتھ لفظوں کی گونج اور ارتعاش ECHO اور لفظوں کی تجسیم BODYIMAGES اور تمثال اور پیکریت کا بھی تجزیہ اور تشریح کی جاتی ہے۔

۵) SENTENCES : ڈکشن کے تحت لفظ کو اکائی بنیاد مان کر اس کا تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ عملی تنقید میں نثری تخلیقات کے لئے جملہ کو اکائی/وحدت بنا کر ان کا بھی تجزیہ کرنا پڑتا ہے جملوں کے تجزیے میں جملوں کی ترتیب/جملوں کا دروبست/جملوں کا نظم اور ان کی موزونیت کو پرکھا جاتا ہے اس کے علاوہ جملوں میں خیالات کی ترتیب و تشکیل اور ان کی تنظیم پر بھی نظر کی جاتی ہے

عملی تنقید کے منزل اصولوں میں ایک اصول نہیں ملتا وہ ہے صنفی خصوصیات کا مطالعہ جو کہ اردو ادب پاروں کی عملی تنقید میں ناگزیر ہے یعنی اگر ہم غزل کی عملی تنقید کر رہے ہوں تو صنف غزل کی روایات اور خصوصیات بھی پیش نظر رکھیں گے اسی طرح مرثیہ یا نثر میں افسانہ یا ناول وغیرہ کی منفرد و مخصوص صنفی خصوصیات ہوتی ہیں۔ عملی تنقید میں ان صنفی خصوصیات کو بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے صنفی خصوصیات

وبھی ملحوظ رکھنا ضروری ہوتا ہے منفی خصوصیات کے تحت مواد اور ہیئت کی بحثوں کو
بٹنا ہوتا ہے۔

یہاں تک ہم نے عملی تنقید کے رہنما اصولوں کی وضاحت کی۔ اور اسی کی تفہیم کے ضمن میں
م نے تنقید کے مختلف دبستانوں کا ذکر بھی کیا۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ زندگی ایک
وجود ہے اس کو خانوں میں نہیں بانٹا جا سکتا تو پھر ہم یہ محسوس کرنے میں حق بجانب
ں تنقید کا کوئی دبستاں کسی تخلیق یا فن پارے کی مکمل تنقید نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ادب
ندگی کا آئینہ ہے تو زندگی کی طرح اس کو بھی خانوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی جس
رح زندگی صرف روحانیت یا مادیات نہیں ہے بلکہ ان دونوں کا حسین امتزاج ہے
ندگی صرف عقلیات، صرف جذبات، صرف معاشیات، صرف جمالیات، صرف نفسیات
یں ہے بلکہ ان سب کا مجموعہ ہے بعینہٖ ادب ہو یا کوئی اور فن پارہ کسی ایک دبستان
نقید کے اصولوں سے اس کا مطالعہ اور تنقید ناقص ہو گی۔ اس لئے ضرورت اس بات
ہے کہ ہر پہلو اور ہر زاویہ نظر سے اس کو دیکھا جائے اور ہر سمت سے اس پر روشنی
الی جائے تاکہ اس کا وجود خانوں میں نہ بٹ جائے بلکہ اس کا کلی وجود اپنی تمام تر
داقتوں اور رعنائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آ سکے۔

آئی اے رچرڈز کے عملی تنقید کے تصور سے تنقید کا ایک نیا نظریہ پیدا ہوتا ہے وہ
ہے کلی تنقید TOTAL CRITICISM کا تصور۔ یعنی کسی ادب پارے کی عملی
تنقید میں دبستانِ انتقاد کے اصولوں کو پیش نظر رکھیں اس میں کلاسیکی روایات
بھی ہوں رومانوی آزادی فکر و انفرادیت بھی۔ جمالیاتی جذبۂ نشاطِ حسن بھی ہو اور تاثراتی
اثر پذیری بھی۔ اور کسی طبقاتی کشمکش پر بھی نگاہ ہو تو تحلیل نفسی کے اصولوں کے تحت فنکار کی
نفسیات کی گرہ کشائی بھی کی جائے۔ اس طرح جو تنقید وجود میں آئے گی وہ واقعتاً ادب کی تنقید
ہیں بلکہ زندگی کی تنقید ثابت ہو گی۔

نعیم الدین رضوی

بمعرفت بی ۷/ ۱۱ (اُردو سماج)
جامعہ نگر۔ نئی دلی

دبستان کا سالانہ مشاعرہ

مورخہ ۱۵ر فروری ۱۹۹۲ء ۔ تخلیقی فنکاروں کی ادبی اور ثقافتی انجمن "دبستان" جامعہ نگر، نئی دہلی کے زیر اہتمام ڈاکٹر سجاد ستید کے دولت کدے پر سالانہ مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ جس میں بہت سے مقامی اور بیرونی شعرائے کرام نے شرکت فرمائی۔ صدارت کے فرائض کورٹ کے ایڈوکیٹ جناب ایم۔ قمرالدین نے انجام دیئے اور شعبۂ اُردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر خالد محمود نے اپنے مخصوص اندازِ نظامت سے مشاعرے کے حسن میں اضافہ کیا۔ مشاعرے کا باقاعدہ آغاز جناب نعیم الدین رضوی نے تلاوتِ کلام پاک سے کیا اور اُردو دنیا کے مشہور شاعر و نقاد پروفیسر عنوان چشتی کی ایک خوبصورت نعت بھی لحنِ داؤدی میں پیش کی۔ جن مقامی و بیرونی شعراء نے اپنے کلام سے نوازا، اُن کے منتخب اشعار اور اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

پروفیسر عنوان چشتی:

ساری دنیا میں دانا ہے اپنے گھر میں کچھ بھی نہیں
ایسا لگتا ہے اب اسکے کیسۂ زر میں کچھ بھی نہیں
چاروں کھونٹ پھرا ہوں لیکن اپنے آپ کو پا نہ سکا
گھر آ کر یہ راز کھلا ہے سمت و سفر میں کچھ بھی نہیں

ایم۔ قمرالدین:

سایہ کہیں نہ کوئی شجر میرے شہر میں
اور اس پہ ختم تیرا سفر میرے شہر میں
زیر اور پیش تو کوئی پہچانتا نہیں
ہر شخص جانتا ہے زبر میرے شہر میں

پروفیسر ظفر احمد نظامی:

بس تری چشمِ التفات نہیں
اور تو کوئی خاص بات نہیں
تم اگر پاس ہو تو سب کچھ ہے
تم نہیں ہو تو کائنات نہیں

باقی بر صفحہ

ہماری ادبی سرگرمیاں

میونخشا ہشوق
اشرف ولا۔ ٹولی چوکی
حیدرآباد

یکم جنوری ۱۹۹۲ء ۶ بجے شام۔ انجمن ترقی اردو، انجمن ترقی پسند مصنفین، مخدوم سوسائٹی، ساؤتھ انڈیا اُردو اکیڈیمی، محفلِ خواتین، اے پی اُردو ٹیچرس اسوسی ایشن، زندہ دلان حیدرآباد، اُردو مجلس، انجمن تحفظ اردو اور فائن آرٹس اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام ڈاکٹر حسینی شاہد معتمد عمومی انجمن ترقی اُردو اے پی اور بانی پرنسپل اُردو آرٹس ایوننگ کالج مرحوم کا جلسہ تعزیت اُردو ہال حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ صدر انجمن ترقی اُردو آندھرا پردیش ڈاکٹر ایس اے منان نے صدارت کی۔ جسٹس گوپال راؤ اکبوٹے نے کہا کہ ڈاکٹر حسینی شاہد نے تلگو، ہندی، مراٹھی اور کنڑی کے نمائندوں کو ایک جگہ جمع کرنے کے لئے موثر اور سرگرم اقدامات کئے۔ ڈاکٹر رفیع رؤف نے کہا کہ مرحوم کو میں ایک مشہور استاد کی حیثیت سے خراج پیش کرتا ہوں جو طلباء میں کافی شہرت رکھتے تھے۔ مسٹر اکرام جاوید نے کہا کہ انھوں نے اُردو کے کاز کے لیے کام کرنے والی مختلف تنظیموں کو متحدہ مجلسِ عمل میں شامل کرنے میں پہل کی تھی۔ مسٹر مصطفےٰ کمال نے اردو آرٹس کالج میں ڈاکٹر حسینی شاہد کی ایک یادگار کے قیام کی تجویز پیش کی۔ مسٹر عاتق شاہ نے ڈاکٹر حسینی شاہد کو اُردو کا مسیحا قرار دیا۔ مسٹر رحمٰن جامی صدر اُردو مجلس نے اس موقع پر اپنے کچھ قطعات سنائے۔ مسٹر محمود انصاری نے اپنے تجربات بیان کئے۔ شریمتی قمر جمالی نے محفلِ خواتین کی جانب سے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کہا کہ پروفیسر حبیب الرحمٰن مرحوم نے جن روایات کی بنیاد ڈالی تھی ڈاکٹر حسینی شاہد اس پر مضبوطی سے قائم رہے اور کبھی بھی اُردو کے کاز کو جانبدار سیاسی رنگ دینے کی اجازت نہیں دی۔ صدارتی تقریر میں ڈاکٹر ایس اے منان نے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے کام کو آگے بڑھایا جائے گا۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر روزنامہ سیاست

نے ایک پیام روانہ کیا جس میں ڈاکٹر ... شاہد کے انتقال پر اظہارِ تعزیت کیا گیا۔ ایک
تعزیتی قرارداد بھی منظور کی گئی۔

● گیت چاندنی، ہندی بیٹھک سنگھ اور ہندی پرچار سبھا حیدرآباد کے زیرِ اہتمام ہندی کے مہمان شعراء اور ادیبوں کے اعزاز میں محفلِ شعر کا انعقاد کیا گیا۔ اس محفلِ شعر کی صدارت جناب انور ہاشمی ایڈیٹر شاہکار نے کی اور شری نیپال سنگھ ورما نے معتمد کے فرائض انجام دیئے۔ جناب کنور بے چین کی غزلوں نے خوب سماں باندھا۔ انھوں نے اس موقع پر کہا کہ ہندی غزل اور اردو غزل میں کوئی فرق نہیں ہے غزل کے ساتھ ہندی کا لفظ اس لیئے لگایا جاتا ہے اس کی پہچان ہو سکے۔ کنور بے چین کی غزلوں میں حالاتِ حاضرہ پر پوری طرح روشنی ڈالی گئی ان کا ترنم بھی سامعین سے داد حاصل کرتا ہے ڈاکٹر رما سنگھ (غازی آبادی) کی غزلوں کو گیتوں کو بہت پسند کیا گیا۔ شری جگدیش چندر شاستری (دہلی) نے بھی گیتوں اور غزلوں سے ماحول رنگین بنایا۔ دہلی کے نوجوان کوی آنند پرکاش شرما نے نظم پیش کی۔ ڈاکٹر پرشانت ویدالنکار شری دیونزا دیپک (دہرپال) کی نظمیں بھی بھرپور رہیں۔ مقامی شعراء میں سرز انور ہاشمی، نیپال سنگھ ورما، نریندر رائے، ڈاکٹر منیر الزماں منیر، پشپا ورما، ریکھا اگروال، اہلیا مز ولویک، رشی رام، چندر شرما کوشک، سریش کلگیا نے کلام سنایا۔ شری نیپال سنگھ ورما کے شکریہ پر محفلِ شعر کا اختتام ہوا۔

● ۸ جنوری ۹۲ء ۶-۳۰ بجے شام انجمن ترقی پسند مصنفین کا ادبی اجلاس حیدرآباد کی شعری، ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لئے منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت جناب شہیدی صاحب نے کی۔ صدرِ محفل نے کہا کہ ترنم ایک خدا کا عطیہ ہے مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی سلیمان اریب ترنم سے پڑھتے تھے۔ آج کے شاعر بھی ترنم سے پڑھتے ہیں اور انھیں تسلیم کیا جاتا ہے بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ باہر کے دانشور حیدرآباد کے شاعروں اور ادیبوں کا نام عزت سے لیتے یہاں ہم اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ہماری اپنی ذات سے پہچانے جاتے ہیں میر، غالب بھی شاعری ہمت رہا آج بھی شاعری ... ہے اور پہلے کے مقابلے میں آج شعرا

کی خدمت کرنا اہم ترین عمل ہے جناب اکمل حیدرآبادی نے اپنے دور کے نوجوانوں کی ادبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور آج کے دور کو بھی اہم، فعال اور متحرک قرار دیا۔ جناب رئیس اختر نے کہا کہ مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی اور سلیمان اریب کے دور میں بھی شاندار تھا آج کا دور بھی شاندار ہے۔ ہم کل بھی مشاعرے پڑھتے تھے آج بھی پڑھتے ہیں ہر دور کے اقدار، معیارات اور مسائل ہوتے ہیں شاعر ہو کہ ادیب اپنے دور کے ساتھ چلتا ہے جناب راشد آذر نے کہا کہ حیدرآباد کے شاعروں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ ترنم سے کلام سناتے ہیں گا کر شعر نہیں سناتے۔ مشاعروں کی ایک تہذیبی روایت رہی ہے ہمارے مشاعرہ نے ہر دور میں اپنی صلاحیتوں کا سکہ بنایا ہے اپنے وجود کا احساس دلایا ہے جناب نصرت محی الدین نے کہا کہ ہمارے اساتذہ اپنے طالب علموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے۔ پہلے ہر کالج میں ادبی تہذیبی محفلیں ہوا کرتی تھیں۔ بیت بازی کے مقابلے ہوتے تھے اردو میڈیم کے طلبا کی حالت اچھی نہیں ہے ہمیں اردو کے مسائل پر بھرپور توجہ کرنی چاہئیے۔ حیدرآباد کی موجودہ ادبی انجمنیں قابل تعریف ہیں کہ وہ اپنے اپنے دائرہ میں اچھا کام کر رہی ہیں جناب رحمٰن جامی، صادق نوید، عزیز بھارتی، قمر جمالی اور قمر الدین صابری ایڈیٹر شاداب نے بھی اظہار خیال کیا۔ ادبی اجلاس کے بعد مشاعرہ میں مسرز سعید شہیدی، راشد آذر، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، صلاح الدین نیر، رحمٰن جامی، اکمل حیدرآبادی، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، عزیز بھارتی، گیان سنگھ شاطر، صادق نوید، منظور احمد منظور، ذکی بالکل شاداب، منان منظور، برق یوسفی، اختر غوری، ریاست علی تاج، شفیع اقبال، ڈاکٹر میر الزماں منیر، تدبیر انصاری، قمر الدین صابری، محمود شریف محمود اور رؤف رحیم نے کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر نے شکریہ ادا کیا۔

★ ۱۱ جنوری ـــ محفل خواتین کا ادبی اجلاس آفس آف سوشیل ویلفیر میں ڈاکٹر اے ایم ایس اشرف صدارت میں منعقد ہوا۔ عطیہ سعید نے "رفاقت کے واسطے" کوثر گل نے "بدلتے رشتے" تاج نے "شعلوں کے درمیان" افسانے پڑھے۔ سعیدہ افروز نے "شادی مسئلہ کیوں" ... نے "لڑکی دیکھنے چلیں" معز آشا نے "میرا شہر میرے لوگ" معلوماتی مضامین

پڑھے۔ شاعرات نے تازہ کلام سنایا۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید مہمان خصوصی تھیں۔ صفیہ شاہین اور سلطانہ شرف الدین نے آزاد نظمیں پڑھیں۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، ناز حیدر ناز، نایاب سلطانہ، عزیز النسا صبا، انجم قمر سوز، فاطمہ تاج، مظفر النسا ناز، نسیم نیازی نسیم، رضیہ سلطانہ شاہین اور حنا شہید نے اپنا کلام پیش کیا۔ ڈاکٹر ناصرہ نے مضامین اور افسانوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ صدر محفل خواتین سلطانہ شرف الدین کے شکریہ پر ادبی اجلاس برخواست ہوا۔

★ ۱۱ جنوری ۶-۳۰ بجے شام ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) کا ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ ڈاکٹر بیگ احساس جنرل سکریٹری نے ۱۹۹۱ء میں منعقدہ ادبی اجلاس کی رپورٹ پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے ادبی اجلاس کی تعداد کم رہی۔ حسب روایت حلف نے اس سال بھی رمضان المبارک اور محرم کے احترام میں اپنے ادبی اجلاس نہیں کئے۔ اس طرح چودہ اجلاس ہوئے۔ تفصیلی رپورٹ کے بعد جناب رضا وصفی کی صدارت میں مشاعرہ ہوا۔ اقبال ہاشمی، محمود حامد، رحمت کوثر، مظہر مہدی، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، علی ظہیر، رؤف خیر، غیاث متین اور رضا وصفی نے کلام پیش کیا اور داد پائی۔ ڈاکٹر بیگ احساس جنرل سکریٹری نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

★ ۱۲ جنوری ۹۲ء۔ کل ہند صنعتی نمائش میں ادبی ٹرسٹ کے اردو بک اسٹال کا افتتاح کے موقعہ پر ابتداء میں جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست و مینیجنگ ٹرسٹی نے خیر مقدمی و تعارفی خطاب کیا۔ مسٹر سمر سمہا ریڈی وزیر قانون و عدلیہ نے افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ حیدرآباد اور اہل حیدرآباد نے اردو فروغ کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں وہ دہلی اور لکھنو سے کم نہیں ہے مسٹر سمر سمہا ریڈی نے تالیوں کی گونج میں کہا کہ ریاستی حکومت اردو کے مسائل سے ہمدردی رکھتی ہے اس کی یکسوئی کے لئے ہر ممکنہ اقدام کر رہی ہے انھوں نے اس زبان کے فروغ اور بقاء کے لئے حکومت کے تعاون کا اعادہ کیا۔ انھوں نے اردو بک اسٹال سے کتابوں کی زیادہ سے زیادہ فروخت کو اردو زبان کی بہترین خدمت قرار دیا اور نمائش سوسائٹی کو مبارکباد دی کہ وہ اس سلسلہ میں دلچسپی لیتی۔ جناب عابد علی خان نے حسانی کے ذریعہ اور نمائش سوسائٹی کے تعاون پر اظہار تشکر کیا۔ جناب

اب نصیر احمد نے مسٹر سمر سہارے میکو اسٹال میں موجود کتابوں کی تفصیل بتائی اور چند کتابیں
دیا۔ جناب عابد علی خان نے بھی ادبی ٹرسٹ کی مطبوعات تحفتاً دیں۔ انھوں نے وزیر قانون
د کا ہمدرد قرار دیا۔ ساتھ ہی انکشاف کیا کہ وزیر قانون کے آنجہانی والد گردھاری لال کی انجمن ترقی
کے مددگار بھی تھے۔ اس بک اسٹال کے قیام میں عثمانیہ بک ڈپو کا تعاون بھی رہا ہے۔ اس
ٹال میں اردو میں علمی، ادبی، فنی، تحقیقی اور تاریخی کتابوں کے ساتھ ساتھ نادر و نایاب قرآنی
نسخے اور حیدرآباد پر اردو، انگریزی، تلگو، ہندی کتابوں کا بھی اسٹاک موجود ہے۔ ممتاز
جناب امیر احمد خسرو اور مزاحیہ شاعر جناب حفیظ خان مذاق نے حیدرآباد پر اپنی نظمیں
باد حاصل کی۔ اس موقع پر نمائش سوسائٹی کے سکریٹری مسٹر کرشنا جی یادو، کے ایس ریڈی
مین جیلانی اردو شعراء، ادیبوں، صحافیوں اور ہمدردانِ اردو کی کافی تعداد موجود تھی۔

و ۱۴ جنوری۔ مرکز ادب حیدرآباد کا ۱۷واں سالانہ غیر طرحی مشاعرہ بمکان محمد قمر الدین
بار ایڈوکیٹ، مدیر شاداب، ریڈ ہلز حیدرآباد منعقد ہوا جس کی صدارت جناب
بانی صاحب نے کی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے بیرسٹر غلام یزدانی (لندن) جناب صلاح الدین
رجناب عبدالرحیم آرزو گلبرگہ شریک تھے۔ ابتداء میں جناب عزیز بھارتی صدر ادارہ نے
رفی تقریر کی۔ جناب محمد قمر الدین صابری نے مہمانِ خصوصی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ
عائشہ بیگم رباب صاحبہ صدر سید صلاح الدین اکبر میموریل ایجوکیشن سوسائٹی اپنی علالت
سے شریکِ مشاعرہ نہ ہوسکیں۔ جناب سید لیسین سیٹھ صدر اردو ہندی منچ بھی اپنے
ی اتفاقی شدید علالت کی بناء پر تشریف نہ لاسکے۔ بیرسٹر غلام یزدانی جامعہ عثمانیہ کے
ور حیدرآبادی ہیں مگر گزشتہ تیس سال سے لندن میں قیام کرتے ہوئے اردو کے جھنڈے
ڑکتے ہوئے ہیں۔ اس طویل عرصہ میں آپ نے ایشیائی باشندوں اور دوسرے غیر
کے قانونی مسائل کو انگلستان میں حل کرنے میں بہت بڑا حصہ ادا کیا ہے اور اب
انون دانوں میں صفِ اول کے ماہرین میں شامل ہیں اور ایک عرصہ سے اردو مجلس
منعقد ہوے جناب صلاح الدین نیر جو ہمارے شہر کی تہذیبی اور ادبی محفل ایک روح رواں

میں خصوصاً مشاعروں میں موصوف کی شرکت محفل کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔ جناب عبدالرحیم آزاد گلبرگہ جو جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ ہیں اور جناب غلام یزدانی کے دور ہی سے تعلق رکھتے ہیں ایک زمانے سے اپنی شعری تخلیقات کا لوہا منواتے آ رہے ہیں۔ اس موقع پر ادارہ کی جانب سے مہمانوں نے کی گل پوشی کی گئی۔ بیرسٹر غلام یزدانی نے صاحب نے کہا کہ مرکز ادب کے ارباب و مجاز قابل مبارکباد ہیں کیونکہ میں مسلسل تین گھنٹوں سے حیدرآباد اور اضلاع کے نمائندہ شاعروں کے بہترین اور اعلیٰ درجہ کے کلام سے لطف اندوز ہوتا رہا کسی لمحہ بھی مجھے یہ محسوس نہیں ہوا کہ میں وقت ضائع کر رہا ہوں۔ مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ حیدرآباد میں شعری معیار کس قدر نکھرا ستھرا ہے مجھے افسوس ہے کہ ہم مختلف اداروں سے وابستہ ہوئے ہوئے بھی حیدرآباد کے نمائندہ شاعروں کو انگلستان میں ہونے والے مشاعروں میں شرکت کے لئے زحمت نہ دے سکے۔ جب میں لندن جاؤں گا تو میرا اولین کام یہ رہے گا میں خود سے وابستہ اداروں کو متوجہ کروں کہ حیدرآباد کے شاعروں، دانشوروں کی اعلیٰ صلاحیتوں سے اپنی سالانہ محفلوں میں استفادہ کریں۔ صدر مشاعرہ جناب رحمٰن جامی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ ہم اس دور کے اپنے فعال متحرک اور با صلاحیت شاعر ہیں جن پر ہندوستان و پاکستان کے ادبی حلقے فخر محسوس کرتے ہیں۔ آج سارے ملک سے زیادہ حیدرآباد میں شعر و ادب کی خدمت ہو رہی ہے اور حیدرآباد کے شاعر و ادیب اپنا مقام خود بنا رہے ہیں ادارۂ مرکز ادب قابل مبارکباد ہے کہ شعر و شاعری کے فروغ کے لئے ۱۷ سال سے چراغ جلائے رکھا ہے یہاں ہر مکتب خیال کے شعراء کو برابر جگہ دی جا رہی ہے مجھے یہ جان کر خوشی ہوتی ہے کہ شعری مصروفیات کے ساتھ نثری ادبی مصروفیات بھی شروع کی گئی ہیں جسے اور تیز تر کیا جانا چاہیئے۔ جناب صلاح الدین نیر نے کہا کہ بیرسٹر غلام یزدانی صاحب اردو کے چراغ کو انگلستان میں جلائے رکھا ہے اپنی تہذیبی ورثے کے تحفظ کے لئے وہاں کوشش کرتے رہتے ہیں ہماری سرزمین دکن آج بھی باکمال ادیبوں شاعروں سے بھری پڑی ہے جو اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں مجھے امید ہے کہ حیدرآباد کے باہر بھی ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا جائے گا اور انھیں انگلستان کی محفلوں میں بھی

رکھا جائے گا۔

اس نمائندہ سالانہ مشاعرہ کی نظامت کے فرائض جناب مومن خان شوق معتمد عمومی نے بڑی عمدگی سے ادا کئے۔ اس مشاعرہ میں صدر مشاعرہ نے جناب رحمٰن جامی مہمانِ خصوصی مسز صلاح الدین نیر اور عبدالرحیم آرزو، گلبرگہ کے علاوہ مسرز منظور احمد منظور، ڈاکٹر صادق نقوی، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، رئیس اختر، عزیز بھارتی، اکمل حیدرآبادی، صادق نوید، قمرالدین صابری، مومن خان شوق، حسن فرخ، محمود شریف محمود، ڈاکٹر منیرالزماں منیر، منان منظور، مسعود جاوید ہاشمی، ابوالفاروق شعور، ڈاکٹر سید حسن، طاہر گلشن آبادی، بشیر آکبر، لے حسن الہ آبادی، رؤف رحیم، قدیر انصاری، محمود حامد، بے ہوش محبوب نگری، اضلاع کے مہمان شاعروں میں مسرز جمیل نظام آبادی، علیم پرواز، سلیم عابدی، حلیم بابر اور ظہیر ناصری نے اپنا بہترین اور منتخب کلام سنایا۔ محترمہ عائشہ بیگم رباب صاحبہ کا کلام محترمہ مہر النساء بیگم بیرسٹر غلام یزدانی (لندن) نے سنایا۔ تمام شعراء کا کلام پسند کیا گیا۔ باذوق سامعین کی کافی تعداد شریک تھی اس شاندار کامیاب سالانہ مشاعرہ کا اختتام جناب محمد قمرالدین صابری کے شکریہ پر ہوا۔

● ۱۲ / جنوری ۷ بجے شام صنعتی نمائش کے یوم خواتین کے موقع پر نمائش کلب میں محفل خواتین سے وابستہ خاتون شعراء کا مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے کی اور مہمان خصوصی محترمہ آمنہ نقوی پبلک پرسیکوٹر بمبئی اور محترمہ بیگم ڈاکٹر حیدر خان تھیں۔ اس مشاعرہ کے آغاز سے قبل معتمد محفلِ خواتین محترمہ فاطمہ عالم علی خاں نے تعارفی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اب محفلِ خواتین کی شعری ادبی سرگرمیاں کافی حد تک بڑھ چکی ہیں قدیم اہلِ قلم خواتین کے ساتھ ساتھ بعض نئی شاعرات اور ادیبوں نے محفلِ خواتین کے معیار کو اور اونچا کیا ہے مہمان خصوصی نے کہا کہ میں ۲۵ سال سے بمبئی میں ہوں لیکن میرا تہذیبی رشتہ حیدرآباد سے باقی ہے محفلِ خواتین ملک کی واحد محفل ہے جو حیدرآبادی تہذیب کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ محترمہ فاطمہ علی خان، فاطمہ تاج، مظفر النساء ناز اور کوثر گل نے مشاعرہ کے انتظامات کی نگرانی کرتے ہوئے مشاعرہ کی کامیابی کے لئے بھرپور تعاون کیا۔ مشاعرہ میں ادب دوست خواتین کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ اس مشاعرہ میں ڈاکٹر

بانو طاہرہ سعید، محترمہ آمنہ نقوی، محترمہ سلطانہ شرف الدین، تاباں سلطانہ، ناصرہ میرزا، النساء صبا، انجم قمرسوز، مظفر النساء ناز، فاطمہ تاج، ثمینہ عبدالواحد، عصمت حلیم، رضیہ سلطانہ دوشاہین، حنا شہیدی، ڈاکٹر صبیحہ پروین، خورشید حمید پاشاہ، آر بانو، نسیم نیازی، اقبال جہاں قدیری، سروری، عالم شاہ، شمیم اور تحول رحمانی، ذرینا آپشیانے کلام سناکر داد تحسین حاصل کی۔ معتمد مشاعرہ محترمہ فاطمہ تاج نے نہایت عمدگی سے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ یہ خوشگوار محفل شعر سخن معتمد محفل خواتین محترمہ فاطمہ عالم علی خاں کے شکریہ کو اختتام کو پہنچی۔

٭ ۱۶۔ جنوری ۹ بجے شب عرس حضرت جہانگیر پیراں کے سلسلے میں نعتیہ مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا جس کی نگرانی شیخ سعد حسین سعد آئی اے ایس اسپیشل آفیسر آندھرا پردیش اسٹیٹ وقف بورڈ نے فرمائی اور حضرت عبدالعزیز عزیز ایڈیٹر "تعمیر" نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ کنوینر مشاعرہ ڈاکٹر میر الزماں مَیر نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ اس مقدس محفل نعت میں حیدرآباد، محبوب نگر، جڑچرلہ اور شادنگر کے ممتاز شعراء نے شرکت کی۔ تلاوت کلام پاک کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا جس میں نگران مشاعرہ جناب سعد حسین سعد کے علاوہ مسرز صلاح الدین نیّر، رحمن جامی، قاضی انجم عارفی، عزیز بھارتی، ڈاکٹر میر الزماں میر، رمضان منظور ضیاء عرفان، فاروق عارفی، حافظ محمد الیاس خان، عبدالعزیز عزیز، نصرت فاروقی، نور آفاقی، سلیم عابدی، شکیب رزمی، ظہیر ناصری، حلیم بابر، سلیم رضا، شکیل فاروقی، نصر خالد رشید رہبر، جلال عارف، تقی احمد تقی، اور علیم عادل قابل ذکر ہیں۔ جناب سلیم عابدی محبوب نگری کے اظہار تشکر پر رات دیر گئے اس مقدس محفل کا اختتام عمل میں آیا۔

٭ ۱۸ جنوری کی شب عشق خانقاہ کے موقع پر زیر اہتمام ناثر سوسائٹی ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے کی اس مشاعرہ میں صدر مشاعرہ کے علاوہ ممتاز شعراء حضرت خواجہ شوق، راشد آذر، صلاح الدین نیّر، ناصر کرنولی، اکمل حیدرآبادی، فیض الحسن خیال، عزیز بھارتی، علی الدین نوید، بے حس حیدرآبادی اور رمضان منظور نے اپنا منتخب کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ صلاح الدین نیّر نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ اور شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر منشاءالرحمٰن خاں منشا
۱۱۔ اسٹارکی ٹاؤن۔ ناگپور

الفت اشرفی
5-6-565 محلہ درگاہ حضرت شاہ خاموش
نامپلی۔ حیدرآباد

غزلیں

تیغِ قاتل کو بھی پیاسا نہیں رہنے دیتے
اپنے سر ہم کوئی قرضہ نہیں رہنے دیتے

جن میں کچھ ہوتی ہے اخلاصِ عمل کی بو باس
وہ کوئی کام ادھورا نہیں رہنے دیتے

جو بڑے چاؤ سے دیتا ہے محبت کا پیام
لوگ اس شخص کو زندہ نہیں رہنے دیتے

ننھے منے سے یہ پنچھی بھی بڑے ظالم ہیں
شاخ پہ میوۂ تازہ نہیں رہنے دیتے

حادثے کرتے ہیں تاریخِ وفا اس پہ رقم
ورقِ دل کو یہ سادہ نہیں رہنے دیتے

پردۂ ذہن پہ یادوں کے ابھرتے منظر
فرطِ تنہائی میں تنہا نہیں رہنے دیتے

جو اہلِ سخن رکھتے ہیں جولانیٔ فکر
کوئی مضمون اچھوتا نہیں رہنے دیتے

ہماری بات بھی اک بار تم سنا تو کرو
برا کیا ہے ہمیشہ کبھی بھلا تو کرو

جو تم کو چاہیئے لے لو مگر دعا تو کرو
جو دینے والا ہے اس سے بھی التجا تو کرو

گلے لگائیں گے تم کو تمہارے دشمنِ جاں
خلوصِ دل سے مگر دوستی کیا تو کرو

تمہاری ساری نصیحت کا شکریہ واعظ
خود اپنے آپ کو تھوڑا سا پارسا تو کرو

ملے گا کیا تمہیں یہ بعد میں پتہ ہوگا
تم احترام سے دستِ طلب کیا تو کرو

زمانہ تم کو ڈرائے تو کوئی بات نہیں
خدا کی ذات سے ہر دم مگر ڈرا تو کرو

جنونِ شوق میں جیتے ہیں عمر بھر الفت
مگر سلیقے سے تم بھی ذرا جیا تو کرو

غزل

ڈاکٹر زینت اللہ جاوید

خداؤں کو بسایا جارہا ہے — دلوں کا قصر ڈھایا جارہا ہے
عجب یہ بے ضیاء پیغمبری ہے — چراغوں کو بجھایا جارہا ہے
یہ بالا دستیٔ کوتاہ قامت — فلک کو بھی جھکایا جارہا ہے
قلم کا سر قلم کردو تو اچھا — کہ سچ کو بھی چھپایا جارہا ہے
جو دیکھو تو ہے یہ بھی سربلندی — کہ سر نیزوں پہ لایا جارہا ہے
اندھیروں میں سلا کر چاند اپنے — تقدس کو بچایا جارہا ہے

غزل

رؤف خیر

نہ ہی مینار نہ کلس کا ہے — مسئلہ نفس اور نفس کا ہے
کتنا پیچھے ڈھکیل دیتا ہے — ایک لمحہ جو پیش و پس کا ہے
اس پہ ہر چند نام ہے میرا — یہ بدن ایک ایک نس کا ہے
تو اگر کرشن ہے تو تیرے لئے — منتظر ہر مکاں میں کنس کا ہے
میں کہاں رام کی تلاش میں ہوں — یہ علاقہ تو راکھشس کا ہے
تو سمجھتا ہے یا اسے تتلی — لمس تک فاصلہ جو مس کا ہے
ہر تماشہ ہمارے بس کا تھا — ہر تماشہ ہمارے بس کا ہے
تاش کا گھر نہ تھا، گھروندہ تھا — دکھ ہوا کو خس ہنس کا ہے
دیکھو لیکن نہ دیکھنے کی طرح — مشورہ چشم بے ہوس کا ہے
ایسی ویسی غزل نہ کہہ کہ ہمیں — ماورائے سخن کا چسکا ہے
خیر پھر کیا فریب کھاؤں گا — تجربہ خوب اس برس کا ہے

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید
رین ولیہ۔ شانتی نگر۔ حیدرآباد

وعدۂ شاہجہاں

(نظم)

موت نے مجھ سے تجھے چھین لیا اے "ممتاز"
میں تجھے زندۂ جاوید بنا ڈالوں گا
یادگار ایسی تیرے نام سے ہوگی منسوب
جس سے ہو جائیں گی دُنیا کی نگاہیں خیرہ
تیرے دربار میں ہر ملک سے آئے گا سلام
اہلِ دل تیری قدمبوسی کو حاضر ہوں گے
نام تیرا سرِ فہرست رہے گا ممتاز
لفظِ محبوب کی تفسیر لکھی جائے اگر
ہاں میرا نام بھی ہوگا کہیں تیرے ہی پاس
جس نے پوجا میں تیری کر دیا ارپن سب کچھ
تو ہی تُو میرے خیالوں کا رہی ہے مرکز!

اک شہنشاہ بھی ہو کر میں رہا تیرا اسیر
گھر تیرا تاج محل ہوگا محبّت کی قسم!
ایسا اک تاج محل جس کی نہ ہو کوئی نظیر
یہ میرا وعدہ ہے "ممتاز" — میرا وعدہ ہے!!

جمیل نظام آبادی

کھوج !

میں اپنے آپ میں اُلجھا ہوں برسوں سے
حصارِ ذات کے باہر
بہت اندھیرا ہے
سمٹ گیا تو بنا اپنے آپ کا قیدی
بکھر گیا تو اندھیروں سے واسطہ ہے مرا
اندھیری کھائی میں ناگ سر اُٹھائے ہوئے
ستم کی جبر کی لمبی زباں نکالے ہوئے
حصارِ ذات کے اندر بھی
اک گھٹن سی ہے
حصار ! جس کو کوئی توڑ بھی نہیں سکتا
اگر یہ ٹوٹے تو میں ٹوٹ ٹوٹ جاؤں گا
حصارِ ذات کے اندر بھی
اس کے باہر بھی
رہی ہے مجھ کو خود اپنی ہی آگہی کی تلاش
سزا یہ کیسی ہے
آخر کو کیا ہے میرا گناہ
میرے لئے نہیں جیسے کہیں بھی جائے پناہ

O

ماہنامہ

شاداب حیدرآباد

جلد (۹)
شمارہ (۴)

ایڈیٹر محمد قمرالدین صابری

اپریل ۱۹۹۲ء

جائنٹ ایڈیٹر - رشید الدین   منیجنگ ایڈیٹر - کلیم الدین احسن

مجلس مشاورت

قیمت :- 6/- روپے

زر تعاون

ہندوستان	65 روپے	۲ سال کیلئے 120 روپے	تاحیات 1500 روپے
خلیجی ممالک	200 "	" " 360 "	" 3700 "
امریکہ	40 ڈالر	" " 70 ڈالر	" 700 ڈالر
انگلستان	25 پونڈ	" " 45 پونڈ	" 400 پونڈ
پاکستان	175 پاکستانی روپے	" " 300 پاکستانی روپے	" 3000 پاکستانی روپے

229161
ترسیل زر کا پتہ :- ماہنامہ 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004 - فون نمبر

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے پبلک پرنٹرس، چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر شاداب ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا

فہرست

ڈاکٹر محمد یونس نگرامی

دینی تعلیم کی اہمیت

خطبہ صدارت : مدرسہ تعلیم القرآن مورخہ ۲۳/فروری ۱۹۹۲ء چک منڈی لکھنؤ

اسلام کو تاریخ کے ہر عہد میں ہمیشہ کشمکش اور پرخطر سیلابوں اور ابلیسی نظریات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور یہ ایک فطری بات بھی ہے۔ کیوں کہ جو دین آخری دین ہو اور امت آخری امت ہو۔ اس کے لیے یہ قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور زمانوں سے اس کا واسطہ رہے اور اس کو ان حالات کا سامنا کرنا پڑے گا جو کسی دوسری امت کو پیش نہ آتے ہوں گے۔ کیوں کہ چراغ مصطفویؐ سے شرار بولہبی کی ستیزہ کاری اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود دین اسلام کی تاریخ اور اس کا وجود۔

اگر ایک طرف باطنیت اور اس کی شاخیں اسلامی روح اور اس کے عقائد کے لئے خطرہ تھیں تو دوسری طرف صلیبیوں کی یورش اور تاتاریوں کا حملہ تھا تو کبھی تحریفات، تاویلات، بدعات، عجمی اثرات، مشرکانہ اعمال و رسوم، مادیت، نفس پرستی، تعیشات، الحاد ولادینیت اور عقلیت پرستی کی یورش جس کا مقابلہ اپنے اپنے زمانوں کے علماء طاقتور اور دل آویز اسلامی شخصیتوں نے پوری قوت کے ساتھ کیا جو جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت اور اندھیرے کے لیے اپنی اپنی آستینوں میں ید بیضا لئے بیٹھے تھے

اور بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی روشن کئے ہوئے تھے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز حضرت حسن بصری، حضرت امام احمد بن حنبل، امام غزالی، حضرت شیخ عبد القادر جیلانی، علامہ ابن جوزی، جلال الدین رومی، ہندوستان میں خواجہ معین الدین اجمیری، خواجہ بختیار کاکی حضرت مجدد الف ثانی، خواجہ نظام الدین اولیاء خواجہ فرید الدین گنج شکر، خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی وہ نفوس قدسیہ ہیں جن کے بارے میں کہا گیا ہے۔ ؎

تیرا جلال و جمال مرد خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سر کلیم و خلیل

حضرات! ہر عہد میں جاہلیت نئے رنگ و روپ میں ظاہر ہوتی رہی ہے۔ آج کھلی وثنیت ذہنی معنوی اور تہذیبی ارتداد کا خطرہ ہے وحدت ادیان، احیائے پرستی کی اور قوم پرستی کی پکار ہے۔

زمانہ کے نئے ابو الفضل و فیضی کا سامنا ہے ان تمام زہریلے دھاروں اور سیلاب کے لیے سد سکندری یہ اسلامی مدارس ہیں جہاں قلب و نگاہ ذہن و دماغ ڈھلتے ہیں اور جہاں نبوت محمدی کی ابدیت پر یقین اور زندگی کا نمونہ پایا جاتا ہے۔ مدارس سے بڑھ کر دنیا میں کون سا متحرک اور معروف ادارہ ہے جسکا سر اکار نبوت سے بندھا ہوا ہے۔ اور جو نبوت محمدی کے چشمۂ حیواں سے پانی لیتا ہے اور زندگی کے کھیتوں کو سیراب کرتا ہے مدارس اپنا کام چھوڑ دے تو زندگی کی یہ کھیتیاں سوکھ جائیں مدارس کو ہی قدم قدم پر زندگی کا جائزہ لینا ہے نئے نئے فتنوں کا مقابلہ کرنا ہے بہکے ہوئے قدموں کو صحیح راستہ پر لگانا ہے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو جمانا ہے مدارس کا تعلـ

خودکشی کے مترادف اور انسانیت کے ساتھ بے وفائی کے ہم معنیٰ ہے

پھر وہ مدرسہ جہاں صرف کلام اللہ کے حفظ و درس کا بندوبست کیا گیا ہو جو علوم الٰہیہ و شریعتِ محمدی کا مصدرِ حقیقی ہے اس کی پاکیزگی و نورانیت کے دائرہ و ہالہ کی کشادگی کا اندازہ کس پیمائش سے کیا جا سکتا ہے

یہ وہی کلام ہے جسکی عظمت و اہمیت کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اللہ کا کلام ہے۔ اللہ کی حقیقی صفت ہے اس دنیا میں جو کچھ بھی ہے حتیٰ کہ خانہ کعبہ، انبیا علیہم السلام کی مقدس ہستیاں، عرش کرسی لوح و قلم یہ سب اپنی عظمتوں و اہمیت کے باوجود مخلوق ہیں۔ لیکن قرآن مجید اللہ کی حقیقی صفت ہے جس کی شیرنی و نمکینی تاثیر و تسخیر دوست و دشمن موافق و مخالف شاہ و گدا عالم و جاہل سب کو یکساں فریفتہ کئے ہوئے ہے حکما، فلاسفر، ادبا، اہل لغت، مفسرین، محدثین، فقہا، صوفیا، شعرا، متکلمین غرض نوع انسان کی وہ کونسی صنف ہے جس نے ایک امی کے زبان سے ادا ہوئے۔ الفاظ و پیغام کے عشق و محبت میں اپنا سرمایہ حیات قربان نہیں کر دیا۔ اور یہ وہی کتاب ہے جو قانون و شریعت بھی ہے اخلاق و موعظت بھی مناجات قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی اور دیگر کتب الٰہیہ کی مجموعی صفات کی حامل بھی عین اس وقت جبکہ اور کتب الٰہیہ تحریف و تغیر سے اپنی اصل زبان اور الفاظ کھو چکی ہیں۔ قرآن مجید کا ایک ایک حرف ایک ایک لفظ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور جو اپنی زندگی کے لیے نقوش و حروف کا محتاج نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کے پاکیزہ سینے اس خزانہ کی حفاظت کے لیے صندوق بن گئے ہیں۔

ملا علی قاریؒ نے ایک حدیث سے نقل فرمایا ہے کہ جس شخص نے کلام پاک

حاصل کر لیا اس نے علوم نبوت کو اپنی پیشانی میں جمع کر لیا۔

حضرت ابن عمر سے منقول ہے کہ: حضورؐ نے ارشاد فرمایا: کہ رشک دو شخصوں کے علاوہ کسی اور میں جائز نہیں ایک وہ جس کو اللہ نے قرآن شریف کی تلاوت عطا فرمائی ہے اور وہ دن رات اس میں مشغول رہتا ہو اور دوسرا وہ شخص جس کو اللہ نے دولت عطا فرمائی ہے اور وہ اس کو خیر کے کاموں میں خوب خرچ کرتا ہو۔

حضرت ابن عمر سے مروی ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جس طرح کہ لوہے کو پانی سے، دریافت کیا گیا کہ دل کی صفائی کا کیا طریقہ ہے ارشاد فرمایا گیا موت کو اکثر یاد کرنا اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا۔

ہمارے حضرت مولانا گنج مرادآبادی" فرمایا کرتے تھے کہ قرآن شریف پڑھنے سے اللہ میاں دل پر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔

حضرات: غیر دینی تعلیم نے صرف عقلی اور ظاہری تربیت کی طرف توجہ دی ہے جس کی عقل باریک ہے مگر روح تاریک ہے جس کا چہرہ بارونق مگر بصیرت اندھی ہے بے یقینی اس کا حاصل محرومی اس کی قسمت ہے اور جسکے زہریلے اثرات لات و منات کی در آمد میں بھی کوئی عار نہیں محسوس کرتے اور جو فرزند حرم کو بھی سجدہ ہائے صنم سے متنفر نہیں کرتے۔

آج پھر شرک جلی اصنام پرستی اور دیومالائی عقائد کی شب تاریک اور نور محمدیؐ کو نہ صرف یہ کہ کمزور بلکہ اس پر چھا جانا چاہتی ہے۔ اس زہر کا تریاق اس اندھیرے کا اجالا یہی قرآن پاک کی تعلیم اور اسلامی درسگاہیں ہیں۔ اور زمانہ کی صدا و پکار۔ ان ہی مدارس سے پھر ہے۔

کانپتا ہے دل تیرا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تو بحر تو کشتی بھی تو ساحل بھی تو

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

رمضان المبارک کا پیغام

ہندوستانی مسلمانوں کے نام

الحمد للہ نحمدہ ونستعینه ونستغفره ونومن به ونتوکل علیه
ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یهده اللہ
فلا مضل له ومن یضلله فلا هادی له ونشهد ان لا اله الا اللہ و
نشهد ان سیدنا ومولانا محمدا عبده و اهل بیته و بارك و
سلم تسلیما کثیرا کثیرا ۔ اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم ؁
یا ایها الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم
لعلکم تتقون ۔

روزے کی فرضیت میں انسانی فطرت کی رعایت

میرے دینی بھائیو ! بزرگو اور عزیزو ! میں نے ابھی آپ کے سامنے قرآن کریم کی وہ آیت پڑھی ہے ۔ جس سے رمضان المبارک میں روزہ کی فرضیت کا اعلان ہوا اور تمام مسلمانوں کو اس زمانے کے مسلمانوں کو اسی آیت سے علم ہوا ، اور قیامت تک

یہی ہمت اس کی دلیل رہے گی۔ اس میں کچھ باتیں ہیں سوچنے اور غور کرنے کی، نکتہ کی، پہلے ہم اس کا تجزیہ کریں گے، پھر ایک خاص بات کی طرف اشارہ کریں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔"

اس خطاب میں بڑی بلاغت وحکمت ہے کہ ایک ایسی چیز جو نفس پر شاق ہے، دشوار ہے، جس کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت ہے، اس کی بنیاد ایمان کو بنایا گیا اور پہلے ایمان کا تذکرہ کیا گیا کہ اے لوگو! جو ایمان لا چکے ہو، اللہ تعالیٰ کی تمام باتوں کو قبول کرنے کا عہد کر چکے ہو۔ اور دائرہ اسلام میں داخل ہو چکے ہو۔ اور اپنے کو [redacted] کہ ہم اس پر عمل کریں گے، اس سے مطلب نہیں کہ اس میں کچھ مزہ ملے گا۔ یا نہیں۔ دنیاوی فائدہ ہوگا یا نہیں، وہ آسان ہے یا مشکل ہے، ایک بات ہے یا دس باتیں ہیں، ایک مرتبہ کرنا ہوگا، دس یا بیس مرتبہ کرنا ہوگا۔ سو، پچاس مرتبہ کرنا ہوگا، اس سے کوئی بحث نہیں ہم نے اللہ کی غلامی قبول کر لی اس کی عبودیت کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیا اور اعلان کر دیا کہ ہم جو حکم دے گا ہم اسی پر عمل کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کی حکیم ذات ہی اس حکم کو اس طرح شروع کر سکتی ہے ورنہ دنیا کے جو قوانین ہیں، جن باتوں کا حکومتیں اعلان کرتی ہیں۔ اور جو نئے نئے قوانین بنتے ہیں، جو نئی نئی پابندیاں عاید ہوتی ہیں، ان کے لیے کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ کروگے تو بچ جاؤگے، ایسا عمل نہ کروگے تو سزا پاؤگے بس، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، حالانکہ وہ حاکم مطلق ہے زمین وآسمان کو پیدا کرنے والا ہے۔ اور سب کی زندگیاں، سب کی جانیں، سب عزتیں اسی کے قبضہ میں، کسی طرح کہہ دیتا، کہہ سکتا تھا، اس کا حق تھا لیکن اس نے

یا ایھا الذین آمنوا

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔

تو اللہ تعالیٰ نے ہم تمام مسلمانوں کی قوتِ ایمانی کو آواز دی ہے' قوت ایمانی کو جگایا ہے اور اس کو بنیاد بنایا ہے' اے وہ لوگو! جو اس بات کا عہد کر چکے ہو کہ ہمیں تو بات ماننا ہے' ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ "کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم" تم پر روزے فرض کئے گئے' جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے۔

یہ انسان کی فطرت ہے' اللہ تعالیٰ فطرتِ انسانی کا بنانے والا اس کا خالق ہے' اس کی رعایت کرنے والا بھی ہے کسی مجبوری سے نہیں' اپنی حکمت سے بھی اپنی رحمت سے بھی' کہ جب وہ کسی بات کا حکم دیتا ہے' تو اس بات کے لیے زمین تیار کر دیتا ہے کہ انسان اس کو آسانی سے قبول کر سکے اس لیے کہ انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اسکو انوکھی اور نرالی معلوم ہوتی ہے' اس سے گھبراتا ہے' چونک اٹھتا ہے' اچھا یہ بھی کرنا ہوگا۔ لیکن جب اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ ہوتا آیا ہے لوگ کرتے رہے ہیں۔ تو پھر وہ اس کو سنتا ہے خوشگواری کے ساتھ مانتا ہے اور آسانی کے ساتھ تابعداری کے ساتھ

اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسے کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض تھے' چنانچہ' مذاہب اور اخلاقیات کی تاریخ سے اور قوموں اور ملکوں کی تاریخ سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ ہر مذہب میں کسی نہ کسی شکل میں روزہ رہا ہے' مذہبی تاریخی کتابوں میں تفصیل موجود ہے' کہ اس کی کیا شکل اور کیا تعداد تھی' کیا وقت' کہاں سے شروع ہوتا تھا کیا پابندیاں تھیں' یہ ایک علمی تاریخی مسئلہ ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ لعلکم تتقون۔ تاکہ تم متقی بن جاؤ۔

تقوے کا صحیح مفہوم:

یہاں ایک بات کی طرف توجہ دلانی ہے جب کسی زبان کا لفظ کسی زبان میں آتا ہے' تو اکثر ایسا ہوتا ہے' کہ وہ اپنے اصلی معنی کھو دیتا ہے' اور اس

کے ساتھ ذہن کے سوچنے کے بہت سے طریقے لگ جاتے ہیں، انہیں میں سے ایک لفظ تقویٰ اور متقی کا ہے، ہمارے یہاں متقی کے معنی ہیں بڑا عبادت گزار، راتوں کو بہت کم سوتا ہو اور نہ سوتا ہو تو اور زیادہ متقی ہے، اور نہ کھاتا ہو، اور اگر وہ مسلسل عبادت کرتا ہو۔ تو اور بڑا متقی ہے، اور کثرت سے نماز پڑھتا ہو نماز ہی میں اس کا دل لگتا ہو جب دیکھو نماز پڑھ رہا ہے تو اور بڑا متقی ہے اور ذرا ذرا سی چیزوں میں شبہ سے بچتا ہو۔ متقی ہے لیکن عربی میں جہاں سے یہ لفظ آیا ہے تقویٰ کے معنی زیادہ عبادت گزار اور زیادہ شب بیدار کے نہیں ہیں، کہ بڑا عبادت گزار، شب بیدار، دن کو روزے رکھنے والا رات کو عبادت کرنے والا نمازیں پڑھنے والا، بلکہ عربی زبان میں "تقویٰ" کے معنی ہیں، لحاظ کرنے والا، ہر کام کے کرتے وقت یہ لحاظ کرنا کہ یہ کام کیسا ہے، خدا کو راضی کرنے والا ہے یا ناراض کرنے والا ہے، جائز ہے یا ناجائز، دین کے مطابق ہے یا منافی۔

"تقویٰ" کے معنی ہیں لحاظ و شرم کی عادت، پاس و لحاظ کی عادت پڑ جانا مثلاً کوئی بچہ ہے، اس کو اگر صحیح تعلیم دی گئی ہے، اسے اچھا ماحول ملا ہے، اور اس کی صحیح تربیت کی گئی ہے۔ بڑوں کا ادب کرنے لگتا ہے، بڑوں کا ادب کسے کہتے ہیں کہ بڑوں کے سامنے کوئی ایسا کام، ایسی حرکت نہیں کرے گا جو بے ادبی شمار ہو، جس سے ان بڑوں کی توہین ہوتی ہو۔ یا ان بڑوں کا مذاق اڑتا ہو۔ ہوتی ہو، تو کہا جائے گا اس لڑکے کو بڑا پاس و لحاظ ہے، ادب سیکھ گیا ہے، ایسے طالب علم کا ادب و لحاظ ایسے ہی مرید کا ادب و لحاظ، ایسے ہی ملازم کا ادب و لحا تقویٰ کے معنی ہیں ادب و لحاظ کے کام کرنے سے پہلے یہ سوچنا کہ یہ کام کیسا ہے، خوش کرنے والا ہے یا ناراض کرنے والا ہے۔ اور اگر دین و شریعت کے مطابق ہے

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق ہے یا نہیں اس کی عادت
ڑ جانا، یہ ہے تقویٰ، چنانچہ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو فاروق
عظم اور امیرالمومنین ہیں، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد صحابہ کرام میں
سب سے بڑا درجہ انہی کا ہے۔ مسلمانوں کے خلیفہ تھے، امیرالمومنین تھے، قرآن مجید
ن کے سامنے ہی نازل ہوا اور پھر اہل زبان ہیں اور اہل زبان بھی کیسے ہیں کہ اس
مانہ کی ٹکسالی زبان جو ہر زمانہ میں معتبر رہے گی، سکہ رائج الوقت کی طرح، وہ وہاں پلے
ڑھے، وہی زبان بولنے والے اور صحابہ کرام وہ تھے کہ کسی چیز کو پوچھنے میں ان کو کوئی
شرم نہیں آتی تھی، وہ ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے، کہ اپنے علم کو صحیح کریں، اور
ڑھائیں، تو انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود کا نام لے کر کہا۔ یہ بتاؤ کہ تقویٰ
کسے کہتے ہیں، تو انہوں نے کہا امیرالمومنین! آپ ایسے راستہ پر چلے ہیں کہ دونوں
ف کانٹوں کی باڑ لگی ہو (ادھر بھی کانٹوں کی قطار ادھر بھی کانٹوں کی قطار ہے)
راستہ تنگ، حضرت عمرؓ نے فرمایا ہاں! ایسا اتفاق ہوا ہے، انہوں نے کہا پھر
، کیا کیا، حضرت عمر نے فرمایا، دامن سمیٹ لیا، آستین وغیرہ دیکھ لی کہ کہیں
یں پھنس نہ جائے، کہا: یہی تقویٰ ہے کہ زندگی اس طرح گزاری جائے
ایسا نہ ہو کہ کوئی کام ایسا کر بیٹھے جو خدا کو ناراض کرنے والا ہو، مسئلہ کے خلاف
کز ہو، تو اس آیت میں جس میں بہت سے لوگ غور نہیں کرتے کہ عربی زبان کے
سے واقف نہیں ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ روزے اس لئے فرض کئے گئے کہ ہم
ی جائیں، کہ ۲۹ دن یا ۳۰ دن روزے رکھے گا۔ رمضان ختم ہو گیا۔
اند نکلنے لگا تو وہ متقیوں میں ہو گیا، "اللہ اکبر" کہ جس نے دن کو روزہ رکھا
ا نہیں، اور کئی کئی قرآن شریف ختم کئے، رات میں عبادت کی اور تراویح کی

یہ متقی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امتحان میں پاس ہو گیا چھٹی ملی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ رمضان کے مہینہ میں حلال پاک و طیب چیز میں رمضان کے دن کے اوقات میں اللہ کے حکم سے، اللہ کی مرضی سے پاک و صاف چیزیں چھوڑیں، ایک دن دو دن نہیں ۲۹ دن ۳۰ دن پانی نہیں پیا، حالاں کہ پانی سب سے بڑی نعمت ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے کہ ہم نے پانی ہی سے ہر زندہ چیز پیدا کی ہے۔

اور کھانا نہیں کھایا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دیا تھا، گھر میں وہ چیزیں موجود تھیں حلال کمائی سے تھیں، لیکن نہیں کھایا، کیوں نہیں کھایا، کیوں نہیں پیا، وہ چیزیں جو انسان بحیثیت انسان کے اور بشری تقاضوں کے کرتا ہے، تعلقات بھی اس میں ہیں، "تصرفات" بھی اس میں ہیں، اس میں عمل بھی ہیں، یہ سب چیزیں ہم نے چھوڑیں محض اللہ کے حکم سے، کہ اللہ تعالیٰ نے صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک حلال و پاک چیزوں کے استعمال سے بھی روکا ہے کہ تمہارے حلق سے پانی کا ایک قطرہ نہ اترنے پائے، تمہارے حلق میں کھانے کا ایک دانہ نہ جانے پائے۔ تو جب ہم نے اللہ کے حکم سے یہ پاک طیب چیزیں چھوڑیں ہیں تو اب جب رمضان المبارک ختم ہو گیا تو اس سے یہ بات بھی ہم میں واضح ہو جانی چاہیئے کہ جو ناپاک چیزیں ہیں، اور ناپاک کیا ہیں؟ ہم آپ سمجھتے ہیں کہ جیسے گندگی لگ جائے، گندی چیز پڑ گئی، وہ ناپاک ہو گئی جبکہ سب سے بڑی ناپاک یہ چیز گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے۔

تو جس طرح ہم نے اللہ کے حکم سے رمضان کے دنوں میں حلال و پاک طیب چیزیں چھوڑیں تو اسی طرح اللہ کے حکم سے غیر رمضان کے دنوں میں گناہوں کا ارتکا

ہے کریں، ہم اللہ کو ناراض کرنے والی چیزیں کیوں کر گزریں۔ ہم جھوٹ کیوں بولیں
جھوٹی گواہی کیوں دیں ؟ ہم کسی مسلمان کی طرف آزاری کیوں کریں ! ہم کسی کا حق
وں ماریں، ہم بہتان کیوں لگائیں، ہم چوری کیوں کریں، ہم ظلم کیوں کریں، ہم
سی کا خون کیوں بہائیں، ہم کسی کا دل کیوں توڑیں لیں، ساری چیزیں جو آپ
نتے ہیں ان چیزوں سے بچنے کی عادت، خیال و دھیان پیدا ہو جائے، یہ ہے
توئی یہ ہے رمضان کا مقصد، اور یہ تو بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ اللہ کے حکم سے ہم نے
نی چھوڑا، کھانا چھوڑا۔ اب اللہ کے حکم کے باوجود ہم چوری کریں، ہم جھوٹی گواہی
یں۔ ہم کسی کی زمین پر قبضہ کریں، ہم کسی کا حق ماریں ہم بہن کو، بھتیجی کو، خالہ کو
ر میراث نہ دیں، ہم شادی بیاہ کے معاملات میں شریعت کے خلاف کریں۔ ہم
فضول خرچی کریں۔ ہم رشوت لیں، ہم اسراف میں مبتلا ہوں ہم جہیز کا مطالبہ کریں، اولا
ں کے لیے جائز تک نے لیں اللہ تعالیٰ ہم سے رمضان کے ان ۲۹ ، ۳۰ دنوں میں طیب
ل نعمتیں چھڑا کر، خاص وقت میں چھڑا کر ہماری مشق کراتا ہے۔ کہ ہم گناہوں کے
رتکاب سے بچیں، اور اب جو کام بھی کریں، خیال کر کے کریں، پہلے سوچ لیں کہ یہ
شریعت کے مطابق ہے یا نہیں، بس میرے بھائیو! رمضان المبارک کا سب سے
بڑا فیض اور اثر یہ ہونا چاہیے کہ ہمیں خیال کرنے کی عادت پڑ جائے، اور خدا
کی نافرمانی سے اور اس کی منع کی ہوئی چیزوں سے بچنے کا خیال پیدا ہو جائے
یہ نہیں کہ ہم بے خیالی میں کر گزریں اور پھر یہ بہانہ کر کے یہ سمجھیں کہ رمضان تو ہو گیا
ہم نے کھایا پیا نہیں، روزے ہمارے پورے ہو گئے اور یہ تو دنیاوی چیزیں ہیں۔
ان سے روزوں کا کیا تعلق، یہ تو زندگی کی چیزیں ہیں۔ بس اللہ جل شانہٗ ہم سے
یہ مشق کرانا چاہتا ہے کہ ہماری یہ مستقل عادت پڑ جائے کہ ہم ہر کام کے کرنے سے

پہلے یہ سوچ لیں، ہم یہ نہیں کہتے کہ آپ گھر سے نکلئے تو سوچ کر قدم اٹھائیے۔ یہ نہیں، مطلب یہ ہے کہ جس کا تعلق حکم شرعی سے ہو کسی کا حق متعلق ہو، اور حرام حلال کا مسئلہ، جائز و ناجائز کے دائرہ میں وہ آتا ہو، اس کو بغیر سوچے نہ کریں اور یہ معلوم کر کے یہ اللہ کو پسند نہیں ہے اور یہ شریعت کی طرف سے ممنوع ہے، اس سے اسی طرح بچیئے بلکہ اس سے زیادہ بچیے جتنے کہ روزے کے دنوں میں رمضان کے زمانہ میں دن کے اندر آپ کھانے سے بچتے ہیں، اس سے زیادہ اس سے بچیں۔

رمضان المبارک کا اصل پیغام:

دیکھیے! ہم آپ کو ایک بات نکتہ کی بتاتے ہیں۔ اسے لے کر جائیے انشاء اللہ عمر بھر کے لیے کافی ہوگی، اور صحابہ رضی اللہ عنہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کرتے تھے کہ دین کے احکام بہت ہو گئے ہیں، کوئی ایک بات ایسی بتلائیے جو جامع ہو جیسے ہم پلّو میں باندھ لیں گے ـــــ اسی طرح ہم آپ سے ایک بات کہتے ہیں کہ ساری زندگی کے لیے ایک دستور العمل ہے وہ کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ

(تم میں سے کوئی شخص صاحب ایمان نہیں ہو سکتا، مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفسانی اس کی دل کی چاہت، اس کے دل کی مانگ، طبیعت کی مانگ تابع نہ ہو جائے اس کے جس کو میں لے کر آیا ہوں) اور دیکھیے! کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کے اخلاق اتنے بلند و عالی نہیں تھے۔ کوئی اپنی عبدیت پا اتنا فخر نہیں کرتا تھا، لیکن یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واحد متکلم کا صیغہ اختیار کیا اور اپنی طرف نسبت کی ہے، اور اس میں تمام وزن پیدا کر دیا ہے جس کا

ذوق رکھنے والے اور اسرارِ شریعت کے جاننے والے سمجھ سکتے ہیں، آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ جب تک وہ اپنی خواہشاتِ نفسانی کو اللہ کے احکام قرآن و حدیث کے تابع نہ کردے، لیکن یہاں پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا جو مقام تھا اور آپ کی نبوت کا جو حق تھا اور آپ کی نبوت کا درجہ تھا، اور اس میں اس وقت مخاطب کی نفسیات کا اور اس کے فہم کا اور ذوق کا بھی آپ نے خیال فرمایا، کہ کم ایسا حدیثوں میں آتا ہے کہ آپ صیغۂ واحد متکلم بولتے ہوں جیسا کہ یہاں پر لَا یُؤمِنُ اَحَدُکم حتیٰ یکون ھواہ تبعًا لما جئتُ بہٖ "میں تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن، صاحبِ ایمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہشاتِ نفسانی اس کے تابع نہ ہوجائے جس کو میں لے کر آیا ہوں، محمد بن عبداللہ جس کو لے کرکے آئے ہیں" کہ آپ نام لے لیتے محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب لے کر کے آئے ہیں۔ اس کے تابع نہ ہوجائے" اس لیے اس کے اندر ایک خاص قسم کی طاقت پیدا کردی اس جملے میں غیرتِ نبوت ہے۔ اللہ کی غیرت کے بعد کوئی بھی غیرت اس کے برابر نہیں بادشاہوں کی غیرت اس غیرت کے سامنے گرد۔ یہاں غیرتِ نبوت ہے جس کو میں لے کر آیا ہوں، جس نے اس کے خلاف کیا، گویا کہ اس نے میری غیرت کے خلاف بغاوت کی، میرے منصبِ رسالت سے اس نے سرتابی کی۔

ہم لوگوں کو چاہیے کہ ہر کام کے کرنے سے پہلے یہ خیال کرلیں، ہم اسے اپنی خواہشاتِ نفسانی سے کر رہے ہیں، اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان، آپ کی شریعت اور قرآن و حدیث کے خلاف تو نہیں ہے۔ ساری زندگی کے لیے کافی ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ کسی نے کھانے پر بلایا یہ حضورؐ کے فرمان کے خلاف تو نہیں ہے۔ وہ کام جن سے لوگوں کے حقوق متعلق ہوں، جن سے نفس کا تقاضہ پورا ہو

یا کوئی بڑا دنیاوی فائدہ حاصل ہوتا ہو۔ جس کے لیے کوئی بڑا اقدام کرنا پڑتا ہو اس سے پہلے یہ سوچ لیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو دین اور جو شریعت لے کر آئے ہیں اس کے یہ تابع اور ماتحت ہے یا اس سے یہ مستغنی اور بے نیاز ہے بس ساری زندگی کے لئے کافی ہے کوئی مرید ہوتا ہے کوئی شاگرد ہوتا ہے، کوئی خط غلامی لکھتا ہے، یہ خط غلامی ہے، یہ مستقل خط غلامی ہے اسکے سامنے مریدی، شاگردی، سب گرد ہیں اس لئے کہ یہاں پر نبوت کا سوال آگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت نبی کے فرمایا، بحیثیت کسی انسان کے نہیں فرمایا تم میں سے کوئی ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفسانی اس چیز کے تابع نہ ہو جائے جس کو میں لے کر آیا ہوں کوئی بادشاہ ہو اپنے وقت کا سلطان ہو، کوئی بڑے سے بڑا فاتح ہو، کوئی بڑے سے بڑا اپنے وقت کا قارون و ہامان ہو، کچھ ہو، سب کے لیے ضروری یہ ہے کہ آپ جو لے کر کے آتے ہیں اس کے ماتحت اپنی زندگی کو کر دے۔ اس کے خلاف نہ ہو۔

اس کو آپ رمضان کا پیغام سمجھیں، یہی رمضان حقیقتاً بہار کا زمانہ ہے، اور وہ اس مہینہ میں عمل صالح کے میدان میں اتنی طویل مسافت طے کر لیتے ہیں جس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، ان کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی اور چیز دیکھ رہے ہیں۔ اور کوئی چیز سن رہے ہیں، ان کا جسم ضرور یہاں ہے لیکن ان کا دل کسی اور جگہ ہے، وہ ایک ایک لمحہ اور ایک ایک سانس کی قیمت سمجھتے ہیں۔ اور غیر دینی مشغولہ ان کے لیے اس زمانہ میں انتہائی ناگوار اور شاق ہوتی ہے۔

اور اگر ہم کچھ بھی کوشش کریں اور جن چیزوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس مہینہ میں اہتمام کریں اور یہ سمجھ کر کچھ دن محنت کریں کہ یہ شب و روز رہے ہیں دوبارہ لوٹنے والے نہیں تو اللہ تعالی کی رحمت کاملہ سے امید

وہ ہماری دستگیری کرے گی اور ہمارے وہ سب کام آسان کردے گی جو آج ہمیں اپنی کمزوری کی وجہ سے پہاڑ معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے لیے طلب صادق دل دردمند اور کچھ سعی وعمل شرط ہے اگر یہ موجود ہے تو ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا دریائے رحمت اس وقت بھی جوش مار نے کے لیے تیار ہے اور اسکی لطف و کرم بڑے بڑے آلودہ دامنوں اور غفلت شعاروں کو قسمت آزمائی کا دعوت دے رہی ہے، اور ان کے انفعال و ندامت کی بڑی سے بڑی قیمت لگا رہی ہے۔ ؎

ھنوز آں ابر رحمت درافشان است
خم و خمخانہ با مہر و نشان است

فارم ۴ تحت ضابطہ ۸

تحت یادداشت ملکیت وغیرہ برائے ماہنامہ شاداب حیدرآباد (اے پی)

مقام اشاعت : دفتر شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد (اے پی)

اوقات اشاعت : ماہانہ

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر اور مالک کا نام اور پتہ اور قومیت } محمد قمرالدین صابری
147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد (اے پی)

میں محمد قمرالدین صابری اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق بالکل درست ہیں۔

محمد قمرالدین صابری یکم اپریل ۹۲ء

محمود انصاری ایڈیٹر روزنامہ منصف حیدرآباد

ڈیوڈ سے داؤد

داؤد۔ آر۔ میتھیوز کا نام ۱۹۷۱ء تک ڈیوڈ آر میتھیوز تھا۔ لیکن اس سال وہ آکسفورڈ (انگلستان) میں مشرف بہ اسلام ہو گئے اور ڈیوڈ سے داؤد بن گئے۔ گزشتہ ماہ جنوری کے دوران ریاض (سعودی عرب) میں ایک ملاقات کے دوران انھوں نے بتایا کہ ۲۲ سال کی عمر تک وہ ایک عیسائی نوجوان کی حیثیت سے چرچ آف انگلینڈ سے وابستہ تھے لیکن اس وقت بھی وہ عیسائیوں کے خدا کی پرستش کے تصور اور حضرت یسوع مسیح کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ انھوں نے موروثی گناہ کے فلسفہ پر شک و شبہ ظاہر کیا۔ انہیں عیسائی کلیسا کا سارا نظام غیر ضروری نظر آنے لگا۔ جب یہ شکوک تقویت پانے لگے تو وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ اگر میں چرچ جانے کا سلسلہ جاری رکھوں تو منافق یا فریبی بنوں اور انہیں چرچ میں "خدا" نہیں ملا۔ انھوں نے چرچ جانا بند کر دیا۔ بعض پادریوں سے اس بارے میں تبادلہ خیال کیا تو انھوں نے کہا "بیٹے، تمہیں ان سب باتوں پر ایمان رکھنا چاہیئے۔ اگر تم اس قسم کے دلائل پر غور کرتے رہے تو اس بات کا خطرہ ہے کہ تم چرچ سے باہر ہو جاؤ گے" وہ اس نتیجہ پر بھی پہونچ گئے کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ آیا واقعی خدا کا وجود بھی ہے یا نہیں۔ مسٹر میتھیوز نے بتایا کہ اس کے بعد ۸ سال تک انھوں نے رسمی طور سے کسی مذہب

وابستگی کے بغیر دنیا کے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا اور ان مذاہب کے پیروؤں سے یہ معلوم بھی کیا کہ ان کے مذہب کی کیا خصوصیات ہیں۔ ان مذاہب میں رومن کیتھولک، یہودیت، شنتو، بدھ مت، ہندو مت، تاؤازم، کنفیوشینزم اور سوئیڈن بورجیز شامل تھے۔ انہیں احساس ہونے لگا کہ ان مذاہب میں وہ بات نہیں ہے جس کی انہیں تلاش تھی۔ ۱۹۶۸ء کے دوران ۳۰ سال کی عمر میں وہ اعلیٰ توانائی سے متعلق فزکس لیبارٹری میں ملازمت کے دوران سینٹ ہاسٹل میں مقیم تھے جہاں ہندوستان، پاکستان اور ایران سے تعلق رکھنے والے افراد کے علاوہ مقامی افراد بھی رہتے تھے۔ عشائیہ کے بعد ہم سیاست اور مذہب کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے تھے کسی نے اسلام کا تذکرہ کیا تو مجھے کچھ دلچسپی ہوئی میں قریبی شہر آکسفورڈ گیا اور مرکز معلومات میں دریافت کیا کہ آیا آکسفورڈ میں کوئی مسجد ہے۔ انہوں نے ایک ایسے شخص کا نام دیا جو ممکن ہے کچھ مدد کرسکے۔ وہ شخص ایک انگریز تھا۔ جس نے قریباً ۲۰ سال قبل اسلام قبول کیا تھا۔ مسٹر میتھیوز نے ان سے یہ بھی کہا کہ وہ نہیں جانتے کہ وہ مذہب اسلام قبول کریں گے یا نہیں کیوں کہ اس تعلق سے فیصلہ حصول معلومات کے بعد ہی ممکن ہے انہوں نے ہفتہ میں دو شام ان کے ساتھ گذارنے کا اہتمام کیا۔

قریباً ۶ ماہ بعد میں ان کی امامت میں نماز پڑھنے لگا روزہ رکھنے لگا اور زکواۃ ادا کرنے لگے ایک رات انہیں بالکل نیند نہیں آئی اور ان کے ذہن میں یہ الفاظ گونجنے لگے "تم صاحب ایمان ہو" صراط مستقیم سے نہ ہٹو" یہی راستہ وحدانیت کی طرف جاتا ہے" مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی میں بیٹھ گیا۔ روشنی کی اور اس فقرہ کو لکھ دیا اس کے ساتھ ہی میرے اندر کی کشمکش ختم ہوگئی اگلی صبح میں نے تجزیہ کیا مجھے سکون ملا اور میں اسلام کی راہ پر گامزن ہوگیا۔ ڈیڑھ سال تک اسلام کی راہ پر چلنے کے بعد

۱۹۷۱ء کے دوران میں رسمی طور پر مشرف بہ اسلام ہو گیا ہم نے ہاسٹل میں تبادلہ خیال کا سلسلہ جاری رکھا ایسی ہی ملاقاتوں کے درمیان میری ملاقات ایک ایسی لڑکی سے ہوئی جو میری ہم خیال نظر آئی۔ ہم ایک دوسرے کی باتوں کے صحیح معنی سمجھنے لگے تھے کسی نے ایسی صورت حال کو ذہنی ملاپ قرار دیا ہے۔ میں کوئی نوجوان لڑکا نہیں تھا۔ یہ خاتون ایم۔ فل کرنے کے بعد پاکستان چلی گئیں۔ ہماری خط و کتابت جاری رہی جس میں انہیں اسلام کے بارے میں اپنے تجربات سے واقف کراتا۔ ایک سال بعد مجھے ان کے ارکان خاندان سے ملاقات کے لیے پاکستان مدعو کیا گیا۔ جہاں ان کے ارکان خاندان سے میرے خوشگوار روابط قائم ہوئے۔ میں نے ان سے شادی کی خواہش ظاہر کی۔ چناں چہ ۱۹۷۳ء میں ہماری شادی ہوئی۔ یہی وہ خاتون ہیں جن کی اسلام کے بارے میں کسی فقرہ سے میں اس عظیم الشان مذہب کی طرف متوجہ تھا۔ ۱۹۷۴ء میں مجھے یونی ورسٹی آف پٹرولیم اینڈ منرلس طہران سعودی عرب میں ملازمت ملی اور ۱۹۷۶ء میں میں ریاض منتقل ہوا۔ جہاں کنگ سعود یونیورسٹی کے کمپیوٹر سنٹر میں منیجر ٹکنیکل سروسیس کی حیثیت سے برسر خدمت ہوں ان کی بیوی مسز انیس میتھیوز نے پاکستان سے نیوکلیر فزکس میں ایم ایس سی اور انگلستان سے ایم فل کیا۔ وہ کنگ فیصل یونیورسٹی دمام میں لکچرر ہیں۔ مسز انیس داود میتھیوز ہر ہفتہ خواتین کے لیے وعظ کا اہتمام کرتی ہیں۔ مسٹر میتھیوز نے یہ بھی بتایا کہ انگلینڈ میں ان کی ۹۰ سالہ ضعیف والدہ اور بھائی بہنوں نے ان کے تبدیلی مذہب پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ مسٹر میتھیوز نے اسلام صرف یونہی قبول نہیں کیا بلکہ سوچ سمجھ کر مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اور ان کی رفیق حیات دل و جان سے تبلیغ اسلام کے لیے وقف ہو گئے ہیں۔ مسٹر میتھیوز نے یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ گذشتہ سال خلیجی جنگ

کے دوران سعودی عرب میں متعینہ امریکی فوج میں تبلیغی سرگرمیوں کے نتیجہ میں ۵ ہزار امریکی فوجی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس کی تفصیل یہ بتائی کہ ابتدائی مرحلہ پر تو اکثر و بیشتر سیاہ فام فوجیوں نے اسلام قبول کیا لیکن بعد ازاں سفید فام فوجی بھی بڑی تعداد میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ غالباً خلیجی جنگ کا یہ ایک مثبت ترین پہلو ہے۔ جس سے لوگ ناواقف ہیں مسٹر میتھیوز نے کہا کہ سعودی عرب میں اسلامی طرز زندگی رہنے سے بیرونی باشندے متاثر ہیں۔ مسٹر میتھیو ریاض میں ۷۶ ارکان پر مشتمل تبلیغی کمیٹی کے رکن بھی ہیں۔ ان کی کوششوں سے سعودی عرب کے مشرقی صوبہ کے علاوہ خود انگلینڈ میں بہت سے لوگ مشرف بہ اسلام ہو چکے ہیں۔ ابھی حال ہی میں انہوں نے سابقہ سوویت یونین کی مسلم جمہوریتوں کا دورہ کیا۔ جہاں کمیونزم کے خاتمہ کے بعد ۷۰ سال تک اسلام سے بے تعلق رہنے کے باوجود لوگ اسلام کے قریب آگئے ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ تاشقند، سمرقند، بخارا اور کئی دوسرے شہروں میں مساجد میں مصلیان بڑی تعداد میں آرہے ہیں۔ مسٹر میتھیوز نے رائے بھی ظاہر کی کہ اگر ترکی اور سعودی عرب زیادہ دلچسپی لیں تو یہ مسلم جمہوریتیں پھر اسلامی ممالک میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ مسٹر میتھیوز سے میں نے دریافت کیا کہ انہیں اسلام اور عیسائیت میں کیا فرق نظر آیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اسلام ایک مکمل طرز زندگی ہے جبکہ عیسائیت "ہفتہ میں ایک دن یعنی اتوار" کا مذہب ہے جب عیسائی کلیساؤں کو ترجیحاً جاتے ہیں مسٹر میتھیوز ہندوستان کا بھی دورہ کر چکے ہیں۔ جہاں وہ بمبئی اور ناگپور گئے ہیں۔ ان کی رفیقہ حیات کا خاندان ناگپور سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ مسٹر میتھیوز ابھی تک حیدرآباد نہیں آسکے لیکن اپنے اگلے دورہ ہند کے دوران حیدرآباد آنے کا ارادہ رکھتے ہیں مسٹر میتھیوز امریکہ کا بھی دورہ کر چکے ہیں

حکیم عبدالقوی دریابادی

عصمت چغتائی

مشہور فحش نگار اور ترقی پسندوں کی سرتاج عصمت چغتائی تقریباً ۸۰ سال کی طویل عمر پاکر اس دنیا سے رخصت ہوگئیں اور انہیں ان ہی کے حسب وصیت مسلمانوں کی طرح دفن نہیں کیا بلکہ جلایا گیا۔ ترقی پسند حلقوں میں ان کا ماتم ہو رہا ہے اور ان کا شمار سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کی صف میں کیا جا رہا ہے حالانکہ وہ اپنی فحش اور اخلاق سوز تحریروں میں ان سب سے بدرجہا بڑھی ہوئی تھیں۔ ان کا بدنام ترین جنسی افسانہ "لحاف" جن کو ان کے ادب یا بے ادبی کا شاہ کار کہا جاتا ہے۔ خشونت سنگھ کے سے صحافی نے (جن کی تحریروں میں شہوانیت عموماً نمایاں رہتی ہے) اسے فحش قرار دے کر اسے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا۔ افسانہ کی اشاعت کے بعد اس کے خلاف مقدمہ بھی چلا۔ بھلا ہو رائج الوقت قانون کی بے بضاعتی کا کہ عدالت نے ان کو بری کر دیا۔ ایک شریف اور معزز مسلم گھرانہ میں پیدا ہونے اور نشو و نما پانے کے باوجود ان کے قلم کی اٹھان اسلامی اور اخلاقی قدروں سے بغاوت کا تھا اور اسی کو ان کا سرمایہ کمال تصور کیا گیا ان کی کتابیں "ضدی" اور "چوٹیں" سب اسی رنگ کی تھیں اپنے حقیقی بھائی اور اپنی دلچسپ تحریروں میں انتہائی بے اعتدالی برتنے والے اور مذہبیات و اخلاقیات سے تمسخر کرنے والے مرزا عظیم بیگ چغتائی مرحوم (جو کو فقط

سے قبل توبہ اور رجوع کی توفیق ہو گئی تھی) کے انتقال پر اپنے مضمون "دوزخی" میں ان کا خاکہ جس بے باکی سے پیش کیا اور جس طرح ان کی زندگی اور مرض موت جس میں انہیں بدترین قسم کے جسمانی آزار جھیلنے پڑے تھے۔ ان کا تفصیلی نقشہ عبرت کے لہجہ میں نہیں بلکہ خالص ترقی پسندانہ مضحک لہجہ میں پیش کیا ان کے مرنے پر ان کے مداح 'مضمون نگاروں نے اس کی خصوصی داد دی اور ایسی باغی خاتون جو مرد کے تابع نہیں رہنا چاہتی تھی اور مرد کو اپنے سے اعلیٰ وارفع تو کجا مانتی بلکہ موقع ملنے پر اس کی تذلیل پر بے دھڑک اتر آتی تھی' ان کے پس مرگ قدردانی کرنے والوں میں سے ایک نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۹۳۰ء میں جس فساد کی بنیاد انہوں نے ڈالی تھی اس کی چنگاریاں ان کے مرتے دم تک پرتصنع سماج (ظاہر ہے کہ اس سے مراد مسلم معاشرہ ہی ہے) کی زبوں حال قدروں کو خس و خاشاک کی طرح جلاتی رہیں انہوں نے ریڈیو پر کبھی کبھی تقریریں کیں ان میں بھی وہ اپنے اسی مخصوص اسٹائل میں مرد ذات کو گالیاں دیتی رہیں۔ اور اس کے تفوق سے انکار کرتی رہیں۔

مذہب اسلام سے ان کو کتنا لگاؤ تھا اور آزادی کے بعد مسلمانانِ ہند کو کن حالات سے گزرنا پڑا اس کے بارے میں ان کے ایک مداح کا یہ چونکا دینے والا انکشاف بھی پڑھ لیجئے۔

"عصمت آپا وطن پرست تھیں اور سیکولر مزاج۔ ایک مرتبہ (ان کے مرحوم) شوہر شاہد لطیف نے ان سے کہا چلو پاکستان چلتے ہیں عصمت چغتائی نے فوراً کہا کہ اگر زیادہ لو گے تو میں ہندو ہو جاؤں گی انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یہاں ہمارے ملک ہندوستان میں مجھے کہیں متعصبانہ رویہ کی شکایت کا موقع نہیں ملا۔

انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ میں نے بھگوت گیتا کا بہت گہرائی سے

مطالعہ کیا اور میرے نزدیک یہ دنیا کی سب سے اہم ترین کتاب ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ گیتا میں دنیا کے (WISDOM) عقل و فکر کا نچوڑ موجود ہے۔

ان خیالات کی حامل عورت نے اگر یہ وصیت کی کہ مرنے کے بعد اسے ہندوؤں کی طرح جلایا جائے تو اس پر کسے تعجب ہو سکتا ہے۔ حمید دلوائی اور شری چھاگلہ اس سے قبل ایسی ہی وصیت کر کے اپنے وارثوں سے اس پر عمل کرا بھی چکے تھے۔ البتہ حمید دلوائی نے موت سے کچھ قبل یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ میں سرے سے مسلمان ہی نہیں ہوں۔

زندگی بھر اردو زبان میں لکھنے والی اور اس کی ادیبہ شمار ہونے والی اس خاتون نے ایک ترقی پسند شاعر مجروح سلطان پوری کے ساتھ یہ مشورہ پوری بلند آہنگی کے ساتھ دیا تھا کہ اردو کے موجودہ رسم خط کو دیو ناگری میں تبدیل کر کے لسانی جھگڑے کو ختم کر دیا جائے ان کی اس تحریک پر شدید ردعمل ہوا اور حد یہ کہ ترقی پسند ادیبوں کی اکثریت نے بھی اسے ٹھکرا دیا لیکن باغیانہ فطرت والی عصمت چغتائی اپنی اس رائے پر اٹل رہیں۔ ہندوؤں کی مذہبی کتاب گیتا جسکی انہوں نے اتنی تعریف کی بہرحال اخلاق کی ایک اعلیٰ کتاب ہے اسکو سمجھکر پڑھنے کے بعد ان کے قلم سے اس قسم کے خرافات اور فحشیات کا نکلنا اور زیادہ حیرت انگیز ہے آخر زمانہ میں انھوں نے ایک فنا لوجی نشست کی صدارت کرتے ہوئے عریانی کی تائید میں یہ فقرہ بھی کہہ ڈالا تھا کہ "قدرت نے ہمیں کبھی پائجامہ پہنا کر نہیں پیدا کیا ہے"۔

غالباً تعمیر حیات کو چھوڑ کر شاید ہی مسلمانوں کے کسی اخبار یا رسالہ نے ان خرافات کی فحش نگاری اور اس کے نتیجہ میں ان کا جو انجام خود ان ہی کے حسب وصیت جلائے جانے کی شکل میں ہوا۔ اس پر قلم اٹھانے کی کوئی ضرورت محسوس کی۔

علی مصری
سنٹرل یونیورسٹی
گچی باؤلی، حیدرآباد

سخنورانِ گجرات
ایک جائزہ

"سخنوران گجرات" اصل میں ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کا پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ ہے جو انہوں نے پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے زیر نگرانی ۱۹۴۷ء کے اواخر میں بمبئی یونیورسٹی میں داخل کیا تھا اور ۱۹۴۸ء میں انہیں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری دی گئی تھی۔ ڈاکٹر مدنی نے لکھا ہے۔

"چند سال قبل جب مقالے کی اشاعت کا ارادہ کیا تو نظر ثانی کی گئی۔ نظر ثانی میں اتنی کتر بیونت عمل میں آئی کہ مقالہ نے نئی شکل اختیار کر لی۔" ؎۱

[سخ]نوران گجرات میں ساڑھے چار صفحات کے اظہار ممنونیت" چار صفحات کے [پیش لفظ] تقریباً ۲۰ صفحات کے مقدمے اور ۹ صفحات کے سیاسی سماجی پس منظر" کے بعد [...] صفحات میں ادبی تبصرے کے بشمول جن شاعروں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ گجرات کے [...] ہیں۔ جیسے شیخ احمد کھٹو، باجن، قاضی محمود دریائی، شاہ علی محمد جیو گام دھنی، [...] شاہ حسینی، شیخ خوب محمد چشتی، اور سید حسن جی، مگر دوسرے باب کے "دھاتی [...] سیاسی سماجی پس منظر ۱۶۵۷ء تا ۱۷۰۷ء کے اختتام کے ساتھ ہی ڈاکٹر مدنی نے

؎۱ [سخ]نوران گجرات' سید ظہیر الدین مدنی' مطبوعہ ترقی اردو بیورو' نئی دہلی' ۱۹۸۱ء ص ۱۳

ولی کے بارے میں زورِ قلم صرف کیا ہے۔ ساڑھے چار صفحات کے اس تذکرے میں انہوں نے اپنی کتاب "ولی گجراتی" اور مضمون اختر جوناگڑھی سے استفادہ کیا ہے۔ ولی کی وطنیت کے بارے میں ان کی کتاب "ولی گجراتی" کا پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا۔ ولی کے بعد انہوں نے اشرف کا تذکرہ کیا جو صفحات ۸۹ تا ۹۰ کو محیط ہے اور اشرف کو گجراتی ثابت کرنے کی سعی ناکام کی ہے۔ خود انہوں نے گلشن گفتار میں اشرف کے تذکرے کا اعتراف کیا ہے۔ گلشن گفتار میں لکھا ہے۔

"محمد اشرف/ اشرف تخلص گجراتی بلا واسطہ شاگرد ولی محمد طبع رنگین داشت
شعرش در نواح گجرات شہرت دارد و دیوان لطیف تصنیف نمودہ" ۱

اشرف کا تذکرہ نصیر الدین ہاشمی نے "دکن میں اردو" کے صفحات ۳۳۱ تا ۳۳۳ میں لکھا ہے اور نمونۂ کلام بھی دیا ہے۔ اشرف کے مرثیہ کا ایک شعر واضح طور پر یہ داخلی شہادت پیش کرتا ہے کہ وہ دکنی تھا۔ یہ شعر "سخنورانِ گجرات" کے صفحہ (۹۰) "دکن میں اردو" کے صفحہ ۳۳۲ اور دکنی ادب کی تاریخ کے صفحہ (۱۰۲) میں موجود ہے

کہیا ہوں بے بدل یو مرثیہ جیب سوں اماموں کا
ہوا اشتاق ہر ایک شاعر ملک دکن میرا

یہ شعر صحیح صورت میں "دکنی ادب کی تاریخ" میں ملتا ہے۔ "سخنورانِ گجرات" میں "ہر ایک" چھپا ہے، اور "دکن میں اردو" میں مصرع اول یوں چھپا ہے۔

۱۔ سخنورانِ گجرات، سید ظہیر الدین مدنی، مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۸۱ء ــــــ ص ۹

کھا پھول بے بدل یوں مرثیہ جب سوں اماموں کا

ہاشوف دکنی تھا اس کا ایک ثبوت ان اشعار میں بھی ملتا ہے جو "سخنوران گجرات" کے صفحہ (۹۰) پر ملتے ہیں۔

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے "ولی گجراتی" میں "رضی" کا نام "حافظ تقی الدین" لکھا ہے (صفحہ ۹۲) مگر "سخنوران گجرات" میں محمد رضی بتایا ہے (صفحہ ۹۰)

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے "سخنوران گجرات" کے صفحہ ۱۲۰ تا صفحہ ۱۲۲ عبدالولی عزلت کا تذکرہ کیا ہے انہوں نے لکھا ہے۔

"تخلص عزلت تھا مگر عزلت نشین نہیں تھے۔ ۱۷۹۰ء تا ۱۱۶۴ھ میں عزلت نے دہلی کا سفر کیا تھا اور دہلی جانے سے قبل نظام الملک کے عہد میں اورنگ آباد بھی گئے تھے۔ آزاد بلگرامی کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے کہ عزلت ۱۷۵۶ء ۱۱۶۶ھ میں دہلی میں تھے۔ دہلی سے یہ مرشد آباد گئے جہاں علی وردی خاں مہابت جنگ ان کا قدردان تھا مہابت جنگ کے انتقال کے بعد عزلت نے دکن کا رخ کیا۔ حیدرآباد میں صلابت جنگ نے انہیں دو گاؤں بطور وظیفہ دیئے گئے تھے عزلت نے آخری بیس سال حیدرآباد میں گذارے اور ۱۶ رجب کو ۱۷۷۵ء / ۱۱۸۹ھ وفات پائی۔ ان کا مزار میر مومن کے دائرہ میں واقع ہے" [1]

اس اقتباس کی پہلی سطر میں ۱۷۹۰ء غالباً کتابت کی غلطی ہے ۱۷۵۴ء کا محل ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عزلت نے اپنی زندگی کا ایک معتدبہ حصہ (۲۰ برس)

---

[1] "سخنوران گجرات" سید ظہیر الدین مدنی، مطبوعہ ترقی اردو بیورو ——— صفحہ ۱۲۱

کو (کچھ عرصہ) حیدرآباد ہی میں گزارا۔ آخر یہیں رحلت کی اور مدفون ہوئے۔ چنانچہ اس حقیقت کے باوجود کہ عزلت ۱۶۹۲ء/۱۱۰۴ھ میں بمقام سورت (گجرات) میں پیدا ہوئے ("سخنوران گجرات" ص۱۱۷) انہیں گجراتی نہیں کہا جاسکتا البتہ گجراتی نژاد تو کہا جاسکتا ہے۔ مگر ان کا وطن دکن ہی قرار پائے گا۔

ڈاکٹر مدنی نے "سخنوران گجرات" کے باب سوم میں عبیداللہ شاہ تجرد کا تذکرہ کیا ہے اور میر کے "نکات الشعراء" کے حوالے سے تجرد کو عزلت کا شاگرد بنایا ہے۔ توثیق مزید کے لیے حدیقۂ احمدی کا بھی حوالہ دیا ہے۔ جس میں تجرد کو شاگرد عزلت قرار دیا گیا ہے ۔

تجرد کے سلسلے میں قدیم دور کے دیگر شاعروں کی طرح کئی ناگزیر امور پوشیدہ ہی میں ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ کب پیدا ہوئے اور خاندان کی تفصیلات کیا ہیں، مگر اس کے باوجود یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ محض عمر کا ایک حصہ چونکہ انہوں نے سورت میں گزارا اس لیے ڈاکٹر مدنی نے ان کا تذکرہ گجراتی شاعروں میں کر دیا ہے۔ چونکہ ہم خود مذکورہ الصدر ملکی قواعد کے فرمان کے پیش نظر اسی بات کے قائل ہیں، اس لیے تجرد کی ڈاکٹر مدنی کی وضع کردہ وطنیت کو تسلیم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر مدنی نے "سخنوران گجرات" کے ص۱۲۵ پر پیر محمد شاہ اقدس کا تذکرہ کیا ہے۔ اقدس ۱۵ر شعبان ۱۱۰۱ھ/۱۶۸۹ء میں بیجاپور (دکن) میں پیدا ہوئے اور ۲۶ر جمادی الاول ۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ یہاں بھی مدنی صاحب نے پیر محمد شاہ اقدس کے دکن میں پیدا ہونے کے باوجود چونکہ ان کی "عمر کا بڑا حصہ احمد آباد میں گزرا"

---

۱ سخنوران گجرات، سید ظہیر الدین مدنی (ص۱۴۲)

سخنوران گجرات صفحہ ۱۲۵) اس لیے اس مسلمہ معیار وطنیت کے تحت کہ آدمی کہیں بھی پیدا ہو
س کی عمر کا بڑا حصہ خصوصاً آخری اور مقام رحلت و تدفین ہی کی اساس پر توطن قرار پاتا
ہے۔ اور اس کا ذکر گجراتی شاعروں میں کیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ بالکل ٹھیک ہے
یسے ہی جیسے غالب اکبرآباد میں پیدا ہوئے لیکن دہلی میں بودوباش اختیار کی اور وہیں
فن ہونے کے باعث دہلوی کہلائے۔
ڈاکٹر مدنی نے کسی بھی باب میں "سیاسی سماجی پس منظر" کے تحت لکھے جانے
الے واقعات کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔
"سخنوران گجرات" میں جہاں غیر گجراتی شاعروں پر وقت صرف کیا گیا ہے
اور کئی غیر معروف شعراء پر بھی تحقیقی صلاحیت کا استعمال کیا گیا ہے بعض گجراتی
مور خاندانوں کے تذکروں میں غیر ضروری امور پر بھی درج کر کے کتاب کی ضخامت
بڑھائی گئی ہے۔ وہیں یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ اس پوری کتاب میں کہیں بھی
مین گجراتی جیسے بلند آہنگ و پُر گو شاعر کا نام تک نہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا
کہ یہ مقالہ ۱۹۷۷ء میں مکمل ہوا اور اس وقت تک کئی شاعروں پر تحقیقی کام
ہوا ہی نہیں تھا۔ کیوں کہ یہ مقالہ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا اور خود مدنی صاحب
لکھتے ہیں۔
"نظر ثانی میں آتی کتر بیونت عمل میں آئی کہ مقالے نے نئی شکل اختیار
کرلی"۔ ۱

اس کے باوجود ۱۶۷۵ء تا ۱۷۰۰ء کے عہد میں صرف ولی، اشرف، رضی، تنہا،
دق فراقی، راجا رام، احمد احمدی، صباق احمد آبادی ہی کا تذکرہ پیش کرتے ہیں۔

---

۱ "سخنوران گجرات" سید ظہیر الدین مدنی — (صفحہ ۱۲۰)

تبصرے میں بھی تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھتے حتیٰ کہ ۲۰ صفحاتی مقدمے میں بھی کہیں امین گجراتی کا ذکر نہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق۔

"گودھرا کے رہنے والے امین گجراتی اورنگ زیب کے آخری دور میں ۴۳ عنوانات کے تحت اپنی ۱۱۴۴ اشعار پر مشتمل مثنوی "یوسف زلیخا" ۱۱۰۹ھ / ۱۶۹۷ء میں مکمل کی اور اپنی زبان کو گوجری کے لفظ سے موسوم کیا۔" ۱

"محمد امین گجراتی کے ایک ہم عصر محمد فتح بلخی نے جو گودھرا ہی کے رہنے والے تھے امین کی فرمائش پر ایک مثنوی "یوسف ثانی" کے نام سے تصنیف کی" ۲

پروفیسر نجیب اشرف ندوی نے لکھا ہے:

امین گجراتی مصنف "یوسف زلیخا" "تولد نامہ" کا دعویٰ ہے
ہر ایک جگہ قصہ ہے فارسی میں امین اس کو اتارے گوجری میں"
یہ مثنوی سنہ ۱۱۰۹ھ/۱۶۹۸ء میں مکمل ہوئی ۳

ان اقتباسات میں ۱۱۰۹ھ کے متوازی سنہ یا تو ۱۶۹۷ء یا پھر ۱۶۹۸ء لکھا ہے جو غلط ہے ۱۱۰۹ھ جولائی ۱۶۹۷ء تا جون ۱۶۹۸ء کو حاوی ہے۔ اس لیے کوئی ایک سنہ نہیں دیا جا سکتا۔ ۱۱۰۹ھ کے متوازی سنہ کے طور پر ۹۸-۱۶۹۷ء لکھا جانا چاہیئے تھا۔ حفیظ انصاری نے لکھا ہے۔

۱؎ تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۶ء جلد اول طبع دوم ص ۱۳۹
۲؎ تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر جمیل جالبی، مطبوعہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۶ء جلد اول طبع دوم ص (۱۴۳)
۳؎ علی گڑھ تاریخ ادب اردو۔ (ص ۹۷)

(سلسلہ ص ۳۴ پر)

محمد قمر الدین صابری
ایڈیٹر "شاداب"

"پنچھی باورا"

"پنچھی باورا" ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کے افسانوں کا مختصر مجموعہ ہے

ڈاکٹر بانو طاہرہ ایسی تخلیق کار ہیں جنہوں نے نظم و نثر دونوں میں اپنے کمالِ فن کا جادو جگایا ہے۔ نظم میں ہر موضوع پر خیال آرائی کی ہے اور ترجمہ جو ایک مشکل فن ہے اس میں بھی انگریزی سے سلیس اور با محاورہ ترجمہ کر کے زبان و بیان پر اپنے ماہرانہ عبور کا ثبوت دیا ہے۔ نثر میں بڑوں کے لیے لکھنے کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے بھی ایک دلچسپ کہانی لکھ کر انعام بھی حاصل کیا ہے ڈاکٹر بانو طاہرہ کئی زبانوں میں لکھتی ہیں لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو میں زیادہ لکھتی ہیں۔ اور محترمہ کی اردو تخلیقات کا اعتراف کیا جا کر ان پر انعامات بھی دیے گئے ہیں۔ ہماری اسٹیٹ بلکہ ملک میں ڈاکٹر بانو طاہرہ کو جس طرح بین الاقوامی اعتراف حاصل ہوا ہے۔ وہ شاید کسی اور ادیب یا تخلیق کار کو حاصل نہیں ہوا ہے۔

"پنچھی باورا" ڈاکٹر بانو طاہرہ کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے۔ موصوفہ کا افسانوی کا پہلا مجموعہ "خونِ جگر" ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا تھا۔ پورے دس سال بعد اب مارچ ۱۹۹۱ء میں یہ دوسرا مجموعہ منظر عام پر آیا ہے۔ جس میں

ٹائٹل افسانہ "پنچھی باورا" کے علاوہ دس افسانے اور شامل ہیں ہر افسانہ سلاست وروانی کا ایک نمونہ ہے۔ جس میں موصوفہ نے اپنے احساسات و مشاہدات کا بڑے عام فہم انداز میں اظہار کیا ہے۔ بانو ایک خاتون ہیں اور انھوں نے خواتین ہی کے مسائل پر یہ افسانے لکھے ہیں۔ ایک خاتون جب خواتین کے مسائل پر لکھے سنجیدہ اور پروقار انداز میں لکھے اور اپنے علم و فن اور تجربہ کو بھرپور انداز میں کام میں لائے تو ایسی تخلیق کو قبول عام کی سند ملنا غیر متوقع نہیں ہے

"پنچھی باورا" پہلا ٹائٹل افسانہ افلاطونی محبت کا اظہار ہے۔ محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔ پاسبانِ عقل سے بچ کر دل جب کہیں آ جاتا ہے تو نتائج کی پروا نہیں کرتا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے سچ لکھا ہے "پنچھی باورا چاند سے پریت لگائے" دوسرا افسانہ "یقین آئے نہ آئے" میں ایک ماورائی کیفیت بیان کی گئی ہے جس پر کم لوگ یقین کرتے ہیں مگر یہ ایک حقیقت ہے اور ڈاکٹر صاحبہ نے یہ افسانہ لکھ کر اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ "دو سہیلیاں" میں گیتا اور شمیم فیملی پلاننگ پر گفتگو کرتی ہیں۔ اس میں بانو نے اپنا شعر

ہوئے شادی کو پانچ سال مگر
ماں کی آغوش میں ہیں چھ بچے

میں واقعاتی صورت حال بیان کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے کہ

جانور بھی اصول رکھتے ہیں
وقفہ موسم قبول رکھتے ہیں
کس قدر بدنصیب ہیں وہ لوگ
فیملی جو فضول رکھتے ہیں

حیرت زدہ" میں جہیز کے لالچی کامران کو اپنی پسند کی لڑکی ملتی ہے اور نہ جب جائداد لڑکی۔ نتیجتاً یہ جہیز زدہ لڑکا حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ دوسرے کے اسے پڑھ کر " اگلا گرا پچھلا ہوشیار" کے مصداق سنبھل سکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحبہ نے ایرانِ قدیم کی ایک داستان " ابتدائے عشق" بھی بیان کی تو ...یں بھی اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ کہ شادی سے پہلے لڑکے لڑکی کو ملنا ...ہیے۔ ایک قدیم پر محبت اور پر اثر قصہ کو بیان کرتے ہوئے یہ بتا دیا ہے کہ ...جوانوں میں یہ پختگی نہیں ہوگی کہ اپنے طور پر لڑکا لڑکی مل کر صحیح تصفیہ کر سکیں۔ ...مسئلہ کو اپنے بزرگوں پر چھوڑ دینا ہی نفع بخش ہوتا ہے کہ وہ تمام حالات دیکھ کر رشتہ کا تصفیہ کرتے ہیں۔ " انتظار" میں بہت پہلے رشتہ طے کر لینے ...اس کے ایک عرصہ کے بعد شادی کرنے کی خرابیوں کا ذکر ہے۔ اس سے کئی ...جنس پیدا ہوسکتی ہیں اور ہوتی ہیں۔ گو یہ ایک طربیہ کہانی ہے مگر اس خوشگوار ...نے کے لیے کافی " انتظار" کرنا پڑا۔ اگر قبل از قبل دوسری جگہ رشتہ طے نہ ہو جاتا ...تو ...نتظار کی زحمت نہ ہوتی۔

"پنچھی باورا" میں ایک نہایت مختصر منظوم افسانہ بھی شریک ہے جس میں ...کے نوجوان کی کھوکھلی زندگی اور ہرجائی پن کا بیان ہے۔ بیوی نے شوہر کے ...کا یقین تو کر لیا لیکن اصلاح حال کی طرف رجوع کرنے کی بجائے اپنے مقدر ...تابع ہو بیٹھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ شوہر کو راہ راست پر لانے کے لیے ...ہمت باندھتی۔ مگر لطیف طنز۔

کس قدر قابلِ رشک ہے زندگی !

...ہی اکتفا کیا اور جد و جہد کا مشکل راستہ اختیار کرنے کی بجائے بے عملی کو اپنا مقدر

بنالیا۔ خبر نہیں ڈاکٹر صاحبہ نے اس منظوم افسانے میں ایسا شکست خوردہ کردار کیوں پیش کیا۔ جب کہ انہوں نے "عورت کی دشمن عورت" میں عورت کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے عورت کی دکھتی رگ پر بھی اپنا ہاتھ رکھا ہے۔ غرض ڈاکٹر صاحبہ نے اپنے تمام افسانوں میں سماج خصوصاً عورتوں کے اصلاحی اور افادی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور تقریباً سبھی مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ یقین ہے کہ یہ مجموعہ اردو قارئین خصوصاً خواتین میں پسند کیا جائیگا۔

بقیہ۔ "سخنوران گجرات" صفحہ ۳۰ سے آگے

"دبستان گجرات کا اولین نمائندہ شاعر امین گجراتی ہے اس کی مستقل تصنیف مثنوی "یوسف زلیخا" ہے" ۱؎

اس تناظر میں "سخنوران گجرات" جیسی کتاب میں امین گجراتی کا عدم تذکرہ بڑا کھٹکتا ہے۔ گودھرا احمد آباد سے ۶۵ کیلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ ایک مشہور صنعتی شہر ہے۔

ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی نے کتاب کی فہرست عہدواری بنیادوں پر ترتیب دی ہے۔ قاری کو گجرات سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شاعر کا تذکرہ دیکھنے کے لئے پوری کتاب کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے۔ بہتر ہوتا اگر ایک مبسوط قسم کا اشاریہ بھی دے دیا جاتا۔

۱؎ مضمون "گوجری، گجری یا بولی گجرات" مشمولہ ماہنامہ شاعر جلد ۵۲، شمارہ ۶/ ۵ (۱۹۸۱ء، صفحہ ۸)

نعیم الدین رضوی

نصابی کتابوں پر نظرثانی ورکشاپ

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں

این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کی درسی کتابوں کا ورک شاپ کا افتتاحی جلسہ آج بتاریخ ۲۵/۱۱/۹۱ء کانفرنس ہال جامعہ ملیّہ اسلامیہ میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کا اہتمام ورک شاپ کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر عنوان چشتی اور ڈاکٹر محمد صابرین ریڈر (این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی) نے کیا۔ جلسے کا افتتاح فرماتے ہوئے جامعہ کے وائس چانسلر پروفیسر مجیب رضوی نے فرمایا کہ ہائی اسکول کے لیے نصابی کتابیں تیار کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ایک سبق ایک طرح کے طلبا اور طالبات کے لیے آسان ہو سکتا ہے جب کہ وہی دوسرے طلبا اور طالبات کے لیے مشکل ثابت ہو سکتا ہے۔ انھوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ایسی کتابیں تیار کرتے وقت موضوعات اور مواد نیز مقصد کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے ادیبوں اور شاعروں کو نہیں۔ ورک شاپ کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر عنوان چشتی نے کہا کہ این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی اردو کی نصابی کتابوں کی تیاری کرتی ہے لیکن جامعہ ملّیہ اسلامیہ نے شروع ہی سے تعلیم کے میدان میں تعمیری تجربوں کا خیر مقدم کیا ہے یہ تجربے استادوں کے مدرسے اور جامعہ کی سطح کے شعبۂ اردو میں لگاتار ہوتے رہے ہیں۔ اس لیے این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کا یہ ورک شاپ جامعہ کی سرزمین پر کامیاب رہے گا ڈاکٹر خلیق انجم سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نے کہا کہ [illegible] این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی

کی نصابی کتب کی تیاری کے سیمناروں اور ورک شاپوں میں شریک ہوتا رہا ہوں اپنے تجربے کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک مفید اور موزوں قدم ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے کہا کہ یہ ورک شاپ بہت اہم ثابت ہوگا۔ اس ورک شاپ میں ہم اپنے کاموں کا جائزہ لیں گے۔ خاص طور پر نویں کلاس کے لیے جو کتاب تیار کی گئی تھی اس کی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیں گے۔ ڈاکٹر محمد صابر نے کہا کہ ۱۹۸۳ء سے تاحال این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی کا شعبۂ اردو لگاتار اردو کی نصابی کتابوں کی تیاری میں مصروف ہے۔ ہم لوگ اس نوع کے سمینار اور ورک شاپ ملک کے مختلف حصوں میں منعقد کرتے رہتے ہیں۔ جس کے خاطر خواہ مفید نتیجے نکلے ہیں۔ ڈاکٹر خالد محمود نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ اپنی نوعیت کا واحد ورک شاپ ہے۔ اس لیے نصابی کتابوں کے سلسلے میں اس ورک شاپ کی سفارشات بہت وقیع ہوں گی۔ اس ورک شاپ کو کامیاب بنانے میں ڈاکٹر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر خالد محمود اور نعیم الدین رضوی نے خاص حصّہ لیا۔

بقیہ ۔ "ڈیوڈ سے داؤد" (صفحہ ۱۷ سے آگے)

جہاں اسلام سب سے تیزی سے پھیلنے والا مذہب ہے۔ مسٹر میتھیوز کی یہ رائے ہے کہ امریکہ اور سابق سوویٹ یونین دونوں ممالک میں ۵ سال کے اندر اسلام اکثریتی مذہب بن سکتا ہے لیکن عیسائی مشنری اسے روکنے کے لیے ضرور سازشیں منظم کریں گے۔ مسٹر میتھیوز الحمدللہ دو مرتبہ حج اور ۵۰ مرتبہ عمرے کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔

مصطفیٰ شروانی

ہماری سماجی سرگرمیاں

سال ۱۹۹۱ء کا اختتام حیدرآباد میں اردو زبان کے استحکام میں ممد و معاون ہونے والے ایک ستون کے گر جانے سے ہوا۔ جب بھی حیدرآباد میں اردو زبان کی ترویج کا تذکرہ ہوگا یہاں کے زعما جناب نواب سعید جنگ بہادر مرحوم جناب نواب ناظر یار جنگ بہادر مرحوم جناب سید سجاد مرزا مرحوم والد معظم پدما بھوشن جناب پروفیسر ہارون خاں شروانی مرحوم، مولوی عبدالحق، جناب پروفیسر حبیب الرحمن صاحب کے دور کے بعد جو اہم شخصیت ہمیشہ نمایاں رہے گی وہ جناب ڈاکٹر حسینی شاہد کی اردو زبان کے لیے بے لوث خدمات کی یاد تازہ رکھے گی۔

۲۲ر ڈسمبر ۱۹۹۱ء کو ڈاکٹر حسینی شاہد اور محترمہ ڈاکٹر زینت ساجدہ کے فرزند جناب سجاد شاہد کا عقد مقرر تھا اس تقریب کے دوران ہی شہ کا محفل کو معلوم ہوگیا کہ ڈاکٹر حسینی شاہد بیحد علیل ہیں اور بقول ڈاکٹر سید عبدالمنان شاہد صاحب کی حالت نازک ہے۔ دوسرے روز شام کو ڈاکٹر حسینی شاہد کے دوسرے فرزند نیفی شاہد صاحب کا عقد مقرر تھا جسے حسینی شاہد صاحب کی بگڑتی ہوئی حالت کے پیش نظر بجائے شام کو منعقد کرنے کے صبح ۹ بجے مقرر کیا گیا مگر ڈاکٹر حسینی شاہد کا اُس روز صبح ۷ بجے انتقال ہوگیا اور مرحوم اپنے ساتھ حیدرآباد میں اردو ...

کے فروغ کی ایک پوری تاریخ لے گئے۔ تدفین مسجد الٰہی چادر گھاٹ کے قبرستان
میں ۲۳ ڈسمبر ۱۹۹۱ء کو ہوئی۔ مرحوم ڈاکٹر حسینی شاہد کے رفقا طلبا معتقدین اور متعلقین
کی کثیر تعداد نے بہ دیدہ نم اردو کے اس محسن کو سپرد خاک کیا۔ اردو ہال، اردو
آرٹس کالج، اردو ایوننگ کالج کے قیام اور استحکام میں ڈاکٹر حسینی شاہد
نے جس جانفشانی کے ساتھ جناب پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب اور دیگر رفقا
کے ساتھ تعاون کیا ان اداروں کے در و دیوار ہمیشہ اپنے ان کرم فرماؤں کی
یاد تازہ رکھیں گے۔ دوسرے فرزند شفیقی شاہد کی تقریب عقد سادگی کے ساتھ
۲ جنوری ۱۹۹۲ء کو منعقد ہوئی۔

۲۵ ڈسمبر ۱۹۹۱ء کو رویندرا بھارتی منی تھیٹر میں TELE FILM
"سہارا" کے مصنف اور ڈائرکٹر جناب اعظم شفیق اور فلم کے فنکاروں کی
تہنیتی تقریب بصدارت جناب تجمل حسین صاحب تہذیبی سفیر مقرر ہوئی یہ
TELE FILM دوردرشن کے قومی پروگرام میں دہلی سے ۱۸ دسمبر ۱۹۹۱ء
کو دکھائی گئی تھی اور اسکے تمام فنکار حیدرآباد کے ہیں۔ اس تقریب میں
جناب کے بھیم راؤ وزیر آندھرا پردیش، جناب بلبل پاشا صدر آندھرا پردیش
اردو اکیڈیمی جناب سدھاکر ریڈی چیرمین ٹورل ڈیولپمنٹ کارپوریشن
آندھرا پردیش، مصطفیٰ شرواتی، ٹھاکر ہری ناتھ سنگھ صدر نشین وقف بورڈ
بطور مہمان خصوصی شرکت فرمائی دوردرشن کیندر حیدرآباد کے پروڈکشن اکزیکیٹو
... سید امتیاز علی تاج صاحب بھی اسی پراثر محفل میں تشریف فرما تھے
... ریڈی اور عزت مآب جناب کے بھیم راؤ صاحب
... نے پر جناب اعظم شفیق صاحب

و مبارکباد دی۔ جناب مصطفیٰ شروانی نے پاکستان ٹی وی کے لیے تیار کی ہوئی امیر خسرو پر ایک TELE FILM کا تذکرہ کیا اور جناب اعظم شفیقی صاحب کے نقش اول "سہارا" کے بعد ایک اور زیادہ کامیاب نقش ثانی کے طور پر حضرت امیر خسرو پر ایک زیادہ پر اثر ٹیلی فلم بنانے کا مشورہ دیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں جناب تجمل حسین صاحب نے "سہارا" کے ڈائرکٹر جناب اعظم شفیقی کے اس کارنامہ پر مبارکباد دی اور کہا کہ اگر ایسی ٹیلی فلمیں تیار کی جائیں جنکے ذریعہ ملک میں یکجہتی اور باہمی بھائی چارہ کا پرچار ہو تو ملک اور قوم کے لیے ایسا اقدام مفید اور کارگر ثابت ہوگا۔ جناب اعظم شفیقی صاحب کے شکریہ اور مہمانان خصوصی کی گلپوشی کے بعد جلسہ کا اختتام عمل میں آیا اور آخر کار ٹیلی فلم "سہارا" دکھائی گئی۔

۲۹ دسمبر ۱۹۹۱ء کو مدینہ منشن نارائن گوڑہ میں اقبال اکیڈیمی کی جانب سے خصوصی محفل اقبال کا انعقاد عمل میں آیا جسکی صدارت پروفیسر تقی علی مرزا نے فرمائی۔ پروفیسر سراج الدین نے اقبال کی پر اثر نظم "مسجد قرطبہ" پر ایک جمالیاتی تبصرہ فرمایا جناب علی ظہیر نے اس نظم پر ایک تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ جناب ظہیر الدین احمد صاحب نے نظم "مسجد قرطبہ" کے پس منظر پر تبصرہ کیا۔ تقاریر کے بعد جناب سعید آرکیٹکٹ نے اپنے حالیہ دورہ بیت المقدس، مصر، دمشق، اسپانیہ، اشبیلیہ، غرناطہ کے دوران لی ہوئی تصاویر سے حاضرین کو متاثر اور ممنون کیا۔ اس موقعہ پر جناب سعید آرکیٹکٹ کی کاوشوں سے متاثر ہو کر مصطفیٰ شروانی نے ایک نادر و نایاب انگریزی تصنیف

سنہ ۱۹۱۲ء جو RROF. S. MRS. BERNARD WHYSHAW'S ARABIC SPAIN

میں لندن میں شائع ہوئی اور ۱۹۱۹ء میں مصطفیٰ شروانی کے تایا جناب نواب فیاض علی صاحب سابق رکن وائسرائے کاونسل نے لندن میں خریدی تھی جناب سعید آرکیٹکٹ کو بطور تحفہ پیش کی جناب سعید آرکیٹکٹ نے اس تصنیف کیلئے مصطفیٰ شروانی کا شکریہ ادا کیا۔

۵ر جنوری ۱۹۹۲ء کو جوبلی ہال میں انڈو عرب لیگ کی جانب سے مسئلہ فلسطین کے ساتھ ہندوستان کے کامل تعاون کا یقین دلانے ایک جلسہ بصدارت عزت مآب جناب پی راجندر ریڈی وزیر بھارتی مصنوعات حکومت آندھراپردیش منعقد ہوا اپنی افتتاحی تقریب میں جناب سید وقارالدین صدر انڈو عرب لیگ نے اس مسئلہ فلسطین کے خدوخال بیان کئے جناب چندرسریواستو، جناب ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے علاوہ عرب ممالک کے معزز سفراء سفیر فلسطین اور دیگر زعماء نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا اور ہندوستان کے مسلسل مسئلہ فلسطین پر تعاون کا اعتراف فرمایا۔ جناب معین فاروقی صاحب کے شکریہ پر جلسہ کا اختتام عمل میں آیا اللہ تمام حاضرین کی مشروبات سے تواضع کی گئی۔

۲۴ر جنوری ۱۹۹۲ء کو اردو ہال میں تمام اُردو اداروں کے نمائندہ جلسہ تعزیت میں جناب ڈاکٹر حسینی شاہد مرحوم کی خدمات کا اعتراف کیا گیا جناب ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب نے جلسہ کی صدارت فرمائی۔ جناب ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر انجمن ترقی اُردو، جناب هندر راج سکسینہ، جناب عاتق شاہ، مصطفیٰ شروانی اور دیگر معززین نے جناب ڈاکٹر حسینی شاہد مرحوم کی اردو زبان استحکام کے سلسلہ میں خدمات کا اعتراف کیا اور مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔

۹ر فبروری ۱۹۹۲ء کو دور درشن کیندر حیدرآباد کے وسیع اسٹوڈیو میں

محفل مشاعرہ کی ریکارڈنگ قومی پروگرام کے لیے عمل میں آئی اس کامیاب محفل سخن کی تزئین اور ترتیب کا سہرا دوردرشن حیدرآباد کے اگزیکیٹو پروڈیوسر جناب سید امتیاز علی تاج کے سر ہے۔ جن کی کوشش و کاوش سے اس محفل کا کامیاب انعقاد عمل میں آیا۔ آندھراپردیش کے گورنر عزت مآب جناب کرشن کانت اور لیڈی گورنر محترمہ سمن کرشن کانت نے بطور مہمان خصوصی شرکت فرمائی محفل مشاعرہ کا آغاز جناب رحمن جامی کی متاثر کن نظم سے ہوا۔ اس مشاعرہ کی ایک خصوصیت اہمیں جناب تاج مہجور مرحوم کی آخری بار شرکت اور بالکل آخری مرتبہ نظم اور غزل سے سامعین کو بیحد متاثر کرنا تھا جناب تاج مہجور کے ۱۷ فروری ۱۹۹۲ء کو اچانک حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال سے حیدرآباد نے ایک اور اردو شعر و سخن کا محسن کھو دیا۔ ٹی وی مشاعرہ میں جناب ڈاکٹر صادق نقوی جناب سعید شہیدی اور دیگر حیدرآباد کے جانے مانے شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ مدعوشعراء کا محفل میں جناب ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جناب منظور الامین صاحب سابق ڈپٹی ڈائرکٹر دوردرشن محترمہ رفیعہ منظور الامین صاحبہ مصطفیٰ شروانی، جناب معین فاروقی صاحب مدیر انگارے جناب منیر احمد صدیقی صاحب محترمہ ڈاکٹر حبیبہ ناصری صدیقی صاحبہ بھی اس محفل مشاعرہ میں شرکت فرمار ہے یہ ٹی وی مشاعرہ ۲۷ فروری ۱۹۹۲ء کو دہلی کے قومی پروگرام بھی دکھایا جانے والا تھا لیکن کسی ناگزیر وجہ سے اسی روز یہ دکھایا نہیں جاسکا۔

۱۶ فبروری ۱۹۹۲ء کو مدینہ مشن نرائن گوڑہ میں اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کی جانب سے محفل فکر منعقد ہوئی جس کا موضوع "ہندوستانی دستور میں سیکولرزم کا تصور اور ملک کا مستقبل" تھا۔ جناب عبدالرحیم قریشی معتمد عمومی کل ہند

مجلس تعمیرِ ملت اور سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے کلیدی خطبہ میں ملک کے سیاسی عمل اور فیصلہ سازی میں دائیں بازو کی بڑھتی ہوئی اہمیت کا اعادہ فرمایا۔ جناب رحیم قریشی نے دستور کی متعلقہ دفعات کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ سیکولرزم یکسانیت کا نام نہیں ہے، جناب پروفیسر احمد اللہ خاں، جناب پروفیسر رئیس خاں اور جناب محمد ظہیرالدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈیمی اور جناب ڈاکٹر جاوید عالم ہماچل پردیش نے موضوع اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ مباحث میں حصہ لیتے ہو مصطفیٰ شروانی کسی بھی دستور کی دو مختلف اور متضاد حیثیتوں کا تذکرہ کیا ایک حیثیت RIGID یعنی مختص اور دوسری FLEXIBLE یعنی لچکدار ہے۔ اور بتایا کہ ہندوستان کے دستور کو لچکدار اسلیے کہا جاسکتا ہے کہ اسمیں ترمیم کیلئے راستے بتا دیے گئے ہیں۔ جسطرح مصطفیٰ شروانی نے جناب پروفیسر رئیس خاں صاحب کی تقریر کے حوالے سے بتایا کہ دستور میں اظہارِ خیال کی آزادی کے سلسلہ میں دو متضاد اسطرح کے دائرے کئے گئے کہ اظہارِ خیال میں کاغذ اور تحریر کا استعمال بھی ناگزیر ہے اور تشہیر اور اشاعت بھی ضروری ہے اور عدالت نے ان محرکات کو تسلیم کیا۔ اگر دستور میں "اظہارِ خیال" کے ساتھ نشر و اشاعت اور کاغذ کے استعمال کی تحقیقی جو ہوتی تو پھر کیا کہا جانا چاہیئے اور کاغذ پر کیا تحریر ہو یہ پیچیدگیاں برقرار نہیں اسلئے ہندوستان کے دستور پر عمل پیرا رہے ہیں اس افادیت کے پہلو نمایاں ہیں مباحث میں جناب ارشد احمد اور جناب سید علی ید اللہی نے بھی اظہارِ خیال کیا۔ ڈاکٹر سلطان عمر کنوینر اقبال اکیڈیمی نے شکریہ ادا کیا۔

عزیز بھارتی

سڑک اور پگڈنڈی

شہر کی ان جگمگاتی
شاہراہوں سے پرے
گاؤں کی پگڈنڈیوں پر
ایک البڑسی جوانی
پیار اور اخلاص کے
نغمے لٹاتی
جارہی ہے
سر پہ روٹی
ہاتھ میں پانی کا لوٹا
جارہی ہے کھیت کی جانب
جہاں پر
اس کا شوہر
چلچلاتی دھوپ میں بیلوں کو لے کر

ہل چلاتا ہے پسینہ میں نہایا
اپنے شوہر کی تھکن کو دور کرنے
اس کے ماتھے کی شکن کو دور کرنے
مسکراتی جا رہی ہے
پیار اور اخلاص کے
نغمے لٹاتی جا رہی ہے
ایک الہڑ سی جوانی
دیکھ کر
اس کو
میرا دل سوچتا ہے
شہر میں بھی ایسی کون
ماہ پارہ
پیار کا خوش کن
نظارہ
دیکھنے کو
مل سکے گا۔؟

غزل

محمد منظور احمد

تھا وفورِ گل چمن میں اِس قدر
ہم بھی فصلِ گل میں آوارہ ہوئے

حادثوں کی یورشیں مت پوچھیے
دربدر کھاتے پھرے ہیں ٹھوکریں
شیشہ جیسے دل بھی صد پارہ ہوئے

اپنے ضبطِ شوق کا عالم یہ تھا
تیرے دیوانے جو آوارہ ہوئے
ہم کبھی بھٹکے نہ آوارہ ہوئے

غزل

ضامن علی حسرت نظام آبادی

اُن کے نقشِ قدم بھی ہوا ہو گئے
میرے ہمسفر کیوں فنا ہو گئے

ہے احساسِ ماضی سے دل بھی فسردہ
اے دل کیا بتاؤں وہ کیا ہو گئے

وفا کی قدریں اب زمانے میں کہاں
فاکش ہی اہلِ جفا ہو گئے !

بنے اجنبی جن کے اکثر تھے تم
ہوئی بات کیا کیوں خفا ہو گئے

ملی دل کے ہاتھوں وہ رسوائی حسرت
کہوں کس سے وہ بے وفا ہو گئے

غزلیں

شفیع اللہ سعدی راز اناوی

دشمنی کا اثر نظر آیا		ہوئی خوں میں تر نظر آیا
زندگی ڈھونڈنے کو نکلا تھا		آدمی دار پر نظر آیا
آسماں کی نگاہ حیراں تھی		جانے کیا خاک پر نظر آیا
ساری بستی میں شور ماتم تھا		کس کا نیزے پہ سر نظر آیا
راہگیروں کا قتل عام ہوا		راستہ خوں میں تر نظر آیا

عزیز ناگپوری تاپلی حیدرآباد

نظر نظر میں وہ ہم سے کلام کرتے ہیں
زباں کا کام نظر سے تمام کرتے ہیں

دکھانے سب کو مرا احترام کرتے ہیں
پرائے نام مجھے وہ سلام کرتے ہیں

تمہیں خیال ہمارا کبھی نہیں آتا
تمہارا ذکر تو ہم صبح و شام کرتے ہیں

انہی کو ملتی ہے قدرت سے دائمی عزت
جو مل کے خاک میں حاصل مقام کرتے ہیں

بہت خراب ہے ایمان جن کا اندر سے
دکھانے دنیا کو وہ نیک کام کرتے ہیں

کہوں تو کیسے کہوں دوستاں کو میں اپنا
جو راز فاش میرا بزم عام کرتے ہیں

عزیز آپ نے وہ زخم دیے ہیں دل پہ
صدمات دن میرا جینا حرام کرتے ہیں

غزلیں

نادر اسلوبی

زمیں تو پھر ہے زمیں آسمان میں بھی نہ تھا
ترا بدل تو نظر کی اُڑان میں بھی نہ تھا

وہ اعتبار جہاں کا ہے جس پہ دار و مدار
زمان میں بھی نہ تھا وہ مکان میں بھی نہ تھا

میں چند سال ہی تو گاؤں سے رہا باہر
بدل وہ جائیں گے اتنے گمان میں بھی نہ تھا

تصورات نے بخشی تھی ایک بے خبری
میں دھوپ میں بھی نہ تھا سائبان میں بھی نہ تھا

یہ اختلاف کی دیوار کیا اُٹھی شاہد
سکون نام ہے جس کا ہے مکان میں بھی نہ تھا

مقبول احمد مقبول

ذہنِ رسا کے دام سے پہچانتا ہوں میں
ان کو حسین شام سے پہچانتا ہوں میں

کتنا ہے التفاتِ و کرم کتنی بے رخی
ساقی کے ایک جام سے پہچانتا ہوں میں

اس درجہ امتزاج ہے رنج و نشاط میں
غم کو خوشی کے نام سے پہچانتا ہوں میں

جس دور کی سحر پہ ہے غرّہ حضور کو
اُس دور کو تو شام سے پہچانتا ہوں میں

مقبول رات خلاءِ غزل ہوں جو آپ کا
رنگینیٔ کلام سے پہچانتا ہوں میں

غزل

شوکت راہی لکھنوی
صدر انجمن "پاسبانِ ادب" حیدرآباد

برائے نام بھی کچھ لوگ کام کرتے ہیں
رنگا کے خون شہیدوں میں نام کرتے ہیں

تری نظر سے جو ہم نوش جام کرتے ہیں
ہمارا دنیا میں سب احترام کرتے ہیں

ہیں کیسے لوگ جو اپنے مفاد میں اکثر
بلا جھجک وہ برائی کے کام کرتے ہیں

تعجب ہے کہ جو دیتے ہیں درس دنیا کو
وہی تو قوم کا جینا حرام کرتے ہیں

مجھے بھی انکی غلامی کا ہے شرف حاصل
سلام آکے جنھیں خاص و عام کرتے ہیں

رہ وفا سے گذرنا بھی اک قیامت ہے
جنون عشق میں خود سے کلام کرتے ہیں

جواب ہوش میں راہی ذرا صحیح دینا
فرشتے لحد میں تجھ سے کلام کرتے ہیں

ماہنامہ

شاداب حیدرآباد

جلد : (۹)
شمارہ : (۵)
مئی ۱۹۹۲ء

ایڈیٹر
محمد قمرالدین صابری

قیمت : -/6 روپے

زر تعاون

ہندوستان	65 روپے	۲ سال کیلئے 120 روپے	تاحیات 1500 روپے
خلیجی ممالک	200 "	" 300 "	" 3700 "
امریکہ	40 ڈالر	" 70 ڈالر	" 700 ڈالر
انگلستان	25 پونڈ	" 45 پونڈ	" 400 پونڈ
پاکستان	175 پاکستانی روپے	" 300 پاکستانی روپے	" 3000 پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ 147-5-11، ریڈہلز، حیدرآباد 500004

فون نمبر 229161

پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر شاداب ریڈہلز حیدرآباد ۴ سے شائع کیا۔

فہرست

سید احمد عروج قادری (۱۹ ویں قسط)

اسلامی تصوف

چند موثر واقعات :

(۱)۔ بنی اسرائیل میں ایک شخص نے بیس سال تک اللہ کی عبادت کی اور پھر بیس سال تک نافرمانی کرتا رہا۔ ایک دن اس نے آئینہ دیکھا۔ اس کی داڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ غمگین ہوا اور اس نے کہا الٰہی میں نے بیس سال تک تیری اطاعت کی اور پھر بیس سال تک تیری نافرمانی کرتا رہا۔ اب اگر میں تیری طرف رجوع کروں تو کیا تو مجھے قبول کرے گا؟ اس نے سنا کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے۔ جسے وہ دیکھ نہیں رہا تھا۔ تو نے مجھ سے محبت کی تو میں نے تجھ سے محبت کی۔ تو نے مجھے چھوڑ دیا تو میں نے تجھے چھوڑ دیا۔ تو نے میری نافرمانی کی تو میں نے تجھے مہلت دی۔ اور اگر تو میری طرف رجوع کرے گا تو میں تجھے قبول کر لوں گا (۱)

(۲) ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس آیا، اور پوچھا کہ میں نے ایک گناہ کیا ہے تو کیا میرے لیے توبہ ہے۔ یہ سن کر انہوں نے اس سے منہ پھیر لیا اور پھر اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تو اس کی آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ انہوں نے کہا اے شخص توبہ کے دروازے پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو اسے بند نہیں ہونے دیتا تو عمل کئے جا اور مایوس نہ ہو۔ (۲)

---

(۱) احیاء علوم الدین ج ۴

(۲) احیاء علوم الدین ج ۴ (۲) الرسالۃ القشیریہ

حضرت ابن مسعودؓ نے اس سے اعراض یہ دیکھنے کے لیے کیا تھا کہ اس پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے اور وہ اپنے گناہ پر نادم بھی ہوتا ہے یا نہیں؟

(۳) ابو سلیمان دارانیؒ کہتے تھے کہ میں ایک قصہ گو کی مجلس میں گیا جو قصے سنا کر لوگوں کو نصیحت کیا کرتے تھے ان کی گفتگو سے میرا قلب متاثر ہوا لیکن جب ان کی مجلس سے باہر آیا تو وہ اثر غائب ہو گیا میں دوبارہ ان کی مجلس میں گیا اس دفعہ ان کے کلام کا اثر راستے میں باقی رہا پھر غائب ہو گیا، میں تیسری دفعہ پھر ان کی مجلس میں گیا اور اب کے کلام کی تاثیر میرے دل میں قائم رہی یہاں تک کہ میں گھر واپس ہوا اور اللہ کی نافرمانی کے تمام آلات توڑ پھوڑ دیے۔ اور سلوک الی الحق کی راہ اختیار کر لی۔ اپنا یہ واقعہ انہوں نے یحییٰ بن معاذؒ کو سنایا تو انہوں نے کہا ایک عصفور نے ایک کرکی (کوریئے سے بڑا ایک پرندہ) کو شکار کر لیا اس جملے میں قصہ گو کی تحقیر نہیں بلکہ ابو سلیمان کے بلند درجے کا بیان ہے (۲)

(۴) ابو عمرو بن نجیدؒ ابو عثمان حرانی کی مجلس میں جانے لگے اور اتنے متاثر ہوئے کہ تائب ہو گئے لیکن کچھ دنوں بعد پھر اپنی سابق زندگی کی طرف پلٹ گئے، انہوں نے ان کی مجلس میں جانا بھی چھوڑ دیا اور کہیں راستے میں ابو عثمان کو دیکھ لیتے تو ادھر ادھر بھاگ جاتے۔ ایک دن راستے میں سامنے سے ابو عثمان کو آتے دیکھا تو وہ راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے کی طرف مڑ گئے۔ ابو عثمان نے ان کا پیچھا کیا اور قریب پہنچ کر کہا بیٹے! تم اس شخص کی صحبت اختیار نہ کرو جو تمہیں معصوم سمجھ کر تم سے محبت کرے۔ یہ سن کر ابو عمرو کے قدم رک گئے، ابو عثمان نے ان کا تاثر دیکھ کر کہا تم جس حالت میں ہو اس میں ابو عثمان تمہارے لیے مفید ہو گا۔ ابو عمرو!

---

(۱) احیاء علوم الدین ج ۴	(۲) الرسالۃ القشیریہ

تائب ہو گئے۔ اور اب ان کی توبہ پائدار ثابت ہوئی۔

ابو عثمانؒ کی تربیت کا یہ انداز کتنا موثر اور عالمانہ تھا۔

ان واقعات کا حاصل بھی یہی ہے کہ نہ توبہ سے غفلت برتنی چاہیئے اور نہ شکستِ توبہ کی وجہ سے مایوس ہونا چاہیئے توبہ اگر ٹوٹ جائے تو پھر توبہ کرنی چاہیئے۔

توبہ سے کوئی شخص کسی حال میں بھی بے نیاز نہیں ہے۔

کبائر سے بالکلیہ اجتناب کرنے اور صغائر سے بھی بالقصد دامن بچانے کی کوشش کے باوجود کوئی شخص توبہ و استغفار سے بے نیاز نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال اور اس کی بے نیازی کا استحضار اور اپنے نقص و احتیاج خطا و نسیان اور تقصیر و غفلت کا علم انسان کو ہر آن توبہ و استغفار پر مجبور کرتا رہتا ہے لفظ ذنب (گناہ) کا اطلاق بشری لغزشوں، کوتاہیوں اور سہو و غفلت پر بھی ہوتا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے تعلق سے یہ لفظ اس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے باوجود جب ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو بھی استغفار کا حکم دیا ہے۔ اور وہ بکثرت استغفار کرتے رہے ہیں تو ہمیں اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ توبہ سے کوئی شخص بے نیاز نہیں ہو سکتا، پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز جیسی عبادت کے بعد بھی استغفار فرماتے تھے تو ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ کسی حال میں بھی کوئی شخص استغفار سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

حضرت ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہوتے تو تین بار استغفار فرماتے (۱)

رسالۃ القشیریہ (۱) مشکوٰۃ بحوالہ مسلم شریف

نماز کے بعد استغفار کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اپنی کوتاہی اور تقصیر کی معافی مانگی جائے۔ بارگاہِ احدیت میں جن کا تقرب جس قدر بڑھتا جاتا، اسی قدر وہ اللہ کے جلال سے لرزہ براندام اور اپنی کوتاہی کے معترف ہوتے جاتے ہیں قرآن مجید میں انبیائے کرام علیہم السلام اور اللہ کے دوسرے نیک بندوں کے حالات و کیفیات کی تفصیل اس حقیقت پر شاہد عدل ہے۔ اس کے علاوہ استغفار دعا کی ایک قسم ہے اور دعا عبادت بلکہ مغز عبادت ہے اس لیے ہم استغفار سے کسی حال میں بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

توبہ میں تاخیر خطرناک ہے۔

مسلمان خواہ کسی ایسے گناہ میں مبتلا ہو جس کا تعلق اللہ کے حق سے ہو۔ یا کسی ایسے گناہ کا مرتکب ہو جس کا تعلق اللہ کے بندوں سے ہے اسے فوراً بلا تاخیر اس سے توبہ کرنا چاہیئے۔ یہ خیال کرنا کہ توبہ آئندہ کبھی کر لوں گا ابھی تو زندگی بہت باقی ہے۔ ایک شیطانی وسوسہ ہے جو انسان کو تباہ کر سکتا ہے۔ کسی کو اپنی موت کا وقت نہیں معلوم اس لیے توبہ میں ایک لمحہ کی تاخیر بھی حماقت ہے سورۃ النساء رکوع ۳ میں کہا گیا ہے

"اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق انہیں لوگوں کے لیے ہے جو ناواقفی کی وجہ سے کوئی برا فعل کر گزرتے ہیں اور اس کے بعد جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں، ایسے لوگوں پر اللہ اپنی نظر عنایت سے پھر متوجہ ہو جاتا ہے اور اللہ ساری باتوں کی خبر رکھنے والا اور حکیم و دانا ہے" (آیت ۱۷)

اس آیت میں ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ (اس کے بعد جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں) کا ٹکڑا قابل غور ہے اگرچہ صحابہ و تابعین کے اقوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مِن قَرِيبٍ

کے لفظ میں پوری زندگی داخل ہے اور نزع سے پہلے اگر توبہ کر لی جائے تو اس پر "قریب" کا اطلاق صحیح ہوگا لیکن خود اس لفظ میں کھلا ہوا اشارہ موجود ہے کہ توبہ میں تاخیر سے قبولیت میں خلل واقع ہوتا ہے اس میں جتنی تاخیر ہوگی اس کی قبولیت اتنی ہی بعید ہوتی جائے گی۔

سوال یہ ہے کہ توبہ میں تاخیر کی وجہ کیا ہوگی؟ ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آئندہ توبہ کر لینے کا ارادہ ہو لیکن یہ وجہ نامعقول اس لیے ہے کہ موت کا وقت کسی کو نہیں معلوم، وہ اچانک بھی آ سکتی ہے اس لیے آئندہ زندگی کی امید پر توبہ میں تاخیر غفلت اور حماقت ہے۔

دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ گناہ کی لذت یا اس کا کوئی دنیوی فائدہ اسے تاخیر توبہ پر اکساتا ہے اگر وجہ یہ ہو تو یہ بات ایک مومن کے لیے شرمناک بھی ہے اور خطرناک بھی۔ اگر اچانک موت نہ آئے جب بھی دنیوی فائدہ کا خیال اس کو اس وقت تک توبہ سے باز رکھ سکتا ہے کہ نزع کی کیفیت طاری ہو جائے اور توبہ کا دروازہ اس کے لیے بند ہو جائے چنانچہ اسی سورۃ النساء کی آیت ۱۸ میں ایسے ہی لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے:

"مگر توبہ ان لوگوں کے لیے نہیں ہے جو برے کام کیے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو اس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں نے توبہ کی" (آیت ۱۸)

باقی آئندہ شمارہ

محمد قمر الدین صابری
ایڈیٹر شاداب

جہیز اور ہمارا قانون

جہیز قانون کی نظر میں! یہ دیکھنے سے پہلے اس بات پر غور کرنا ضروری ہے کہ جہیز اصل میں ہے کیا چیز؟ لفظ "جہیز" عربی ہے اور اس کا اطلاق اس ساز و سامان پر ہوتا ہے جس کی مسافر کو سفر میں، دلہن کو نیا گھر بسانے اور میت کو قبر تک پہنچانے کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ اسی لئے میت کے غسل اور تیاری کو "تجہیز" کہتے ہیں۔ عربی لغات میں اس کے معنی سامان تیار کرنا اور مہیا کرنا ہے خواہ وہ کسی مسافر کے لئے ہو، کسی دلہن کے لئے ہو یا کسی میت کے لئے۔

اسلامی قانون میں جہیز دینا خاوند کی ذمہ داری ہے۔ بیوی کی جملہ جائز ضروریات اور اخراجات کا شرعاً ذمہ دار خاوند ہی ہے اور وہ کسی صورت سے دلہن والوں سے دلہن والوں سے جہیز کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

یہ عجیب بات ہے کہ مسلمان آج جہیز کی تائید میں حضرت فاطمہؓ کے جہیز کا ذکر کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلعم نے حضرت فاطمہ کو جو جہیز دیا اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی رقم سے تیار کیا گیا تھا جو انہوں نے اپنی زرہ فروخت کر کے رقم حضور صلعم کے سامنے پیش کر دی تھی۔ اسی رقم سے وہ اشیاء تیار کی گئیں جن کی نئے گھر میں حضرت فاطمہؓ کو ضرورت تھی۔ یہ انتظام حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کے والد کی حیثیت سے نہیں بلکہ حضرت علیؓ کے سرپرست کی حیثیت سے کیا تھا۔ کہا جاتا

رقم فراہم کی اور دلہا کے سرپرست نے جہیز تیار کروایا۔

جہیز کو انگریزی میں Dowry کہا جاتا ہے۔ انگریزی لغات کے مطابق Dowry وہ رقم، سامان یا جائیداد ہے جو ایک عورت شادی کے وقت اپنے ساتھ لاتی ہے۔

چنانچہ ہندوؤں میں ویدک زمانہ سے اس کا رواج ہے۔ تبھی سے "کنیادان" کے ساتھ "ور دکھشنا" بھی لگی ہوئی ہے۔ "کنیادان" اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک دولہا کو "ور دکھشنا" رقم یا اشیاء کی صورت میں نہ دی جائے۔ پہلے یہ "ور دکھشنا" تحفہ کی صورت میں تھی اور لڑکی کے والدین اپنی خوشی سے اپنی حیثیت کے مطابق اسے مہیا کرتے تھے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا یہ لازمی مطالبہ بنتا گیا اور دینے والے کی حیثیت سے زیادہ ہوتا گیا، اس کی تکمیل اس کے لئے محال ہوتی گئی اور اس کے انتظام نہ ہونے کی صورت میں کئی لڑکیاں بن بیاہی بیٹھنے لگیں اور جو بیاہی جاتیں وہ شادی کے وقت اپنے والدین کی معاشی تباہی کا باعث بنتیں اور یہ سلسلہ شادی کے بعد بھی جاری رہتا۔

مسلمان ہندوستان آئے تو انہوں نے اپنے برادران وطن کا اثر قبول کیا۔ ہندوؤں میں لڑکیوں کو وراثت میں حصہ نہ ملتا، اسی لئے شادی کے وقت لڑکی کو کافی رقم و اشیاء جہیز کی صورت میں دی جاتی تھیں۔ گو مسلمانوں میں لڑکی کو وراثت میں حصہ ہے مگر انہوں نے بھی حصہ نہ دے کر شادی کے وقت جہیز دینا شروع کیا۔ اور ہندوستان کے تقریباً سبھی فرقوں اور طبقوں میں جہیز کی لعنت نے جڑ پکڑ لیا۔ مجبوراً حکومت کو اس طرف متوجہ ہونا پڑا اور ۱۹۶۱ء میں Dowry Prohibition Act نافذ کیا گیا۔ کسی سماجی خرابی کی اصلاح کے لئے قانون بنایا جانا کافی نہیں ہے۔ عام سوسائٹی کو اس کیلئے

یار کرنا ضروری ہے۔ چونکہ ۱۹۶۱ء کے قانون سے اصلاح کا مقصد پورا نہیں ہوا۔
ی لئے Prohibition Law سے متعلق Joint Parliamentry
Committe بنائی گئی۔ اور اس کمیٹی کی سفارشات کے بعد ۱۹۸۴ء اور
۱۹۸۶ء کی ترمیمات کے ذریعہ اسے مزید سخت بنایا جا کر موثر بنانے کی کوشش کی
گئی تاکہ جہیز کی لعنت اور اس کی خرابیاں ہمارے سماج سے دور ہوسکیں۔

مانع جہیز قانون بابتہ ۱۹۶۱ء کے تحت Dowry کی تعریف بڑی وسیع
ہے۔ دولہا والوں کے مطالبہ یا حصول کے ساتھ دولہن والوں کا مطالبہ یا حصول
بھی Dowry میں شامل ہے۔ اس حقیقت کو اکثر نظر انداز کردیا جاتا ہے۔
اس لئے کہ ہندوؤں میں جہیز زیادہ تر لڑکی والوں کو دینا ہوتا ہے اور وہی اس کی
خرابیوں کے شکار بنتے ہیں، مگر Dowry کی تعریف کی روشنی میں لڑکی والے
بھی اس جرم کے قصور وار ٹھیرتے ہیں۔ اگر وہ لڑکے والوں سے حصول جہیز یا
اس کے مطالبہ کے مرتکب ہوں۔ ہندو مذہب کی "اسورہ" شادیوں میں "شلکا"
کی ادائی شوہر کے ذمہ ہوتی ہے۔ اگر اس کی وصولی میں سختی اور دباؤ کا استعمال
کیا گیا، تو لڑکی والوں کے خلاف کاروائی کی جاسکتی ہے۔ مسلمانوں میں جو "مہر"
کا رواج ہے اس کی مثال کسی اور مذہب میں نہیں ہے۔ اسے کسی صورت میں
Dowry قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ایک ایسی رقم ہے جو شوہر کی طرف سے
دلہن کو تحفہ میں دی جاتی ہے اور اس میں طرفین کے درجے اور مرتبے کا خیال
رکھا جاتا ہے۔ یہ عقد کے وقت فوری دیا جاتا ہے یا دلہن کو اختیار ہوتا ہے
کہ شادی کے بعد کسی بھی وقت مطالبہ کرکے حاصل کرلے۔ مہر میں دلہن کے علاوہ کسی اور
کا کسی قسم کا کوئی حق یا حصہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے یہ Dowry نہیں ہے اور اسے
اس قانون سے مستثنیٰ کردیا گیا ہے۔

ابتدائی قانون ۱۹۶۱ء میں جہیز کی تعریف یہ تھی کہ کوئی رقم یا چیز
شادی کی Consideration میں دی گئی ہو تو جہیز قرار دی جائیگی۔
وضاحت میں یہ صراحت تھی کہ شادی کے وقت دی گئی رقم زیورات، کپڑے اور
دیگر اشیاء کو Dowry قرار نہیں دیا جائیگا تا آنکہ یہ شادی کی
Consideratio میں نہ دی گئی ہو۔ چونکہ دینے والے یہ کہنے تیار نہیں ہوتے
تھے کہ یہ رقم یا اشیاء شادی کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے شادی کی
Consideratio میں دی گئی ہیں۔ اور اس امر کا ثابت کرنا بھی مشکل تھا۔ اس لئے
جہیز کی تعریف سے اس وضاحت کو نکال دیا گیا اور اصل تعریف سے بھی
As consideration for the marr-age کو نکال کر In connection
with the marriage کے الفاظ شریک کر دیئے گئے۔ اس ترمیم
کا روشنی میں صرف یہ بتانے پر کہ یہ رقم یا سامان شادی کے سلسلہ میں دیا گیا
ہے۔ عدالت یہ تسلیم کرلیتی ہے کہ یہ شادی کی Consideration میں دیئے گئے
ہیں اور مطالبہ یا دباؤ کے ثابت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ البتہ اس
ترمیم شدہ تعریف کے تحت تحفے دینا ممنوع قرار نہیں دیا گیا۔ تحفوں کا رواج نہ صرف
ہندوؤں میں ہے بلکہ غیر ہندوؤں میں بھی ہے اور یہ تحفے شادی کے وقت اپنی خوشی
رضامندی سے دیئے جاتے ہیں۔ اسی لئے بلا جبر و کراہ اور رضاکارانہ طور پر دیئے
گئے "تحفے" جہیز کی تعریف میں نہیں آتے۔ البتہ شادی سے پہلے اور بعد کے
جہیز قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ جہیز کا مطالبہ شادی سے
تکمیل کرالیا جاتا ہے اور بعد میں بھی اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لڑکی کی
ان مسلسل مطالبوں سے عذاب میں رہتی ہے اور بسا اوقات وہ خودسوزی
پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس لئے لڑکی کو اس ظلم سے بچانے کے لئے ایسے

تحویل پر روک لگادی گئی ہے اور ۱۹۸۶ء کی ترمیم میں at or before کے الفاظ کے ساتھ at any time after marriage کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ تاکہ شادی سے پہلے، شادی کے وقت اور شادی کے بعد کے ایسے مطالبات یا ادائی کو بھی "جہیز" میں شامل قرار دیا جا سکے۔

ترمیمات کے ذریعہ جہیز کے مطالبہ کی سزا کو سخت کر دیا گیا ہے۔ پٹنہ ہائیکورٹ نے یہ طے کیا ہے کہ صرف مطالبہ جرم نہیں ہے تا آنکہ دوسرے فریق نے تکمیل کی رضامندی نہ دے دی ہو مگر بمبئی ہائیکورٹ نے یہ طے کیا ہے کہ صرف مطالبہ بھی جرم ہے حالانکہ فریق ثانی نے ماننے سے انکار ہی کیوں نہ کر دیا ہو۔ سپریم کورٹ نے بمبئی ہائیکورٹ کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ اس طرح جہیز کے صرف مطالبہ پر ہی کارروائی کی جا سکتی ہے اور ظالم کو خاطر خواہ سزا دلوائی جا سکتی ہے۔

۱۹۸۶ء میں ترمیم کے ذریعہ ایک نئی دفعہ A-4 بڑھائی گئی ہے جو شادی کے سلسلہ میں ترغیب کے طور پر کسی جائیداد یا کاروبار میں حصہ پیش کرنے اور اس قسم کا اشتہار وغیرہ سے روکتی ہے۔ لیکن اس دفعہ کے الفاظ مبہم اور غیر مسلسل ہیں۔ مرکزی قانون میں ایسی عبارت قابل غور ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قانون سازی میں کتنی بے توجہی برتی گئی اور قانونی مہارت کا استعمال بھی ضروری نہ سمجھا گیا۔

قانون کی دفعہ ۶ میں حکم ہے کہ شادی شدہ عورت یا اس کے ورثاء کو جہیز واپس کیا جائے۔ ۱۹۸۴ء کی ترمیم کے ذریعہ جہیز کی واپسی کی مدت کو ایک سال سے کم کر کے ۳ ماہ کر دیا گیا ہے۔ نیز عدم تعمیل کی صورت میں سزا اور جرمانہ کو بڑھایا گیا ہے۔ نئی ذیلی دفعہ اہم ہے۔ حکم اور سزا کے باوجود جہیز واپس نہ کیا گیا ہو تو عدالت بہ تعیین مدت واپسی کا حکم دے گی، اس پر بھی واپس نہ کیا جائے تو اس کی قیمت کے مساوی رقم جرمانہ کی طرح وصول کی جا کر عورت یا اس کے ورثاء کو دی جائے

رنامہ میں والدین اور بچوں کو شریک کیا گیا ہے۔

شادی شدہ عورت کو ظلم و زیادتی سے بچانے کے سلسلے میں ہریانہ اسٹیٹ
رکز اور دوسری ریاستوں سے بھی آگے بڑھ گئی ہے۔ ہریانہ نے دو دفعات A-6
ور B-6 کا اضافہ کیا ہے۔ A-6 میں یہ صراحت ہے کہ اگر شوہر جہیز نہ لانے
ی صورت میں بیوی سے عدم توجہی برتے اور وظائف شوہری ادا نہ کرے تو عدالت
یک سال تک قید اور دس ہزار روپے تک جرمانہ کی سزا دے سکے گی۔ نیز دوران کارروائی
یں شوہر کے اقرارنامے پر کارروائی ختم کر سکے گی۔ جو عدم پابندی اقرار کی بنا پر دوبارہ
اری ہو سکے گی۔ B-6 میں صراحت ہے کہ A-6 کے تحت سزا کے بعد عدالت
کم دے سکے گی کہ شوہر اپنی حیثیت کے مطابق 500/= روپے تک ماہانہ گذارہ ادا کرے
ے۔ ایسی کوئی آسانی مرکزی قانون میں فراہم نہیں کی گئی۔ گو پارلیمنٹری
ورڈ نے یہ سفارش کی تھی۔ پارلیمنٹ نے اس سفارش کو منظور نہ کیا۔ البتہ
ر ثبوت کے سلسلہ میں ایسی رعایت فراہم کی گئی ہے جو قانون کے اصول اور
فت کے خلاف ہے۔ ۸۶ء میں ترمیم کے ذریعہ دفعہ A-8 بڑھائی گئی
ہے تاکہ اگر کسی شخص پر جہیز لینے یا مطالبہ کرنے کا مقدمہ چل رہا ہو تو
ر ثبوت اُسی شخص پر ہوگا کہ وہ خود یہ ثابت کرے کہ اُس نے جہیز لیا ہے
اس کا مطالبہ کیا ہے۔ قانون کو زیادہ موثر بنانے اور مظلوم کے لئے آسانی
اکرنے کی خاطر یہ اضافہ کیا گیا ہے اور یہ بار ثبوت ملزم پر ڈالا گیا ہے۔

شادی کے بعد بھی جہیز کے مطالبہ کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور شادی شدہ
ت پر ایسا ظلم و ستم ہوتا رہتا ہے کہ وہ خودکشی یا اقدام خودکشی پر مجبور ہو جاتی
یا اس کی ذات کو نقصان پہنچتا ہے۔ شادی کے بعد کے ایسے مطالبات اور
تی ضابطۂ فوجداری کی دفعہ 498-A کے تحت لایا گیا ہے۔ اس دفعہ کو

۱۹۸۳ء کی ترمیم کے ذریعہ پینل کوڈ میں شریک کیا گیا ہے اور شادی کے بعد (۷) سال تک ایسے عمل کو جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس ۷ سال کی مدت کے اندر اگر شادی شدہ عورت کے جلنے یا ایسے ہی غیر معمولی حالات میں موت واقع ہو اور اس کی وجہ جہیزی مطالبات کے سلسلہ کی ظلم و تعدی بتائی جائے تو ضابطہ فوجداری کی دفعہ B-4 کے تحت شوہر یا اس کا رشتہ دار اس موت کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا اور سات سال کی سزا یا عمر قید بھی دی جائیگی۔

۱۹۸۳ء میں قانونِ شہادت میں بھی دفعہ A-113 بڑھائی گئی ہے کہ اگر یہ ثابت کیا جائے کہ (۱) شادی شدہ عورت نے شادی کے ۷ سال کے اندر خودکشی کی اور (2) اس کے شوہر یا اس کے رشتہ دار نے عورت پر جہیز کے سلسلہ میں ظلم کیا۔ تو یہ Presume کیا جائے گا کہ شوہر یا اس کے رشتہ دار نے عورت کو خودکشی میں مدد کی۔ ۱۹۸۶ء میں دفعہ B-113 بڑھائی گئی جس کی بناء پر عدالت یہ Presume کرے گی کہ شوہر یا اس کے رشتہ دار کی وجہ سے عورت کی موت Dowry Death واقع ہوئی ہے۔

Dowry کی خرابی ہندوؤں میں زیادہ ہے مگر مسلمانوں میں بھی یہ خرابی آگئی ہے اور ہندی عیسائیوں میں بھی تبدیلی مذہب سے پہلے کے کنیادان وغیرہ کا رواج باقی ہے اور دیگر طبقات بھی اس خرابی سے متاثر ہیں۔ گو قانون مانع جہیز ۱۹۶۱ء اور ضابطہ فوجداری اور قانونِ شہادت کی ترمیمات ملک کے سبھی مذاہب اور فرقوں پر نافذ ہیں۔ اس سے اصلاح کے مقصد کی خاطر خواہ تکمیل نہیں ہو رہی ہے۔ صرف قانون سازی اس خرابی کا علاج نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ اس خصوص میں رائے عامہ ہموار کی جائے تاکہ یہ سماجی خرابی دور ہو اور جہیزی ظلم و زیادتی سے نجات حاصل کی جا سکے۔

-o- -o- -o-

ڈاکٹر محمد اسد اللہ
جعفر نگر، ناگپور

تحریکِ آزادی میں اردو شاعری کا حصہ

تحریکِ آزادی تقریباً ایک صدی پر محیط ایک طویل جدوجہد کا سلسلہ تھا جس کے نتیجے میں ہمارے ملک کو آزادی کی نعمت نصیب ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا پانے کی ایک کوشش کی گئی، یہ بغاوت تھی جو نوابوں اور حکومتِ انگلستان سے ناخوش عناصر کے ایما پر وجود میں آئی۔

واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کا غدر تحریکِ آزادی کا دیباچہ تھا، کہ اس کے بعد جلد ہی وہ واقعات پیش آئے جنھوں نے سوراج کے مطالبے کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنا شروع کر دیا۔ غدر کی ناکامی نے عوام الناس کی سوچ و فکر کے دھارے بدل دیے۔ ہمارے قومی رہنماؤں نے غدر کے دوران ابھرنے والی آزادی کی تحریک کو جو خواص تک محدود تھی عوام الناس سے روشناس کروا دیا۔ اس تحریک کا عوام کے اندر راسخ ہونا تھا کہ آزادی پورے ملک کی ضرورت بن گئی اس لحاظ سے غدر نقشِ اول تھا اور اس کے بعد ملک بھر میں برپا ہونے والا جذباتی اور فکری انقلاب نقشِ ثانی جو اپنے نقشِ اول سے بہتر اور کارگر ثابت ہوا، چنانچہ ملک آزاد ہو گیا۔

کوئی بھی تحریک خواہ وہ سیاسی، سماجی یا ادبی ہو، اس کے پروان چڑھانے میں جذبات اور شعور ہمیشہ اہم کام دیتے آئے ہیں۔ ان تحریکات کے

قائدین عوام کو فکری و جذباتی سطح پر بیدار کر کے صحیح رہنمائی کرتے ہیں فکر و شعور کی ان ہی چنگاریوں کو جذباتی برانگیختگی کے ذریعے شعلہ بنانے کا کام اس قسم کے فنکاروں اور خصوصاً شاعروں نے انجام دیا ہے۔

آزادیٔ ہند کے ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ یہ ایک انقلاب ضرور تھا مگر خونیں انقلاب نہ تھا۔ اس کی بنیاد اہنسا پر تھی۔ عوامی بیداری کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس بات سے ملک کی خاطر مرمٹنے والوں کا مرتبہ گھٹانا ہرگز مقصود نہیں! بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وطن کی خاطر لہو بہانے والوں نے بھی اپنے طور پر سوتے ہوئے لوگوں کے دل و دماغ کو جھنجھوڑا۔ خصوصاً ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کا سانحہ تحریکِ آزادی میں عوامی بیداری کا سب سے بڑا محرک قرار پایا۔

آج ان تمام شہدائے آزادی کے نام اور قربانیاں تاریخ کے صفحات پر جگمگا رہے ہیں، لیکن کیا آپ اس مجاہدِ آزادی سے بھی واقف ہیں جس نے عوامی بیداری کا عمل بڑے پیمانے پر انجام دیا؟ وہ مجاہدِ آزادی ہے — "اردو شاعری" اسی کے پیشِ نظر مشہور جدید شاعر عمیق حنفی نے لکھا ہے۔

"اردو ہماری گنگا جمنی تہذیب کی زبان، اردو ہندو مسلم کلچر کا مشترکہ سرمایہ، اردو جس نے ہندوستان کی جد و جہدِ آزادی کو انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا۔ اور سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا جیسا ترانہ دیا۔ جس میں جوش نے کمپنی سرکار کے فرزندوں کو بری طرح پھٹکارا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بے شک ہماری زبان کو وہ مقام میسر ملنا چاہیے تھا جو آزادی کی سلور جوبلی پر مجاہدینِ آزادی کو دیا گیا۔

تحریکِ آزادی میں اُردو شاعری کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف اُردو شاعروں نے اس تحریک کو اپنے خونِ جگر سے سینچا بلکہ وقت پڑا تو اپنی گردنیں بھی کٹائیں، مشقِ سخن کے ساتھ چکی کی مشقت بھی جھیلی اور اس کی خاطر ملک بدر بھی ہوئے۔

قلعۂ معلیٰ کے گہوارے میں پروان چڑھتی ہوئی اس زبان کو نوازنے والے اعلیٰ پائے کے شاعر اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے لہو ہی سے تحریکِ آزادی کی آبیاری کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ پھر اس کی خاک بھی آزادیٔ وطن کی خاطر ملت [illegible]

ہے کتنا بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

آزادی سے متعلق اُردو شعرا کا فکری وجذباتی بہاؤ خطِ مستقیم کا سفر نہیں ہے۔ بلکہ یہ سفر اتار چڑھاؤ کے علاوہ مختلف ارتقائی مراحل سے بھی دوچار ہوا۔ ابتدا میں ہمیں اُردو شاعری میں آزادی کا موضوع حکومتِ انگلستان [illegible] ناخوشگواری، بے چینی اور بہ الفاظِ دیگر مغلیہ حکومت کے خاتمے پر حزن وملال کے اظہار کی صورت میں ملتا ہے۔ مغلیہ حکومت کا چھن جانا ایک تہذیب کا زوال اور ایک عہد کا خاتمہ تھا۔ اس پر مرزا غالب کا یہ تبصرہ یقیناً بے مثال ہے

اب کہاں وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں غالب
اٹھئے بھی اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی !!

مرزا غالب نے غدر کی تباہ کاریاں بھی بڑے دکھ کے ساتھ [illegible] [illegible] رقم کی ہیں۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے ۔ زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے ۔ گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک ۔ تشنۂ خون ہے ہر مسلماں کا

مرزا غالب کے بعد حالی، شبلی اور محمد حسین آزاد کے ہاں نیا شعور اور نئی سمتوں کی نشاندہی نظر آتی ہے۔ ان شعراء نے ذہنوں سے فرسودگیوں کے جالے اتار کر، وطن کی محبت کے چراغ جلائے۔ اس دور میں تحریک آزادی انگریزوں کے طوقِ غلامی کو اتار پھینکنے کے مرحلے تک نہیں پہنچی تھی۔ محمد حسین آزاد، جن کے والد محمد باقر کو غدر کے بعد پھانسی دے دی گئی تھی۔ غدر کی ناکامی کو نااتفاقی کا نتیجہ سمجھتے ہوئے اپنی نظم "حبِ وطن" میں اتحاد پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

کچھ ہو گیا زمانے کا الٹا چلن یہاں ؛ حب الوطن کے بدلے ہے بغض الوطن یہاں
بن تیرے ملک ہند کے گھر بے چراغ ہیں ؛ جلتے عوض چراغوں کے سینے کے داغ ہیں

الطاف حسین حالی نے "آزادی کی قدر" "انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی" "نیچر" "سیاست" وغیرہ نظموں میں غلامانہ ذہنیت کو ہدفِ ملامت بنایا۔ اسمٰعیل میرٹھی بہتر زمانے کی بشارت کے ساتھ آزادی کی قدر وقیمت ان الفاظ میں سمجھاتے رہے۔

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
تو وہ خوف و ذلت کے حلوے سے بہتر

علامہ اقبال تک آتے آتے قومی اتحاد کا یہ نعرہ واضح شکل اختیار کر گیا۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اقبال نے نہ صرف "وطن کی محبت" کے نغمے گائے بلکہ اپنی تہذیبی جڑوں کی شناخت پر بھی زور دیا، اسی کے ساتھ عصری حقایق سے باخبر کر کے غلامی کا احساس بھی دلایا۔ اقبال کی شاعری میں حریت اور آزادی کا تصور اپنی فلسفیانہ بنیادوں پر استوار ہو کر واضح سمتوں کی نشاندہی کرنے لگا۔ اقبال نے فرنگی چالوں پر کھلے حملے بھی کئے اور دھرتی کے باسیوں کو خوابِ غفلت سے جگایا بھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری جنگِ عظیم، تحریکِ خلافت اور قومی تحریکوں نے جراتِ گفتار عطا کی، اردو شاعری بہ اشارے کنائے ایک طرف دکھ کر کھلے بندوں انقلاب کی زبان میں بات کرنے لگی۔

چکبست وطن کی محبت پر مرشتے کے جذبات سے سرشار نظموں کے ساتھ سوراج کا مطالبہ ان الفاظ میں دہرانے لگے۔

طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

بیسویں صدی کے ابتدائی دور سے حصولِ آزادی تک، اردو شاعری میں "آزادی" ایک اہم موضوعِ سخن رہا ہے۔

ضبط شدہ نظمیں میں شامل نظمیں اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے میں اردو کی بے شمار نظمیں آزادیِ وطن کا خالص جذبات سے سرشار ہو کر لکھی گئیں، ان تمام کا احاطہ یہاں ممکن نہیں۔

حسرت موہانی جیسے شعراء مشقِ سخن کے ساتھ قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں۔ حفیظ جالندھری، جگر مرادآبادی، افسر میرٹھی، اختر شیرانی، احسان دانش، جمیل مظہری، معین احسن جذبی، علی جواد زیدی، اور شمیم کرہانی وغیرہ نے بھی اس

موضوع پر معیاری تخلیقات پیش کیں۔

ان شعرا میں ظفر علی خاں اور جوش ملیح آبادی دو ایسی منفرد آوازیں ہیں جو اپنی انقلابی گھن گرج کے ساتھ عوام میں مقبولیت اختیار کر گئیں۔ ظفر علی خاں شاعری کے علاوہ صحافت کے محاذ پر بھی حکومتِ انگلستان سے برسرپیکار رہے اور جوش نے ان رجعت پرست اداروں کو بھی خوب پھٹکارا جو تحریکِ آزادی کی جڑیں کھوکھلی کرتے رہے۔ جوش کے لہجے کی گھن گرج ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیے۔

اٹھو وہ صبح کا غرفہ کھلا زنجیرِ شب ٹوٹی
وہ دیکھو پو پھٹی، غنچے کھلے پہلی کرن پھوٹی
اٹھو، چونکو، بڑھو منہ ہاتھ دھو ڈالو
ہوا ئے انقلاب آنے کو ہے ہندوستان والو

(آثارِ انقلاب)

اسی دوران ترقی پسند تحریک اور اشتراکیت کے زیر اثر اردو شعرا کا ایک ایسا طبقہ بھی وجود میں آگیا۔ جنہوں نے انگریزوں کی سامراجی طاقت کو ہر پلیٹ فارم سے للکارا ان شعرا میں مجاز، فیض، مخدوم، جاں نثار اختر، سلام مچھلی شہری، ساغر نظامی اور ساحر لدھیانوی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

فیض نے مجاز کے متعلق آہنگ کے دیباچے میں لکھا ہے "مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے۔ اس کے نغموں میں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی ہے اور بہار کی رات کی سی گرم جوشی و تاثیر آفرینی۔"

ہندوستان پر انگریزوں کی ڈھیلی ہوتی ہوئی گرفت اور ایک نئے عہد کا

آغاز کی بشارت مجاز کی نظموں میں صاف طور پر سنائی دیتی ہے

مسافر بھاگ وقتِ بے کسی ہے   تیرے سر پر اجل منڈلا رہی ہے
نہ دے ظالم فریب چارہ سازی   یہ بستی تجھ سے اب تنگ آ چکی ہے
مرتب ایک نیا دستور ہو گا   بنا اک دورِ نو کی پڑ رہی ہے

مجاز کے ہاں یہ انقلاب ایک آفاقی تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے

آؤ مل کر انقلابِ تازہ پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

اس انقلاب کی آفاقیت ترقی پسند تحریک سے وابستہ دیگر شعرا کے ہاں بھی نمایاں ہے اس ضمن میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ترقی پسند تحریک بنیادی طور پر دیسی تحریک نہ تھی، اس کا سرچشمہ اشتراکیت اور انقلاب روس اور اس کا ہدف سامراج تھا۔ برصغیر میں اس تحریک کو جڑ پکڑنے کے لیے بہرحال ایک محاذ کی ضرورت تھی جو سامراجی طاقت، حکومتِ انگلستان کے روپ میں دستیاب ہو گیا، چنانچہ ابتداً اس تحریک کی ساری توانائی اسی طاقت کے خلاف ابھر کر آئی اور اعلیٰ مقصد کے حصول کی خاطر استعمال ہوئی۔ ترقی پسند تحریک کے تحت ابھرنے والے ہمارے شعرا کے ہاں آزادی اور انقلاب ہمیشہ ہی ایک اہم موضوع رہا ہے۔

غرض بیسویں صدی کے اوائل میں اردو ادب میں ابھرنے والی مختلف تحریکات نے تحریکِ آزادی کو مختلف زاویوں سے روشن کیا، نہ صرف تحریکِ آزادی کو نیا عزم دیا بلکہ اس فن کو روانی بھی عطا کی۔

سیدہ مہر
ایم اے بی ایڈ
وقار آباد

رشید الدین

چار متنوع کتابوں کے مصنف

ہمایوں نگر کے ایک صاف ستھرے حصے میں مختصر مگر خوبصورت مکان واقع ہے صحن میں کروٹن کے گملوں اور پھولدار پودوں کی سجاوٹ فرحت افزا ہے۔ سیر حاصیوں سے اوپر مغرب و مشرق کے ملاپ کا نمونہ نفاست سے ترتیب دیا ہوا مختصر سا دیوان خانہ میز پر کتابیں اور رسائل جس کے درمیان صاحب خانہ کی خندہ پیشانی سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہ رشید صاحب ہیں تھوڑی ہی دیر میں انکی بیگم مسکراتی ہوئی شادابی بکھیرتی داخل ہوتی رہیں۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد رخصت ہونا چاہوں تو اصرار ہوگا کہ کھانا کھا کر جائیں۔ اس خلوص و ملنساری سے میں ہمیشہ متاثر رہی۔

رشید صاحب کو میں اس وقت سے جانتی ہوں جب میں اورنگ آباد میں گرلز ضلع پریشد اسکول پر صدارت کے فرائض انجام دے رہی تھی اور وہ ایک طالب علم تھے اسی لئے میں انہیں آج بھی رشید میاں کہکر پکارتی ہوں اور وہ بھی ایک بڑی بہن کی طرح میرا احترام کرتے ہیں۔ اورنگ آباد کی ایک ممتاز شخصیت سعادت نواز مرحوم کے گھر ان سے اکثر ملاقات ہوا کرتی جو ان کے حقیقی پھوپا تھے۔ رشید صاحب کی خوش اخلاقی اور ملنساری کی وجہ سے میرے

شوہر بھی ان سے بے حد متاثر ہیں۔ حال ہی میں ان کے گھر دو شادیاں ہوئیں ہم نے بھی وقارآباد سے آکر شرکت کی۔ رشید صاحب کی دفتری قابلیت کا کر تو ہیں کرونگی ہی یہاں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ شادی کا انتظام اور دعوت طعام خالص حیدر آبادی معیار سے کی گئی اس پورے حسنِ انتظام کا سہرا رشید صاحب کے سر جاتا ہے لڑکی کے والد کی حیثیت سے بھی اور لڑکے کے والد کی حیثیت سے بھی۔

رشید صاحب ایک قاضی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ اورنگ آباد سے ابتدائی اور کالج کی تعلیم مکمل کی اچھی تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ گھر کی اچھی تربیت بھی ان پر اثر انداز ہوتی۔ اس دور کے بہترین اساتذہ سے شرف تلمذ حاصل ہوا۔ اسی طرح کالج کی تعلیم کے زمانے میں بھی ان کو لائق ترین اساتذہ کے سامنے زانوے ادب تہہ کرنے کا موقع ملا۔ نام کی مناسبت سے ظاہر ہے کہ ہائی اسکول اور کالج میں شاگرد رشید ثابت ہوئے ہوں گے۔ طالب علمی کے زمانے ہی سے رشید صاحب شعرا اور افسانہ نگاروں کی صحبت میں اپنے شب و روز گزارتے لہذا خود بھی کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ زور قلم رنگ لایا اور انہیں اورنگ آباد کالج کے میگزین کا مدیر منتخب کیا گیا رفتہ رفتہ ملک کے موقر رسائل میں ان کے مضامین شائع ہونے لگے جیسے شاہراہ، آج کل۔ اخبار سیاست میں وہ اکثر لکھا کرتے ہیں۔ زندہ دلان حیدرآباد سے بھی وابستگی رکھتے ہیں۔ لہذا ماہنامہ شگوفہ میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حیدر آباد میں طنز و مزاح نامی کتاب میں ان کا تذکرہ موجود ہے بقول شمس بایر جدہ "سنجیدہ ادب کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے مگر طنز و مزاح ایک ایسا میڈیا ہے جس کے ذریعہ عوام تک

تک بہ آسانی پہنچ ہوتی ہے" ان کا ایک افسانہ "پرانے کپڑے نئے برتن" ٹھیٹ حیدرآبادی معاشرے کی ایک اچھی تصویر ہے۔ روزمرہ پیش آنے والے واقعات سے مزاح کا پہلو نکالنا بھی قابل تحسین بات ہے۔ کچھ عرصے سے ماہنامہ شاداب کے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ اب تک ان کی ۴ تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔

(۱) علامہ حیرت بدایونی حیات و خدمات

(۲) خواہ مخواہ مزاحیہ (۳) ذکر رفتگاں، مرحوم شعرا اور ادیبوں کے مختصر خاکے ہیں جس پر آندھرا پردیش اردو اکیڈمی نے ایوارڈ عطا کیا ہے ان کی ایسی کتاب پر ماہنامہ "شاداب" میں تبصرہ کرتے ہوئے۔ لکھا تھا۔

"خود ان کی تحریر کے مطابق وہ ۲۸ سال سے لکھ رہے ہیں۔ اس عرصہ تحریر میں پختگی آجاتی ہے اور ادیب صاحب طرز بنتا ہے۔" ادب بہر معنوی اولاد کا اضافہ اگر وہ صالح قدروں کی حامل ہوں تو ہمیشہ خوش آئندہ اور قابل قدر ثابت ہوتا ہے۔ رشید صاحب اس قول پر پورے اترتے ہیں"

(۴) خیالی پلاؤ بچوں کے لیے کہانیاں۔

گریجویشن کے بعد تعلیم ختم کر کے رشید صاحب محکمہ دارالترجمہ میں جونیر مترجم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے اور اپنی فطری جانفشانی دیانت و مستقل مزاجی سے ترقی کرتے ہوئے نائب ناظم کے عہدے پر فائز ہیں۔ ترجمہ جیسے عرق ریزی کے کام کو انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا ترجمے کے سلسلے میں کام سے دلچسپی و انہماک سے خود ان کے عہدے دار اعلیٰ اور ماتحتین بھی عقیدت مند ہیں وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی کام میں مصروف رکھنے کا گر جانتے ہیں۔

مشکلات اور پیچیدہ حالات کو صبر وسکون سے جھیلنا ان کا شعار ہے۔ وہ مرنجان مرنج فطرت واقع ہوئے ہیں۔ بہت سی اہم ذمہ داریوں کو بیک وقت شروع کر کے بڑی مستعدی سے ان کی بجا آوری میں جٹ جاتے ہیں وہ اس مصرعے پر پورے اترتے ہیں: "نرم دم گفتگو گرم دم جستجو"

میں نے انکو ایک شفیق باپ فرض شناس شوہر اور دوست نواز شخصیت کے روپ میں دیکھا ہے۔ انکی ملنساری خلوص اور خوش طبعی سے مخاطب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مزاج کے ساتھ طرز معاشرت میں بھی سادگی ہے اور یہی بات انکے اسلوب نگارش میں بھی موجود ہے انکی مزاحیہ تحریر قہقہہ بردوش نہیں بلکہ ہلکے پھلکے چٹکلوں کی شکل میں ہے جو مسکراہٹ بکھیرتی ہے۔ نثر میں وہ بلند بانگ الفاظ اور پیچیدہ جملے لکھنے کے عادی نہیں یہاں بھی وہی سادہ روی اپنی خاکہ نگاری میں شخصیات کی فطرت کے تجزیے اچھے انداز میں لکھے ہیں۔ چونکہ یہ خاکے (؟) مختلف احباب کی موت کے فوری بعد لکھے گئے ہیں اور مرحومین سے ان کے خلوص کے آئینہ دار ہیں۔ اس لئے دل کی پکار بھی شامل ہے جو کسی عزیز کی موت کے بعد درد آمیز انداز میں نکلتی ہے۔ اپنی دفتری گوناں گوں مصروفیات کے باوجود بھی رشید صاحب اُردو کے لئے جو وقت نکالتے ہیں اس سے ہمیں پوری امید ہے کہ مستقبل میں بھی ان کے رشحاتِ قلم منظرِ عام پر آتے رہیں گے۔

رفعت نواز

کتابوں کی باتیں

خیالی پلاؤ

خیالی پلاؤ، رشید الدین کی چوتھی کتاب ہے، اس سے پہلے رشید الدین تین کتابیں متنوع اصناف اور موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں (۱) علامہ حیرت بدایونی حیات اور ادبی خدمات " جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے علامہ حیرت بدایونی حیات اور ادبی کارناموں کے بارے میں یہ کتاب ہے (۲) خواہ مخواہ رشید الدین کے طنزیہ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ (۳) ذکر رفتگاں مرحوم شعرا اور ادبا کے خاکوں مشتمل مجموعہ ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رشید الدین نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے تحقیق و تجزیہ، طنز و مزاح، خاکہ نگاری اور اب بچوں کے لیے دلچسپ اور رنگا رنگ کہانیاں۔ پس ثابت ہوا کہ رشید الدین ہر صنف میں بہ خوبی اور بہ آسانی لکھ سکتے ہیں اور ایسا لکھتے ہیں کہ فوراً قاری کو متوجہ کر لیتے ہیں۔

بچوں کے لیے لکھنا کوئی آسان کام نہیں اور بچوں کا کھیل نہیں ہے بڑی سوجھ بوجھ سے، رک رک کر، سنبھل کر، بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر آسان اور ایسے انداز میں لکھنا پڑتا ہے کہ بچے بہ آسانی جو لکھا گیا اُسے سمجھ سکیں، اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ اور سبق بھی حاصل کریں،

اردو میں بچوں کے لیے نسبتاً کم لکھا گیا ہے، بچوں کیلئے لکھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ جب کہ ہمارے یہاں لکھنے والوں کی بہتات ہے، اردو کا کوئی رسالہ اٹھا کر دیکھ لیجئے پچاس ساٹھ صفحات کے رسالے بیس پچیس مصنفین کی تخلیقات مل جائیں گی، اگر رسالہ سہ ماہی، ششماہی ہے تو لکھنے والوں کی تعداد سو تک پہنچ سکتی ہے، جبکہ بچوں کے لیے دو یا تین رسالے نکلتے ہیں اور لکھنے والے بھی گنتے چنے افراد ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا بڑا مشکل کام ہے، اور ہمارے یہاں مشکل کام کرنے کا رواج نہیں رہا ہے، تن آسانی عام ہے۔ شارٹ کٹ راستے سے جلد از جلد منزل مقصود پر پہنچنے کی وبا عام ہے۔ لیکن رشید ہم جو ہیں مشکل سے مشکل کام کو اس انداز میں کرتے ہیں کہ بظاہر وہ مشکل نہیں لگتا۔ یوں تو ہر لکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ بچوں کے لیے لکھنا کون سا مشکل کام ہے۔ پند و نصائح کی کتابوں، اساطیر، مذہبی صحیفوں اور بزرگان دین کے ملفوظات میں ایسی ایسی سبق آموز حکایتیں ہیں کہ انہیں سلیس انداز میں قلمبند کر دیا جائے تو بچوں کے لیے ایک نہیں دسیوں کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ مگر غور کیا جائے تو یہ بھی بڑا مشکل کام ہے، پہلے پڑھنا، پھر سمجھنا اور پھر اسے آسان زبان میں لکھنا۔ کس کے پاس اتنی فرصت ہے کہ ان بکھیڑوں میں پڑے اور بچوں کے لیے یہ مشکل کام کرے کہ نہ تعریف کے ڈونگرے برسیں نہ انعامات کی بارش ہو، نہ مضامین میں ستائشی کلمات سے نوازا جائے۔ لیکن رشید الدین نے صلہ ستائش سے بے نیاز ہو کر یہ مشکل کام کیا ہے۔

"خیالی پلاؤ" میں دس چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں، سادہ اور سلیس زبان میں

اختصار سے قصے ایسے ڈھنگ سے قلمبند کئے گئے ہیں کہ انہیں شروع سے آخر دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے چھوٹے چھوٹے جملوں میں کہانیاں ایسی تکنک سے لکھی گئی ہیں کہ ابتدائی جملے سے ہی قاری کو متوجہ کر لیتی ہیں اور کہانی کے اختتام تک دلچسپی اور تجسس برقرار رہتا ہے اور کہانی متاثر بھی کرتی ہے۔ سبق آموز تاثر رشید الدین کی کہانی کی اولین خوبی ہے یہ خوبی بڑی ریاضت کے بعد ہوتی ہے اور رشید الدین یہ ریاضت کم و بیش پینتیس سال سے کر رہے ہیں پینتیس سال کی ریاضت، تجربے، مشاہدے اور تجزیے کے بعد جو لکھا جائے وہ کڑی کسوٹی پر بھی کھرا ثابت ہوگا۔

یوں تو "خیالی پلاؤ" میں شامل سب ہی کہانیاں مختصر، دلچسپ اور سبق آموز ہیں لیکن خصوصیت سے "خیالی پلاؤ" جادو کی کھیر، عقلمند قاضی، املی کا بیج اور باجی کا کارنامہ، ایسی کہانیاں ہیں۔ جو بچوں کے ادب کے کڑے سے کڑے انتخاب میں جگہ پا سکتی ہیں۔

کتاب کا سرورق شعیب ربانی نے بنایا ہے جو عنوان کی مناسبت سے بڑا با معنی ہے لکھائی چھپائی معقول ہے اور قیمت پندرہ روپے مناسب ہے کتاب شاداب پبلی کیشنز، ۱۴۷-۵-۱۱، ریڈ ہلز، حیدر آباد سے خرید کر پڑھی جا سکتی ہے

سلسلہ صفحہ ۳۸

بشیر بدر، ڈاکٹر فوق کریمی، شاہد الوری، حنا تیموری، اینا شبنم، سراج اجملی حسن کاظمی، احمد محفوظ، اسرار اکبر آبادی، ارمان فیروز آبادی، شاہانہ راحت نے شرکت کی۔ ڈاکٹر شفیق اشرفی کی خصوصی دعوت پر جناب نعیم الدین رضوی نے بطور خاص شرکت فرمائی۔

خورشید حمید پاشاہ

بچوں کی ادبی مجلس "للکار"

زہرہ ذرا تیز چلو اور فٹ پاتھ پر آجاؤ۔ دیکھو تو چاندنی کیسے نکھر آئی ہے ہاں ادھر دیکھو یہ نوجوان بچوں کی ٹولیاں جارہی ہیں۔ ہم بھی انکے پیچھے ہولیں۔ آؤ ذرا تیز قدم یہ لوگ آپس میں کچھ بول رہے ہیں۔ اور ذرا آگے ہو جاؤ۔ تو ہم انکی باتوں کو سن بھی سکینگے۔

عائشہ یہ تو کنج عثمانیہ کی طرف جارہے ہیں۔ شاید چاندنی رات میں پکنک منائے۔ اور سنو کہتے ہیں ہمارے لیڈر باربار ہم سے مخاطب ہیں اور کہتے ہیں۔" ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے ' اس دیس کو رکھنا مرے بچو سنبھال کے " چلو آج کی اس محفل ادب میں ہم اسی عنوان پر سوچیں کر ہمیں آئندہ شہری ہونے کے ناتے کیا کرنا چاہیئے۔؟ دیکھو

ہم چلتے چلتے کہاں پہنچ گئے۔ یہ تو کنج عثمانیہ کا وہی پیڑ ہے جہاں ہم اکثر جمع ہوکر اپنے مستقبل کے متعلق سوچا کرتے تھے۔ ہم کیا بنینگے ؟ کیا کریں گے۔ کسطرح قوم کی ذمہ داریوں کو سنبھالیں گے۔! ہماری آواز عوام تک کیسے پہنچے گی۔ اور ہم قومی ایکتا کو کیسے قائم کرسکیں گے۔ ذرا سستالیں تو پھر ان ٹولیوں کے پیچھے چلیں گے۔

زہرہ ! یہ سب تو اب اس کنج میں بیٹھ گئے ہیں اور انکی محفل جم گئی ہے جہاں خصوصی بنکر ہماری "عظمت آپا" بھی تشریف لائی ہیں۔ چلو سنبھل کر بیٹھ جاؤ یہ محفل ادب تو اب بہت دلچسپ ہو جائیگی۔ دیکھو چانسلر صاحب بھی تقسیم انعامات کے لیے جلوہ افروز ہیں۔ اتنے میں صدر مجلس طلبا و طالبات نے ان کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا چلو کی محفل شعر ادب کا ذکر کیا ہے۔ یہ کلچرل پروگرام تو ہم دیکھکر ہی جائیں گے بیٹھ بھی جاؤ۔ اور سنو۔ آواز آئی۔ ہماری اس محفل کا آغاز تو ہمارے قومی نعرہ سے ہوگا۔ تمام طلبا و طالبات ہم آواز ہو کر

انصاف کی ڈگر پر آئے ہیں آج چل کے
یہ دیش ہے ہمارا نیتا نہیں گے کل کے

صدر مجلس طلبا و طالبات :

سامعین میں تہ دل سے آپ سبکا خیر مقدم کرتی ہوں کہ آپ سب اپنی گونا گوں مصروفیات کے باوجود اس محفل میں شریک ہوئے ہیں۔ آپ کی علم دوستی۔ طلبا پروری ہمارے لیے مشعل راہ بنے گی اس کلچرل پروگرام میں ہم اپنے منظوم خیالات پیش کریں گے اجازت چاہتے ہیں۔ عنوان ہے "للکار" ہماری اس جدت پسندی کی آپ داد دینگے اور ہمارے ابھرتے ہوئے نوجوانوں کی ہمت افزائی فرمائیں گے۔ اس محفل شعر و ادب میں سب سے پہلے آپکے سامنے آرہے ہیں۔ اظہر سال اول۔ انکی نظم کا عنوان ہے۔

ہمارا عزم

ہندکو دشمن کے حملے سے بچانا ہے ہمیں
اپنے بھائی اور بہنوں کو جگانا ہے ہمیں

ہے اہنسا اپنا نعرہ پنچ شیل اپنا سپر
پھر بھی پوشاک سپاہی اب سجانا ہے ہمیں
خون شہیدوں کا ہمارے رنگ لائیگا ضرور
بنکے ٹیپو اور ارجن آگے بڑھنا ہے ہمیں
صرف نعروں اور جلوسوں سے بنیگا کچھ نہیں
اپنے تن۔ من۔ دھن کو اب قربان کرنا ہے ہمیں
جان لے دشمن بھی اب اسکا چلیگا کچھ نہیں
اپنی آزادی کو ہر قیمت بنا ہنا ہے ہمیں
نام ہے اپنا اٹل۔ شان نرالی اپنی ہے
پرچم امن و سکون پھر سے اڑانا ہے ہمیں

اب آپکے سامنے آرہے ہیں صبیتا متعلم سال دوم۔ یہ ایک ترانہ پیش کرینگے عنوان ہے۔

تنظیم کا پرچم

تنظیم کا پرچم لیکر ہم بھارت کو سنوارا کرتے ہیں
ہم سبکی منزل ایک ہی ہے ہم قوم کی سیوا کرتے ہیں
ہندو ہیں ہم مسلم ہیں ہم پارسی سکھ عیسائی ہیں!
ہم آپس میں سب بھائی ہیں اور قومی ایکتا رکھتے ہیں
صنعت گر ہم آہنگر ہم کاشتکار اور سوداگر
ہم اپنی اپنی محنت سے قوم کی سیوا کرتے ہیں

ہم کمہار ہیں ہم معمار ہیں ہم تیلی اور جولاہے ہیں
دیہات نواسی ہو کر بھی تنظیم ہیں حصہ لیتے ہیں
وہ دن بھی بہت اب دور نہیں ہر جگہ ترقی ہوگی یہاں
کچھ ایسے ہی ان منصوبوں کے خواب اشارہ کرتے ہیں

اب آپکے سامنے آرہے ہیں اسلمان سال سوم۔
یہ سماجی ماحول پر تنقیدی نظر رکھتے ہیں۔ انکے ترانہ یا گیت کا عنوان ہے۔

"سفر"

یہ کیسا سفر ہے کدھر جا رہے ہیں!
ذرا سوچو اب ہم کہاں جا رہے ہیں
صراط مبین کی ڈگر ہم نے چھوڑی
صداقت سعادت کی راہ ہم نے چھوڑی
سر بزم عورت کی ہستی کو لا کر
حیا اور وفا کی ہے لاج ہم نے کھوئی
یہ کیسا سفر ہے کدھر جا رہے ہیں
آ بھلایا اصولوں کو ہم نے تو اب ہے
خریدا ہے دولہا ہم نے تو اب ہے
تلک اور جہیز کی تجارت تو اب ہے
کمائی پوت بیٹے کو بیچا۔ تو اب ہے
یہ کیسا سفر ہے کدھر جا رہے ہیں

تجارت میں بیٹی کے ماہر بنے ہم

بساطِ سیاست کے شاطر بنے ہم

مجالس میں قائدگھروں میں ہیں کچھ ہم

سراپا ہیں گفتار۔ عمل سے ہیں کچھ ہم

خریدار۔ بیوی ہے کیسے د بیگی

نئی پود پروان کیسے چڑھے گی؟

ذرا سوچو اب ہم کدھر جا رہے ہیں

اب آپکے سامنے آرہی ہیں مسلمہ سلطان سال دوم انکی نظم کا عنوان ہے۔ " میرا وطن آزاد ہے"

میرا وطن آزاد ہے۔ میرا وطن آزاد ہے

للکار ہے وطن کی بڑھے جاؤ جہاں میں

ہے جذبِ قیامت کا اس آوازِ نہاں میں

ہر سمت ہے کھولے ہوئے آغوشِ ترقی

ہر شعبہ میں ہے موجزن جوشِ ترقی

ہر راہبر قوم ہے مدہوشِ ترقی!

مضمر اسی للکار میں ہے قومی ترقی

میرا وطن آزاد ہے۔ میرا وطن آزاد ہے

عزم مصمم۔ کاوشِ پیہم۔ جذبہ باہم چاہیئے

کرنے غریبی دور اب شمعِ ہدایت چاہیئے

بھارت کے تم ہو پاسباں ارمان ہندستان ہو تم
معمار قوم تم ہی تو ہو آپس میں ایکتا چاہیئے
میرا وطن آزاد ہے ۔ میرا وطن آزاد ہے
نعروں کو اپنے چھوڑ دو ذہنِ رسا پیدا کرو
جدوجہد ایسی کرو دنیا کو جنت بخش دا
انسان ہو انسان بنو انسانیت کا درس دو
بنجاؤ تنویر عمل صدق و صفا کا درس د
میرا وطن آزاد ہے ۔ میرا وطن آزاد ہے

اب آ رہے ہیں کنول کمار سال سوم انکے ترانہ کا عنوان ہے

"بڑھے چلو"

بڑھے چلو ۔ بڑھے چلو نہ سست ہو کبھی قدم
تعمیر قوم اپنا ہے فن وطن کے پاسبان
وطن ہے اپنا اک ارم سینہ و چمن شانتی چمن
لیئے ہیں جسکی خاک پر ہمارے راہبر جنم
بھلا کے ایکتا کو ہم بھٹک رہے ہیں دم بہ دم
شیطانیت کی راہ پر کشاں کشاں چلے ہیں
بڑھے چلو ۔ بڑھے چلو نہ سست ہو کبھی قدم
آزاد وطن کی شوخیاں سیاسی چالبازیاں
حصول زر کے شوق میں لیجائینگی کہاں

یہ قتل و خون کی ہولیاں، ہوا ہوس کی بازیاں
حیوانیت کے دور کی بنے گی ایک داستان
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو نہ سست ہو کبھی قدم
وطن کے پاسبان ہو سنبھل بھی جاؤ وقت ہے
بھولو نہ اپنی ایکتا۔ یہی تمہارا فرض ہے
یہ کشمکش حیات میں ہمیشہ سچ کی جیت ہے
ہمالہ بن کے ڈٹ بھی جاؤ یہی تمہاری ریت ہے
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو نہ سست ہو کبھی قدم

اب سب سے آخر میں آرہی ہیں **روحی** سال دوم یہ مناجات پیش کریں گی
علامہ اقبال کی لکھی ہوئی زمین پر۔

دعا

یارب دلِ آدم کو توفیق سعادت دے
انسان کے تقدس کو اک روپ نیا دے دے
بھٹکے ہوئے انساں کو پھر سوئے عمل لے چل
اور امن کے پرچم کو ہر سمت میں لہرا دے
اس دور کی شورش سے ہر جان پریشاں کو
اخوت کا سبق دیدے ایکتا کی شمع دے دے
پھر ہستیٔ آدم کی تنظیم مکمل کر
اور صدق و صفا کا اک درس نیا دے دے

نیکی کی ضیا سے تو تنویر عمل کر دے
تو یقیں کے خوگر کو توفیق امن دے دے

صدرِ محفل کا خطاب

مادرِ ہند کے سپوتو ہوش میں آؤ ذرا !
چل پڑو انسانیت کی راہ پر اب تو ذرا
قتلِ راجیو یہ نہیں قتلِ آدم زاد ہے
انسانیت پھر زندہ ہوگی یہ زندگی کا راز ہے
قتل و غارت سے کبھی انسانیت دبتی نہیں
ہستیٔ آدم ہے یوں تابندہ کی مٹتی نہیں!
سرزمینِ ہند سے لیں گے جنم ایسے سپوت
پھر وقارِ ہند کو قائم کریں گے یہ سپوت
سارے بکھرے موتیوں کو پھر سے بندھن باندھ کر
ایکتا کی ڈور جب کھینچ لیگی بے گماں
زندگی ہر سو پر ہر سمت سے آجائے گی
راہِ حق پر چل پڑیگا پھر سے جب یہ کارواں
آکے تنویرِ عمل جب ضوفشاں ہو جائیگی
حق شناس و حق پسند ہو جائینگے اہل

پروفیسر عنوان چشتی کو

حضرت امیر خسروؒ ایوارڈ ۱۹۹۲ء

نئی دہلی، اردو ادب اور تصوف کے حلقوں میں یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائے گی۔ دو کے ممتاز شاعر، نقاد اور محقق پروفیسر عنوان چشتی کو امسال حضرت امیر خسروؒ کے ن کے موقع پر حضرت نظام الدین اولیا روحانی مشن کی طرف سے "حضرت سروؒ ایوارڈ ۱۹۹۲ء پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ حضرت پیر ضامن نظامی سجادہ نشین ہ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے ۲۲ اپریل ۱۹۹۲ء کو پیش فرمایا ہے۔ واضح رہے کہ فیسر عنوان چشتی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ڈین فیکلٹی آف ہیومنی ٹیز اینڈ لنگویجز کی بت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور درگاہ حضرت شاہ ولایت منگلوری سجادہ نشین بھی ہیں۔ موصوف کی تقریباً دو درجن کتابیں اور چار سو مضامین ئع ہو چکے ہیں۔ انہیں حضرت امیر خسروؒ ایوارڈ ان کی صوفیانہ شاعری اور ررتو۔ ر کے ذریعے تبلیغ تصوف کے سلسلے میں پیش کیا گیا ہے۔

نوان چشتی کی صدارت میں علامہ میکش اکبر آبادی سیمنار

ڈاکٹر شفیق اشرفی صدر شعبۂ اردو سینٹ جانس کالج نے ۲۵ اپریل علامہ میکش اکبر آبادی سیمنار کا انعقاد کیا۔ جس کی صدارت پروفیسر ستی ڈین فیکلٹی آف ہیومنی ٹیز اینڈ لنگویجز جامعہ ملیہ اسلامیہ نے فرمائی موصوف صدارتی تقریر میں کہا کہ علامہ میکش اکبر آبادی کی شاعری تصوف اور تغزل کا

سنگم ہے۔ لیکن ان کی شاعری میں رومانی حسیت پر روحانی حسیت غالب ہے۔ پروفیسر محمود الحسن صدر شعبۂ اردو، لکھنؤ یونیورسٹی نے کہا کہ میکش اکبرآبادی گئے اردو شاعری کے کلاسیکی دبستان کے آخری ستون تھے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی (الہ آباد یونیورسٹی) نے کہا کہ جو خوبیاں میکش اکبرآبادی کی زندگی میں تھیں وہی ان کی شاعری میں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر شبیہ رضوی (لکھنؤ یونیورسٹی) نے کہا کہ میکش اکبرآبادی کی شاعری میں کلاسیکی نظم وضبط اور رومانی وفور بدرجۂ اتم ملتا ہے۔ ڈاکٹر فوق کریمی (علی گڑھ) نے کہا کہ میکش صاحب کی شاعری تصوف کا سمندر ہے۔ جناب محمد عظیم فیروزآبادی نے کہا کہ میکش اکبرآبادی ایک تہذیب اور ایک دبستان کا نام تھا۔ اس سمینار کا افتتاح پاکستانی شاعر شاہد الوری نے کیا۔ اور شکریے کے فرائض ڈاکٹر شفیق اشرفی نے انجام دیئے۔

آگرہ میں بیاد علامہ میکش اکبرآبادی آل انڈیا مشاعرہ

علامہ میکش اکبرآبادی کی یاد میں سینٹ جانس کالج کے وسیع سبزہ زار پر ۲۵؍ اپریل ۹۲ء کو ایک آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر عنوان چشتی ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لنگویجز جامعہ ملیہ اسلامیہ نے فرمائی۔ اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے انجام دیئے۔ صدر مشاعرہ پروفیسر عنوان چشتی نے قرآن کریم کی سورۃ الحجرات کے حوالے سے کہا کہ تمام انسان ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس لیے رنگ، نسل، زبان اور کلچر کے تفرقے فضول ہیں۔ اس لیے تمام انسانوں کو ایک دوسرے سے بھائی کی طرح محبت اور تعاون کرنا چاہیئے۔ اس مشاعرے میں پروفیسر عنوان چشتی

باقی صـ ۲۸ پر

کے۔ کھلر

توں کی مساوات کیلئے تعلیم

۱۹۹۱ء کی مردم شماری کے مطابق عورتوں کی خواندگی کی شرح ۳۹.۴۲ فیصد
۔۔ ۱۹۸۱ء کی شرح خواندگی سے ۹.۶۷ فیصد کا اضافہ ہے۔ پرائمری اسٹیج
داخلہ لینے والی لڑکیوں کی شرح صرف ۴.۷ فیصد ہے اور مڈل اسکول کی
ؤ پر ۲۶.۰۷ فیصد سکنڈری اور پری سکینڈری سطح پر داخلہ لینے والی لڑکیوں
شرح ۳۲.۳ ہے اور یونیورسٹی کی سطح پر شرح داخلہ ۳۲.۵ ہے
ے اندازے کے مطابق اسکول چھوڑنے والی لڑکیوں کی تعداد ملک گیر پیمانے پر
۲ کروڑ یعنی ان تمام بچوں کا دو تہائی حصہ جو ۶ سے ۱۱ سال کی عمر کے ہیں۔ ۶
، ۱۴ سال کی عمر کے بچے جو آج اسکول سے باہر ہیں ان کی ۷۵ فیصد تعداد لڑکیوں
ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تعلیم کے اعتبار سے لڑکیاں
کے مقابلہ میں کافی پیچھے ہیں حالانکہ لڑکیوں کے لیے تعلیم بارہویں جماعت
سارے ملک میں فری ہے۔ اس کی تین وجوہات ہیں۔ سب سے پہلی یہ کہ لڑکیوں
کے کام کاج دیکھنے پڑتے ہیں۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کرنی پڑتی
گاؤں میں ایندھن اکٹھا کرنے کا کام بھی لڑکیاں ہی کرتی ہیں۔ کھانا بھی
سا ہی پکاتی ہیں۔ اپنے والدین کو کھیت یا فیکٹری میں کھانا پہنچانے کا کام بھی

کیوں کے ہی سپرد ہے۔ دوسری وجہ ہے۔ اقتصادی جس سے لڑکیوں کو اپنا
م چلانے کے لیے کسی فیکٹری یا گھروں میں نوکری کرنی پڑتی ہے ان لڑکیوں سے
م بھی زیادہ لیا جاتا ہے اور انہیں اجرت بھی کم ملتی ہے۔ تیسری وجہ ہے سماجی
مافتی تعصب، جو آج بھی والدین کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنی لڑکیوں کو صرف ان
سکولوں میں داخل کرائیں جہاں ٹیچر خواتین ہیں۔ اسلئے کئی لڑکیاں پرائمری کی
علیم کے بعد اسکول چھوڑ دیتی ہیں۔ لہٰذا اسکول میں داخلہ لینے والی لڑکیوں کی تعداد
ں اضافہ اور اسکول چھوڑنے والی لڑکیوں کی تعداد میں اضافہ اور اسکول چھوڑنے
الی لڑکیوں کی تعداد میں کمی کرنا قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء اور عملی پروگرام کا
سب سے اہم پروگرام ہے۔

قومی تعلیمی پالیسی ۱۹۸۶ء میں یہ چیز واضح ہے کہ تعلیم کو عورتوں کے مقام
اور رتبے میں بنیادی تبدیلی لانے کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ ماضی
کی مجموعی غلط بیانیوں کو بے اثر کرنے کے لیے سارے نصاب کا جائزہ لیا جائے گا
قومی تعلیمی نظام عورتوں کو بااختیار بنانے میں ایک اہم رول ادا کرے گا۔ یہ نظام
نو تشکیل شدہ تعلیمی نصابوں، درسی کتابوں، اساتذہ، فیصلہ کنندگان اور منتظمین کی
تربیت اور تعلیمی اداروں کی سرگرم شمولیت کے ذریعہ نئی قدروں کی نشوونما میں
فروغ دے گا۔ عورتوں کے مطالعہ کو مختلف ہدایات کے جزو کی حیثیت سے بڑھاوا
دیا جائے گا اور سماجی اداروں کو عورتوں کی ترقی میں مدد دینے کے لیے ٹھوس پروگرام
شروع کرنے کی ترغیب دی جائے گی۔

خواتین کی ناخواندگی کو دور کرنے کے لیے اور بنیادی تعلیم تک ان کی
رسائی کا خاطر خواہ انتظام کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائیگی بلکہ اس پروگرام

کو سب سے زیادہ اہمیت دی جائے گی۔ اس پروگرام کی تشکیل کی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کو ہٹانے کے سامان کو بھی خاص ترجیح دی جائے گی۔ اس پروگرام کے نشانے مقرر کئے جائیں گے اور وقتاً فوقتاً ان تمام پروگراموں کا جائزہ لیا جائے گا۔

آج ملک میں تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ پرائمری اسکول ہیں جن میں ۵۰ ہزار صرف لڑکیوں کے لیے ہیں۔ ۴۴ء۱ لاکھ مڈل اسکول ہیں جن میں ۲۰ ہزار صرف لڑکیوں کے لئے ہیں۔ باقی اسکول اور ہائر سیکنڈری اسکولوں کی تعداد کا بڑا حصہ لڑکیوں کے اسکولوں کا ہے۔ ۷۰۰۰ کالجوں میں تقریباً ۷۰۰ کالج صرف لڑکیوں کے ہیں، چار یونیورسٹیاں صرف عورتوں کی ہیں۔

وہ لڑکیاں اور عورتیں جو رسمی تعلیم حاصل نہیں کر سکیں یا کر سکتی ہیں انہیں غیر رسمی تعلیم دی جائے گی۔ آج ہندوستان میں ۲،۷۰،۰۰۰ (دو لاکھ ستر ہزار) غیر رسمی تعلیم کے ادارے چل رہے ہیں۔ ان میں ۸۱،۲۸۲ مراکز صرف لڑکیوں کے لیے ہیں۔ یہ مراکز ۶ سے ۱۴ سال کی لڑکیوں کے لیے ہیں۔ ۱۵ سے ۳۵ سال کے لوگوں کے لیے تعلیم بالغان مراکز ہیں۔ ان مراکز کی تعداد تقریباً تین لاکھ ہے۔ غیر رسمی تعلیمی اداروں میں تقریباً ۸۴ لاکھ بچے پڑھ رہے ہیں جن میں آدھی لڑکیاں ہیں۔ اسی طرح تعلیم بالغان کے تین لاکھ مراکز ہیں جو لوگ تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں آدھی عورتیں ہیں کچھ لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ ہے کہ غیر رسمی تعلیم دوسرے درجے کی تعلیم ہے اور غربا کے لیے ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ غیر رسمی تعلیم کا معیار اور اس کا نصاب رسمی تعلیم سے کسی لحاظ سے کم نہیں ہے بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو غیر رسمی تعلیم رسمی تعلیم سے مواقع کے اعتبار سے بہتر ہے۔ یہاں

اسکول کے اوقات سیکھنے اور پڑھنے والوں کی سہولت پر مبنی ہیں۔ کلاس صبح، شام، رات حسب سہولت طالب علم کبھی بھی لگ سکتی ہے۔ نصاب پھیلا ہے۔ ماحول کے مطابق رسمی تعلیم میں بچہ اسکول کو جاتا ہے، غیر رسمی تعلیم میں اسکول بچے کے پاس آتا ہے۔ اس کے علاوہ کھلے اسکول (open school) ہیں جہاں اسکول چھوڑنے پر بھی (credit) کریڈٹ جمع ہوتے رہتے ہیں اور اگر طالب علم کسی وجہ سے کچھ دیر کے لیے پڑھائی چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے تو دوبارہ اسکول میں داخلہ لے سکتا ہے۔ CBSE نے حال ہی میں ایک اور اسکیم شروع کی ہے جس کے تحت نویں، دسویں، گیارہویں، اور بارہویں، جماعت کے طالب علم سال میں اگر ایک ان پڑھ کو پڑھا لکھا بناتے ہیں تو انہیں ۵ نمبروں کا کریڈٹ ملے گا۔ اگر دو کو پڑھا کر بناتے ہیں تو ۸ نمبروں کا اگر تین یا تین سے زیادہ کو خواندہ بناتے ہیں تو ۱۵ نمبروں کا اضافہ۔ اس کام کو ان کے سرٹیفکٹ میں لکھا جائے گا۔

نئی تعلیمی پالیسی کے تحت تعلیم نسواں کے لیے ایک اور نئی اسکیم تیار کی گئی ہے جس کا نام ہے "مہیلا سماکھیا" یہ ایک ایسی اسکیم ہے جس کے تحت گاؤں میں ایک مہیلا سنگھ قائم کیا جاتا ہے اور اس سنگھ کے ذریعے خواتین کو بیدار کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ تعلیم کے لئے مطالبہ کریں، اصرار کریں، بلکہ تقاضہ کریں، یہ اسکیم کرناٹک یوپی اور گجرات کے دس اضلاع میں 1500 گاؤں میں عمل میں لائی گئی ہے اور کافی کارگر ثابت ہو رہی ہے۔ ان گاؤں میں تعلیم نسواں کے لیے ایک ایسی بیداری پیدا ہو رہی ہے جو پہلے نظر نہیں آتی تھی۔

ایک اور پراجکٹ ہے جس کا نام "شکشا کرمی" ہے یہ پراجکٹ راجستھان

ام کر رہا ہے اور اس کا نصب العین ہے ابتدائی تعلیم کو عام کرنا۔ شکشا کرمی"
یلا سماکیہ دونوں ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں۔ اس اسکیم میں ہر گاؤں میں
ایسی خاتون کو تیار کیا جاتا ہے جو رسمی استاد کی غیر حاضری میں اسکول میں
ائی کا کام فوری طور پر سنبھال سکے۔ یہ اسکیم بھی کافی کارگر ثابت ہو رہی ہے اور
تھان جہاں عورتوں کی خواندگی کی شرح کافی کم ہے۔ امید ہے اس اسکیم
زیادہ ہو جائے گی۔ ان تمام رسمی اور غیر رسمی اسکولوں اور مراکز میں لڑکیوں
لیے بھی ا جماعت تک پڑھائی مفت ہے۔ وہ بچے جن کے والدین غربی کی
سے نیچے ہیں اور پچھڑی درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کے بچوں
لیے وردی، کتابیں اور دوپہر کا کھانا بھی کئی ریاستوں میں مفت ہے، کئی
ریاستوں میں لڑکیوں کو اسکول جانے کے لئے سواری کا انتظام بھی مفت کیا
ہے ویسے بھی قانون کے مطابق اسکول بچے کے گھر سے ایک کلومیٹر کے دائرہ
ہی ہو نا ضروری ہے۔ صفائی کا کام کرنے والوں، چمڑے کا کام کرنے والوں
روں کی کھال اتارنے والوں کے بچوں کے لیے قبل میٹرک وظائف دیئے
تے ہیں۔

ایک اور اسکیم جو "آپریشن بلیک بورڈ" کے تحت چل رہی ہے وہ ہے استانیوں
تقرر۔ گورنمنٹ کے اس فیصلے کے بعد کہ سبھی Single teacher school
Teacher School میں بدل دیئے جائیں۔ یہ بھی سفارش کی گئی ہے کہ جہاں تک
ممکن دوسری ٹیچر استانی یعنی "Lady teacher" ہو اس طرح 97,000 ہزار
ی ٹیچرز کا تقرر کیا گیا ہے۔

عورتوں کی خواندگی کے ساتھ کچھ اور مسائل بھی جڑے ہوتے ہیں۔ کیرالہ میں

خواندگی کی شرح ۱۰۰٪ فیصد ہے۔ وہاں یہ دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر کنبے کا سائز چھوٹا ہو گیا ہے اور شادی کی عمر بڑھ رہی ہے۔ کم عمر کی شادی تقریباً وہاں ختم ہے، بچوں کو اچھی خوراک ملتی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ صرف صحت مند بچے ہی کامیابی کے ساتھ اچھی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں کیرالا کی خواتین نے اہم رول ادا کیا ہے۔ کیرالا کے مہیلا منڈلوں نے گھر گھر جا کر عورتوں میں ایک نئی بیداری پیدا کر دی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج سارے صوبے میں کوئی ان پڑھ نہیں رہا۔

پیشہ وارانہ تعلیم میں بھی لڑکیوں کے لیے اہم سفارشیں ہیں۔ تکنیکی تعلیم کے میدان میں لڑکیوں کی شمولیت بہت کم ہے۔ ڈگری کی سطح پر بارہ فیصد اور ڈپلومہ کی سطح پر ۱۷ فیصد۔ اس شرح کو بڑھانے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ تکنیکی اور سائنسی تعلیم ملک کی ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہ سائنسی مزاج بناتی ہے۔

تعلیم نسواں ایک ایسی ضمانت ہے جس سے اکیسویں صدی کا استقبال بڑے فخر کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے بھی تعلیم نسواں ہندوستان کی بہت پرانی وراثت ہے۔ قومی تعلیمی پالیسی اور اس کے تحت پروگرام آف ایکشن مہیلا سماکھیہ، شکشا کرمی جیسی اسکیموں کی کوشش ہے کہ اس روایت کو مزید جاندار اور وسیع تر بنایا جائے تاکہ اکیسویں صدی کے آغاز تک کوئی بچہ خاص کر لڑکی اسکول سے باہر نہ ہو، کوئی بالغ خاص کر خاتون ان پڑھ نہ ہو۔ ایک سیکھنے اور لکھنے پڑھنے والا سماج وجود میں آئے۔ کوئی بے روزگار نہ ہو، ہر ایک کا مزاج سائنسی ہو۔ آنے والی دہائیوں میں ہماری آبادی میں ہونے والے اضافے کو کافی کم کرنے کا

ضرورت ہے۔ خواندگی کا پھیلاؤ اور خواتین کی تعلیم اس مقصد کے حصول کا واحد اور سب سے بڑا طریقہ ثابت ہو سکتا ہے۔ تعلیم ہی جہالت اور غریبی کو دور کر سکتی ہے تعلیم ہی تاریکی اور گھٹن کی زندگی سے نجات دلا سکتی ہے آنے والے وقتوں میں پڑھی لکھی عورتیں ملک کی ترقی اور بوقت ضرورت سماجی تبدیلی لانے میں بہت اہم رول ادا کریں گی تعلیم انسانی تہذیب کا معیار اور تمدن کا مرتبہ ہے۔ تعلیم نسواں اس معیار اور مرتبے کی کسوٹی ہے۔

غزل

ڈاکٹر محبوب راہی

دل ہو فولاد کا پتھر کا جگر ہو تو چلو
تم مری طرح جو بیباک و نڈر ہو تو چلو

منزل عشق ہے رستہ ہے یہ انگاروں کا
اس حقیقت کی اگر تم کو خبر ہو تو چلو

سر کو شانوں پہ سجانا ہو تو گھر بیٹھ رہو
ہاتھ میں تیرہ ہتھیلی پہ جو سر ہو تو چلو

دوستو شہر میں ہوگا نہ کبھی کوئی فساد
ایسے خوابوں پہ یقیں تم کو اگر ہو تو چلو

بے ہنر ہو تو اٹھو جاؤ کہیں ڈوب مرو
ہاں! اگر ہاتھ میں کچھ نقد ہنر ہو تو چلو

لمس سجدہ سے جبینیں ہوں جہاں نورانی
آستاں ایسا ہو ایسا کوئی در ہو تو چلو

روند ڈالی ہیں زمینیں تو سبھی اسے راہی
آسمانوں کا جو درپیش سفر ہو تو چلو

غزلیں

ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجد، آرٹس و کامرس ڈگری کالج
بیاول (جلگاؤں)

(۱)

تجھ سے ملنے کا سلسلہ نکلا
جیسے صدیوں کا فاصلہ نکلا
اپنی پوجا بھی ہو گئی بے کار
وہ بھی پتھر کا اک خدا نکلا
رات جذبوں کی نرم تنہائی
تیری چاہت کا تذکرہ نکلا
گم ہوا تیرگی میں آتے ہی
اپنا سایہ بھی بے وفا نکلا
ہر عبادت میں تھی غرض مخفی
اس لگن میں بھی مدعا نکلا
کوئی شیریں نہ مل سکی مجھ کو
تیشہ آخر کو بے صدا نکلا
آنکھ پُر نم سی ہو گئی ساجد
دل سے یادوں کا راستہ نکلا

(۲)

دور ساحل سے کوئی چہرہ صدا دیتا ر
حلقۂ موج مگر اس کو سزا دیتا ر
دیکھ ایسے بھی کیا جاتا ہے شب کو روشن
جل کے پروانہ کوئی درس وفا دیتا
جبکہ رشتوں کا کوئی آسرا باقی نہ
کون آنچل سے مجھے شب میں ہوا دیتا
تو نگاہوں سے کسی وقت ہوا نہ اد
میرا ہمزاد مجھے تیرا پتا دیتا
اپنے دامن میں سمیٹا ہے بہت پیار کے
عمر بھر جو بھی یہاں ہم کو خدا دیتا
ملنے والوں کو کیا پیار سے رخصت
کیا عجیب بات کہ ہر کوئی سزا دیتا

غزل

پروفیسر محمد منصور خان
صدر شعبہ انگریزی گورنمنٹ کالج
چھندواڑہ - ایم پی

اپنے چہرے پہ سنوارے ہوئے رکھنا مسکان
اپنی آواز میں اک شبنمی نرمی کا جہان

وار داتوں کیلئے کچھ کم نہیں پھیلے زمین
تم مگر تنگ ہی رکھنا اپنے ابرو کی کمان

تم تو جاتے ہو یوں چھوڑ کر محفل سونی
بن دیا جسطرح ہو جائے کوئی بے نور مکان

ہائے نکلے وہ فقط حرص و ہوس کے بندے
جن کو سمجھا تھا خلوص اور وفا کا دیوان

بندگی میں میری کیا تجھکو گماں تھا یارب
جو ہوا تجھکو مقدر میرا یہ امتحان !!

کتنے دشوار مراحل سے گذر کر یہ خودی
اپنی آواز کی خود اب کرنے لگی ہے پہچان

میرے جذبات کی اس تندیٔ صہبا کے لئے
آبگینہ ہی غزل کا ہے اک موزوں پیمان !

منزل شوق کا سودا تو ہے سر میں منصور
دیکھئے ٹوٹے ہے اسکی اک کس حال پہ تان

غزل

جمیل نظام آبادی

کبھی گرداب اور طوفان دیتے ہیں سہارے بھی
کبھی کشتی ڈبو دیتے ہیں ساحل کے کنارے بھی

سنورتی ہے جہاں تیری وفا تیری خوشی ہمدم
بھڑکتے ہیں اُسی دل میں ترے غم کے شرارے بھی

زمانہ ہم سے پوچھے قدر اور قیمت اُجالوں کی
کئے ہیں ہم نے صدیوں تک اندھیروں میں گزارے بھی

ہیں تیرے شہر کے منظر یقیناً دید کے قابل !!
مگر کچھ کم نہیں ہیں میرے گاؤں کے نظارے بھی

اُتر جاتا ہے مجھ کو دیکھ کر چڑھتا ہوا دریا !!
مری آواز سنتے ہی ٹھہر جاتے ہیں تارے بھی

جمیل خستہ جاں کب تک کسی کی راہ دیکھو گے
سحر ہونے کو ہے اب جھلملاتے ہیں ستارے بھی

انجمن ترقی اردو ریاستی کنونشن نمبر

جلد [۹] شمارہ [٦]

جون ۱۹۹۲ء حیدرآباد

229161

قیمت =/6 روپے

شاداب

ایڈیٹر: محمد قمرالدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر: رشید الدین منیجنگ ایڈیٹر: کلیم الدین احسن

مجلس مشاورت

زر تعاون

ہندوستان	65 روپے	۲ سال کیلئے 120 روپے	تاحیات 1500 روپے
خلیجی ممالک	200 "	" 360	" 3700 "
امریکہ	40 ڈالر "	70 ڈالر	" 700 ڈالر
انگلستان	25 پونڈ "	45 پونڈ	" 400 پونڈ
پاکستان	175 پاکستانی روپے "	300 پاکستانی روپے "	3000 پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004

○ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے پبلک پرنٹرس سے چھپوا کر دفتر شاداب ریڈ ہلز حیدرآباد سے جاری کیا

فہرست

نواب میر احمد علی خاںؒ
سابق وزیر حکومت آندھرا پردیش
صدر مجلس استقبالیہ

خطبۂ استقبالیہ

اردو کانفرنس

(انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے ۲۳ ویں سالانہ اجتماع منعقدہ ۹، ۱۰ مئی ۱۹۹۲ء کے افتتاحی اجلاس م ۹، ۵، ۹۲ء میں پڑھا گیا)

عالیجناب ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب! صدر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش

س۔ ستقبالیہ کی حیثیت سے حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں محبان اردو کا پھر ایک مرتبہ استقبال کرتے ہوئے مجھے بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

خصوصاً عالی جناب پی راجندرا ریڈی صاحب وزیر بھاری صنوعات حکومت آندھرا پردیش کی یہاں تشریف آوری اور آج کے اس عظیم اجتماع کا افتتاح اہل اردو کی بڑی خوشنودی کا باعث ہے۔ موصوف عرصہ دراز سے انجمن ترقی اردو سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کی مدد کرتے رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اب جبکہ آپ کا تعلق ضلع میدک سے بڑھ کر پورے آندھرا پردیش سے قائم ہوگیا ہے تو اردو کی طرف آپ کی توجہ بھی پیش از پیش رہے گی۔

آج کے اس اجتماع میں عالی جناب سی نارائن ریڈی صاحب وائس چانسلر تلگو یونیورسٹی آندھرا پردیش کی شرکت کو بھی میں خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ کی تشریف آوری اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ آندھرا پردیش میں تلگو اور اردو میں کتنی یگانگت ہے۔

جو لوگ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ آندھرا پردیش کے کئی اضلاع میں ہماری تلگو برادری کے ممتاز افراد انجمن کی اضلاعی شاخوں کے عہدوں پر متمکن رہے ہیں اور ہیں۔ میں اردو [illegible] نوجوان رہنما عالی جناب جلیل پاشاہ صدر نشین اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کا بھی خیر مقدم کرتا ہوں جو خاص طور پر اضلاع تلنگانہ کے علاوہ اضلاع رائلسیما و شمالی سرکار کیا بھی اردو کی خدمت گذاری میں اپنا کافی وقت دے رہے ہیں۔

عالی جناب خلیق انجم صاحب معتمد کل ہند انجمن ترقی اردو کی آندھرا پردیش سے دلچسپیوں کے ہم ہمیشہ معترف رہے ہیں۔ وہ نہ صرف ہمارے اجتماعات میں شرکت فرماتے ہیں بلکہ اپنے مفید مشوروں سے مستفید فرماتے رہے ہیں۔

ہندوستان میں اردو زبان ایک کل ہند زبان ہے جو شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے۔ کل ہند انجمن ترقی اردو اس پس منظر میں شاندار کارنامہ انجام دے رہی ہے۔

آج کے اس اجتماع میں آندھرا پردیش کے اضلاع سے کافی محبان اردو شرکت فرما رہے ہیں۔ میں ان سب کی خدمت میں خوش آمدید عرض کرتا ہوں۔

دراصل آندھرا پردیش میں اردو کا مسئلہ زیادہ تر اضلاع سے تعلق رکھتا ہے۔ شہر حیدرآباد میں اردو آبادی ریاست کی کل اردو آبادی کا تقریباً ۱۰ فیصد ہے اور باقی ۹۰ فیصد میں بھی آندھرا پردیش کی اردو آبادی کا ۵۲ فیصد حصہ دیہات میں رہتا ہے۔ دیہات میں تلگو آبادی کے مقابلہ میں اردو آبادی بہت کم ہے۔ لیکن چونکہ ہر گاؤں میں وہ موجود ہیں۔ اس لیے ان کا مجموعی اوسط ریاست کی کل اردو آبادی کا ۵۲ فیصد ہے۔

بڑی خوشی کے ساتھ یہ دیکھا جا رہا ہے کہ جہاں یہ ۵۲ فیصد آبادی پوری تلگو والی ہے اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کا شوق اس آبادی میں روز افزوں ہے۔

ہم حکومت آندھرا پردیش کے مشکور ہیں کہ حالیہ فیصلے کے تحت ۱۰ فیصد اردو آبادی مقامات پر اردو تعلیم کی جماعتیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے

ہم امید کرتے ہیں کہ حکومت اپنے اس فیصلے کی تعمیل پر نگاہ رکھے گی اور اس کو طور پر عملی جامہ پہنائے گی۔

آج کا یہ اجتماع انجمن ترقی اردو کی جانب سے منعقد کیا جا رہا ہے۔ جیسا کہ خود انجمن کے سے ظاہر ہے کہ انجمن کا اولین مقصد اردو کی ترقی ہے۔ اردو کی ترقی اسی وقت ہو سکے گی اردو سائنس اور تحقیق کی زبان بنے گی اور اس زبان میں نہ صرف لکھنا، پڑھنا بلکہ علوم و فنون، سائنس و ٹکنالوجی کے ذخائر ہوں گے اور ان میں تحقیقات ریسرچ) ہوگی۔ یہ سب اس وقت ہوگا جب بچے تلگو اور انگلش ایک زبان کی شکل سے سیکھتے ہوئے نہ صرف ابتدائی تعلیم بلکہ جامعاتی تعلیم اور ریسرچ میں لگ جائیں میں تعلیم سے نہ صرف اردو کی ترقی ہوگی بلکہ اردو مادری زبان والے بچوں کا غیر ضروری کا بوجھ ہلکا ہوگا اور وہ اپنے مضامین پر حاوی ہو سکیں گے اور اعلیٰ مدرجہ میں یابیاں حاصل کر سکیں گے۔ جس کا ثبوت اس صدی کے حیدرآباد نے جامعہ عثمانیہ شکل میں پیش کیا جہاں کے طالب علم بہت بڑی تعداد میں انگریزی میڈیم کے ب علموں سے بدرجہا آگے رہے۔

جب تک بچوں کو اردو ذریعہ تعلیم سے تعلیم نہ دلوائی جائیگی نہ اردو کی ترقی ہوگی نہ بچے اپنا جوہر دکھا سکیں گے۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
نائب صدر انجمن ترقی اردو

کلیدی خطبہ اردو کانفرنس

آندھرا پردیش میں اردو کے مسائل

جناب صدر محترم وزیر بھاری صنعتوں حکومت آندھرا پردیش صدر استقبالیہ نواب میر احمد علی خاں صاحب معزز مہمانان مدعوین خواتین و حضرات !

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی مجلس عاملہ نے پھر ایک بار مجھے کلیدی نوٹ پیش کرنے کی ذمہ داری دے کر آپ کی سمع خراشی کا موقع فراہم کیا ہے میں انجمن کا مشکور ہوں اور آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔

ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں لسانی اور نسلی مسائل نے بڑی بڑی ریاستوں کے لیے مصیبتیں کھڑی کر دی ہیں۔ ریاستیں ٹوٹ رہی ہیں اور زبانیں اور نسلیں اپنی شناخت منوا رہی ہیں۔

خوش قسمتی سے ہندوستان نہ صرف کثیر لسانی ملک ہے اور یہاں مختلف نسلوں قبیلوں سے تعلق رکھنے والے بستے ہیں بلکہ سینکڑوں برس کی تاریخ نے ہمیں متحد رکھا لسانی ہم آہنگی اور رواداری ہماری تہذیب اور ہمارے قومی مزاج کا جز بن چکی ہے لیکن اس بات سے بھی صرف نظر ممکن نہیں کہ بعض تنگ نظر قوتیں زبانوں کے سوال کو بھی پیچیدہ بنانے کے درپے ہیں کہیں برتری اور کمتری کی بات کی جاتی ہے تو کہیں ملکی اور غیر علاقائی کی اصطلاحوں کے ذریعہ فرق کیا جاتا ہے

سب سے پہلے ہمیں یہ بات مان کر چلنا ہوگا کہ ہندوستان میں بولی جانے والی ہماری زبانیں قومی ہیں چاہے ان کے علاقے چھوٹے ہوں کہ بڑے ہوں چاہے ان کا ذکر آئین کے آٹھویں شیڈول میں ہو کہ نہ ہو۔

آئین کا آٹھواں شیڈول کچھ مضحکہ خیز ہو گیا ہے۔ اس میں ۱۵ زبانیں درج ہیں آئین کی دفعہ ۳۵۱ میں یہ درج ہے کہ ہندی کے فروغ کے لیے ہندوستانی اور آٹھویں شیڈول میں مندرجہ بھارت کی دوسری زبانوں سے بھی استفادہ کیا جائے۔

ذرا غور کیجئے ہندی کے فروغ کے لیے تو سب سے پہلے ان زبانوں اور بولیوں سے استفادہ کرنا ہوگا جو ہندی علاقے میں مستعمل ہیں اور آٹھویں شیڈول میں یہ کہاں ہیں۔ انگریزی بھی پورے ریاست کی سرکاری زبان ہے۔ نیپالی یا گورکھالی دارجلنگ ہل کونسل کی زبان ہے کونکنی گوا کی سرکاری زبان ہے۔ یہ سرکاری زبانیں ہیں لیکن آٹھویں شیڈول میں ان کا ذکر نہیں۔

راجستھان ایک ریاست تو ہے لیکن راجستھانی آٹھویں شیڈول میں نہیں ڈوگری کافی ترقی یافتہ ہے لیکن آٹھویں شیڈول میں نہیں۔ اردو آٹھویں شیڈول میں تو ہے لیکن ملک کے تعلیمی نظام میں اسے جو مقام ملنا چاہیئے اس سے وہ محروم ہے اور دستور میں تو اسے کوئی جگہ نہیں۔

اس سوال پر نظر ثانی کی اور اس کے حل کے لیے قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اردو کے تعلق سے ایک اور بے بنیاد بات بھی کہی جاتی ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے اور اب اسے پاکستان مل گیا ہے۔ لیکن یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ اردو وادی گنگ و جمن میں پیدا ہوئی پلی پروان چڑھی اور اس کے ادب کو موجودہ مقام تک پہنچانے میں ہندو اور مسلمانوں دونوں ہی نے حصہ ادا کیا۔ اگر ہندی ادب کی تاریخ بوعلی قلندرؒ

خواجہ مسعود سلمان ملک محمد جائسی عبدالرحیم خانخاناں اور بیسیوں مسلمان ادیبوں کے بغیر ناممکن ہو گی تو اسی طرح اردو ادب برج نرائن چکبست رتن ناتھ سرشار منشی پریم چند کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، فراق گورکھپوری وغیرہ کی تخلیقات کے بغیر انتہائی مفلس اور کم مایہ ہو گی آج بھی متعدد غیر مسلم اردو کے بولنے اور لکھنے والے موجود ہیں یہ اور بات ہے کہ مردم شماری کے طریقے میں کچھ ایسی تبدیلی لائی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ حقیقت چھپ سی جاتی ہے پہلے مادری زبان کے ساتھ وہ سب زبانیں بتائی جانی پڑتی تھیں جن سے شہری واقف ہے لیکن اب مادری زبان کے علاوہ یہ بتاؤ کہ دو اور کون سی زبانیں آپ جانتے ہیں ظاہر ہے یہاں مثلاً تلگو والے ہندی اور انگریزی لکھائیں گے گو وہ اردو جانتے اور بولتے ہیں لیکن مردم شماری کے کالم میں اس کا ذکر نہ ہوگا اس طرح اردو کے ان جاننے والوں کی تعداد مردم شماری میں گھٹ گئی ہے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے

پھر زبان کو کسی ایک مذہب سے وابستہ کر دینا دونوں کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے ہندوستان میں ایسے بہت مسلمان ہیں جن کی مادری زبان ملیالم تامل اڑیہ بنگالی گجراتی یا تلگو وغیرہ ہے اور اگر اردو مسلمانوں کی مادری زبان ہے بھی تو ان ہی مسلمانوں کی ہے جو وادی گنگ و جمن سے تعلق رکھتے ہیں یا تاریخ کے کسی نہ کسی دور میں ان کے اجداد اس علاقے سے دوسرے لسانی علاقوں میں جا بسے تھے۔

پاکستان میں اردو بھلے رابطے کی سرکاری زبان ہو لیکن مادری زبان انہی کی جو یوپی بہار سے پاکستان گئے ہیں۔

زبان کے تعلق سے اسی دانستہ پروپگنڈہ اور اسے نادانستہ طور پر تسلیم کرنے والوں ہی کا ہمیں مقابلہ کرنا چاہیئے اور تاریخی اور تہذیبی حقیقتوں کو توڑنے مر

اجازت نہیں دینی چاہیئے۔

لسانی تبدیلی اور نسلی سوالوں کو جمہوریت اور انصاف کی بنیادوں پر حل کرنا ہیئے آزادی، امن، جمہوریت اور انصاف نا قابل تقسیم قدریں ہیں یہ ممکن نہیں کہ ماج کے کسی طبقے کو کچھ زیادہ آزادی جمہوریت اور انصاف ملے اور دوسرے طبقات کو لے یا وہ اس سے محروم ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ سب تو برابر ہیں لیکن کچھ دوسروں سے زیادہ "برابر" ہیں۔

ہمارے ملک کی تہذیب ایک گلدستہ ہے اگر اس کا ایک رنگ بھی مجروح ہو جائے رسارا گلدستہ بگڑ جائے۔ اس تہذیبی طیف کی حفاظت ہمارا فرض ہے اور کسی بھی زبان ے ساتھ ناانصافی ہماری قومی یکجہتی کو مجروح کر دے گی۔ ہمارے ورثہ کو نقصان پہنچائے گی

جہاں تک ریاست آندھرا پردیش کا تعلق ہے ہم اس معاملے میں خوش قسمت ں کہ یہاں لسانی ہم آہنگی اور اردو دوستی کے جذبات گہرے ہیں اردو کو اس کے جائز قام سے کوئی محروم نہیں رکھنا چاہتا۔ بلکہ ہمارا تجربہ تو یہ ہے کہ ہمارے گرامی اسکول ں غیر اردو داں بھی اردو سیکھنے کے لیے شوق سے آتے ہیں اردو اخبارات کی اشاعت پتہ چلے گا کہ کتنے ہی ایسے جن کی مادری زبان اردو نہیں اردو اخبارات خریدتے اور ھتے ہیں

لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ حکومت کے وعدے اور اعلانات ناقابل تعلیم شاید ہوں ا قابل تعمیل نہیں سمجھے جاتے بڑی جدوجہد کے بعد حکومت نے کابینی سب کمیٹی کے یض اردو کا سوال رکھا اور اس کمیٹی نے ایک رپورٹ بھی دی لیکن اس کمیٹی کے سربراہ نذر ریڈی صاحب ہمارے درمیان موجود ہیں حکومت نے اس رپورٹ کو تسلیم بھی کر لیا ہے ا عمل کے میدان میں کچھ نہیں ہوا۔

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس رپورٹ میں جو سفارشات کی گئی ہیں وہ بیشتر ہمارے مطالبات پر مبنی ہیں۔ تعلیمی سہولتوں اور نظم ونسق میں ضروری استعمال کے لئے ہمارے مطالبہ کے مطابق دس فیصد آبادی کی تجویز مان لی گئی ہے جبکہ پہلے ۱۵ فیصد کی شرط تھی یہ اور بات ہے کہ عمل دونوں ہی پر نہیں ہوا۔

کم سے کم سرکاری اغراض جہاں اردو استعمال ہوگی ان میں بھی کچھ وسعت پیدا کی گئی ہے اور بھی اچھی باتیں ہیں لیکن جن باتوں کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کروانا چاہوں گا وہ یہ ہیں کہ اردو ذریعہ تعلیم کی متوازی جماعتوں کے قیام کے لئے بھی تحتانوی مدارس میں ۱۰ اور ۳۰ اور چھٹی سے آٹھویں یا نویں کلاس تک ۴۵ طالب علموں کی شرط لگائی گئی ہے۔

تعداد کی یہ شرط ۱۹۴۹ء میں وزرائے تعلیم کی کانفرنس کے مجوزہ فارمولے میں تھی۔ اور اس کا جو تلخ تجربہ ہوا وہ ہم سب کو معلوم ہے لیکن اس کے بعد کافی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں آئین میں ترمیم کی گئی اور دفعہ (۳۵۰ الف) شامل کی گئی جس کی رو سے ریاستوں اور حکومت مقامی کے اداروں کی یہ ذمہ داریاں ہے کہ وہ تحتانی تعلیم کا طلبا کی مادری زبان میں معقول انتظام کریں بصورت دیگر صدر جمہوریہ کو اختیار ہوگا کہ وہ ہدایات جاری کریں اب اس کے بعد تعداد کی شرط بے معنی ہو گئی۔

پھر گجرال کمیٹی نے یہ کہا کہ جہاں دس فیصد اردو بولنے والے ہوں وہاں تحتانوی جماعتوں کا انتظام ہو اور پھر ۸ یا ۱۰ تحتانوی مدارس پر ایک ثانوی تعلیم کا مدرسہ قائم ہو اس کے بعد طلبا کی تعداد کے مقرر کرنے کا جواز کہاں رہ جاتا ہے۔

جامعاتی تعلیم کے لیے اس تجویز پر بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ ذریعہ تعلیم چاہے کوئی زبان ہو امتحان میں جوابات انگریزی زبان میں دینے کا اختیار ہونا چاہیے۔

تعلیمی محاذ پر ایک تکلیف دہ سوال ان بچوں بچیوں کا ہے جو تحتانی تعلیم بھی
ری نہیں کر پاتے اور گھریلو مجبوریوں کے تحت تعلیم چھوڑ دیتے ہیں انہیں کام سے
ی ہوتی تعلیم چاہیئے اور اس کا انتظام ہونا چاہیئے ورنہ وہ ان پڑھ رہیں گے۔

پھر تعلیم کے معیار پر بھی غور کرنا ضروری ہے ایک تو معیار کمتر ہونے کی وجہ سے
لدین بچوں کو اسکولوں سے نکال کر زیادہ تر خانگی اور اگر استطاعت رکھتے ہوں تو
رزی ذریعہ تعلیم کے اسکولوں میں داخل کرتے ہیں یا تعلیم ہی ختم کر دیتے ہیں اس کے
ہم نے مطالبہ کیا تھا اور کابینی سب کمیٹی نے بھی سفارش کی کہ ہر سال نتائج کا جائزہ
جائے اور تعلیم میں جو بھی سقم پائے جائیں انہیں دور کیا جائے۔

جو بچے کسی خاص مضمون میں کمزور ہوتے ہیں ان کے لیے ان مضامین میں
چنگ کلاسس کا انتظام ہونا چاہیئے۔

طریق تدریس میں بھی نئی نئی تبدیلیاں آرہی ہیں اس لیے اساتذہ کے لئے
فریشر کورس کا انتظام ہونا چاہیئے۔

پڑھانے کے لیے بعض ضروری اعانتی ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے جیسے
ارض نقشے بلکہ ویڈیو کیسٹس بھی استعمال ہو رہے ہیں لیکن کتنے ہمارے مدرسے
ب TEACHING AIDS سے محروم ہیں۔

اسکولوں کے انسپکشن کا معقول انتظام ہونا چاہیئے کابینی سب کمیٹی نے سفارش
ہے کہ اگر انسپکٹر اس زبان سے ناواقف ہیں جن میں تعلیم دی جا رہی ہے تو انسپکشن
مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اسکول انسپکشن کو محکمہ آرٹ کی طرح خود مختار ہونا چاہیئے
نظامت تعلیمات کے تحت نہ ہو۔

اردو کے نظم ونسق میں استعمال کے لیے کابینی سب کمیٹی نے سفارشات کی ہیں

اگر ان پر بھی عمل ہوتا ہے اور سابقہ حکومتی اعلانات کے ہجوم اور اس ہجوم میں انتشار کی جو کیفیت ہے کہیں کہیں تو متضاد باتیں ہیں انہیں دور کرتا ہے تو ایک جامع جی۔او مرتب کرنا اور جاری کرنا ضروری ہے حکومت نے اس سے اتفاق کر لیا ہے لیکن عمل نہیں ہوا۔

اُردو کے سرکاری استعمال کے سلسلے میں کابینی سب کمیٹی نے ۱۰ فیصد اُردو آبادی کے علاقے میں کم سے کم سرکاری اغراض کا تعین کیا ہے لیکن جہاں آبادی اس سے زائد ہے وہاں کس اصول کے تحت اغراض میں اضافہ کیا جائے گا نہیں بتایا گیا ہم نے مطالبہ کیا ہے کہ جس اڈمنسٹریٹیو علاقے میں اردو آبادی ۲۰ فیصد یا اس سے زیادہ ہے وہاں مقامی نظم و نسق تلگو کے ساتھ اُردو میں بھی چلایا جائے مثلاً کیا حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کا نظم و نسق دو لسانی نہ ہوگا؟

حکومت نے مان لیا ہے کہ تحت کی عدالتوں میں اُردو میں دستاویزیں داخل کی جا سکیں گی اردو میں دی ہوئی شہادت اُردو ہی میں قلمبند ہوگی اور مطالبہ کرنے پر فیصلہ کا اُردو ترجمہ بھی فراہم کیا جائے گا۔

ہم بھی تحت کی عدالتوں پر اس لیے زور دیتے ہیں کہ سب ابتدائی چارہ جوئیں ہوتی ہے شہادتیں یہیں قلمبند ہوتی ہے ان عدالتوں کو (Original Jurisdiction) حاصل ہے ہائی کورٹ کو صرف (Appellate Jurisdiction) حاصل ہے تحت کی عدالتوں کی کارروائی کی نوعیت الگ ہے اور ہائی کورٹ کی الگ تحت کی عدالتوں کی کارروائی موکل جاننا چاہتا ہے لیکن حکومت کا جی۔او یا اعلان کی عدالت پابند نہیں۔

اسی طرح یہ تو حکومت نے مان لیا کہ قانون سرکاری زبان کی دفعہ ۵ کے تحت جو سرکاری زبان کمیشن ہے اس میں اُردو کا نمائندہ بھی شامل ہو۔

ان سب باتوں پر عمل کے لیے سرکاری زبان کے قانون میں ترمیم کی ضرورت ہے سرکاری زبان کے ساتھ سرکاری طور پر مسلمہ زبان کی اصطلاح بھی قانون میں ہونی چاہیے پھر اس مسلمہ زبان کو جن سرکاری اغراض کے لیے استعمال کیا جائے گا انہیں شیڈول میں درج کردیا جائے۔ اس کے بعد عاملہ اور عدلیہ دونوں بھی اُردو کے مجوزہ استعمال کی پابند ہوں گی۔ دفعہ ۵ میں سرکاری زبان کے کمیشن کے دائرہ اختیار کو وسعت دے کر اقلیتی زبانوں کے بھی مجوزہ سرکاری اغراض کے لیے استعمال پر نگرانی بھی اس کے سپرد ہونی چاہیے اور جہاں تساہل محسوس ہوتا ہے وہاں ضروری اقدام کی بھی گنجائش ہونی چاہیے

دفعہ ۷ میں جہاں اُردو اور دوسری اقلیتی زبانوں کے سرکاری استعمال کا ذکر ہے وہاں اس استعمال کے لیے مدت کے تعین کی بات بھی ہے مدت کا کوئی سوال نہیں اسے حذف کر دینا چاہیے۔

قانون میں یہ ضروری ترمیمات وقت کا اہم تقاضہ ہیں ورنہ حکومت کی نیت نیک فیصلے معقول لیکن ان پر عمل کی ذمہ داری کسی پر نہیں ایسی مضحکہ خیز صورتحال کو ختم کرنا ہی ہوگا آخر میں میں دو لفظ اردو والوں سے بھی عرض کردوں ایک تو یہ ہے کہ اُردو کے لیے مطالبات کرنے والی جماعتیں تو بہت ہیں اور کچھ تو ہمارے ساتھ متحدہ مجلس عمل میں شامل ہیں کچھ اور ہیں جو آسکتی ہیں کچھ دوسری ہیں جو ذرا الگ رویہ اپنائے ہوئے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم زبان کو سیاسی مسئلہ نہ بنائیں دوسری بات یہ ہے کہ تہذیبی مسئلہ ہے اور اسے اسی حیثیت سے دیکھنا اور جمہوری طریقے سے حل کرنا ہے۔

جمہوریت صرف ووٹ کا نام نہیں جمہوریت اس سب مسائل کا احاطہ کرتی ہے اور ان کا حل تلاش کرتی ہے جن سے جمہور دوچار ہے پھر ایک مصیبت سب کی مصیبت

کی حیثیت سے دیکھ کر ہی جمہوریت کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ اپنے ایسے تہذیبی مسائل کو [illegible]
کرنے کے لیے ہمیں قیاس اجتہاد اور اجماع کا جدلیاتی طریقہ اپنانا چاہیے۔ ہم سوچیں پر[illegible]
سے جوجھیں اور اس کا حل معلوم کریں اور اس کے بعد اسی طرح سوچ کر مسئلہ سے جوجھ کر او[illegible]
نے بھی جو حل تلاش کئے ہیں ان کے ساتھ تبادلہ خیال کریں۔ اپنی بھی کہیں اور ان کی بھی [illegible]
اور اس کے بعد اتفاق رائے سے کوئی تجویز معلوم کریں اجماع یا اوروں سے رائے [illegible]
کرنے کا مقصد ہی (consensus) معلوم کرنا ہے اتفاق رائے کی تلاش کرنا ہے اس [illegible]
ہم ایک ایسے مقام پر آجائیں گے جہاں سے مطالبات وہی ہوں گے چاہے جدوجہد کے راستے
الگ الگ ہوں۔

ایک بات اور جو ہم سنتے آئے ہیں کہ اردو کا تعلق جب تک روزی روٹی سے نہیں
جوڑا جاتا ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے یہ ایک بھول بھی ہے اور ایک حقیقت
ت ناہی بھی۔

روزی روٹی کے لئے تو ہم انگریزی عربی چاہے کوئی زبان سیکھ لیں آخر تو اس [illegible]
زبان میں کام کرتا ہے لیکن مادری زبان کی قربانیاں کیوں دیں؟

پھر اگر اردو پڑھنے والے زیادہ ہوں گے تو اردو اخبارات اور کتابیں زیادہ
ہوں گی مدرسے زیادہ ہوں گے یہ خود روزگار کے مواقع فراہم کریں گے۔

آج ہندوستان میں اردو بولنے والوں کی جتنی تعداد ہے اس سے کہیں کم ا[illegible]
بھی زبانیں بولنے والوں کی ہے۔ کیا وہ اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر "روزگار کی زبان"
ہی کی رٹ لگاتے ہیں؟ آخر سندھی بھی تو ہے۔ سندھی زبان سے انہیں ایسا کون سا
ملتا ہے؟ لیکن انہوں نے سندھی زبان کو چھوڑا نہیں ہے۔

ہمیں ایسے گمراہ کن سوالات میں الجھنا نہیں ہے۔

حاضرین! میں نے آپ کی بہت سمع خراشی کی۔ میں نے آپ کے سامنے آپ ہی کے مختلف مسائل کا اجمالی جائزہ پیش کر دیا ہے۔ اب ہم کل کے اجلاس میں ان کا حل نکالیں گے اور پھر اس کے حصول کے لیے لائحہ عمل بھی بتائیں گے۔ "لائحہ عمل" بھی ایک پیچیدہ عمل ہے۔ یوں تو ہم چاہیں گے کہ نالۂ شائستہ بھی حدِ آداب میں ہو لیکن صورت اگر یہ ہو کہ

"ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک"

اور اگر انہیں بروقت خبر پہنچانی ہے تو فریاد کرنی ہوگی اور فریاد کی کوئی لے نہیں ہوتی۔

سلسلہ صفحہ ۱۹

تعلق رکھنے والی شخصیتوں کی تقاریر سے اردو کے مختلف النوع مسائل کا اظہار ہو چکا ہے۔ یقین ہے کہ اجلاس مندوبین کے مباحث کے بعد منظور قراردادوں پر حکومت عاجلانہ فیصلے کرے گی انجمن کو حکومت کی گرانٹ ۵۰ ہزار روپے مقرر ہونے کے باوجود صرف پندرہ ہزار روپے اجراء کے انکشاف سے اردو والوں کو بڑی مایوسی ہوئی حکومت کو چاہیئے کہ اس گرانٹ کو کم از کم دو لاکھ روپے کر دے۔ مرکزی انجمن کے معتمد عمومی ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی تقریر میں اردو کے مسائل کو بڑی عمدگی سے پیش کیا اور ان مسائل کو حل کرنے اور ریاستی انجمن کے مالیہ کو مستحکم بنانے کے لیے ریاستی شاخ کو عاجلانہ اقدامات کرنا چاہیئے۔ انجمن کی اس کانفرنس میں بھی اضلاع سے بھی بڑی تعداد میں مندوبین نے شرکت کی۔ ان مطالبات کے سلسلہ میں بھی انجمن کو کوئی موثر مشترکہ تشکیل دینا چاہیئے۔ اسی طرح خود اپنے مالی وسائل میں اضافہ کے لیے بھی انجمن کے ارکان و ہمدردان کو زیادہ وسعت دی جا سکے۔ انجمن کی سینئر رکن مجلس انتظامی ڈاکٹر زینت ساجدہ کی خدمات سے بھی زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے سے انجمن کو زیادہ فعال بنایا جا سکے گا۔

مقرر کیا جائے۔ اردو کی اور ساتھ ہی ملک کی قومی یکجہتی کی ضروریات کے مدنظر اردو پروگرام پر نظر ثانی اور اس کے معیار کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں کنونشن کی تجویز ہے کہ آکاش وانی اور دور درشن کے مراکز کے لیے

ریاستی انجمن ترقی اردو کی کانفرنس

ادارتی نوٹ روزنامہ منصف مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۹۲ء

انجمن ترقی اردو کی ریاستی شاخ کی ۲۳ ویں بسالانہ کانفرنس ایک ایسے وقت منعقد ہورہی ہے جبکہ حکومت نے اردو کے بعض مطالبات کو قبول کرنے کا اعلان ضرور کیا لیکن کئی دوسرے مسائل حل طلب ہیں اور جامع جی او کے اجرا کے تعلق سے حکومت نہیں آئی۔ جہاں تک خود ریاستی انجمن کا تعلق ہے اس کانفرنس کی اس اہمیت سے حالیہ چند ماہ کے دوران انجمن پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب اور ڈاکٹر حسینی شاہد صاحب جیسی فعال شخصیت سے محروم ہوگئی ہے جن کے انتقال کے بعد خود انجمن کے بعض حلقے انجمن کی کارکردگی کے تعلق سے شک وشبہ کررہے ہیں۔ حالانکہ صدر انجمن ڈاکٹر سید عبدالمنا اور نائب صدر انجمن ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی قیادت میں یہ کوشش جاری ہے کہ ریاست میں اردو کے مسائل کی جمہوری اور سیکولر انداز میں یکسوئی عمل میں آئے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ریاستی وزیر بھاری صنعتوں مسٹر پی راجندرا ریڈی نے وعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کانفرنس میں شرکت نہیں کی ان کی شرکت سے کم از کم مختلف مسائل پر ان کے رویہ کا اظہار ہوتا اور وہ خود بھی اردو والوں کی آواز چیف منسٹر این جناردھن ریڈی تک پہونچا سکتے ہیں اقلیتوں سے متعلق کابینی ذیلی کمیٹی کے سربراہ کی حیثیت سے مسٹر راجندرا کو حکومت اور اردو والوں کے مابین رابطہ کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے جس کی برقراری اور اردو والوں دونوں کے مفاد میں ہے۔ نواب میر احمد علی خاں کی خیر مقدمی تقریر مسٹر عبدالرحیم کی رپورٹ اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کے کلیدی خطبہ کے علاوہ مختلف بیانات کے...

باقی صفحہ ۱۵

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے ۱۰ رمئی ۱۹۹۲ء کی شام کے اجلاس میں منظور کردہ قرار دادیں

(۱) انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا یہ ۲۳ واں ریاستی کنونشن حکومت آندھرا پردیش کی مقرر کردہ سب کمیٹی کی سفارشات کا جنہیں ریاستی کابینہ نے منظور کر دیا ہے خیر مقدم کرتا ہے لیکن اس رپورٹ میں مدرسوں کے قیام کے لیے طلبا کی تعداد کی جو شرط لگائی گئی ہے اسے نامناسب سمجھتا ہے۔

گجرال کمیٹی نے اور بعد میں جعفری کمیٹی نے بھی سفارش کی ہے کہ ان علاقوں میں جہاں اردو آبادی دس فیصد یا اس سے زیادہ ہو اردو ذریعہ تعلیم کے تحتانی مدارس یا متوازی جماعتیں قائم کی جائیں اور ۸ تا ۱۰ تحتانی مدرسوں پر ایک ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اسکول یا متوازی جماعتیں کھولی جائیں۔

یہ کنونشن مطالبہ کرتا ہے کہ طلبا کی تعداد کی بجائے تجویز پر عمل کیا جائے۔

حکومت کی ذیلی کمیٹی نے اردو کے سرکاری استعمال کے لیے بھی سفارشات پیش کی ہیں اور ماتحت کی عدالتوں میں بھی اردو میں دستاویزات کے پیش کرنے، شہادت قلمبند کرنے اور مطالبہ کرنے پر فیصلے کا اردو ترجمہ بھی مہیا کرنے کی سفارش کی ہے۔

کمیٹی نے سرکاری زبان کمیشن میں اردو کے نمائندے کے شمول کی بھی سفارش کی ہے یہ کنونشن مطالبہ کرتا ہے کہ حکومت آندھرا پردیش ایک جامع حکمنامہ جاری کرے جس میں یہ سب امور شامل ہوں۔

کنونشن محسوس کرتا ہے کہ جب تک سرکاری زبان کے قانون میں مناسب ترمیم نہیں کی جائے
ان سفارشات پر اور خاص طور پر عدلیہ میں ان پر عمل مشکل ہوگا ۔ سرکاری زبان کے قانون پر
امور کی صراحت کرتے ہوئے ترمیمات لائی جائیں ۔

(الف) پہلے سکشن میں سرکاری زبان کے علاوہ سرکاری طور پر مسلمہ اقلیتی زبان (جو
ذکر دفعہ 7 ۔میں ہے) کی تعریف بھی شامل ہو ۔

(ب) قانون کی دفعہ 5 میں سرکاری زبان کمیشن کے دائرہ اختیار میں اردو اور اقلیتی ز
کے استعمال پر نگرانی اور دفعہ 7 پر عمل آوری پر نظر رکھنا بھی شامل ہو ۔ اور کمیشن
ایک اردو نمائندہ کو بھی شریک رکھا جائے

(ج) دفعہ (7) میں اُردو یا کسی اقلیتی زبان کے سرکاری استعمال کے لیے مدت ر
تعین مذکور ہے ۔ اسے حذف کر دیا جائے ۔

(د) دفعہ (7) میں سرکاری اغراض کا تعین عاملہ پر چھوڑ دیا گیا ہے اور کوئی رہنما
خطوط معین نہیں ہیں ۔ قانون میں ایک شیڈول شامل کیا جائے جس میں 15 فیصد ا
آبادی کے علاقوں میں ان سرکاری اغراض کا ذکر کر دیا جائے جن کی کابینی سب کمیٹی
نے سفارش کی ہے ۔ اس سے عاملہ اور عدلیہ دونوں پر ذمہ داری عاید ہو جائے گی ۔

(ہ) قانون میں اس کی بھی وضاحت کر دی جائے کہ جہاں آبادی دس فیصد سے ز
ہوگی وہاں مزید سرکاری اغراض کے لیے بھی اردو استعمال ہوگی جن کا تعین اردو
کے مطالبے پر سرکاری زبان کمیشن کرے گی اور جس علاقے میں اردو آبادی 30 فیصد
اس سے زیادہ ہے وہاں مقامی نظم و نسق تلگو کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ہو

(و) ذیلی کمیٹی کی سفارش کے مطابق ان علاقوں کی نشاندہی کر دی جائے
اردو آبادی دس فیصد یا اس سے زیادہ ہے ۔

(ح) ریاستی گزٹ بھی انگریزی اور تلگو کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شائع کیا جائے۔

(2) انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش کا یہ 23 واں ریاستی کنونشن مطالبہ کرتا ہے کہ کابینی سب کمیٹی کی سفارش کے مطابق ضلع کی سطح پر کلکٹر کی صدارت میں متواتر اجلاس طلب کئے جائیں جن میں اساتذہ اور اولیائے طلبا اور غیر سرکاری انجمنوں کے نمائندے شریک ہوں اور نتائج کا جائزہ لیا جائے۔ خرابیوں اور کوتاہیوں کو دریافت کیا جائے اور نئے تعلیمی سال سے ان کو دور کرنے کے لیے قدم اٹھائے جائیں۔

(3) اردو جاننے والے اردو انسپکٹر مقرر کئے جائیں تاکہ اردو ذریعہ تعلیم کا معقول انسپکشن ہوسکے۔ اور اسکول انسپکشن کو محکمہ آڈٹ کی طرح محکمہ تعلیم سے علاحدہ کر دیا جائے۔

(4) ... کے لیے ریفریشر کورس کا پابندی سے کیا جائے

(5) جو طلبا کسی خاص مضمون میں کمزور ہوں ان کے لیے ٹیوٹوریل کلاسس کا سرکاری طور پر انتظام کیا جائے۔

(6) درسی کتابوں کی دستیابی مشکل ہوگئی ہے۔ اور اساتذہ گائیڈ سے کام نکالتے ہیں اس کی وجہ سے طلبا کے ذہنی ارتقا میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور علمی صلاحیت کمزور رہتی ہے۔ درسی کتابوں کے لیے معقول انتظام کیا جائے۔ اس سلسلے میں اردو اکاڈمی سے کام لیا جائے۔

(7) اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے انتظامات ناکافی ہیں موجودہ ٹریننگ کالجوں میں اردو اساتذہ کی ٹریننگ کا متوازی انتظام کیا جائے اور نشستوں میں اضافہ کیا جائے۔

(8) تعلیم آئین کے متوازی شیڈول میں شامل ہے لیکن اس سلسلہ میں حکومت ہند کی ذمہ داریوں کا واضح تعین نہیں ہوا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تحتانی تعلیم کے سلسلے میں جو آئین کی دفعہ 350 (الف) کی رو سے حکومت کی ذمہ داری میں داخل ہے

مرکزی حکومت ریاستی حکومتوں کو مالی امداد فراہم کی اور (TEACHING AIDS
مہیا کرنے میں مدد کرے۔

(۹) کئی مدارس تجربہ خانوں، کتب خانوں، اور خود معقول عمارتوں سے محروم ہیں۔
ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پر فوری توجہ کی جائے۔ عمارتوں کی تعمیر کی جائے
آئین میں دیئے گئے اختیار کو عوامی ضرورتوں کے لیے حکومت زمین یا مکان حا
کر سکتی ہے،" استعمال کیا جائے اور اسکولوں کے لیے عمارتیں اور کھیل کے میدان ف
کئے جائیں۔

(۱۰) مدارس کے قیام کے وقت علاقے کی لسانی ساخت کا پوری طرح جائزہ لیا
اور اردو جماعتوں کے قیام کے لیے اُردو آبادی کا لحاظ رکھا جائے۔

(۱۱) ان احکامات اور مراعات پر عمل کرنے کے لیے کابینی سب کمیٹی کی سفارش
مطابق جنرل اڈمنسٹریشن اور ایجوکیشن سکریٹریٹ میں عملہ مقرر کیا جائے۔ ڈائر
اسکول ایجوکیشن اور ڈائرکٹر ہائیر ایجوکیشن کے دفتر میں بھی اس غرض سے عملہ
کیا جائے۔ ضلع کی سطح پر ایک مستقل مشنری کا انتظام کیا جائے جو اس سلسلہ
ہونے والی شکایات کا ازالہ کرے گی۔ اس فورم میں اردو نمائندے ضرور شامل رہیں۔

(۱۲) انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش کا یہ 23 واں ریاستی کنونشن، دور درشن
میں علاقائی خبروں کے سنانے کا فیصلہ کا خیر مقدم کرتا ہے لیکن اس غرض کے لیے 5 منٹ
ناکافی ہیں وقت کو بڑھا کر ۱۵ منٹ کیا جائے۔

(۱۳) گجرال کمیٹی نے بھی اور جعفری کمیٹی نے بھی اپنی رپورٹ میں آکاش وانی اور
کے اردو کلچرل پروگرام کے اچھا اور معیاری نہ ہونے کی شکایت کی ہے اور سفارش
ہے کہ ایسے مرکزوں میں جہاں اردو آبادی خاصی تعداد میں ہے، اردو عملہ اگر نہ ہو یا کم

باقی

سید حامد
صدر انجمن ترقی اردو ہند

ہندوستان میں اردو کا مستقبل

سید حامد صاحب نے جامعہ اردو کے زیر اہتمام ۲۲، ۲۳ فروری ۱۹۹۲ کو علی گڑھ میں منعقد ہونے والے سمینار میں بطور بنیادی مقالہ پڑھا۔

اردو ہندوستان تک محدود نہیں ہے زبان پر چڑھی ہوئی اردو اپنے بولنے والوں کے ساتھ دنیا کے بہت سے کونوں میں پہنچ گئی ہے۔ افغانستان، ایران، دوبئی، ابوظہبی، شارجہ، سعودی عرب، مسقط، عمان، انگلستان، کینیڈا، یونائیٹڈ اسٹیٹس میں ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی ایک بڑی آبادی اردو بولتی ہے اور اس پر جان دیتی ہے اور بے تاب ہے کہ کسی طرح اس کی نئی نسل کا رشتہ اردو کے ساتھ بنا رہے، حالاں کہ:

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

ہمارے لیے یہ خیال خوش آیند ہے کہ ہندوستان کی شیرازہ بندی کا کام جو زبان خاموشی سے کر رہی ہے اس کا جادو دوسرے ملکوں میں بھی چلنے لگا ہے۔ اس خیال سے ہم دل ضرور بہلا سکتے ہیں لیکن اگر اس سے زیادہ اہمیت اسے دی گئی تو اس کا شمار سادہ لوحی میں کیا جائے گا۔ اردو کے مستقبل کے بارے میں جو تخمینہ اور حکم لگایا جائے گا وہ صرف اردو کے سواد اعظم یعنی ہندوستان اور پاکستان سے متعلق ہوگا۔ یہ حقیقت بس ہے باقی ہوس۔

ہمارے لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ پاکستان میں اُردو کی سرگزشت پر غور کرنے بیٹھ جائیں نظریاتی بحث چھیڑنے اور خیالی گھوڑے دوڑانے سے کیا حاصل خصوصاً ہمارے ملک میں اُردو دردسے کراہ رہی ہے اس پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے ہندوستان کے اُردو والے پاکستان پر نگاہ غلط انداز سے ڈالتے رہتے ہیں۔ ہمارے ادیب اور شاعر جب وہاں ہوتے ہیں تو ہمارے آنسو پونچھنے یا بیٹھ کر سسکنے کے بجائے سمجھاتے ہیں کہ وہاں اردو غریب کی حالت ہم سے بھی ابتر ہے۔ وہ علاقائی عداوت اور لسانی دشمنی کے ہاتھوں جاں بلب ہے۔ آپ انہیں تو نہار یاد کیجیے لسانی دشمن اور نسلی بیر اپنی جگہ پر۔ لیکن ان کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ نظام تعلیم، صحافت ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ اُردو بچے بچے کی رگ و جاں میں پیوست ہو گئی ہے اور خون کی گردش کے ساتھ ساتھ رگوں میں دوڑ رہی ہے جو لوگ اس بنیادی حقیقت سے آنکھیں موند لیتے ہیں انہیں احساس تناسب یا ظرف نگاہی سے کوئی اس موٹی سی بات کو ملحوظ رکھیے تاکہ ہم آگے بڑھیں یوں بھی ہمیں پاکستان سے کیا لینا دینا اور اس کی لسانی پالیسی سے کیا سروکار ہے

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

اتنی ہی ناپسندیدہ دو ایک باتیں اور سن لیجیے کہ ذہن کے جالے جھاڑنے کے لیے صاف اور تلخ نوائی سے زیادہ کارگر اور کوئی حربہ نہیں ہے۔ میں یہ کہنے کی جسارت کر دیتا ہوں جمہوریت نے اپنی ایک قومی زبان کے ساتھ ایسا ناروا سلوک نہیں کیا جیسا کہ ہندوستانی جمہوریت اُردو زبان کے ساتھ کرتی چلی آئی ہے لیکن یہ بیان جوڑ رہا۔ بیان اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا میں کسی آبادی نے اپنی مادری زبان سے اتنی شدید غفلت نہیں برتی اور اس کا اس قدر استحصال نہیں کیا جتنا ہندوستان کے اردو والوں نے اس کے ساتھ کیا ہے اور کر رہے ہیں۔

پہلے بیان پر آپ برہم ہوں گے اور کہیں گے کہ ہندوستانی سرکاروں نے اردو کے تحفظ اور ترقی کے لیے گاہ گاہ ترقی پالیسیاں بنائیں، اتنے بیانات شائع کئے اتنی ہدایتیں جاری کیں کہ ان کا شمار رکھنا مشکل ہو گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہندستان کے دستور اور یو پی کے زمین داری خاتمہ ایکٹ کی ترمیموں کا سراغ رکھنا اور یہ بات بھی دہرانے کے لائق ہے کہ سرکاروں نے اُردو اکیڈمیاں کھولیں۔ اردو انجمنوں کو امداد دی اردو کی ترقی کے لیے بورڈ بنایا اور بیورو کو سانچے میں ڈھالا۔ اُردو کے مشاہیر اہلِ قلم کو وہ سمّان دیتی چلی آئی ہے ان سب امدادوں اور احکام کو جوڑیے اور نچوڑیے تو تاریخ کی شکل میں ایک قطرہ بھی نہ نکلے گا۔ مختلف سیاقوں میں لوگ کہتے چلے آئے ہیں کہ جڑوں کے بجائے پتوں کو سینچا جا رہا ہے۔ یہ سارے اقدامات اُردو کی جڑ کو چھو نہیں گئے بلکہ پتیاں بھی خشک رہ گئیں کہ مدعا یہاں آبیاری نہیں تھا، نہ جڑوں کی نہ پتیوں کی مقصد صرف التفات کی نمائش تھا اور منصفی کی تشہیر یہ مقصد بخوبی حاصل ہو گیا کہ مذکورہ اقدامات سارو سے سخن ان لوگوں کی طرف تھا جو

عامی اور دیرپا میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ جو دیدہ زیب کو دوررس سمجھ بیٹھتے ہیں۔ بات کی تہہ تک پہنچنے اور ضروری اور غیر ضروری میں تفریق کرنے کا ہنر جنہیں آتا ہی نہیں اور جو اسس گراں قدر شے سے ناآشنا ہیں جس کے بغیر جمہوریت میں گاڑی چل ہی نہیں پاتی۔ وہ شے ہے رائے عامہ۔ محت مند یا صائب رائے عامہ بنتی ہے۔ سوجھ بوجھ، احساس تناسب، آگاہی اور تنظیم سے۔

یہاں حکومت کی ناانصافی اور تغافل شعاری کی داستان کو دہرانے کا موقع نہیں ہے۔ موٹی سی ایک مثال گجرال کمیٹی کی رپورٹ کی لیجیے۔ اس کا شانِ نزول خود اندر کمار گجرال صاحب کی زبان سے سنیے۔

"یہ محسوس کیا گیا کہ ان مسائل کا جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے دیرپا حل جب ہی نکل سکے گا جب ان کا گہرا مطالعہ کیا جائے۔ ان مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مل کر ان پر غور کیا جائے اور ان سارے عناصر سے گفتگو جنہیں ان میں دلچسپی ہے۔ کمیٹی برائے ترقی اردو (گجرال کمیٹی) اسی مقصد سے بنائی گئی ہے۔

"اس رپورٹ میں ہم نے جو سفارشیں کی ہیں وہ اس محکم عقیدہ کی بنا پر ایک ایسی زبان کی حفاظت اور ترقی جو اتنی متمول روایات کی حامل ہے اور جسے لاز حسن عطا ہوا ہے، قوم کی فکر اور توجہ کی مستحق ہے۔ ان سب لوگوں کے لیے جنہیں ہماری ثقافتی زندگی کے استحکام میں گہری دلچسپی ہے اور جس کا مدعا ہے کہ ہم آہنگی اور یک جہتی کے رجحانات کو مضبوط کیا جائے ان سب کے لیے اس زبان کا نشوونما اور ترقی بے حد اہم ہے۔ اس بات کا احساس عام ہو چلا ہے کہ مختلف لسا اقلیتوں کی جائز تمناؤں کی تکمیل فوری ترجیح کی مستحق ہے۔"

گجرال کمیٹی آگے چل کر کہتی ہے کہ:

" ان سفارشوں کے ذریعہ اس نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ جو تحفظات منظور کر لیے گئے ہیں ان کی تعمیل پورے طور پر ہو اور وہ کجی اور انحراف جو انتظا کی نچلی سطح پر رونما ہوتے ہیں یک قلم مٹا دیے جائیں۔ ان قومی پالیسیوں کا جو اتفاق ہو چکا ہے عدم نفاذ بے یقینی اور عدم اعتماد کی فضا پیدا کر دیتا ہے جس نظر ہٹائی نہیں جا سکتی اور اس کا اثر عوام کے حوصلہ پر براہ راست پڑتا ہے لہٰذا ان کا نفاذ جلد سے جلد اور پوری طرح ہونا چاہیے۔"

ملاحظہ فرمایا آپ نے، جو کمیٹی اتنے اہم کام کے لیے حکومت کی طرف سے بنائی گ

تھی، اور جس کی سفارشات پر ایک بڑی لسانی اقلیت کے اطمینان، اعتماد اور خوشی کا انحصار تھا، جیسے ملک کے جمہوری مزاج کی لاج رکھنی تھی اور جس کی سفارشات کی بجا آوری تاخیر کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اسے حکومت نے طاق نسیاں میں رکھ دیا۔ اگر اس کی رپورٹ کو سزاوار تعمیل سمجھنے کے بجائے لائق تدفین سمجھنا تھا تو آخر اس کی تشکیل ہی کیوں کی گئی۔ کیا مقصود اُردو والوں کے زخموں پر نمک پاشی کرنا تھا اور انہیں ان کی اوقات یاد دلانا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اندر کمار گجرال کی قیادت کے زیر اثر اس کمیٹی نے ان توقعات کو پورا نہیں کیا جو حکومت سرکاری کمیٹیوں سے بالعموم کیا کرتی ہے۔ وجہ جو کچھ بھی ہو زمانے نے یہ انوکھا سماں دیکھا کہ رپورٹ ۱۹۷۵ء میں حکومت کو پیش کی گئی اور ابھی تک حکومت نے اس پر کوئی فیصلہ نہیں کیا۔

یہ رپورٹ کوئی دیوانِ غالب تو نہیں تھی کہ اس کی شرحیں لکھوائی گئیں۔ پہلی شرح جناب آل احمد سرور اور ان کے رفقا نے لکھی، وہ بھی پردۂ خفا میں چلی گئی، دوسری شرح جناب علی سردار جعفری اور ان کے ہم انجمنوں نے لکھی یہ شرح بھی حکومت کی سمجھ میں نہیں آئی۔ حالاں کہ اقلیتوں کے ساتھ برتاؤ میں وہ غیر معمولی فراست کرتی رہی ہے اس فراست کا جو فریب کی ہم نشیں ہے۔ اس کم مایہ انسان کو جو آپ سے خطاب کر رہا ہے، موقع ملا کہ جعفری کمیٹی کے سامنے اور اس کے بعد افسروں کی مختار کمیٹی کے سامنے دادرسی کے لیے جائے۔ آخر الذکر کا وہی رخ تھا، "اصول پر پردہ ڈالو اور فروع کو اچھالو۔ تم بھی خوش، ہم بھی خوش۔" اس سے پہلے تعلیم پر نظر ثانی کرنے کے لیے ایک راما مورتی کمیٹی بیٹھی تھی۔ آچاریہ راما مورتی شہرتوں کی ہنگاموں سے دور، سادہ مزاج اور درمیانی وضع کے انسان ہیں۔ میں ان کے حضور شہادت کے لیے گیا۔ باتیں ہمدردی کے ساتھ سنیں لیکن اس ہمدردی کا

انعکاس رپورٹ لکھتے وقت نہیں ہوا۔ سہ لسانی فارمولے میں اُردو کے شمول کی بابت ہمارے بنیادی مطالبے کو اچاریہ جی کی کمیٹی نے بھی نظرانداز کر دیا۔ اور نہ وہ فرقہ وار خواندگی کے اعداد و شمار کو شائع کرانے کے لیے ہمارے ہمنوا ہو سکے۔ حالاں کہ ان اطلاعات کو منظرِ عام پر لانے کا کوئی جواز نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔

انصاف سے انحراف اور حق سے اغماض کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ریاست سے جو ایک عنوان اُردو کا گہوارہ ہے اور جہاں اُردو والوں کی سب سے بڑی آبادی زندگی بسر کرتی ہے "اُردو بے دخل ہو گئی"۔ قول اور فعل، اعلان اور عمل، آئین اور اقدام کے درمیان اتنی بڑی کھائی چشمِ فلک نے کاہے کو دیکھی ہو گی۔ لطف یہ ہے کہ آپ کوئی گرفت بھی نہیں کر سکتے۔ ہدایات جاری کر دی جائیں اور عمل درآمد نہ کرے تو سرکار کا کیا قصور بعض لوگ البتہ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ وہ سرکار کس کام کی جو اپنا حکم نہ منوا سکے۔

سہ لسانی فارمولے سے جس طرح اُردو کو بے دخل کیا گیا" اس کا داغ ہر اُردو والے کے دل میں ہے۔ لیکن اس غریب کو انقباض ہو کہ انشراح "ارباب اختیار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اتر پردیش سرکار نے اُردو کو اپنی قلمرو سے نکالنے کے لیے سنسکرت کو جدید ہندوستانی زبان قرار دے کر سہ لسانی فارمولے میں جو جگہ اردو کو ملتی اُس اس قدیم زبان کو دے دی۔ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

اس ہرزہ سرائی سے دو باتیں نکلتی ہیں جہاں تک ہندی کے علاقے میں اُردو کے ساتھ سرکاری پالیسی کا تعلق ہے۔ اس میں تبدیلی راہ پا ہی نہیں سکتی خواہ کسی پارٹی کی حکومت ہو۔ فرق صرف لب و لہجہ کا ہوتا ہے۔ گویا حکومت کی اُردو پالیسی اس کی خارجہ پالیسی کی طرح ہے لیکن اسی لمحہ خارجہ پالیسی کو عالمی حوادث کے سایے میں بدلنا پڑ جاتا

انعکاس رپورٹ لکھتے وقت نہیں ہوا۔ سہ لسانی فارمولے میں اُردو کے شمول کی بابت ہمارے بنیادی مطالبے کو اچاریہ جی کی کمیٹی نے بھی نظر انداز کر دیا۔ اور نہ وہ فرقہ وار خواندگی کے اعداد و شمار کو شائع کرانے کے لیے ہمارے ہمنوا ہو سکے۔ حالاں کہ ان اطلاعات کو منظر عام پر لانے کا کوئی جواز نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔

انصاف سے انحراف اور حق سے اغماض کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ریاست سے جو ایک عنوان اُردو کا گہوارہ ہے اور جہاں اُردو والوں کی سب سے بڑی آبادی زندگی بسر کر رہی ہے "اُردو بے دخل ہو گئی۔ قول اور فعل"، اعلان اور عمل، آئین اور اقوام کے درمیان اتنی بڑی کھائی چشم فلک نے کاہے کو دیکھی ہو گی۔ لطف یہ ہے کہ آپ کوئی گرفت بھی نہیں کر سکتے۔ ہدایات جاری کر دی جائیں اور عملہ عمل نہ کرے تو سرکار کا کیا قصور بعض لوگ البتہ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ وہ سرکار کس کام کی جو اپنا حکم نہ منوا سکے۔

سہ لسانی فارمولے سے جس طرح اُردو کو بے دخل کیا گیا، اس کا داغ ہر اُردو والے کے دل میں ہے۔ لیکن اس غریب کو انقباض ہو کہ انشراح، اربابِ اختیار پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اتر پردیش سرکار نے اُردو کو اپنی قلم رو سے نکالنے کے لیے سنسکرت کو جدید ہندوستانی زبان قرار دے کر سہ لسانی فارمولے میں جو جگہ اردو کو ملتی اسے اس قدیم زبان کو دے دی۔ جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے۔

اس ہرزہ سرائی سے دو باتیں نکلتی ہیں جہاں تک ہندی کے علاقے میں اُردو کے ساتھ سرکاری پالیسی کا تعلق ہے۔ اس میں تبدیلی راہ پا ہی نہیں سکتی خواہ کسی پارٹی کی حکومت ہو۔ فرق صرف لب و لہجہ کا ہوتا ہے۔ گویا حکومت کی اُردو پالیسی اس کی خارجہ پالیسی کی طرح ہے لیکن اسی لحہ خارجہ پالیسی کو عالمی حوادث کے سایے میں بدلنا پڑ جاتا ہے

مگر اردو کے بارے میں حکومت نے گزشتہ پینتالیس سال میں کوئی کروٹ نہیں بدلی۔ سیاست میں استقامت کی یہ ایک درخشاں مثال ہے، جس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔

مجھے ڈر ہے کہ مغرب میں اشتراکیت کے انہدام کے بعد استعمار نے نام نہاد بنیاد پرستی کو جس طرح نشانہ بنا لیا ہے، کچھ منطقی نہیں ہندوستان میں اردو کو بھی اس کی زد میں نہ لے لے۔ اب آپ لاکھ چلّاتے رہیئے کہ بھائی صاحب اردو کا خمیر ہی سنگم کے پانی سے اٹھایا گیا ہے۔ یہ زبان کٹر پن اور تنگ نظری کی ازلی دشمن ہے۔ یہ وسعت، کشادگی، فراخ دلی، بھائی چارہ، مساوات اور درد مندی کی زبان ہے کوئی سن کر ہنس دے گا۔

اب ہم اس کڑی عداوت کا ذکر کریں گے جو اردو والوں سے اردو کو مل رہی ہے لیکن یہاں بھی پہلے ایک عام غلط فہمی کا ازالہ کر دیا جائے۔ وہ غلط فہمی یہ ہے اور اسے آپ بڑے بڑوں اور سوجھ بوجھ والوں کی زبانی سنتے چلے آئے ہیں کہ " اردو کو کوئی مٹا نہیں سکتا۔ اردو کی اشاعت سنیما، ٹی وی، ریڈیو، مشاعرے اور موسیقی کر رہے ہیں۔ مردم شماری کے آنکڑوں کو دیکھیے۔ ۱۹۷۱ء میں اردو بولنے والوں کی تعداد دو کروڑ چھیاسی لاکھ تھی، ۱۹۸۱ء میں یہ تعداد بڑھ کر تین کروڑ ترپن لاکھ ہو گئی" یہ ساری باتیں دل کے بہلانے کے لیے ہیں ان میں کوئی وزن نہیں، نہ ان سے اردو کے مستقبل کے بارے میں کوئی امید باندھی جا سکتی ہے۔ ان سب سے صرف ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ آبادی کے ساتھ ساتھ اردو بولنے والوں اور اردو سمجھنے والوں کی تعداد بڑھی ہے، یعنی ایک بولی کی حیثیت سے اردو کو فروغ ہوا۔ اردو کے مخالفین بھی سدا سے اسے ایک بولی اور ایک طرز ادا کی حیثیت دینے کے لیے مستعد رہے ہیں۔ دشمن کامی پر ہماری یہ شادمانی حیرت انگیز ہے

زبان کی ثبات، بقا اور وقار اس کے رسم خط اور اس کے ادب پر مبنی ہوتا ہے۔ ابھی دیکھ لیجیے کہ اُردو شاہ کاروں کو سمجھنے والے اب کتنے باقی رہ گئے ہیں۔ عوام میں جب اعلا تخلیقات کو سمجھنے اور ان سے لطف اٹھانے کی صلاحیت نہیں رہے گی تو تخلیقات کا معیار گرتا چلا جائے گا۔ اُردو کے ساتھ یہی ہو رہا ہے اس کے علاوہ اُردو لکھنے والوں کی آزادی فکر و اظہار سلب ہوتی جا رہی ہے کیوں کہ ادب کی صحت مند سرپرستی صرف پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں اور اُردو رسالوں اور کتابوں کے پڑھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اُردو اہل قلم بڑی حد تک حکومت اور اس کے نشر و اشاعت کے اداروں کے دست نگر ہو گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آزادی کے بعد بہت سی علاقائی زبانوں نے اُردو سے زیادہ جرأت زندگی اور مسائل سے نبرد آزما ہونے اور انہیں اظہار میں لانے کا دیا ہے۔ اُردو کے لکھنے والوں کا ناطہ زندگی کی زیریں لہروں سے کہ وہی سرچشمہ ہوتی ہیں سمندر کے تموج کا، ٹوٹتا جا رہا ہے۔

انگریزی میں ایک لفظ ہے مومینٹم جسے ہم حرکت تسلسل کہہ سکتے ہیں۔ مومینٹم بن جائے تو پیش رفت کے لیے کوئی خارجی کوشش درکار نہیں ہوتی۔ وہ اپنی طاقت سے خود چلتا رہتا ہے۔ بہت سی کلیں، کارخانے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ایک دفعہ بند ہو جائیں اور مومینٹم یا اسٹیم (بھاپ) ٹوٹ جائے تو انہیں دوبارہ چلانے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ آزادی کے بعد اردو پر یہی بپتا پڑی۔ اس کی حرکت تسلسل توڑ دی گئی۔ ایک عرصے کے بعد نیم دلی کے ساتھ کچھ کوششیں ضرور ہوئیں۔ رکی ہوئی اس کل کو چلانے کی۔ قتل کے بعد جفا سے توبہ کی گئی، برملا کی گئی، بار بار کی گئی۔ لیکن یہ کوششیں اُردو کی گاڑی کو آگے دھکیل نہ سکیں۔ ماں باپ نے دیکھا کہ اُردو کا سکہ اب رائج نہیں رہا۔ اس لیے انہوں نے بچوں کو اُردو پڑھانے کی زیادہ کوشش نہیں کی کہ اُردو پڑھانا بچوں کے لئے تابناک مستقبل کی بشارت نہیں دے رہا تھا

ان میں جو اہل وفا تھے، انہوں نے بچوں کو مجبور کیا کہ اردو ضرور لیں، لیکن اربابِ تعلیم نے یہ سر و سامان کر دیا کہ اُردو پڑھنے والوں کی مقررہ تعداد جمع نہ ہو سکے یہ سکھایا کہ ایک جماعت میں اردو کے طلب گار دس بچے ضرور ہونے چاہئیں، اُردو تعلیم کے لیے زہر ہلاہل بن گئی، جس کا تریاق نہ اردو والوں سے بن پڑا، نہ اربابِ اختیار سے۔ گجرال کمیٹی نے البتہ یہ سفارش کی کہ اسکول کی آبادی کے بجائے علاقہ کی آبادی کو ملحوظ رکھ کر اُردو پڑھانے کا اہتمام کیا جائے۔ لیکن حکومت نے سنی ان سنی کر دی اور اُردو والے آہستہ آہستہ بلکہ تیزی کے ساتھ اپنی مادری زبان سے بیگانہ ہوتے چلے گئے۔ چناں چہ ہندوستان میں اردو جو کچھ فی زمانہ باقی ہے وہ اُردو میڈیم اسکولوں یا اقلیتی اداروں، مکتبوں اور مدرسوں کی وجہ سے ہے۔

اُردو میڈیم یا اقلیتی ادارے کو تسلیم کرا لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ یو۔ پی میں تو کوئی اُردو میڈیم اسکول ہے ہی نہیں۔ اقلیتی اداروں کی انتظامیہ سالہا سال سرکار اور ڈائرکٹوریٹ کے دروازوں پر دستک دیتی ہے۔ تب کہیں ریکگنیشن کی بھیک اس کی جھولی میں ڈالی جاتی ہے۔ بسا اوقات امتیازی حیثیت تسلیم کرانے کے لیے ان اداروں کو عدالت سے رجوع کرنا پڑتا ہے اور بہت سے لوگ تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ نقصان اُردو والوں کا ہوتا ہی ہے اس سے بڑا نقصان ملک اور قوم کا ہوتا ہے۔ اُردو والوں کا ایک اچھا خاصا طبقہ ان پڑھ رہ جاتا ہے اگر کوئی سر پھرے والدین اپنے بچوں کو اُردو لینے پر مجبور کر ہی دیتے ہیں تو انہیں دو مشکلوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ اُردو کی نصابی کتابیں یا تو ملتی نہیں یا ملتی بھی ہیں تو مہینوں اور کبھی کبھی سالوں کی تاخیر کے بعد۔ دوسری مشکل تربیت یافتہ (ٹریننگ پائے ہوئے) استادوں کی فراہمی کی ہے۔ اس کا اہتمام بالالتزام کیا گیا ہے کہ زنجیر تعلیم کی ایک یا ایک سے زیادہ کڑیاں بیچ سے ٹوٹی رہیں۔ ثانوی اور

اعلا ثانوی سطح پر اگر اُردو کو بہ حیثیت مضمون نصاب میں جگہ ملی ہے تو اس انداز سے کہ اگر اردو لی جاتی ہے تو کوئی دوسرا مضمون چھوڑنا پڑتا ہے، طالب علم کے مستقبل اور مقابلہ کی صلاحیت کے لیئے ضروری ہے عالم یہ ہو گیا ہے کہ اُردو کا اگر تعاقب کرو تو زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاؤ گے۔

اردو زبان کی کسمپرسی اور بے مصرفی کو دیکھ کر اردو والوں نے بھی اس کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔ وہ بھول گئے کہ ان کا آنول نال اسی زبان کی زمین میں گڑا ہے۔ آہستہ آہستہ اُردو کے ساتھ انہیں آنکھوں دیکھے کی مروت بھی نہیں رہی، اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اُردو کو شکایت حکومت سے اتنی نہیں رہی جتنی خود اُردو بولنے والوں سے ہو گئی۔ شکایت کا نام درمیان میں آ گیا ہے تو سن لیجئے کہ شکوہ سنجی اور خود کو مظلوم سمجھنے اور اپنے پر ترس کھانے کی عادت عمل کی طاقت کو بالکل معطل کر دیتی ہے۔ اس قبیح عادت کے تحت انسان اپنی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنے لگتا ہے۔ اس کا ارادہ اور حوصلہ اور اعتماد مفلوج ہو جاتا ہے۔ شکوہ سنجی کی منطق گویا یہ ٹہری کہ جس کے ساتھ ناانصافی اور ظلم ہو وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائے اور وقت عزیز آہیں بھرنے اور فریاد کرنے میں گنواتا رہے حالاں کہ حکومت اس کے اہل کاروں سے اگر ناانصافی سرزد ہو رہی ہے تو اس کا دوہرا جواب دینا چاہیئے۔ پہلا جواب یہ کہ ناانصافی کے خلاف رائے عامہ بنا کر آئینی اور اسمبلی ڈھنگ سے احتجاج کیجیے اور اس وقت تک دم نہ لیجیے۔ جب تک کہ آپ کی جائز مانگ منظور نہیں کی جاتی۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ جو زبان آپ کو اتنی قدر پیاری ہے، اس کے لیے خود بھی تو کچھ کیجئے۔ یہاں اس وقت یہ عالم ہے کہ حکومت نے اردو سے کیا تغافل برتا ہو گا جتنا خود اُردو والے برت رہے ہیں اوّل تو ہمارے وہ بچے جو ماحول اور اچھی تعلیم کی بدولت صلاحیتوں سے مالا مال ہو گئے ہیں اُردو کی نسبت سے کنگال ہیں

انہیں گھر پر مادری زبان پڑھا دینا کچھ دشوار نہ تھا لیکن والدین کی ایک ناقابل لحاظ تعداد نے یہی ایسا کیا۔ اس بے رخی کا کوئی جواز نہیں ہے اردو والوں نے اردو میں خط و کتابت ترک کر دی، اس کا بھی کوئی جواز نہ تھا۔ اردو کے استادوں نے اپنی زبان کی توسیع و ترویج کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ حالاں کہ یہ ان پر فرض تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ جو لوگ اردو کے نام پر استاد رکھے گئے، انہوں نے کوشش یہ کی کہ اولین فرصت میں اردو کے دیئے کو اپنے دامن تدریس سے چھڑا دیں۔ اقلیتی تعلیمی اداروں میں اردو کو پناہ ملی ہوتی ہے لیکن بعض ریاستوں میں ان اداروں کے استادوں نے سر جوڑ کر یہ کوشش کی کہ ان اداروں کو اقلیتی اداروں کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جائے۔ یہ کوششیں روز افزوں ہیں۔

حکومت نے نئی تعلیمی پالیسی میں مادری زبان اور اقلیتی اداروں کے بارے میں کچھ اہم فیصلے کیے لیکن ان میں سے کوئی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا۔

شری متی اندرا گاندھی کے پندرہ نکاتی پروگرام میں بھی تعلیم کے بارے میں کوئی نکتہ نہیں ہے۔

اردو والوں نے اردو کے ساتھ جس بے حسی کا برتاؤ کیا ہے، اس کی تفصیلات آپ کے سامنے رکھی جائیں تو آپ کے کان پک جائیں گے۔ اس داستان کو اس جملے پر ختم کر رہا ہوں کہ اردو کو مٹانے میں حکومت اور اردو والوں نے بے مثال عملی تعاون کا ثبوت دیا ہے۔

سوچنا یہ ہے کہ اردو کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلانے بلکہ اردو کی بازیابی کے لیے ہمیں کیا کیا قدم اٹھانے چاہئیں۔

سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اردو کے بارے میں ایک آواز ہو کر حکومت سے مطالبات کیے جائیں اور اس وقت تک ہم چین نہ لیں جب تک جمہوری حکومت جمہور کی رائے کے آگے سر تسلیم خم نہیں کر دیتی۔

دوسری ضرورت رابطے کی ہے تاکہ اُردو کے بارے میں دوسری زبانوں کو جو غلط فہمیاں ہیں انہیں دور کیا جائے - اُردو والوں کو چاہیئے کہ تنہا روی کے بجائے دوسری زبان بولنے والوں کے ساتھ تعلقات کو شگفتہ اور استوار کریں کہ اگر یہ تعلقات شگفتہ نہ ہوسکے تو حکومت کی پالیسیاں کاغذ کی چار دیواری سے باہر نہ نکل سکیں گی، وہ کبھی عمل کی شکل نہ دیکھ پائیں گی۔

حکومت سے التماس کی جائے بلکہ اصرار کہ وہ جو پالیسی اردو کے تعلق سے اختیار کرے۔ اس کی شرح آخری عملی تفصیل تک کر دے اور سابقہ پالیسیوں کی بجا آوری میں جو دشواریاں ہوئیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے مستقبل کے پروگراموں کو ڈھالے۔

ایسا بھی نہ ہو کہ پالیسیوں کے اعلان پر جب ایک مدت مدید گزر جائے تب لوگ بیدار ہوں۔ اور دریافت کریں کہ وقت گزر گیا اور کچھ نہ ہوا، گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔ اور دنیا اب اتنی تیز رفتار ہو گئی ہے کہ جس نے وقت گنوایا اس نے زندگی سے کچھ نہ پایا اور جو زبان پچھڑ گئی وہ پنپ چکی۔ فیصلہ کیجئے، منصوبے بنا لیجئے تو رواں احتساب یا باہم نگرانی کے بنا کام نہیں چلتا۔ سرکار نے اُردو کی بابت جو بھلے یا برے فیصلے یا اعلان مختلف اوقات میں کیے ہیں ان پر نظر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ رواں دواں مانیٹرنگ کا انتظام کیا جائے اور مختلف سطحوں پر جو کمیٹیاں اس کام کے لیے بنائی جائیں ان میں آزاد اردو والوں کو ضرور شامل کیا جائے۔ اس طرح ایک طرف اردو والوں میں اعتماد کی فضا پیدا ہو گی۔ دوسری طرف غفلت اور لغزش کو وہیں کا وہیں ٹھیک کر دیا جائے گا۔

اُردو کے تئیں حکومت کی پالیسیاں دل فریبی اور دل شکنی کے درمیان گرم سفر رہی ہیں۔ ہمیں اس انداز سے کہ ہماری بات سنی جا سکے۔ اپنے جمہوری لسانی حقوق کی بازیابی کی مانگ کرنی چاہیئے۔ ہاں گرمی میں ابال کی وضع پر نہیں بلکہ برابر، لگاتار، متواتر، مسلسل [illegible]

سفارشات اور ان کی جو شرح علی سردار جعفری کمیٹی نے کی، ان کے بارے میں حکومت سے
پرزور مانگ کی جائے کہ بلا تاخیر ان پر فیصلہ کیا جائے۔ اس بار یہ ضروری ہوگا کہ اس فیصلے کے بارے
میں تفصیلی لائحہ عمل ابھی سے متعین کر دیا جائے تاکہ گریز کی ساری راہیں بند ہو جائیں۔ اپنی مادری
زبان کو پروان چڑھانا ہمارا جمہوری حق ہے۔ ہم اپنے اس حق سے کبھی دست بردار نہیں
ہوں گے، وعدے کتنے ہی پرفریب اور حالات کتنے ہی دل شکن کیوں نہ ہوں ہمیں بات
سلیقہ سے اور متحد ہو کر کہنے اور اسے منوانے کا ہنر بھی نہ۔ کبھی تو آئے گا ہی اور کسی وقت تو
ارباب اقتدار کی نظر بدلے گی ہی، انصاف کے ساتھ ان کا ناطہ جڑا کرے گا ہم اس
امید پر جی رہے ہیں۔ پینتالیس برس کا عرصہ ایک لحاظ سے طویل ہے

لیکن قوموں کی زندگی پر نظر ڈالیے تو یہ مدت کچھ ایسی طویل بھی نہیں۔ ہم نے گزشتہ
چند سالوں میں ہی دنیا میں بڑے بڑے انقلاب دیکھے ہیں جو تصور میں بھی آنے والے
نہیں تھے۔ ہمارے ملک میں بھی انقلاب آسکتا ہے یہاں بھی حالات بدل سکتے ہیں
لسانی اقلیتوں کے دن یہاں بھی پھر سکتے ہیں۔ انصاف کا بول بالا یہاں بھی ہو سکتا ہے
کہیں ایسا نہ ہو کہ جب نظام کہنہ بدلے تو نیا دور ہمیں بیرون عدالت پائے اور ہماری افسردہ
خاطری اور مایوسی سے ہماری زبان کو نقصان پہنچ جائے۔ مطالبہ ہمیں کرتے رہنا چاہیئے۔
اس کی لَے کو تیز کرتے رہنا چاہیئے۔ انصاف کے بغیر کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا۔
انصاف بالآخر ہو کر رہے گا بشرطیکہ ہم مایوس ہو کر ہتھیار نہ ڈال دیں۔ پسپا نہ ہو جائیں۔

لیکن مطالبہ کو برقرار رکھنے اور اسے دوام دینے سے کہیں زیادہ اہم اردو کو اپنے پسینے
سے سینچنا اور اپنے قوت بازو سے اوپر اٹھانا ہے۔ یہ کام گھر گھر ہو سکتا ہے اور ہونا
چاہیئے۔ اگر ہم اتنا بھی نہیں کر سکتے کہ اپنے بچوں کو گھروں میں عملی یا کام چلاؤ اردو سکھا دیں
تو ہم پر اور ہمارے عوام پر تفو ہیں، اردو والوں میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے،

اردو پڑھانے کے لیے یہ سہولت ہے کہ جب کلام پاک پڑھاؤ ساتھ ہی ساتھ اردو بھی سکھادو ۔ نئی نسل کو اردو کہ بچہ اخبار پڑھ سکے ۔ خط لکھ سکے ۔ اس کام کے لیے ملک گیر مہم درکار ہوگی ۔ پڑھے لکھے والدین اپنے بچوں کو اردو اخبار خود پڑھائیں جو پڑھے لکھے نہیں ہیں ان کے پڑوسی ان کی مدد کو آئیں ۔

غور کیجئے تو سارے مطالبات اور داد رسی ایک طرف اور اپنی مدد آپ کرنے کا یہ طریقہ ایک طرف ۔ یہ ایک نسخۂ کیمیا ہے ۔ خود اس پر کوئی لاگت نہ آئے گی ۔ شرط یہ ہے کہ ہم سب اس کام میں لگ جائیں کہ اس میں ہی ہماری پہچان ہے ، ہماری بقا ہے ، ہماری سرخ روئی ہے ۔

اردو کو لے کر سیمینار اور کانفرنسیں بہت ہوتی ہیں ۔ ان میں دل کی بھڑاس نکالی گئی ہے ۔ بھڑاس نکلنی تو چاہیئے لیکن بھڑاس نکالنے کا صحت مند طریقہ نہ شکوے شکایت ہیں ، نہ شعلہ بار تقریریں ، نہ پالیسی کی باتیں بہت مستحکم طریقہ یہ ہے کہ ان کو عمل منصوبہ بناکر اور اس کو عرق ریزی اور دل انگیزی کے ساتھ عملی جامہ پہنانا ۔ یہی کام اس سیمینار کو کرنا چاہیئے اس کے علاوہ ایک مستقل کمیٹی بنادیجئے جو ماہ بہ ماہ پیش رفت کا جائزہ لیتی رہے اور اس کے مطابق پروگرام میں ردو بدل یا اس کی توسیع یا تقویت کرتی رہے جہاں تک تعلیم اداروں کا تعلق ہے ہمیں اردو اداروں کی تنگ معیاری پر رضامند یا ان کا خوگر نہیں ہونا چاہئے باوجود بے شمار رکاوٹوں اور خرابیوں کے اصلاح اور بہتری کی راہ کھلی رہتی ہے ۔ اس مسئلہ پر غور و فکر کے بعد اردو میڈیم اسکولوں اور مکتبوں اور مدرسوں کے معیار کو اونچا کرنے کی کوشش کرنی چاہئیں ۔ کیا ہم طمانیت کے ساتھ اپنی آنے والی نسلوں کو اچھی تعلیم سے محروم رکھنے کا فیصلہ کر بیٹھے ہیں ۔ تم دیر ہوجائیں اور اس انداز سے گویا یہ ان کا دینی فریضہ ، ان کی غیرت کا تقاضہ ہے اور انا بقا اسی پر منحصر ہے ۔ خطرہ کے موسم میں الکسانا ڈھیل دینا یا آسائش ڈھونڈنا خودکشی کے مترادف زندہ وہی رہ سکتے ہیں جو حوصلہ انہیں کو ملتی ہے جو انفرادی خود غرضی سے اوپر اٹھ کر اجتماعی بھلائی کے لئے

اُردو کیوں پڑھیں کیوں پڑھائیں

اُردو : سلیقے کی زبان

یہ بات ہم نہیں کہتے، دوسرے کہتے ہیں کہ اُردو سلیقے اور تہذیب کی زبان ہے۔ اُردو، ادب اور آداب، نرمی اور خوش گفتاری کی زبان ہے۔ اُردو کی مدد سے ہمارے پڑوسیوں نے بھی دعوت دینے، درخواست کرنے، معذرت چاہنے، تقاضا کرنے یاد دلانے کے مہذب طریقے سیکھے ہیں۔ اُردو نے تحفے کو ہدیہ کا، اختلاف کو دشمنی اور ناپسندگی کو نفرت نہ بننے دینے کے لیے سلیقہ دیا ہے۔ تشریف لانا، زحمت کرنا، احسان مند ہونا، عنایت، شکریہ، خدانخواستہ، انشاء اللہ، معاف کیجئے، توجہ فرمائیے، ارشاد کیجئے اور ایسے ہی نہ جانے کتنے فقروں نے ہماری سماجی زندگی میں شیرینی گھولی ہے۔ یہ سب اردو کا فیضان ہے۔ کیا ہم اُردو کی طرف سے بے توجہی کر کے مٹھاس اور سلیقے کی اس رس چشمے کو تو بند کرنے کی غلطی نہیں کر رہے؟ اردو پڑھیے اور پڑھائیے تاکہ ہماری زبان کا لوچ اور مٹھاس برقرار رہے۔

(ڈاکٹر سید حامد حسین، بھوپال)

اس پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیے

(ہماری زبان ۲۲ ستمبر ۹۲ء)

اردو کیوں پڑھیں کیوں پڑھائیں

اردو ہماری تہذیبی وراثت کی تاریخی کڑی ہے

یہ پرچار غلط ہے کہ اردو کو کسی نے بنا کر کسی پر تھوپ دیا۔ دنیا میں کہیں بناوٹی زبان بھی چلی ہے۔ نہ انگریز بیسک انگریزی چلا سکے اور نہ دنیا کے بڑے بڑے ملکوں کی بناوٹی ہوئی اسپرنٹو اپنے قدم جما سکی۔ اردو ہمارے ملک کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی تہذیب کی ایک ایسی سیڑھی ہے جسے بیچ میں نکال دینے سے ہم اپنی تہذیب و تاریخ کی خصوصیات کو نہیں سمجھ سکتے۔ اردو ہندوستان کے تہذیبی کرگھا ئیں تاریخ کی آنچ میں تپتے ہوئے لاتعداد عناصر سے تیار ایک کیمیا ہے جس کو ہم چاہیں بھی تو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ تلسی کی رام چرتر مانس ہو یا گرو گرنتھ صاحب یا شاہ عبدالقادر کا قرآنِ حکیم کا ترجمہ ان میں زبان کا جو خمیر اٹھ رہا تھا اسی سے اردو بڑھی اور پنپتی ہے۔ کیا ہم اپنی عمارتوں سے محرابوں اور گنبدوں کو نوچ کر الگ کر سکتے ہیں، کیا ہم اپنی موسیقی میں سے خیال اور دھرپد کو جدا کر سکتے ہیں کیا غزل کی گائیکی کا جادو آج بھی نہیں چل رہا ہے کیا اردو اشعار کی گونج آج بھی پارلیمنٹ یا سیاسی جلسوں، اخباروں کے اداریوں میں نہیں سنائی دیتی؟ یہ سب ہماری مشترکہ تہذیب کی تاریخی سچائیاں ہیں۔ اردو بولنے والے اس میراث کے محافظ ہیں۔ وہ اس ذمہ داری کا حق ادا کریں۔ اردو تحریر و تقریر میں اپنی صلاحیتوں کو فروغ دیں اور اپنے بچوں کو بھی اردو پڑھائیں۔

(ہماری زبان م ۱/۵ ۹۲) (سید حامد حسین، بھوپال)

اس پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں

اُردو کیوں پڑھیں کیوں پڑھائیں؟

اُردو اور روزگار

یہ جھوٹ ہے کہ اردو پڑھنے سے روزگار نہیں ملتا۔ روزگار کا اصول
ہر لیے ہے۔ مانگ ہوگی تو فراہمی کے لیے روزگار کے موقعے پیدا ہوں گے۔ مانگ
اکیجئے تو روزگار پیدا ہوگا۔ اردو پڑھیے اور پڑھائیے تو اردو جاننے والوں کو
زگار ملے گا۔ اُردو کے اخبار زیادہ چھپیں گے۔ ان اخباروں کو پڑھنے والوں کی تعداد
ے گی تو اشتہار دینے والے اشتہار دیں گے آپ اُردو رسالے پڑھیں گے تو اُردو کے
مضمون کو بھی روزی ملے گی۔ ان کو دوسرے بھی جانیں گے۔ پھر وہ مشاعروں،
مذہبی مجلسوں، ریڈیو، ٹی۔ وی اور فلموں وغیرہ میں پہنچیں گے۔ اُردو کی کتابیں
میں گے تو اُردو کی کتابیں چھاپنے والوں، اُردو کے کاتبوں، جلد سازوں کو
وزگار ملے گا۔ کسی بھی زندہ سماج میں صرف سرکار ہی روزگار مہیا نہیں کراتی
صل روزگار تو سماج کے اندر پیدا ہونے والی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے پیدا
تا ہے۔ اُردو پڑھیے اور پڑھائیے تاکہ اُردو کے ذریعے آپ کو روزگار بھی
مل سکے۔

اس پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا دیجیے

(سید حامد حسین، بھوپال)

(ہماری زبان ۸/۵ م ۹۲ء)

اردو کیوں پڑھیں کیوں پڑھائیں

اردو : دماغ کا بوجھ؟

آپ یقیناً ان چند لوگوں میں سے نہیں جو اپنے بچوں کے مستقبل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس میں تو پوری دلچسپی رکھتے ہیں کہ وہ انگریزی اور ہندی پڑھیں لیکن انہیں اردو پڑھانے کی بات سنتے ہی وہ اس بات سے پریشان ہو جاتے ہیں کہ تین تین زبانوں کا بوجھ بچوں کا ذہن برداشت نہ کر سکے گا۔ حالاں کہ انہیں اس سے تشویش نہیں ہوتی کہ بچے کو تاریخ، جغرافیہ ریاضی اور کیا کیا پڑھنا پڑے گا اور ایک ایک مضمون کی بڑھتی پھیلتی ایک ایک شاخ میں مہارت حاصل کرنا ہوگی۔ ریاضی، ریاضی کے نام کا ایک مضمون نہیں الجبرا، جیومیٹری، کیلکولس اور کیا کیا نہ بن جائے گا۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ ان کے پڑوس میں بسے کیرالا کے ایک خاندان کے بچے اسکول میں انگریزی پڑھتے ہیں، پاس پڑوس میں ہندی میں گفتگو کرتے ہیں اور گھر میں ملیالم بولتے اور پڑھتے ہیں۔ اس وہم کو دماغ سے نکال دیجئے کہ مادری زبان بچے کے ذہن کے لیے بوجھ ہو سکتی ہے وہ اس کا فطری اظہار ہے اسے پنپنے کا موقع دیا اسی میں اس کے خواب اور تمنائیں پنپتی ہیں۔ اس میں سے اس کی انفرادیت اور اس کے اندر کا فنکار ابھرتا ہے۔ کیا آپ یہ ظلم کرنا چاہیں گے کہ آپ اپنے بچے کو ایک اچھا شاعر ایک اچھا مصور، ایک اچھا فنکار بننے سے پہلے اس کی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دیں۔ بچوں کو اردو پڑھائیے تاکہ انہیں اپنی مادری زبان کو پورا اعتماد اور انداز سے استعمال کرنے کی طاقت حاصل ہو سکے۔

اس پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیے

ڈاکٹر [illegible]

—

(ہماری زبان ۲ مئی ۹۲ء)

اردو کیوں پڑھیں؟ کیوں پڑھائیں؟

اُردو بھولا ہوا سبق نہیں بہتا دھارا ہے

اردو ایک زندہ، ترقی کرتی اور پھیلتی ہوئی زبان ہے یہ نہیں کہ وہ کل تک کار آمد تھی اور آج ناکارہ ہو گئی۔ وہ تب بھی کار آمد تھی جب ایک حاکم قوم نے انگریزی کو سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج کیا تھا۔ سارے دفتری کام کاج، اعلا تعلیم، تہذیبی سرگرمیوں اور تقاریب میں ہر جگہ انگریزی کا بول بالا تھا۔ اردو بولنے والوں نے اس وقت ہتھیار نہیں ڈالے انھوں نے انگریزی کے ذریعے لائے ہوئے عناصر سے تقویت حاصل کی اور اُردو کو نئے موضوعات، نئے مضامین نئے افکار و خیالات کے اظہار کا اہل بنایا۔ اب تو ہم کو اپنے ہی وطن کی زبانوں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کا موقع ہے۔ اردو نے نئے عناصر کو جذب کرنے کی جو زبردست لچک حاصل کی ہے وہ اب بھی اس میں موجود ہے۔ وہ ایک بہتا ہوا دھارا ہے جو سب کو سمیٹ کر چلتا ہے۔ حالات سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ زبانوں کو فروغ ملتا ہے تو اپنے بولنے والوں سے اور نقصان پہنچتا ہے تو انہیں بولنے والوں سے۔ اگر ہم خود اردو کو پورے اعتماد کے ساتھ اپنائے رہیں گے تو حالات اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ ہم خود اُردو پڑھیں، بچوں کو پڑھائیں، اپنی تہذیبی وراثت سے محبت کرنا سیکھیں اور اپنی وراثت کی خود قدر کریں تاکہ دنیا بھی اس کی قدر کرے۔

(سید حامد حسین، بھوپال)

اس پیغام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیے

(ہماری زبان ۲۲/۵ ۹۲ء)

مصطفیٰ شیروانی
حیات نگر مرادآباد

جناب حاجی عبیدالرحمٰن خاں شروانی مرحوم پرو چانسلر علیگڈھ مسلم یونیورسٹی

اترپردیش کی علم دوست شخصیت

۱۹۲۰ء میں مرکزی مقننہ کے ایکٹ ۴۰ کی رو سے جسے گورنر جنرل کی منظوری ۱۴ ستمبر ۱۹۲۰ کو حاصل ہوئی تھی، سر سید احمد خاں مرحوم کے قائم کردہ تدریسی ادارہ "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج

(MOHAMMADAN ANGLO - ORIENTAL COLLEGE)

کو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی میں ضم کر دیا گیا اور اس ایکٹ کو "علیگڈھ مسلم یونیورسٹی ایکٹ (۴۰) سنہ ۱۹۲۰ء قرار دیا گیا اسکے بعد سے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے سربراہوں کی طویل اور ایک طرح اسی دور کے پورے معاشرے کے نمائندوں کی بے لوث خدمت سر سید علیہ الرحمہ کے قائم کردہ ادارے کے لیے وقف کرنے والوں کے اسمائے گرامی جناب حاجی عبیدالرحمٰن خاں شروانی مرحوم کا اسم گرامی نمایاں اور ممتاز نظر آتا ہے۔ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلروں میں ہز ہائنس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ والیہ بھوپال، ہز ہائنس نواب سر رضا علی خاں والی رامپور، ہز ہائنس نواب سر رضا علی خاں والی رامپور، ہز ہائنس نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال، ہز اگزالٹڈ ہائنس نواب سر میر عثمان علیخاں آصفجاہ سابع نظام حیدرآباد، ہز ہولی نس سیدنا طاہر سیف الدین صدر بوہیرہ، نواب سر [illegible] نواب [illegible]

سابق گورنر بہار جیسی ذی احترام شخصیتوں کے علاوہ جن اکابرین نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی خدمات سر انجام دی ہیں ان میں نواب محمد علی محمد خاں مہاراجہ محمود آباد، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نواب سر محمد مزمل اللہ خاں شروانی مرحوم سر سید راس مسعود نواب مسعود جنگ بہادر نواب محمد اسمٰعیل خاں ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سر شاہ محمد سلیمان ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کرنل بشیر حسین زیدی مرحوم جناب بدرالدین طیب جی صاحب نواب علی یاور جنگ بہادر مرحوم ڈاکٹر عبدالعلیم مرحوم پروفیسر ڈاکٹر علی محمد خسرو صاحب جناب سید حامد صاحب، جناب سید ہاشم علی اختر صاحب اور موجودہ وائس چانسلر جناب پروفیسر نسیم فاروقی صاحب کے اسمائے گرامی علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک درخشاں اور زریں دور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یونیورسٹی کے پرو چانسلروں کی فہرست میں ہز ہائنس سلطان شاہ آغا خان ہز ہائنس رضا علی خاں والی رامپور کے اسمائے گرامی اور حالیہ دور میں جناب حاجی عبدالرحمن خاں شروانی مرحوم نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو چانسلر کے عہدہ جلیلہ کو وقار اور وزن عطا کیا۔ جناب حاجی عبیدالرحمن خاں شروانی مرحوم علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی بے لوث خدمت کے تقریباً ۷۰ سالہ عرصہ میں متذکرہ بالا تقریباً سب اکابرین کے دور سے وابستہ رہے اور دم واپسی تک پرو چانسلر کے عہدہ پر فائز رہے۔

عبیدالرحمن خاں شروانی صاحب علیگڑھ سے تقریباً ۳۰ کیلومیٹر اپنے آبائی قصبہ حبیب گنج ضلع علیگڑھ میں ربیع الاول ۱۳۱۵ھ مطابق جون ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم عربی اور فارسی در سیاست میں گھر پر ہی حاصل کی ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۶ء تک مدرسۃ العلوم علیگڑھ کے اسکول میں داخل ہوئے ۱۹۱۶ء میں دہلی کے اینگلو عربک اسکول سے میٹرک کیا پھر علیگڑھ میں مدرسۃ العلوم میں انٹرمیڈیٹ میں داخل ہوئے مگر ۱۹۱۸ء میں عبیدالرحمن خاں صاحب کے والد محترم جناب مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم

نواب صدر یار جنگ بہادر کو نظام حیدرآباد نواب میر عثمان علیخاں آصف جاہ سابع نے جب حیدرآباد میں صدر الصدور مقرر فرمایا اسوقت تعلیم کا سلسلہ ترک کر کے عبید الرحمن خاں شروانی ریاست کے انتظام میں مصروف رہے اور اس دوران جائداد میں قابل لحاظ اضافہ کیا۔

جناب عبید الرحمن خاں شروانی مرحوم علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ۱۹۲۳ء میں ممبر منتخب ہوئے اور پھر اگزیکیٹو کونسل کے ممبر بھی ہو گئے اسی سال ۱۹۲۳ء میں اس زمانہ کے صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ (حالیہ اتر پردیش) کی مقننہ کے ممبر رہے اور ۱۹۵۳ء تک برابر مقننہ کے رکن رہے علاوہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے بلا مقابلہ منتخب ہوئے ۱۹۲۸ء میں برٹش گورنمنٹ سے "خان بہادر" کا خطاب عطا کیا جسے جدوجہد آزادی کے دور میں ۱۹۴۶ء کو عبید الرحمن خاں شروانی صاحب نے واپس کر دیا۔ ۱۹۲۵ء میں عبید الرحمن خاں شروانی مرحوم علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے ٹریژرر (خازن) مقرر ہوئے اور اس خدمت کا کوئی معاوضہ تنخواہ بااالاونس نہیں لیا۔ اس دوران کئی بار قائم مقام وائس چانسلر رہے اور ۱۹۴۷ء کے پرآشوب دور میں جناب عبید الرحمن خاں صاحب علیگڈھ مسلم یونی ورسٹی کے قائم مقام وائس چانسلر تھے۔ بعد میں آپکو پرو وچانسلر مقرر کیا گیا جس عہدہ پر آخر تک فائز رہے۔ نہ صرف علیگڈھ مسلم یونی ورسٹی کے معاملات سے جناب عبید الرحمن خاں شروانی مرحوم تقریباً ۷۵ سال وابستہ رہے بلکہ اتر پردیش کے اکثر ملی ادارے آپکی رہنمائی سے مستفید ہوتے رہے دار العلوم دیو بند اور ندوۃ العلما لکھنو کی گورننگ باڈی کے رکن تھے اسلامیہ کالج اٹاوہ عبید الرحمن خاں شروانی مرحوم کی رہبری سے مستفید ہوتا رہا علیگڈھ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے عبید الرحمن خاں شروانی مرحوم تقریباً ۳۲ سال آنریری سکریٹری رہے اور آخر تک اس سرسید علیہ الرحمۃ کے قائم کردہ ادارہ کے استحکام اور ترقی کے لیے کوشاں رہے۔ دار المصنفین اعظم گڈھ کی مجلس منتظمہ کے رکن تھے۔

یکم دسمبر ۱۹۶۰ء کو جناب عبیدالرحمٰن خاں شروانی مرحوم نے اپنے والد ماجد جناب مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم نواب صدر یار جنگ بہادر کی حبیب گنج لائبریری کا نادر و نایاب ذخیرہ علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی مولانا آزاد لائبریری کو منتقل کردیا جس کے متعلق اس وقت کے بہار کے گورنر جناب ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے اپنے مکتوب مورخہ ۲/ دسمبر ۱۹۶۰ء موسومہ جناب عبیدالرحمٰن خاں شروانی ہی تحریر فرمایا تھا۔

"اس کتب خانہ کے یونیورسٹی میں پہنچنے سے یونیورسٹی لائبریری کی حیثیت ہندوستان بھر میں ممتاز ہو جائے گی اور جی یہ گواہی دیتا ہے کہ جس جگہ اسے آپ نے پہنچا دیا ہے وہاں سے اہل علم اس درجہ فیض یاب ہوں گے کہ شاید ہی اور کہیں ہو سکتے۔"

جناب رشید احمد صدیقی مرحوم نے اپنے مکتوب مورخہ ۳۰/ نومبر ۱۹۶۰ء میں تحریر فرمایا تھا۔

"نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم اگر زندہ ہوتے اس قران السعدین یعنی ایک دوست کے عطیہ اور دوسرے دوست کی یادگار کی یکجائی سے کتنے خوش ہوتے۔"

حبیب گنج لائبریری میں مخطوطات تاریخی پر جناب حکیم سید شمس اللہ قادری مرحوم نے ۱۹۱۱ء میں ایک کتابچہ "مخطوطات تاریخی مخزونہ کتاب خانہ نواب صدر یار جنگ بہادر" تصنیف کیا تھا۔ دیگر مخطوطات اور تاریخی تصانیف کے علاوہ اس اہم کتبخانہ میں ملا میر علی کاتب کی لکھی ہوئی ۹۲۳ھ کی "مثنوی گوئے چوگاں" از ملا عارفی بھی ہے یہ مخطوطہ ہرات میں تحریر کیا گیا اور یہ گولکنڈہ میں قطب شاہی کتبخانہ میں رہی پھر جب ۱۰۹۸ھ میں اورنگ زیب عالمگیر کی تسخیر گولکنڈہ کے وقت یہ مخطوطہ مغلیہ کتبخانہ میں شامل کیا گیا۔ اس کتاب پر جو اندراجات ہیں اس میں ایک اہم اندراج "عالمگیری کتبخانہ کا قیمت دو ہزار روپیہ

ہے ۱۱۹۰ء میں یہ تصنیف دوسو دس روپیہ میں فروخت ہوئی ۱۱۶۴ء میں قطب الدولہ نے ڈھائی سو روپیہ میں خریدی اور ۱۳۲۱ھ میں کتبخانہ حبیب گنج میں ایک سو ستر روپیہ خریدی گئی اسکے علاوہ شاہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی مشہور تلوار "ظفر تکیہ" بھی اسی کتبخانہ حبیب گنج کے ذخیرہ " میں شامل ہے یکم دسمبر ۱۹۶۰ء کو جناب حاجی عبید الرحمن خاں شروانی مرحوم نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کی آزاد لائبریری کو عطا فرمایا اس تلوار پر نوری تحریری شعر کندہ ہے

ظفر تکیہ کہ با فتح نہست است
شرف از قبضۂ اورنگ زیب است

جناب حاجی عبید الرحمن خاں شروانی کے بمقام علیگڑھ بروز منگل ۵ مئی ۱۹۹۲ء کو صبح ۵ بجے بعمر ۹۵ سال انتقال سے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کا گویا ایک تاریخی باب ختم ہو گیا اور اتر پردیش ایک باوقار شخصیت سے محروم ہو گیا۔
خدا مغفرت فرمائے آمین۔

سلسلہ ص ۴۸
نے ادبی محفلیں، آداب محفل اور تہذیبی ورثہ کے مختلف دور پیش کرتے ہوئے یہ بتایا ہر دور میں اقدار کی کیا اہمیت تھی۔ جناب محسن علی نے موضوع کی وسعت کو محدود نہ کرنے کی طرف واضح اشارہ کیا اور کہا کہ ہر دور میں تخلیق کے پروان چڑھنے کے لیے اس دور کا ماحول معاون ثابت ہوتا ہے۔ صادق نوید نے معترضین کے بعض سوالات کا کچھ اسطرح جواب دیا کہ اس مخصوص موضوع پر مزید تبصرہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ انجمن کا اجلاس خوشگوار بحث مواازن تنقید و تبصرہ کا عمدہ تاثر چھوڑتے ہوئے اختتام کو پہونچا۔ جناب صلاح الدین نیر نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس

ن خاں شوق کے کلام پر تبصرہ۔ صادق نوید کے مضمون کا جائزہ

۶ مئی ۱۹۹۲ء ۶ ۱/۲ بجے انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس ہنر عمارشن
ٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا جسکی صدارت صدر انجمن جناب عاشق شاہ نے کی۔ ابتدا
جناب صلاح الدین تیر نے تعارفی و مختصر مقدمی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ انجمن کی
واضح پالیسی ہے کہ ادیب کے ہر موضوع پر تبادلہ خیال کیا جائے۔

جناب مومن خاں شوق نے ۳ قطعات اور ۳ غزلیں تبصرہ کے لیے پیش کیں
سب ذیل ہیں۔

قطعات :

بہاریں گنگناتی ہیں، نظارے بات کرتے ہیں
کہ جیسے دور رہ کر بھی کنارے بات کرتے ہیں
ہجوم شوق لگتا ہوتا ہے جب بھی سامنا ہم سے
زباں خاموش رہتی ہے، اشارے بات کرتے ہیں

○

دِل کسی کا بھی دکھانا کیا یہہ اچھی بات ہے
دوسروں پر مسکرانا کیا یہہ اچھی بات ہے
اپنے گھر میں روشنی کرنے کی خاطر دوستو
گھر پڑوسی کا جلانا کیا یہہ اچھی بات ہے

○

زندگی پیار سے عبارت ہے
خدمتِ خلق بھی عبادت ہے
عجز و اخلاص اور وفا ایثار
آج کے دور کی ضرورت ہے

غزلیں

(۱)

لکھی گئی غزل تو سخن بولنے لگا
لہجہ ہماری فکر کا رس گھو
جلتی ہوئی حیات کے تیور کو دیکھ کر
فن کار کا خیال بھی پر تو
جب بھی نشاطِ غم سے ہوا اپنا سامنا
پلکوں پہ قطرہ قطرہ الم رو
اِک شخص ہے حریف مگر نام کیا لکھیں
تحریر کے بدن میں کوئی بو
قربت کی وادیوں میں جھکنے لگے نجوم
احساس خلوتوں کی گرہ کھو

موسم بدل گیا کہ جنوں کام آ گیا
اے شوق پھر بہار میں دل ڈولنے لگا

(۲)

جنوں ہے جوش ہے اک ولولہ ہے
یہاں ہر ایک پتھر بولتا ہے

مروّت، سادگی، اخلاص و الفت
ہماری زندگی میں، ادا کیا ہے

مسلسل سنگ باری سہہ رہا ہوں
میرا احساس شائد مر گیا ہے

نیا دن اک نئی افتاد لائے
عجب یہہ خواہشوں کا سلسلہ ہے

کبھی تو بات مانو، تم خرد کی
میرے کانوں میں کوئی کہہ رہا ہے

کہاں کی خیریت، بس جی رہے ہیں
یہی تو شوق جینے کی ادا ہے

(۳)

سبق یہہ بھی دیا ہے زندگی نے
کیا برباد پھولوں کو ہنسی نے

ذرا ہوش و خرد سے کام لینا
بہت لوٹا ہے تم کو سادگی نے

اندھیرے ہی غنیمت تھے ہمارے
ہمیں بھٹکا دیا ہے روشنی نے

ہوا انسان ہی انساں کا دشمن
بھلا دی ہے شرافت آدمی نے

یہہ ان کی قربتوں کا ہے کرشمہ
ملایا ہے خودی سے، بے خودی نے

ہزاروں غم نوازے شوق ہم کو
ہمارے دور کی دریا دلی نے

جناب صادق نوید نے " ادبی محفلیں ۔ ایک تہذیبی ورثہ " کے عنوان پر مضمون پڑھا ۔ مسرز مومن خاں شوق اور صادق نوید کی تخلیقات پر تبصرہ کرنے والوں میں صدر اجلاس عاتق شاہ کے علاوہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، محترمہ نجمہ نکہت، رئیس اختر، ڈاکٹر طیب انصاری، صلاح الدین نیر، عزیز بھارتی، ریاست علی تاج، محمود حامد، وسیم عباس اور محمود نشتر شامل ہیں، مومن خاں شوق کے کلام پر مبصرین کا یہ مجموعی تاثر ہے کہ شوق ایک باصلاحیت شاعر ہیں جن کے کلام میں تجربات کی گرمی، مشاہدات کی سچائی اور جذبات کی صحیح ترجمانی ملتی ہے ۔ زبان و بیان کا خیال رکھتے ہوئے سیدھے سادے انداز سے اپنی بات کہہ جاتے ہیں ۔ جناب عاتق شاہ نے اپنے انداز سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ غزل بہت اہم ہے عام آدمی غزل سے ہی متاثر ہوتا ہے ۔ مومن خاں شوق ایک ایسا شاعر ہے جو اپنے دل کی بات موثر انداز میں کہہ جاتا ہے ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے مومن خاں شوق کو لطیف جذبات کی ترجمانی کرنے والا ایک کامیاب شاعر قرار دیا ۔ مسرز صلاح الدین نیر، ڈاکٹر طیب انصاری اور رئیس اختر کا یہ مجموعی تاثر رہا کہ مومن خاں شوق کی شاعری ان کی شائستہ مزاجی کی طرح پاک و صاف ہے ریاست علی تاج نے سراہتے ہوئے بہتر سے بہتر کلام کی پیش کشی کا مشورہ دیا ۔ عزیز بھارتی نے کہا مبصرین کو چاہیے کہ اظہار خیال میں صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے تخلیق کے حسن و قبح پر روشنی ڈالیں ۔ جناب صادق نوید کا مضمون ادبی محفلیں ۔ ایک تہذیبی ورثہ زیادہ دیر تک موضوع بحث بنا رہا ۔ محترمہ نجمہ نکہت، ڈاکٹر طیب انصاری صلاح الدین نیر، محمود نشتر، محمود حامد، وسیم عباس اور صدر محفل عاتق شاہ نے اپنے اپنے انداز سے تبصرہ کرتے ہوئے صادق نوید کی ستائش کی اور یہ بھی تاثر دیا کہ اس موضوع پر کچھ اور واضح انداز میں قلم فرمائی کی ضرورت تھی ۔ جناب صادق

باقی ص

شاداب

آل انڈیا ملی کونسل نمبر

جلد [۹] شمارہ [۷]

جولائی ۱۹۹۴ء حیدرآباد

قیمت ——— 6/= روپے

فون ——— 229161

ایڈیٹر : محمد قمرالدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر رشید الدین منیجنگ ایڈیٹر کلیم الدین احسن

مجلسِ مشاورت

زرِ تعاون

ہندوستان	65 روپے	۲ سال کیلئے 120 روپے	تاحیات 1500 روپے
بیرونی ممالک	200 "	360 "	3700 "
امریکہ	40 ڈالر	70 ڈالر	700 ڈالر
انگلستان	25 پاؤنڈ	45 پاؤنڈ	400 پاؤنڈ
پاکستان	175 پاکستانی روپے	300 پاکستانی روپے	3000 پاکستانی روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: ماہنامہ 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004

مدیر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے پبلک پرنٹرس

چھتہ بازار میں طبع چھپوا کر دفتر "شاداب" ریڈ ہلز حیدرآباد سے جاری کیا۔

فہرست

خطبۂ صدارت

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

اتحاد ملّت کانفرنس

صدر عالی وقار! حضرات علمائے عظام وا ساطین اُمت اور نوجوانانِ اسلام!

آج ہم تاریخ کی ایک نازک گھڑی میں ملّت اسلامیہ ہند کے مستقبل پر غور کرنے اور اس کے سلسلہ میں کچھ اہم فیصلے کرنے کے لیے اکٹھا ہوتے ہیں ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ وقت کی نزاکتوں کا احساس آپ سب کو ہے جس فکر اور دردمندی کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے انقلاب اور ۱۹۴۷ء کو سیاسی تبدیلی کے بعد انتہائی نازک اور پیچیدہ حالات میں ہمارے بزرگوں نے زبردست عزیمت اخلاص اور جدوجہد کے ذریعہ ہندوستان میں اس ملت کے با مقصد وجود کو برقرار رکھنے کی جدوجہد اور ان نازک مواقع پر مسلمانوں کی دینی حیثیت اور ان کی ملّی شناخت کی حفاظت کے لیے قربانیاں دیں اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت نازل فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے اور اس کاروان کے ہر اس فرد پر جس کی جدوجہد کے نتیجہ میں ملّت اسلامیہ ہند آج بھی اس ملک میں اپنی مذہبی شناخت کے ساتھ زندہ ہے اپنی رحمتوں کے دروازے کھول دے آمین!

آج اُن ہی بزرگوں کی فکر اور دردمندی کے صدقہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے موجودہ نازک حالات میں ملّت اسلامیہ ہند کے مسائل پر غور کرنے کے لئے ہم

اس بالغ اور باشعور مجمع میں ان تفصیلات کے اظہار کی بہت زیادہ ضرورت نہیں ہے کہ ملت اسلامیہ آج کن حالات سے گزر رہی ہے۔ مسلمانوں کی دینی حالت کی اصلاح کے لیے جو کچھ تھوڑی بہت کوششیں مختلف سطح پر ملک کے مختلف حصوں میں کی جاتی رہی ہیں اور کی جا رہی ہیں۔ ان کی قدر و قیمت کے اعتراف کے باوجود یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اس میدان میں بھی کام کی بہت زیادہ گنجائش باقی ہے۔ دینی تعلیم کے محاذ پر مدارس و مکاتب بڑی تعداد میں قائم کیے گئے لیکن اب تک ہم شاید پانچ فیصد سے زیادہ لوگوں کو بھی دین کی بنیادی تعلیم سے بھی آشنا نہیں کرا سکے عصری تعلیم اور خاص کر ٹکنیکل ایجوکیشن کے میدان میں ہماری قوم انتہائی درجہ پسماندگی کا شکار ہے اس میں جہاں ہماری کوتاہ عملی کو دخل ہے یہ بھی واقعہ ہے کہ اقلیتی تعلیمی اداروں کے قیام اور خاص کر ٹکنیکل تعلیم کے مراکز قائم کرنے کے سلسلہ میں دستور ہند کی دفعہ ۳۰ میں دیے گئے حقوق سے استفادہ کی راہ میں سرکاری پالیسیاں رکاوٹ بن رہی ہیں اور اب تو ہماری عدالتوں نے بھی کچھ ایسے فیصلے کئے ہیں جو اقلیتی تعلیمی اداروں کے قیام کی راہ میں زبردست رکاوٹ بن رہے ہیں۔

اس تلخ حقیقت کے اعتراف میں بھی کوئی تکلف نہیں ہونا چاہیے کہ آزادی کے بعد کئی قابل قدر کوششیں ہوئیں مگر اس کے باوجود یہاں ہندوستان گیر پیمانہ پر ملت اسلامیہ کا کوئی ایسا اجتماعی پلیٹ فارم نہ بن سکا جو ان کے ہندوستان گیر اور مشترک مسائل میں اتفاق رائے تک پہنچنے میں معاون ہوتا اور ملت کی اجتماعی رائے کے اظہار کا ذریعہ بنتا۔ ہمارے مسائل دینی سیاسی معاشرتی تعلیمی ثقافتی اور اقتصادی نوعیت کے تھے۔ اور ملک کے حکمراں طبقہ نے ہمارے انتشار سے فائدہ اٹھا کر ان مسائل کو سنگین سے سنگین ترین بنانے کی کوشش کی۔ دوسری طرف ایک جمہوری ملک میں ادارہ

جماعتوں اور تنظیموں کی تشکیل کی آزادی کے باوجود ملک کی اکثریت یا ارباب اقتدار نے کبھی یہ پسند نہ کیا کہ مسلمان ہندوستان گیر پیمانہ پر منظم و مجتمع ہو کر اپنے دیرینہ مسائل کے حل کی کوشش کریں اور سچ ہے کہ ہمارے اجتماعی مسائل میں سے بیشتر سیاسی سطح پر حل کے طالب تھے لیکن بد قسمتی سے ہم ایک متحدہ سیاسی موقف اختیار کرنے میں بھی بری طرح ناکام رہے ہمارے ذہنی انتشار کا فائدہ اٹھاکر فرقہ پرستوں نے طرح طرح کے فتنے اٹھائے۔ کاش مسلمانوں کا کوئی مشترک پلیٹ فارم موجود ہوتا جو اُن کی آرزوؤں کا سچّا ترجمان بنتا اور جو ان مسائل کو پوری قوت کے ساتھ پیش کرسکتا تو شاید صورتحال کچھ اور ہی ہوتی۔ کم از کم وہ پراگندہ خیالی دور ہوسکتی جو ملّت کے لئے ترجیحات کے تعین اور اپنے اہداف ونصب العین کی نشاندہی کے لیے بسا اوقات پیش رہی ہے اس طرح شاید ہم ایک متحدہ موقف اختیار کرنے اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ایک مربوط جدوجہد کرنے کے معاملہ میں زیادہ بہتر پوزیشن میں ہوتے۔

مسلمانوں کی متحدہ جدوجہد اور کوششوں کے سلسلے میں ہمیں ماضی قریب کے ان تجربات سے بھی کافی رہنمائی حاصل ہوتی ہے جب کہ ہم نے اپنے بچوّں کی دینی تعلیم وتربیت کے اپنے سب سے بڑے جدید تعلیم کے مرکز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسلامی، اقلیتی کردار کی بحالی اور مسلم پرسنل لاء کے تحفظ کے لیے ایک متحدہ اور مربوط جدوجہد کی تو خدا کا شکر ہے کہ ہمارے مطالبات پوری ملّت کے مطالبات سمجھ کر حکمرانوں کو ہمارے ساتھ جھکنا پڑا۔ اس کے باوجود افسوس ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ انحطاط، انتشار، نامرادی اور شکست خوردگی کی کہانی محسوس ہوتی ہے۔ ہمیں ان کوششوں اور ناکامیوں کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے جو مسلمانوں کو بحیثیت ایک خیر امت سربلند کرنے کے سلسلہ میں ہوئیں، اور کس طرح

ایسی تمام کوششوں کو ملک کے حکمراں طبقے فوجی جماعتیں اور پریس اسے ملک کے خلاف سازش اور جمہوریت سیکولرزم پر قاتلانہ حملہ قرار دیتے رہے ہیں۔ مگر اب زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے ہم اپنی اجتماعی شیرازہ بندی اور اس ملک کے عام مسائل سے دلچسپی کے معاملہ میں کوتاہی برت کر بے پناہ نقصانات اٹھا چکے ہیں، رفتہ رفتہ ہمارا وجود غلاموں اور دوسرے درجہ کے شہریوں میں تبدیل ہو چکا ہے آج صورت حال یہ ہے کہ جدید ہندوستان میں ہماری کوئی آواز نہیں۔ ہماری قیادت کا کوئی وزن نہیں ہمارے جذبات کا احترام نہیں ہمارے نفع و نقصان کی کسی کو فکر نہیں۔ دستور ہند اگرچہ اقلیتوں کو بہت سے تحفظات دیتا ہے اور ان کو ایک مساوی شہری کا مرتبہ عطا کرتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس دستور کے کچھ کمزور پہلوؤں کا سہارا لے کر ملک کی سیاسی و اجتماعی زندگی میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو ایسے حقیر اور پست مقام تک ڈھکیل دیا گیا ہے جہاں وہ ایک باوقار زندگی گزارنے کا تصور نہیں کر سکتے۔ ہمارے شرعی قوانین، زبان، کلچر، تعلیمی اداروں کے اسلامی کردار، عبادت گاہوں کا ناموس ملازمتوں میں آبادی کے اعتبار سے معقول نمائندگی۔ جان و مال کی سلامتی کے بارے میں حکمرانوں نے بھی سنگین کوتاہیاں کی ہیں اور حزب اختلاف نے بھی ان امور میں کسی جرأت مندانہ اور مخلصانہ کردار کا مظاہرہ نہیں کیا۔

اس حقیقت سے کسے انکار ہے کہ ہم میں اگرچہ ایسے نیک انسان موجود ہیں جو دلوں کے دروازوں پر دستک دیتے رہے ہیں اور خیرسگالی اور انسان دوستی کا چراغ برابر جلاتے رہے ہیں۔ ان کے پیغام نے بہت سے دلوں کو چھو لیا ہے اور بہت سی آنکھوں کو نمناک بنا دیا ہے لیکن ارباب اختیار و اقتدار اور شرپسند طاقتیں جو کافی منظم ہو، مستحکم ہیں۔ انسانی قدروں کو جھلسا دینے والا آتش فشاں بن کر لاوا

نفرت وعناد کا لاوا اگلتی رہی ہے۔ حیرت ہے کہ ان حالات میں وہ امت جس کے مصائب و مشکلات کی ایک مشترک تاریخ ہے اپنی اجتماعی زندگی کو ایک وحدت میں بدلنے میں اپنے فکر وعمل میں مطابقت پیدا کرنے اور منصوبہ بند طریقے سے اپنے فروغ و ارتقا کی جدوجہد سے کیوں غافل ہے۔

اقتصادی اعتبار سے مسلمانوں کا روزافزوں انحطاط اور ملک کے مختلف حصوں میں ان کی بیروزگاری، افلاس تعلیم کی کمی اور ایک باوقار زندگی کے وسائل سے محرومی نے ان کو ہندوستان کے دیگر اقوام میں سب سے پیچھے ڈھکیل دیا ہے۔ ہماری قوم کی معاشی حالت اس حد تک گر چکی ہے کہ اب رکشا چلانے اور چوتھے درجے کے ملازمین کی حیثیت سے سرکاری محکموں اور تجارتی و صنعتی و نجی اداروں میں بھی ان کے لیے گنجائش نہیں نکل پا رہا ہے جھونپڑے میں رہنا ان کا مقصد بنتا جا رہا ہے جو صنعتیں مسلمانوں کے ہاتھ میں تھیں سرکاری پالیسیوں کے نتیجے میں تیزی کے ساتھ ان کے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہیں یا وہ ایسا محنت کش طبقہ بن کر رہ گئے ہیں کہ جس کی محنت اپنی ہوتی ہے لیکن اس کا پھل اور کوئی کھاتا ہے، سرکاری پالیسیوں نے بھیونڈی، مالیگاؤں، مئو بنارس اور بھاگلپور جیسے کپڑوں کے صنعتی مراکز کو تباہ کر کے رکھ دیا۔

آج غیر تعلیم یافتہ اور بیروزگار افراد اور تعلیم سے محرومی نے ان کو سیاسی میدان اور ملک کی اجتماعی، زندگی میں بھی بے وقار بنا دیا ہے اور ان کے ووٹوں کی کوئی قدر وقیمت باقی نہیں رہی ہے۔

ان حالات میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ایسی قیادت کی نشوونما ہو جو حکمت وجرأت کے ساتھ مسلمانوں کی رہنمائی کر سکے، ان کے درمیان اتحاد و یکجہتی کو فروغ دے سکے۔ اور اس ملک میں جس کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ اسلام اور مسلمانوں کے

کے بارے میں شدید غلط فہمیوں میں مبتلا ہے اس کے سامنے اسلام کی ایک روشن تصویر پیش کر سکے۔ ایسی قیادت ملک میں اتحاد و امان کے فروغ اور طبقہ واری اور فرقہ وارانہ کشمکش کے خاتمہ کا ایک موثر ذریعہ بن سکتی ہے، ملک کے پسماندہ اور مظلوم طبقات کے زخموں پر مرہم رکھنے اور ان کے آنسو پوچھنے کا فریضہ ادا کر سکتی ہے اور رنگ و نسل، زبان مذہب کی بنیاد پر جو باہمی آویزش ہے اس کو انسان دوستی اعلیٰ جذبات اور بلند انسانی اقدار کی رہنمائی میں ختم کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

حضرات! اس اجتماع میں ممکن ہے کہ مسلمانوں کے اصحاب علم، اہل نظر، اہل سیاست اور عوامی زندگی میں خدمات کا وسیع تجربہ رکھنے والے مخلص کارکنوں اور رہنماؤں کی کما حقہ نمائندگی نہ ہو سکی ہو اور یہ حقیقت کہ ہمارے بہت حساس و باشعور افراد جن کی یہاں موجودگی ضروری تھی نہیں تشریف لا سکے، لیکن یہاں جن خطوط پر ہم پوری ملت کو مربوط کرنے اور وحدت فکر و عمل پیدا کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں یہی ان کے بھی دل کی آواز ہے۔ اور یقیناً جب یہ آواز ان تک پہونچے گی تو وہ اپنے دینی و ملی اخلاص کی بنا پر فی الفور ان کوششوں کی طرف دست تعاون دراز کریں گے۔

ہم یہ کنونشن ماضی کے دیگر کنونشنوں کی طرح اس لئے نہیں کر رہے ہیں کہ سیکولرزم کی دہائی دے کر اور قوم پرستی وحب الوطنی کا واسطہ دے کر ملک کے حکمرانوں سے مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ اور ان کی خیر و برکت کی درخواست کریں۔ کسی بھی ہندوستانی شہری سے کسی کو حب الوطنی اور سیکولرزم پر ایمان لانے کا مطالبہ کرنے کا کوئی حق نہیں حب الوطنی انسانی فطرت کا ایک حصہ ہے اور دوسروں کے دین و مذہب کی توہین و تذلیل یا اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنا ہر دور کے صحیح الفطرت انسانوں نے نہایت برا اور نہایت ناگوار کام تصور کیا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے کسی اجتماع کو اس طرح کی سند توثیق کسی سے

طلب کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں، ہم یہاں ملت کے مسائل کی فہرست سازی کے لئے نہیں اکٹھا ہوئے ہیں، نہ ہم کسی عظیم و عالی مرتبہ قائد کے ظہور کی اطلاع دینے یا اس کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔

حضرات اس موقع پر میں مسلمانوں کی ہر سطح کی لیڈرشپ، اداروں اور جماعتوں کے رہنماؤں سے دست بستہ التماس کروں گا کہ وہ اس نازک مرحلہ میں آپس میں اکرام مومن پر سختی سے عمل کریں اور بلا وجہ بدگمان ہونے یا شک و شبہ میں مبتلا ہونے کے بجائے ہر مرحلہ میں سوجھ بوجھ اور ٹھنڈے ذہن و دماغ سے کام لیں اس وقت ہمارے حریفوں کی سب سے زیادہ کوشش اس بات کی ہے کہ ہماری صفوں میں دراڑ اور دلوں میں ایک دوسرے کے تعلق سے شکوک و شبہات پیدا ہو جائیں شاید اب جذباتی نعروں اور شعلہ خیز بیانات کا دور گذر چکا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مل جل کر کام کرنے کی عادت ڈالیں تاکہ خواہ کوئی بھی مضراب ہمارے دل کے تاروں کو چھیڑے اس ساز سے صرف وحدت فکر و عمل کے نغمے ہی بکھریں، بڑے بڑے کنونشن اور جلسے شاید ہمارے درد کا مداوا نہیں بلکہ ایک مشترکہ منصوبہ پر عمل کرنے اور اپنے مسائل پر مل جل کر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے کی ضرورت ہے بقول بہادر یار جنگ مرحوم ہمیں اپنی ملت کے ایسے نقش و نگار کی ضرورت نہیں جو نگاہ نظارہ باز کو خیرہ کرسکے بلکہ ایسے پتھروں کی ضرورت ہے جو زمانہ کی نظروں سے اوجھل بنیاد میں رہ کر عمارت کے استحکام اور مضبوطی کی ضمانت دے سکیں، بڑی کمی یہ ہے کہ ہمارے نوخیز قائد اور اپنا پُر جوش رہنما کبھی اپنے گرد جمع ہونے والوں کے اذہان و افکار کی تربیت کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے اور کسی نظام فکر و عمل ان کو وابستہ کرنے کا احساس بھی انہیں پیدا نہیں ہوتا۔

بلکہ اپنی خنجر زبان سے وہ ملت کی وحدت میں شگاف ہی ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم جب ملت کے خادموں کو خواہ ان کے کسی طرزِ عمل سے ہم کو اختلاف کیوں نہ ہو رسوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس سے ہمارے مخالفین ہی کو فائدہ حاصل ہوتا ہے اور ہمیں اس لئے ضرورت عمل جراحی سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ مریض جب جانکنی کے عالم میں ہو تو کسی ہوشمند جراح کے لئے اس پر نشتر چلانا عقلمندی کی بات نہیں اسی طرح کسی صحیح وسالم جسم پر ہم شوقِ جراحی پورا کریں یہ بھی پسندیدہ بات نہیں۔

حضرات! اسلام کی تاریخ اتحاد و اتفاق اور سالمیتِ ملت کے حیرت انگیز واقعات سے لبریز ہے، ہمارے اسلاف نے صحت مند اختلاف سے گریز نہیں کیا لیکن ملی رشتوں کو مضبوط سے مضبوط بنانے کی کوشش بھی جاری رکھیں، حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان، سو مسائل میں اختلاف تھا مگر اتحاد و اخوتِ اسلامی کا پہلو ہمیشہ غالب رہا۔

ان حالات میں کیا کوئی ہوشمند ملت اپنی اجتماعی شیرازہ بندی سے غافل رہ سکتی ہے۔ اگر ہندوستان کا مسلمان اس تاریخ ساز رول کو ادا کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہو کہ وہ اپنے اختلافات کو بھلا کر اور ملت و اسلام کے وقار کے لیے صف بستہ ہو جائے تو مجھے یقین ہے کہ وہ صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں اسلام کے وقار کی علامت بن جائے گا۔

اور خود ہندوستان میں جو مظلوم انسان اپنے انسانی حقوق کے لیے جدوجہد میں مصروف ہیں مسلمانوں کو جو جماعتیں اور تنظیمیں پہلے سے موجود ہیں وہ اپنے مخصوص مقاصد اور دائرہ کار میں قابل قدر کام کر رہی ہیں، لیکن مسلمانوں کے مسائل اس قدر وسیع الاطراف اور کثیر الجہات ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک ایسے پلیٹ فارم کی واقعی ضرورت ہے جس میں بلالحاظ مسلک و خیال ملت کے سبھی اجزاء و عناصر شامل ہوں اور اسے پوری ملت کا اعتماد

(باقی صفحہ ۴۳)

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

خطبۂ صدارت

اتحادِ ملت کانفرنس

منعقدہ ۲۳/۲۴ مئی ۱۹۹۲ء بمبئی

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ والصلاۃ والسلام علیٰ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم

حضرات!

میں آپ کی عزت افزائی کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے اس اہم اجلاس کی صدارت کے لیے میرا انتخاب فرمایا۔ ایک حقیقت پسند انسان کے لیے جو اپنی حقیقت سے آشنا اور کسی فریب میں مبتلا نہیں ہے۔ اس اعزاز واعتماد کی قدر وقیمت صرف اتنی ہی ہے کہ اس کے ذریعہ اس کو اپنے دل کی بات کہنے اور کچھ حقائق و مسائل کے بارے میں اظہار خیال کا ایک ایسی فضا میں موقع ملتا ہے جس میں اس کی بات سنجیدگی اور اعتماد کے ساتھ سنی جاتی ہے۔ ہر چیز کی ابتدا بڑی نازک اور اہم ہوتی ہے اور اس کا اثر اس کے پورے سلسلہ پر پڑتا ہے خدا ہم سب کو اس اعتماد و ذمہ داری کا اہل ثابت فرمائے۔

بارود کی ایک سرنگ: اس وقت ہمارا ملک اور ہماری ملت دونوں ایسے خطرناک خطرات ومصائب اور ایک ایسی صورتحال سے دوچار ہیں جو ملکوں اور ملتوں کی زندگی اور تاریخ میں۔

بعض اوقات صدہا برس کے بعد اور بعض اوقات اس سے بھی زائد عرصہ کے بعد پیش آتی ہے اگر اس کی جلد خبر نہ لی گئی تو پہلے یہ ملت اپنے تشخص اپنی مذہبی آزادی اپنی ثقافت و تہذ اور اپنے عزیز سرمایہ (معابد و مدارس، علمی ذخیرہ اور زبان و ادب) سے محروم ہو گی پھر یہ وسیع اور شاندار ملک مکمل طریقہ پر تباہ ہو کر رہ جائے گا، بغض و عناد بدگمانی او بے اعتمادی کی فضا، انسانی جان و عزت و آبرو کی بے وقعتی، مردم آزادی و آدم بیزار عقل پر جذبات کی حکمرانی، دور اندیشی پر کوتاہ اندیشی کا غلبہ، ملکی مفاد پر ذاتی اغراض ک ترجیح، جذبات کے پیچھے بہہ جانے اور کھوکھلے نعروں کے پیچھے دیوانہ بن جانے کی عاد ایک ایسا زہر ہے جو بڑی سے بڑی قوم اور ملک کی ہستی کا خاتمہ کر دیتا ہے اور اس کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات، تنگ نظری مفاد پرستی حد سے بڑھا ہو احساس برتری جذبات سے مغلوب ہو جانے، روئی کی طرح جلد آگ پکڑ لینے اور بارود کی طرح بھک سے اڑ جانے کی صلاحیت کسی ایک میدان میں محدود اور کسی ایک فرقہ کے ساتھ مخصوص نہیں رہ سکتی، نفرت و اقتدار کی بڑھتی ہوئی ہوس کی آگ کو اگر جلانے کے لیے ایندھن نہ ملے تو وہ خود کو کھانے لگتی ہے۔ دورِ جاہلیت کے ایک حقیقت پسند عرب شاعر عرصہ ہوا کہا تھا ـ

والنار تاکل نفسہا ان لم تجد ما تاکلہ

(آگ اپنے کو کھانے لگتی ہے اگر اس کو کچھ اور کھانے کو نہ ملے)

نفرت کا زہر : ملک کی سیاسی جماعتیں ہر مسئلہ کو سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھنے جماعتی نفع و نقصان اور انتخابات میں ہار جیت کے پیمانے سے ناپنے کی عادی اور ہو چکی ہیں وہ تخریب میں اپنی تعمیر، تفریق میں اپنا اتحاد اور دوسروں کے اتلاف و مصیبت میں اپنا فائدہ اور اپنی ترقی سمجھتی ہیں، جس ملک میں انسانی جان اتنی ارزاں ہو کر مو م

سیاسی مقاصد اور محدود ذاتی اغراض اور عارضی اور مشکوک اقتدار کی خاطر سینکڑوں ہزاروں ہم وطنوں کی جان لے سکتی ہو جہاں ایک نعرہ ایک تقریر اور ایک اشتہار پر دیکھتے دیکھتے بیسیوں گھر بے چراغ اور سینکڑوں بچے لاوارث اور عورتیں کی جا سکتی ہوں۔ تنگ نظر اور مفاد پرست فرقہ وارانہ قیادت احیا پرستی کے جذبہ غلط تاریخ اور غلط تعلیم و تربیت، غیر دیانت دار اور وطن دشمن صحافت (پریس) روزانہ نفرت و عداوت کے زہر کی ایک بڑی مقدار اس ملک کے لاکھوں، کروڑوں باشندوں کے دل و دماغ میں اتارتی رہتی ہے اس نے تصویر کا ایک ہی رُخ پیش کرنے کی قسم کھائی ہے اس نے ہماری نئی نسل کے دماغوں کو آہستہ مسموم کر دیا ہے اور اس کو اتنا بے برداشت، غضب ناک اور زود رنج بنا دیا ہے اور اس میں مشتعل ہو جانے کی ایسی صلاحیت پیدا کر دی ہے کہ سارا ملک بارود کی ایک سرنگ کی طرح ہو گیا ہے جس کو ایک قدرے اشارہ سے ہر وقت اُڑایا جا سکتا ہے۔

تاریخ ایک سویا ہوا شیر : اس سلسلہ کی چیز ہندو احیائیت HINDU REVIVALISM کی تحریک ہے سینکڑوں اور ہزاروں برس کی سوتی ہوئی بلکہ مری ہوئی تاریخ کو دوبارہ جگانا اور زندہ کرنا، جو تبدیلیاں صدیوں پہلے (اچھی یا بُری) ہوئیں اور ان کو اس ملک کے حقیقت پسند افراد اور غیرت مند شہریوں نے صدیوں گوارا کیا۔ ان کے سفر کو پہلے قدم سے شروع کرنا اور ان کی تلافی کی کوشش اس ملک کو نئے مسائل مشکلات سے دوچار کرے گی جن کا مقابلہ کرنے کی اس ملک کو نہ فرصت ہے نہ فرصت، اور اسی طرح حکومت انتظامیہ اور دانشور طبقہ کی توانائی بے محل صرف ہوگی جس کی ملک کو بیش تعمیری کاموں سالمیت اور استحکام میں ضرورت ہے۔ تاریخ ایک سویا ہوا شیر ہے اس کو جگانا نہیں چاہیے اس کے پاس سے خاموشی سے نکل جانا چاہیے۔ تاریخ کو الٹا کرنا ...نا اور ماضی کے گڑے ہوئے مُردوں کو جو صدیوں سے سوئے ہوئے ہیں اکھاڑنے کی کوشش

[عبادت گاہوں کی تبدیل وغیرہ] کوئی عاقلانہ فعل نہیں ہے۔ اور اس وقت ملک کو جن حقائق اور مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، اس میں اس کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے اس سے ملک نئی نئی مشکلات اور غیر ضروری تنازعات میں پڑ جائے گا اور وہ ترقی پذیر زمانہ کا ساتھ نہ دے سکے گا۔

پولیس کی تربیت: انگریزوں نے [چونکہ سات سمندر پار کر اس ملک پر حکومت کر رہے تھے جن کا ان کو کوئی استحقاق نہ تھا اور وہ اپنی حکومت کو صرف خوف و رعب کے ذریعہ ہی قائم رکھ سکتے تھے] پولیس کی شکل میں ایک ایجنسی قائم کی گئی جو لوگوں پر حکومت کا خوف و رعب قائم رکھ سکے اور وہ ہمیشہ اس سے لرزہ براندام رہیں اور اپنی عزت عافیت کی خیر منائیں۔ انہوں نے نہ صرف اس کام میں کرنے والوں کی اخلاقی تربیت سے اعراض کیا بلکہ اس کو اس کے برعکس ایسی تعلیم دی اور اس کو اس کی کامیابی کا معیار قرار دیا جس سے ہر شریف آدمی اور باعزت انسان ڈرتا ہے۔

جب خود ہندوستانی اور اہلِ ملک، ملک کی حکومت اور انتظامیہ پر فائز ہیں تو ان کو پولیس کی انسانی و اخلاقی تربیت کرنی چاہیئے، ان میں خدمت و اعانت و ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے کہ وہ پولیس کو ایک ایسے شریفانہ ادارہ اور ہمدرد انسان اور اپنے ہم وطنوں کے خادم کی شکل میں تبدیل کر دینے کی کوشش کرنا چاہیئے کہ لوگوں کا ان کے بارے میں تصور و تاثر بدلے، اور وہ ان کو اپنا محافظ و معاون سمجھیں، ان کے دائرہ میں کوئی فرقہ کسی فرقہ کے ساتھ کوئی فرد کسی فرد کے ساتھ زیادتی نہ کر سکے۔ اور وہ فرقہ وارانہ فسادات اور ظلم و تعدی کے راستہ میں [خواہ وہ کسی فریق کی طرف سے ہو] سدِّ سکندری بن جائیں۔

دین میں مداخلت: آخر میں لیکن پوری وضاحت و صراحت اور اہمیت و تاکید کے ساتھ یہ حقیقت پسندانہ اور خیر خواہانہ مشورہ کہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت اور

سی ایسے اقدام اور قانون سازی سے مطلقاً پرہیز و احتیاط کی جائے جس کو مسلمان اپنے ین میں مداخلت اور دستور ہند کی دی ہوئی آزادی کی تنسیخ کا مترادف سمجھیں۔

دنیا کے بہت سے ان ملکوں سے جہاں مسلمانوں کی اکثریت پائی جاتی ہے جہاں مختلف اسباب کی بنا پر (جن سے بحث کرنا بے سود اور واقعات کی منطق کے خلاف ہے) زیادہ مذہبیت اور دینی احساس و حمیت پائی جاتی ہے اس لیے یہاں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے اور ملک کی اس عظیم ترین اقلیت کی (جس کو ملت کہنا زیادہ صحیح ہوگا) مذہبی آزادی میں جو جارحانہ OFFENSIVE اور امن عامہ کے خلاف نہیں اس کے پرسنل لا میں جو اس کے مذہب کا جزء ہے اس کی مذہبی تعلیم اور اس کے مرکزوں اور اداروں میں جو ملک کے لیے مضر ہونے کے بجائے تعلیم و تہذیب پھیلانے اور دوسروں میں اس ملک کا نام بلند کرنے کا ذریعہ ہیں کسی نام یا کسی انتظامی قانون کی بنا پر مداخلت کرنا اس اقلیت کے دل و دماغ میں (جو بعض ملکوں کی پوری پوری آبادی سے زیادہ تعداد میں ہے) بے اطمینانی و بے چینی پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔ اور ملک کی تعمیر و ترقی اور اس کے حصول کے لیے مخلصانہ جدوجہد اور تعاون پر اثر انداز ہوگا۔

انگریزوں کے دور کی یاد : سب سے آخر میں، اس ملک کا اخلاقی انحطاط اپنے نقطہ کو پہنچ گیا ہے دولت پیدا کرنے کے جذبے نے اور تھوڑے سے تھوڑے وقت میں زیادہ سے زیادہ کما لینے کے شوق نے جنون کی شکل اور سرسام HYSTERIA کی کیفیت اختیار کر لی ہے اور سب پر دولت کمانے اور زیادہ منفعت حاصل کرنے کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ یہ جذبہ ملک کے ہر طبقہ اور ہر ملکی و سیاسی مصلحت سے بے پروا اور بے نیاز ہے۔ وہ مذہب و اخلاقیات، شرافت و مقبولیت،

شہریت اور آئین، سب کے حدود پھلانگ گیا ہے۔ ہر محکمہ میں سخت بدنظمی، ہر شعبہ میں سخت ابتری، ہر موڑ پر لاقانونیت کا دور دورہ اور رشوت ستانی کی گرم بازاری ہے انتہا یہ ہے کہ لوگ عاجز آکر انگریزوں کے دور کی باقاعدگی اور زندگی کی تمام سہولتوں کو یاد کرنے لگتے ہیں، اور بعض اوقات اس دور غلامی کو اس دور آزادی پر ترجیح دینے لگتے ہیں۔ یہ کسی ملک کے لیے ننگ و عار کا آخری درجہ اور صاحب اقتدار جماعت کی ناکامی اور نااہلی کی آخری دلیل ہے، کہ لوگ بدیسی حکمرانوں اور ملک کی عزت کو خاک میں ملانے والوں کو یاد کرنے لگیں۔

ملّت کا نشین: ملک و معاشرہ کی موجودہ صورت حال کی (دل پر ہاتھ رکھ کر) یہ تاریک لیکن مطابق واقعہ تصویر سامنے لانے کے بعد جو اس موقر مجلس کے لیے اگرچہ ضروری نہ تھی لیکن وہ افادیت سے خالی بھی نہ تھی، تاکہ اس ملت کو جس کی اپنے پیغام، کار منصبی اور اپنے تشخص و خصوصیات کے تحفظ کے ساتھ اپنے معاشرہ اور ماحول اور اپنے مسکن و وطن کی خدمت و حفاظت کی بھی ذمہ داری ہے، تاکہ وہ اس کو اپنے لیے بھی باعزت زندگی گزارنے کے قابل بنا سکے اور اہل وطن کو بھی سکون و اعتدال اور امن و امان کی پالیسی زندگی گزارنے میں بھی مدد دے جس میں صلاحیتوں کو صرف کرنے اور اپنی حب الوطنی، انسان دوستی اور شرافت کا ثبوت دینے کا موقع ہو۔

پھر یہ وہ امّت ہے جس کے متعلق (قرآن و حدیث کی روشنی میں) کہنے والے نے سچ کہا ہے ع

ہے حقیقت جس کے دین کی احتساب کائنات

اور اس احتساب کے ماسوا دنیا کی تعمیر نو کی بھی ہر زمانے میں اس پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اسی لیے اسی شاعر کا کہنا بیجا نہیں کہ ع

معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرہ کے افراد کو ایک کشتی کے سواروں سے تشبیہ دی ہے جس میں پست حال مسکینوں اور مرفہ الحال بالانشینوں کی کوئی تفریق نہیں۔ اگر اس کشتی میں کسی مسافر کی ناعاقبت اندیشی سوراخ کر دے اور پانی آنے لگے تو پھر اس کشتی کا کوئی مسافر بچ نہیں سکتا اور وہ کشتی ڈوبے گی۔ تو سب ڈوبیں گے ہم سب ایک کشتی کے سوار ہیں۔ لیکن اس سوراخ کا بند کرنا ہماری حب الوطنی اور حقیقت پسندی کا بھی تقاضہ ہے اور ہمارے اس منصب احتساب اور فلاح انسانیت کے فکر کا بھی جو ہمارے مذہب نے ہم پہ عاید کی ہے

یا ایہا الذین آمنو کونو قوامین للہ شہداء بالقسط

(سورہ المائدہ)

اے ایمان والو کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی۔

اللہ تعالی نے اس قلیل التعداد و مختصر جماعت مہاجرین کو جو مکہ معظمہ سے ہجرت کرکے مدینہ طیبہ میں آئی تھی اور چند سو سے زیادہ اس کی تعداد نہیں تھی، قعر ذلت و ضلالت میں گرتی ہوئی دنیا اور جاں بلب انسانیت کی چارہ سازی اور سچائی پر مامور فرمایا اور دعوت و ہدایت کا کام کرنے اور اصلاح و استقامت کا نمونہ بننے اور اتحاد و تعاون کی تاکید فرمائی اور ان لفظوں سے ان کو خطاب کیا، جو تاریخ انسانی بالخصوص ساتویں صدی عیسوی کی تاریخ پڑھنے والے کو عالم حیرت میں پہنچا دیتے ہیں۔

الا تفعلو تکن فتنۃ فی الارض و فساد کبیر[1]

اگر تم اس پر عمل نہ کرو گے تو دنیا میں بڑا فتنہ برپا ہوگا اور بڑا فساد پھیلے گا۔

---

[1] سورہ انفال ۷۳ [2] یعنی اگر مسلمان ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہو کر تبلیغ و ہدایت کا کام نہ کریں گے۔

اس شاخ پر تبصرہ کرنے کے بعد جس پر تقدیر و حکمت الٰہی سے اس ملت کا نشوو
ہے اور ان خطرات کی نشاندہی کے بعد جو واقعات اور حقائق کی شکل میں اس کو درپیش
ہم اس نشیمن میں درپیش خطرات کے بارے میں بھی کچھ عرض کریں گے جو قیاسات نہ
مشاہدات اور تجربات کی شکل میں دیکھنے والوں کے سامنے ہیں۔

(۱) اس ملت کے لیے جس کے لیے خدائی تعلیم اور ایک مقبول و متعین دین پر نہ صرف
اور مرنا ضروری بلکہ اپنی اولاد و نسل کے بارے میں بھی یہ انتظام اور اطمینان ضروری
وہ بھی اسی خدائی تعلیم اور مقبول و معین دین پر زندگی گزارے گی اور سفرِ آخرت اختیا
اس لیے جہاں یہ کہا گیا ہے کہ

وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (آل عمران ۱۰۲)

اور نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔

وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا

(اے ایمان والو بچاؤ اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے (سورۃ التحریم)

ایسی ملت کی ذمہ داری اس ملک میں بہت بڑھ جاتی ہے۔ جہاں لا
کوئی ایسا نظام اور نصاب تعلیم جاری ہو جو اسلام کے بالمقابل عقاید کی تعلیم
اور جس کے مضامین اور مندرجات توحید و رسالت کے بنیادی اسلامی عقائد کے
اور شرک و ذہنیت کے علانیہ داعی اور مبلغ ہوں، جس کا یقین کرنے سے کوئی م
(تاویل اور تکلف کے ساتھ کسی) مسلمان نہیں رہ سکتا، جہاں نصاب تعلیم، طرز تع
و مظاہرات لٹریچر پریس، ذرائع ابلاغ (ریڈیو اور ٹی وی) کے ذریعہ صرف ن
ثقافتی نسل کشی کی کوشش کی جا رہی ہے بلکہ مذہبی و اعتقادی نسل کشی کی!

مسلمانوں کو اپنی آئندہ نسل اور اولاد کو اعتقادی ایمانی اور ذہنی طور پر مسلمان رہنے کا انتظام کرنا ہوگا۔ اور ان کی بنیادی دینی تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنی ہوگی اور اس کے بعد ان کی صحت اور ضرورت کے وقت علاج، لباس اور عام تعلیم سے زیادہ اس کی فکر اور اہتمام کرنا ہوگا اور خدا کے ایک برگزیدہ پیغمبر اور پیغمبر زادہ حضرت یعقوبؑ کی طرح ان کو اپنی اولاد کے بارے میں وہی اطمینان حاصل کرنا ہوگا جو خدا کے اس پیغمبر نے اپنے فرزندوں کے بارے میں (جو تین تین پیغمبروں کی اولاد تھے) یہ کہہ کر حاصل کیا تھا کہ "ما تعبدون من بعدی" (تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟) اور انہوں نے جواب دیا تھا کہ نعبد الٰهك واله آبائك ابراهيم واسماعيل واسحاق الٰها واحدا ونحن له مسلمون (سورۃ البقرۃ ۱۳۳) ہم آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیم و اسماعیلؑ و اسحاق کے معبودوں کی عبادت کریں گے، جو معبود یکتا ہے اور ہم اس کے حکم بردار ہیں۔

دینی تعلیم: اس کے لیے ہندوستان کی ملت اسلامی کو اپنی اولاد اور اپنی نئی نسل کی بنیادی دینی تعلیم کی ذمہ داری غذا اور ضروریات زندگی کی فراہمی کے برابر بلکہ (نتائج کو پیش نظر رکھتے ہوئے) اس سے زیادہ ہی قبول کرنی ہوگی، اس کے لیے آزاد مکاتب و مدارس کا قیام گھروں میں دینی ماحول پیدا کرنے، خواتین و مستورات (ماؤں اور بہنوں اور بزرگ بیبیوں اور مربیات) کے ذریعہ بنیادی عقائد سے واقف اور پیغمبروں اور خصوصیت کے ساتھ خاتم الرسل اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور سیرت سے نہ صرف آشنا اور متعارف بلکہ گرویدہ اور معتقد بنانے کی کوشش کرنے اور ایمان و توحید کی محبت اور کفر و شرک سے وحشت اور دہشت کو گھٹی میں اتار دینے کی ضرورت ہوگی۔

اردو کی تعلیم: دوسری طرف ان کی اردو کی تعلیم کا بھی انتظام کرنا ہوگا اور اس

میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت پیدا کرنی ہوگی، جس میں وہ دینی، علمی، ثقافتی سرمایہ اور ذخیرہ ہے جو عربی زبان کے بعد کسی مسلمان ملک کی زبان میں نہیں ہے (اور بعض حیثیتوں سے وہ بعض شعبوں میں اس سے بھی فائق ہے) اس زبان سے مسلمان نسل کا یکسر ناآشنا ہوجانا اور اس میں لکھنے پڑھنے ہی نہیں اس کے سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو جانا ایک ذہنی و لسانی نسل کشی کے مترادف ہے جو اس کو اپنے ماضی سے اپنے تمدن اور تہذیب سے یکسر ناآشنا بنادے گا۔

اس سلسلے میں رسم الخط کا مسئلہ بھی آتا ہے اس کی تبدیلی بھی کسی قوم کے اپنے قدیم وعلمی تہذیبی سرمایہ اور اپنے اسلاف کی محنتوں اور اپنے ماضی سے رشتہ کاٹ لینے کے مترادف ہے، اور جیسا کہ فلسفی مورخ ٹوائنبی نے لکھا ہے کہ

> "کتب خانہ اسکندریہ کے مسلمان عرب فاتحین کے نذر آتش کر دینے کی روایت صحیح ہو یا غلط[1] اب ایسے کسی ذخیرہ کو نذر آتش کرنے اور برباد کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں رسم الخط (اسکرپٹ) بدل دینا کافی ہے"

اس لیے اردو رسم الخط کے قائم اور باقی رہنے پر اصرار و استحکام، اس کے باقی رہنے کی جدوجہد کی بھی ضرورت ہے۔ اور اس کی تعلیم کے بندوبست اور اس کے مراکز قائم کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

---

[1] واضح رہے کہ اب یہ روایت مورخین و ناقدین کے نزدیک محض افسانہ اور مسلمان عرب فاتحین پر ایک اتہام ہے ملاحظہ ہو علامہ شبلی کی محققانہ کتاب "کتب خانہ اسکندریہ" HITTI PK نے اپنی کتاب SHORT HISTORY OF ARABS میں بھی اس کی تردید کی ہے

مسلمانوں کے ایمان و عقیدہ کا جزو ہے کہ ان کا عائلی قانون (فیملی لاء) اسی خدا کا بنایا ہوا ہے جس نے قرآن اتارا اور عقائد و عبادات کا قانون عطا کیا، سارا قرآن مجید تصریحات سے بھرا ہوا ہے مسلمان اس عقیدہ پر ایمان لانے پر مجبور ہیں، اور اس کے بغیر وہ مسلمان نہیں رہ سکتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ قانون خدائے علیم خبیر کا بنایا ہوا ہے، جو انسان کا بھی خالق ہے اور اس کائنات کا بھی اس کی فطری ضرورتوں اور کمزوریوں دونوں سے واقف ہے وہ فرماتا ہے:۔

الا یعلم من خلق و ھو اللطیف الخبیر (الملک ۱۴)

کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ تو (بڑا ہی) باریک بین اور پورا باخبر ہے اسی طرح وہ زمانہ کا بھی خالق ہے ہمارے لحاظ سے ماضی، حال مستقبل کی تقسیم کتنی ہی صحیح اور ضروری ہو، اس کے لحاظ سے سب ماضی ہی ماضی ہے، اس لیے ایک بار یہ مان لینے کے بعد کہ وہ خدا کا بنایا ہوا قانون ہے جو ایک زندہ جاوید امت اور ایک عالمگیر دائمی شریعت کے لیے بنایا گیا ہے تو ترمیم اور تبدیلی کی ضرورت کا مطالبہ ایک کھلے منطقی تضاد (اور جہاں تک مسلمان کہلانے والے اشخاص کا تعلق ہے) ایک اعتقادی و عملی نفاق کے سوا کچھ نہیں۔

پھر معاملہ صرف ایمان بالغیب اور مذہبی عقیدت اور عصبیت کا نہیں، اس قانون کے مکمل، متوازن اور عادل ہونے اور زمان و مکان کی تبدیلی پر حاوی ہونے کے عقلی و عملی شواہد اور مسلم و غیر مسلم مشرقی و مغربی فضلاء اور حق پسند مقننین کے واضح اعترافات اور عملی تجربے اتنے ہیں کہ کوئی "شپرہ چشم" ہی ان سے انکار کر سکتا ہے، اس موضوع پر متعدد نامور فضلاء نے قلم اٹھایا ہے اور بڑا قیمتی مواد جمع کر دیا ہے۔

مسلم پرسنل لاء: ہندوستان میں جب یہ مسئلہ اٹھا اور دیکھنے والوں کو

یہ نظر آیا کہ افق پر خطرہ کی علامتیں نمایاں ہوگئی ہیں اور یہ بادل جو ابھی کسی کسی وقت گرجتا ہے کسی وقت ضرور برسے گا، تو انھوں نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے نام سے دسمبر ۱۹۷۲ء میں اسی بمبئی میں ایک متحدہ پلیٹ فارم بنایا، جس سے وقتاً فوقتاً قانون سازی کی نوعیت اور اس رُخ کا جائزہ لیا جاتا رہے، تاکہ اچانک ان پر یہ یا کوئی دوسرا مسئلہ "شب خون" نہ مارنے پائے۔ یہ ایک ایسا نمائندہ بورڈ تھا جس کی مثال اپنی وسعت و عمومیت اور مختلف مکاتب خیال کی نمائندگی کے لحاظ سے تحریک خلافت کے بعد نہیں ملتی، ۱۹۴۷ء کے بعد اتنے بڑے اجتماعات دیکھنے میں نہیں آئے اس بورڈ کی تشکیل اور اس کے ان شاندار اور بے نظیر جلسوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ حکومت اور مسلم پرسنل لا میں اصلاح و ترمیم کی آواز بلند کرنے والے حضرات کو ہوا کا رُخ معلوم ہوگیا اور اتنا ثابت ہوگیا کہ مسلمان اس مسئلہ پر صد فیصد متفق ہیں اس لیے دانشمندی حقیقت پسندی اور انتخابی سیاست کا بھی تقاضہ ہے کہ اس مسئلہ کو اٹھانے میں احتیاط کی جائے لیکن ذہنیتوں اور نیتوں کا مطالعہ فرقہ وارانہ اور سیاسی جماعتوں کا مشاہدہ اور مجالس آئین ساز کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس بارہ میں کلی اور دائمی طور پر مطمئن ہونے کا جواز نہیں۔ ایسے مسائل کے بارے میں ہمیشہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے کہ ؏

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

اصلاح معاشرہ: آخر میں اصلاح معاشرہ کا نمبر آتا ہے ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے گھر اور خاندانوں کے ماحول میں اللہ کے بنائے ہوئے اور اللہ کے رسول ﷺ کے بتائے اور سکھائے ہوئے عائلی قانون (رشتہ داروں کے حقوق و فرائض، تقسیم میراث، نکاح و طلاق اور شادی بیاہ کے طریقوں) کے بارے میں سخت خود رائی، انحراف، رسم و رواج کی پابندی اور ہمسایہ قوم کی پیروی اور تعالی سے کام لیا ہے۔ شادی میں حد درجہ کا اسراف و فضول خرچی

نمود و نمائش حدود شرعیہ سے تجاوز اور آخر میں لڑکی والوں سے بڑھے چڑھے جہیز کا مطالبہ (نقد یا چیک) جس کو کہیں "تلک" اور کہیں "گھوڑا جوڑا" کے الفاظ سے یاد کیا جاتا ہے یہ رسم و رواج غیر اسلامی اور غیر شرعی ہی نہیں بلکہ "جاہلیت حاضرہ" کی پیروی، غیر مسلموں کی اندھی تقلید اور دولت پرستی اور پیسہ کی حد سے بڑھی ہوئی لالچ کا وہ مظاہرہ ہے جو نہ صرف بے برکتی کا باعث ہے بلکہ بہت جگہ قابل نکاح لڑکیوں کے بیٹھے رہنے اور ان کے والدین اور سرپرستوں کی اس پریشانی کا سبب ہے جو بعض اوقات اور بعض مقامات پر خودکشی کر لینے اور زہر کھا لینے تک پہنچا دیتا ہے ۔[1]

اس صورت حال کے خلاف ایک مؤثر ملک گیر اصلاح معاشرہ کی مہم چلانے کی ضرورت ہے جو مساجد سے شروع ہو کر انجمنوں، شہروں، قصبات اور محلہ محلہ پھیلے اور وہ مسلمانوں کی زندگی اور معاشرہ اقدار و معیار، عزت و شرافت اور احساس شعور میں انقلاب برپا کر دے، اور وہ ان رسوم جاہلیت، تقابل و تفاخر کے غیر اسلامی طریقوں اور مظاہروں سے توبہ کر کے دین حنیف اور صحیح اسلامی و نبوی منہج حیات کو اختیار کریں۔

وما ذالك على الله بعزيز[2]

ملت کے بارے میں ہم اس محدود اور قیمتی وقت میں ان ہی چند نکات اور پہلوؤں پر اکتفا کرتے ہیں، اور حاضرین یا تمکین سے جو نہ صرف صاحب فکر و مطالعہ ہیں بلکہ اصلاحی

---

[1] اس کے متعدد واقعات بعض شریف گھرانوں میں پیش آ چکے ہیں۔

[2] الحمدللہ کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس دعوت و تحریک کو اپنے بنیادی فرائض اور لائحہ عمل میں شامل کیا ہے جا بجا اس مقصد اور نام سے کانفرنسیں اور اجتماعات ہوئے اور ہو رہے ہیں اور الحمدللہ وہ بے اثر اور بے نتیجہ نہیں۔

واجتماعی و دعوتی و فکری میدانوں سے تعلق رکھتے ہیں یہ کہہ کر اس بحث کو ختم کرتے ہو

تو خود حدیثِ مفصّل بخواں ازیں مجمل

لیکن پھر ایک بار دل پر ہاتھ رکھ کر اور جگر تھام کر کہنا پڑتا ہے کہ ملک کو تباہی سے بچانے اور اس کے معامر دنیا اور تاریخ میں وہ مقام حاصل کرنے کے لیے جو اس کی وسعت کثرت آبادی وسائل و ذخائر، شاندار تاریخ اور ایک ایسی ملت اور دین کی موجودگی کے شایان شان ہے۔ جس کی بنا پر اس کو خیر امت اور جس کے دین کو نعمت خداوندی اور آخری پیغام آسمانی کہا گیا ہے

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا [1] آج میں پورا کر چکا تمہارے لیے تمہارا دین، اور پورا کیا تم پر میں نے اپنا احسان اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین۔

متحدہ پلیٹ فارم: اگر یہ ملت ملک کو بچانے کی جدوجہد کرنا تو الگ رہا۔ اپنے مسائل کو بھی مؤثر طریقہ پر پیش کرنے ملک کی اکثریت اور صاحب اقتدار کو ان حقائق سے آشنا اور ان ضروریات اور کاموں کی تکمیل کے لیے آمادہ کرنے سے بھی قاصر رہی، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ ابلاغ عامہ کے ذرائع اور پریس تک بھی اپنی ضروریات احساسات اور جذبات کو نہیں پہونچا سکی جو ایک شہری اور اس سے زیادہ اتنی بڑی اقلیت کا حق ہے جو ملک کے پورے سیاسی انتظامی فکری و اخلاقی ڈھانچہ کو اگر اس میں اتحاد عزم اور علم و سلیقہ ہو، متاثر کر سکتی، اور اس کو بنا اور بگاڑ سکتی ہے تو اس کو کسی معنیٰ و مفہوم پر آزاد اور ایک جمہوری و نامذہبی (سیکولر) ملک کی باعزت اکائی نہیں کہا جا سکتا۔

---

[1] سورۃ المائدۃ۔

اس کی بڑی وجہ ایک ایسے متحدہ پلیٹ فارم، وفاقی مجلس اور پوری ملت کی نمائندہ قیادت کا فقدان ہے جس کی آواز سمجھی جائے اور جس کو پوری ملّت کا اعتماد اور تعاون حاصل ہو، اور جو گروہی عصبیوں، فرقہ وارانہ اختلافات یا طرز فکر کسی مکتب خیال ادارہ مدرسہ فقہی مسلک خاندان سلسلہ یا شخصیت کی مقبولیت و نامقبولیت، نیک نامی و بدنامی، کامیابی و ناکامی، تعریف و تنقید کے امکانات و مواقع سے بےنیاز و بالاتر ہو کر دھڑکتے ہوئے دل کی آواز، حقائق کی تصویر کشی، بیماری اور تکلیف کی اصل جگہ پر انگلی رکھ دینے اور ایسے اظہار حقیقت کا فرض انجام دے جس میں نہ کسی گروہ و انجمن اور مکتب خیال کی رو رعایت ہو، نہ کسی تنظیم اور انجمن کی پاسداری، اور دوسرا یہ خیال بھی اس کا فائدہ فلاں قیادت یا فلاں مرکز کو پہنچے گا اور اس کو ملّت میں دوسری قیادتوں اور مرکزوں پر تفوق اور بالاتری حاصل ہوگی، اس کے پیش نظر صرف یہ ہو کہ ملک و ملّت کے یہ مسائل ضروریات اور وقت کے یہ حقائق اور صداقتیں ایک متحدہ پلیٹ فارم سے ایک متحدہ آواز میں صاحب اقتدار جماعت حکومت اور محبّ وطن حقیقت پسند اور صاحب ضمیر تنظیموں اور افراد اور پریس و ذرائع ابلاغ تک پہنچ جائے اور اس سے تغافل برتنا ہی نہیں بلکہ صرف نظر کرنا بھی صاحب اقتدار اور با اختیار جماعت کے لیے اگر ناممکن نہیں تو دشوار ہو جائے۔ ہمیں ماننے کہ اگر ملّت کا ایسا متحدہ پلیٹ فارم اور ایسی اجتماعی موثر قیادت (جس کے لئے ضرورت نہیں کہ وہ شخص واحد کی شکل میں ہو، وہ مختلف جماعتوں، گروہوں، تنظیموں اور پلیٹ فارموں کے نمائندوں کا ایک مجموعہ بھی ہو سکتی ہے) وجود میں آجاتے۔[1]

---

[1] اس تاریخی واقعہ اور حقیقت کا اظہار ضروری اور ہر طرح قرین ... ہے کہ ۱۹۶۴ء کے پُر آشوب دور میں جب جمشید پور اور روڑ کیلا اور رانچی میں وسیع اور مہیب پیمانہ پر

(باقی صـ ۱۶)

ر ہر بات بہر حال میں ملک کی حقیقت پسند اور باخبر آبادی، صاحب اقتدار جماعت اور ذرائع ابلاغ
. اچھی طرح واضح ہو کہ یہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے منتخب نمائندے معتمد و محترم قائدین،
ر یہ ایک ملی وفاق ہے جو پوری ملت کا ترجمان اور وکیل ہے، اس کی آواز ملت ہی نہیں
لک کی آواز ہے، اور یہ اس کا ضمیر اور اس کی زبان ہے، آپ یقین فرمائیے کہ اس کے
بعد اس کی طرف سے ملک و ملت کی جو ترجمانی ہوگی وہ ایک آزاد جمہوری ملک میں (جہاں
سی قابل لحاظ تعداد اور موثر عنصر اور آبادی کے کسی معتد بہ حصہ کے مطالبے، شکایت اور حقیقی
ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا) وہ ضائع نہیں جائے گی، اپنا اثر کرے گی اور ملک کو
تباہی اور ملت کو دینی تہذیبی لسانی اور ثقافتی نسل کشی سے بچا لے گی۔

(سلسلہ صفحہ ۱۵) فرقہ وارانہ فسادات ہوتے اور ملت اسلامیہ ان کا نشانہ بنی اور اس غیر فطری اور
غیر انسانی صورت حال سے خود ملک خطرہ میں پڑ گیا تو ہندوستان کے محبان وطن جنگ آزادی کے
قائدین، اور ملت کے غم خواروں کی ایک تعداد (جن میں ڈاکٹر سید محمود صاحب مرحوم پیش پیش اور
اصل داعی اور محرک تھے) کی کوشش سے مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل ہوئی اور اس کا پہلا
اجلاس ۸،۹ اگست ۱۹۶۴ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ڈاکٹر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا، اور
اس کی مجلس کی باضابطہ تشکیل عمل میں آئی اور اس کا مرکزی دفتر دہلی میں قائم ہوا، اس مجلس کے
بنیادی ارکان ... (جن میں ملت اور ملک کے چیدہ اور برگزیدہ افراد اور مختلف سیاسی مجالس کے ذمہ دار
ارکان تھے) بہار و اڑیسہ، گجرات و مہاراشٹرا، تامل ناڈو اور کرناٹک کے بڑے کامیاب اور مفید و موثر
دورے کیے، اور ان کا وہاں کی پبلک نے بڑے جوش و تپاک ،، عقیدت و خلوص سے استقبال
کیا، اور وسیع پیمانہ اور پُر از اعتماد فضا میں عمومی اجلاس ہوئے جن کی نظیر ملک کی پچھلی تاریخ
اور قریبی زمانہ میں ملنا مشکل ہے، اس مجلس کی افادیت اور کارگزاریوں سے صرف نظر کرنا
انصاف نہیں، افسوس ہے ڈاکٹر صاحب اور مفتی عتیق الرحمٰن صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد
(جو اس کے صدر تھے) مجلس میں تعطل اور انتشار پیدا ہو گیا، اور اس میں وہ سرگرمی اور
اتحاد خیال باقی نہ رہا جو اس کی خصوصیت و امتیاز تھا۔

ملی کونسل کے قیام کی قرارداد

ادملت کانفرنس (منعقدہ ۲۳ر۲۴ مئی، بمبئی میں پیش کی گئی)

تحاد ملّت کانفرنس (ممبئی ۲۳، ۲۴ مئی ۱۹۹۲ء) کا یہ اجتماع جس میں
لمانانِ ہند کے تقریباً تمام مسالک و مکاتب فکر اور مختلف جماعتوں اور ملک کے تقریباً
ب ہی علاقوں سے تعلق رکھنے والے دردمند علماء قائدین، زعماء شریک ہیں۔ محسوس
تاہے کہ مسلمانوں کے دینوی و مادی وجود کو مٹانے کی پیہم سازشوں کے باوجود یہ اللہ کا
ل وکرم ہے کہ وہ اس ملک میں نہ صرف باقی اور موجود ہیں بلکہ ان میں اپنے دین و
ذہب و تمدن کے تحفظ کا بے پایاں جذبہ برقرار و قائم ہے۔ اس ملک کے لیے فکرمند ہیں
اس کو خطرات سے بچانے کی صلاحیت و استعداد رکھتے ہیں یہ بھی رب ذوالجلال کا فضل
کہ ان میں مایوسی کی جگہ ہمت۔ ہراسانی کی جگہ حوصلہ پروان چڑھ رہا ہے اور دینی و دینوی
لم، معاشی بہبود اور سماجی بہتری کے لیے کسی نہ کسی نوعیت میں اور کسی نہ کسی سطح تک کوشاں
تاہم اس حقیقت سے انکار مشکل ہے کہ اغیار کی سازشوں، خود اپنے تغافل و تساہل
ہمت۔ ربط اور تعاون کی کمی، مسلکی گروہی، دیگر تعصبات، اتحاد و اشتراک عمل کے
دان نے ملّت اسلامیہ ہند کے مسائل کو سنگین سے سنگین تر بنا دیا ہے شدید ضرورت

اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کا ایک متحدہ پلیٹ فارم وجود میں آئے جو ان مسائل کے حل کی سمت میں مسلمانوں اور ان کی جماعتوں اور اداروں کی کوششوں کو تقویت پہنچائے۔ انہیں مربوط و منضبط اور ملت کی ترجمانی کا حق ادا کرے۔ یہ پلیٹ فارم بلا لحاظ تفریق مسلک خیال پوری ملت اسلامیہ کا نمائندہ ہو اور اس کو متحد کرنے اور بحیثیت خیر امت اس کا اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل کے قابل بنانے کی کوشش کرے۔ دینی، تعلیمی، معاشی ترقی، بہبود نیز ان کی سیاسی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے ٹھوس اور مثبت اقدامات کرے۔ وقتی اور ہنگامی واقعات سے بالاتر ہو کر حالات کے پورے جائزے کی روشنی میں فوری اور طویل مدتی منصوبہ بندی کی جائے اور ایسے اقدامات کئے جائیں جن میں تاریخ ا تسلسل ہو اور اس مقصد کے لیے مختلف شعبہ ہائے حیات میں ملت میں موجود صلاحیتوں کو اکٹھا اور مربوط کیا جائے۔

اتحاد ملت کانفرنس کا یہ اجلاس طے کرتا ہے کہ اس مقصد کے لئے "ملی کونسل" کے نام سے ایک ایسی ہیئت کی تشکیل کی جائے جو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی کے ارشاد کے مطابق ملت کی آواز سمجھی جائے اور جس کو پوری ملت کا اعتماد اور تعاون حاصل ہو اور جو گروہی عصبیتوں فرقہ وارانہ اختلافات یا طرز فکر یا کسی مکتب خیال، ادارہ، مدرسہ، فقہی مسلک، خاندان سلسلہ یا شخصیت مقبولیت و نامقبولیت، نیک نامی یا بدنامی، کامیابی و ناکامی، تعریف و تنقید کے امکانات و مواقع سے بے نیاز و بالاتر ہو کر دھڑکتے ہوئے دل کی آواز، حقائق کی تصویر کشی، و تکلیف کی اصل جگہ پر انگلی رکھ دینے اور اظہار حقیقت کا فرض انجام دے جس میں کسی گروہ و انجمن اور مکتب خیال کی رو و رعایت ہو، نہ کسی تنظیم اور انجمن کی پاسداری دور کا یہ خیال بھی کہ اس کا فائدہ فلاں قیادت یا فلاں مرکز کو پہنچے گا اور اس کو ملت

وسری قیادتوں اور مرکزوں پر تفوق اور بالادستی حاصل ہو گی۔ اس کے پیش نظر ضرورت یہ
ہو کر ملک وملت کے یہ مسائل، ضروریات، وقت کے یہ تقاضے اور صداقتیں ایک متحدہ
یٹ فارم سے ایک متحدہ آواز میں صاحب اقتدار جماعت، حکومت اور محب وطن منصف پسند
در صاحب ضمیر تنظیموں اور افراد اور پریس و ذرائع ابلاغ تک پہنچ جائے اور اس سے
غافل رہنا ہی نہیں بلکہ صرف نظر کرنا بھی صاحب اقتدار اور با اختیار جماعت کے لیے
ر نا ممکن نہیں تو دشوار ہو جائے۔

اتحاد ملت کانفرنس طے کرتی ہے کہ "درج ذیل نکات" ملی کونسل کے اغراض و مقاصد ہوں گے۔

(۱) کلمہ طیبہ کی بنیاد پر مسلمانوں میں اجتماعیت اور اتحاد پیدا کرنا اور اس بات کی
شش کرنا کہ مسلمان بحیثیت خیر امت اس ملک میں اپنی ذمہ داریاں پوری کریں۔

(۲) ہندوستانی مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے مناسب
دابیر اختیار کرنا۔

(۳) مسلمانوں کے دینی و مذہبی تشخص نیز تہذیبی و ثقافتی شناخت کے تحفظ کی
شش کرنا اور اس سلسلہ میں ان مقاصد کے لیے کی جانے والی کوششوں میں خواہ کسی
ت سے ہو رہی ہوں ربط و توافق پیدا کرنا اور ان سے تعاون کرنا۔

(۴) ملک کے بڑھتے ہوئے فسطائی اور فرقہ وارانہ منافرت اور تشدد کے رجحانات
مقابلہ کے لیے رائے عامہ کو بیدار کرنا، ہندوستان کی تمام مذہبی و تہذیبی اکائیوں
فرقوں کے درمیان خیرسگالی اور برادرانہ تعلقات کو مستحکم کرنے کی کوشش کرنا
کے اندر باہمی اعتماد کی فضا پیدا کرنا اور ہندوستان کے تمام شہریوں بالخصوص
قلیت اور مظلوم طبقات کی جان و مال، عزت و آبرو اور تہذیب و تمدن کی کوشش کرنا۔

(۵) مسلمانوں میں حوصلہ و خود اعتمادی کو بحال کرنا اور ان میں اس احساس کو

ابھار نا کہ وہ اس ملک میں دوسرے درجہ کے شہری نہیں ہیں بلکہ دستوری طور پر اقتدار میں برابر کے شریک ہیں اور ملک کی تعمیر و ترقی اور ایک ایسے نظام کو قائم کرنے میں جو سماج کا ضامن ہو انہیں اپنا قرار واقعی رول ادا کرنا ہے۔

[۶] مسلمانوں کی تعمیر و ترقی اور ان کی تعلیمی، معاشی و معاشرتی، فلاح و بہبود کے منصوبہ بندی، دینی تعلیم کے مدارس و مکاتب، عصری تعلیم کے معیاری اسکول و کالج، تعلیم کے ادارے کالج، طبی مراکز، دواخانوں نیز صنعت و حرفت و دستکاری و تجارت شعبوں میں ایسے اداروں کے قیام کی کوشش کرنا جن کے ذریعے مسلمانوں کو ان میدا میں آگے بڑھنے کا موقع ملے اور وہ اپنی محنت کا پورا صلہ پائیں اور ان مقاصد کے تمام تنظیموں اور جاری کوششوں کے درمیان رابط و ہم آہنگی پیدا کر اور ان کو تقویت

[۷] مسلمانوں میں سیاسی و اجتماعی شعور پیدا کرنا اور حالات کی پیچیدگی اور نتا سے انہیں باخبر رکھنا اور مناسب رہنمائی فراہم کرنا۔

[۸] ملت اسلامیہ میں مقامی سطح سے ملکی سطح تک فعال قیادت کو پروان چڑھا ہر سطح پر ان مقاصد کی تکمیل میں مدد مل سکے۔

(۱) جلد از جلد اس تجویز میں دیئے گئے رہنما خطوط کی روشنی میں دستور اساسی مرتب کرنا۔

(۲) کونسل کو زیادہ سے زیادہ نمائندہ بنانے اور مختلف میدان کار میں صلاحیت فعال افرا کے بے سرگرم عمل کرنے کے نقطہ نظر سے مزید (۱۲۵) ارکان کا انتخاب کرے اور

(۳) جتنا جلد ہو سکے مرتبہ دستور کے مطابق ذمہ داران کونسل کے انتخاب کی کارروائی مکمل

• یہ کمیٹی ملی مصالح اور ضرورت کے تحت مزید (۹) ارکان کو COOPT کر سکتی ہے کمیٹی کے رکن متصور ہوں گے۔

یہ کانفرنس بارگاہ رب العزت میں ملتجی ہے کہ آزمائش اور ابتلا کے نازک مرحلہ ملت اسلامیہ کو مربوط و متحد کرنے اور تعمیر و ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لئے کی جانے و کوششوں کو کامیابی سے اور اس کے کارکنوں کو خلوص، توفیق، صلاحیت اور عزم د

آل انڈیا ملی کونسل کا قیام

مسلمانانِ ہند کا مشترکہ پلیٹ فارم اور متحدہ آواز - اتحادِ ملت کانفرنس کا فیصلہ ملی کونسل کی قرارداد پر

شرکائے کانفرنس کی تائیدی تقاریر

مولانا مجیب اللہ ندوی (جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ) قرارداد میں کونسل کا سارا رُخ متعین کردیا گیا ہے جو امراض ہماری تنظیموں کو گھن کی طرح کھاتے رہے ہیں ان سے کونسل کو بچانے کی کوشش کی گئی ہے ... منصوبہ بندی کی ہم میں کمی رہی ہے۔ ہم نے طے کیا ہے کہ منصوبہ بندی کے بغیر ہم کسی کام کو ہاتھ ہی نہیں لیں گے کیونکہ منصوبہ بندی کے بغیر کام پائیدار نہیں ہوتا .. کونسل کا جو ڈھانچہ بنایا گیا ہے اس میں بھی اس بات کا لحاظ کیا گیا ہے کہ ہر فرقہ ہر طبقہ ہر مسلک ہر مکتبِ فکر کی رعایت رکھی گئی ہے تاکہ اتحادِ ملت کا عملی مظاہرہ ہو اور ملی کونسل واقعی اسم با مسمیٰ ہو...

جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ ایم پی اتحادِ ملت کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر ملی کونسل کی تشکیل کی جارہی ہے۔ اس کونسل کا کسی جماعت سے ٹکراؤ نہیں ہے جو جماعتیں کام کر رہی ہیں ان کی خدمات کو تسلیم کیا جارہا ہے مختلف جماعتوں کی کوششوں کو مربوط کرنے کی کوشش کی جائے گی اور کوشش ہوگی کہ یہ کونسل ملت کی مشترکہ اور متحدہ آواز بن جائے۔

مولانا حنیف ملی شیخ الحدیث معہد ملت مالیگاؤں ملت کے لیے اتحاد ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اتحاد و اتفاق کی بنیاد پر اٹھایا تھا ایک مدت کی تکمیل کا ہم کو موقع مل رہا ہے ہمارے مسائل کئی ہیں لیکن ان مسائل کے حل کے سلسلہ میں کسی مرکزی نوعیت کا ادارہ مشورہ دے رہنمائی کرے یا خود کوشش کرے ایسا ادارہ بن رہا ہے جس کا دائرہ ہندوستان میں مشرق سے مغرب تک۔ شمال سے جنوب تک ہو...

لیکن یہ بڑا صبر آزما کام ہے اور صبر و شکیب کی اس میں بڑی ضرورت ہے۔

جناب انیس چشتی (پونے) .. ۱۹۴۷ء کے بعد ملت میں انتشار بہت دنوں تک قائم رہا اور اتنے طویل عرصے تک قائم رہنے کی وجہ سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے درمیان رابطہ کی کمی ہے .. خدا کا شکر و احسان ہے کہ اب ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کرنے کا ماحول بن رہا ہے۔

مولانا سیّد نظام الدین جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ "ملت اسلامیہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تحت متحد ہو کر ایک بات کہی اور پورا ہندوستان اس پر لبیک کہنے کے لیے تیار ہو گیا جس کے نتیجہ میں ایک بڑے امتحان میں مسلمانوں کو کامیابی ملی۔ ملت کا اتحاد منحصر ہے" دانشوروں" علماء" اور زعماء کے اتحاد پر۔ ملت کے اتحاد کی پائیداری اور اس کو استحکام کے لیے آپ نے بڑے مفید مشورے دیئے اور کہا کہ پہلی بات یہ ہے کہ اتحاد کے لیے ذاتی مفاد کو قربان کرنا ہوگا اور تمام صلاحیتوں کو ملت اسلامیہ کے تحفظ اور اس کی بقاء کے لیے صرف کرنا ہوگا۔ دوسری یہ کہ اس اتحاد کو ایک بڑے مقصد سے وابستہ کرنا ہوگا۔ ہمارا مقصد بہت بڑا ہے کہ انصاف قائم کرنا نیکی کو پھیلانا' برائی کو مٹانا' اس بڑے مقصد کو اتحاد کا مقصد قرار دینا ہوگا۔ اتحاد صرف خطرہ کے مقابلہ کے لیے نہیں بلکہ ہر حالت میں اتحاد ضروری ہے۔ اگر صرف خطرہ کے مقابلہ کے لئے اتحاد ہوگا تو یہ اتحاد پائیدار نہیں ہوگا۔ کام کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اللہ کی ساری مخلوق کی فکر ہو۔ انصاف کا خون نہ ہو' انسان شرف انسانیت سے محروم نہ ہو' ہم اس ملک میں دوسری قوموں کے ساتھ ہزاروں برس سے رہتے چلے آرہے ہیں لیکن آج جو حالات پیدا ہو گئے ہیں یہ مضمون ہیں ان کے اسباب کا پتہ چلایا جائے گا اور ان کا تدارک کیا جائے۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے قیام کے لیے ایک منصوبہ بنا کر کام کرنا چاہیئے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہماری آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے ان کو دیکھئے تو بڑی مایوسی ہوگی خود وہ مایوسی کا شکار ہیں اس لئے کام صرف شہر میں نہیں بلکہ دیہات میں بھی کیجئے دیہاتوں کا دورہ کیجئے۔ آپ کے وہاں جانے سے دیہاتوں

حوصلہ پیدا ہو گا۔ زندگی ملے گی اور زندگی میں بھی آگے بڑھنے کا حوصلہ ملے گا چوتھے یہ کہ کام کی اہمیت ساری باتوں کو لے کر ایک ساتھ چلایا جائے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ عوام مایوس کبھی نہ ہوں۔ اگر نیتوں میں خلوص ہے تو ان ہی عوام سے پو پھوٹے گی ان میں سے کارکن ملیں گے دن کو اور رات کو کام کرنے والے کارکن ملیں گے۔ ان میں سے اچھے افراد کا انتخاب کیجئے الٰہی افراد کا انتخاب کیجئے جو ذاتی مفاد کو ترجیح نہ دیں، جن میں خود غرضی نہ ہو اور جو مخلص ہوں اور یہ کہ آپ کبھی اپنے داعیان کردار کو نہ بھولیں یاد رکھیں کہ آپ کسی کے پیچھے چلنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے پیچھے دوسروں کو چلانے کے لیے آئے ہیں۔

مولانا کلب صادق صاحب ایک سنجیدہ مقصد کے لیے سنجیدگی سے غور کر کے اللہ کے فضل و کرم سے ہم نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی ہے اور ملی کونسل کا قیام عمل میں لایا ہے ملی کونسل کی بنیاد ہے وحدت پر۔ اور وحدت سے قوت پیدا ہو گی، اس قوت کو صحیح قیادت کے ذریعہ تعمیری راہ میں صرف کیا جائے۔ یہی دو چیزیں ہوتی ہیں۔ جن سے قوموں کا مقدر بنتا ہے اور بگڑتا ہے قوت کا حاصل ہونا اور پھر قوت کا صحیح سمت میں صرف کیا جانا.... میں بلا کسی ادنیٰ خوف تردید کے یہ بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جہاں تک فرقہ کا تعلق ہے جس کا نمائندہ مجھے آپ سمجھتے ہیں حالانکہ میں اس فرقہ کا نمائندہ نہیں ہوں اسلام کا نمائندہ ہوں پھر بھی اپنا نقطۂ نظر واضح کرتا ہوں اسلام ہمارے لئے اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے اتحاد اسلامی یا شوکت اسلام ادنیٰ طریقہ پر بھی مجروح ہو سکے، یہ ہماری فقہی مجبوری ہے.... سارے مراجع تقلید کا اس مسئلہ پر متفقہ فتویٰ ہے کہ ہمارے فرقے سے وابستہ کسی فرد کو کسی بھی عالم میں کسی ایسی بات کے کرنے کی اجازت نہیں ہے جس سے اکثریت کے جذبات مجروح ہوں.... اس وحدت سے جو قوت پیدا ہو گی اس قوت کے استعمال کے لیے جو قیادت بنی ہے مجھے اس پر سو فیصد اعتبار اور اعتماد ہے۔ ہم نے یہ قیادت آپکی آزمائی ہوئی ہے.... صحیح قیادت وہ ہوتی ہے جو نہ مال کے سامنے بکے اور نہ جیل میں پھنسے قیادت نے آپکو دکھا دیا ہے کہ نہ وہ بکنے والی ہے اور نہ جھکنے والی

اللہ پر ہے، رسول اللہ پر ہے، قرآن پر ہے اور سنت نبویؐ پر ہے

مولانا سلیمان سکندر، کارگزار صدر کل ہند مجلس تعمیر ملت (حیدرآباد) ملت کے تمام مسائل کو لے کر آگے بڑھنا ضروری ہے ... ضرورت ہے کہ مسلمانوں میں اللہ پر اور اپنی صلاحیتوں پر یقین اور اعتماد پیدا کیا جائے، ماضی کے چند واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور یہ اشارہ دیتے ہوئے کہ ایسے مرحلوں پر اجتماعی قیادت انشاء اللہ جرات و عزیمت کا مظاہرہ کرے گی انہوں نے کہا کہ ہم نے بہت پست و بلند دیکھے ہیں زمانے کے بڑے نشیب و فراز ہمارے نظروں کے سامنے سے گزرے ہیں سابق کے تجربات سے سبق سیکھنا ضروری ہے۔

جناب احمدی ذکریا، نائب صدر نشین جج کمیٹی، مسلمانوں کی آل انڈیا کونسل تشکیل دی جائے جو غیر سیاسی ہو اور کسی جذبات میں بہہ کر نہیں بلکہ جذبات سے بلند ہو کر ملت کی رہنمائی کی جائے۔ کونسل کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے تو اس کا مستقر بمبئی ہونا چاہیئے کیونکہ بمبئی ہندوستان کا کاروباری دارالسلطنت ہے

مولانا مختار احمد ندوی، صدر کل ہند جمعیت اہل حدیث (بمبئی) جب تک ہم ایک آواز نہ ہوں گے اور پوری طاقت ایک متحدہ پلیٹ فارم پر مرکوز نہیں کریں گے ہماری کوئی بات سنی نہیں جائے گی اتحاد ملت کے اسباب پر ہم حقیقت پسندی سے غور کریں گے اور ان چند دروازوں پر نظر ڈالیں جنہوں نے ہمیں متفرق کر رکھا ہے ... اسلام کی بنیادی حقیقتیں ہی اتحاد کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہیں ... سب مسلمانوں کا ایمان اللہ کی توحید پر ہے، آخری نبی رسول اکرمؐ پر ہے ہدایت قرآن کریم ہے، کعبۃ اللہ سارے مسلمانوں کا قبلہ ہے یہی ملت کے اتحاد کے لیے متحدہ بنیادیں ہیں ان سے ہٹ کر تنظیم کی جائے تو اتحاد مشکل ہے ... مسلمان یہ بھی یاد رکھیں کہ ہندوستان میں جو کچھ ہوگا اس کے لئے بھی اللہ کے سامنے ہم جوابدہ ہیں۔

مولانا مجیب اللہ ندوی

نو تشکیل شدہ ملی کونسل

(یہ مقالہ اتحاد ملی کانفرنس منعقدہ ۲۳، ۲۴ مئی ۹۲ء بمقام بمبئی میں پڑھا گیا)

محترم حاضرین کرام اس وقت آپ جس مجلس میں موجود ہیں اس کا انعقاد کسی وقتی جذباتی احساس کے تحت نہیں ہو رہا ہے بلکہ اس کی صورت گری کی کوشش دو برس سے جاری تھی بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ دو برس پہلے جون ۹۰ء کی ابتدائی تاریخوں میں دو ایک نشستوں کو مجوزہ کر کے ہم جیسے دوسرے تیسرے درجے کے کچھ افراد ہندوستان کے موجودہ حالات کی روشنی میں ملت کے مسائل پر غور کرنے کے لیے دلوں میں یہ خوف لیے ہوئے [illegible] جمع ہوئے [illegible] کچھ لوگ اس کو محاذ پرستی کی کوئی نئی شکل [illegible] بن جائے اسی وقت کچھ مقاصد اور پروگرام بھی طے ہو گئے تھے پھر اس کے بعد دوبارہ [illegible] نشستیں دہلی میں ہوئیں، ہم دو برس تک اس کے لیے غور کرتے اور ملک کے باصلاحیت افراد سے گفتگو کرتے رہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہیں کہ آج اس نے اپنی بے پایاں رحمتوں سے آپ جیسے بالغ النظر اور باخبر حضرات کی موجودگی میں اس کی عملی صورت گری اور عظیم الشان مقاصد کی تکمیل اور اس کی روشنی میں کوئی عملی پروگرام طے کرنے کا موقع عطا فرمایا۔

بزرگان ملت اور عزیزان گرامی! ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال کی تاریخ کو

عام طور پر ۱۸۵۷ء کی کچھ علاقوں میں انگریزوں کے خلاف بغاوت سے جوڑا جاتا ہے مگر حقیقتاً مشرقی حصہ میں مسلمانوں کا اصل زوال ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ مرحوم کی شکست و شہادت اس کے بعد دکن میں ٹیپو سلطان کی شکست و شہادت سے شروع ہوا تھا جس کی آخری علامت ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت کی سیاسی حیثیت کا رہا سہا خاتمہ تھا ان دونوں حادثوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کا نہ صرف فوجی دبدبہ ختم کر دیا بلکہ ان کا رہا سہا وقار بھی جاتا رہا سراج الدولہ کی شہادت پر ان کے وفادار قدیم ناچیز راجہ رام نرائن موزوں نے درد میں ڈوبا ہوا جو شعر کہا تھا وہ صرف شاعری نہیں تھی بلکہ اشارتی زبان میں انہوں نے ملت اسلامیہ کے تاریک مستقبل کی طرف توجہ مبذول کرادی تھی۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانہ پہ کیا گذری

دو صدی بعد ہندوستان میں ۱۹۴۷ء۔ ۱۹۴۵ء کے درمیان ایک جمہوری سیاسی انقلاب آیا جس انقلاب سے توقع تھی کہ شخصی اور غیر ملکی حکومتوں کے ظلم و جور سے نجات مل جائے گی جیسا کہ جنگ آزادی میں یہ بات بڑے زور و شور سے کہی جاتی رہی کہ غیر ملکی حکمرانوں نے ہماری سیاسی، معاشی، مذہبی اور تہذیبی حیثیتوں کو مجروح اور پامال کیا ہے۔ آزادی کے بعد ہم اس سے نجات پا جائیں گے مگر ۴۷ء کے بعد ہندوستان کے دوسرے طبقات کے تو آزادی یقیناً ایک نعمت ثابت ہوئی مگر مسلمانوں کے لیے یہ آزادی ایک نئی غلامی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی یعنی انگریزوں کے زمانے میں جس قدر ہم اپنے دین اپنی تہذیب اور اپنی زبان میں آزاد تھے آہستہ آہستہ وہ بھی ہم سے چھینی جانے لگی ہم سے ہمارا پرسنل لا چھینا گیا ہم سے ہماری زبان چھینی گئی تعلیم کے ذریعے ہماری دینی و تہذیبی قدروں کو پامال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ہمارے ہندوستان کا دستور سیکولر ڈیموکریٹک، سوشلسٹ ہے لیکن

منایا گیا اور کچھ دنوں تک زبانی طور پر سیاسی پارٹیاں اس کا اظہار بھی کرتی رہیں اور غیر سیکولر طاقتیں برملا ان کے سامنے زبان کھولنے سے کسی حد تک شرماتی بھی رہیں مگر ۱۹۸۵ء کے بعد سے ہندوستان کی سیاسی صورت حال بدل گئی ہے اب سیکولر طاقتیں، آہستہ آہستہ غیر سیکولر طاقتوں کے سامنے سپر انداز ہوتی جارہی ہیں اور اس وقت تو صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ غیر سیکولر طاقتیں اپنے عروج پر پہنچ رہی ہیں، جنہیں نہ تو دستور کا پاس و لحاظ ہے اور نہ عدلیہ کی پرواہ ہے اب صرف فرقہ وارانہ فساد کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ملک کے دستور اور آپکے پورے دینی و تہذیبی وجود کے تحفظ اور عدم تحفظ کا مسئلہ ہے آج انہیں حالات پر غور کرنے کے لئے آپ کو زحمت دی گئی ہے مگر اب نہ تو ہمیں ویرانہ پہ کیا گذری کا ماتم کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی مجنوں کی تلاش میں سرگرداں ہونے اور صحرانوردی کرنے کی ضرورت ہے بلکہ ایک نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ اس ویرانہ کو آباد کرنے کیلئے آگے بڑھنا ہے۔

جب ہم ہندوستان میں اپنے زوال اور بے وزنی کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کے تین بڑے اسباب نظر آتے ہیں ایک ہمارا اخلاقی انحطاط دوسرے آپسی اختلافات اور حد سے بڑھی ہوئی مفاد پرستی اور بدگمانی تیسرے بغیر کسی بڑی منصوبہ بندی کے ہماری کوششیں اگر ہم اس ملک میں اپنی دینی و تہذیبی خصوصیات سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ہم کو ان تینوں چیزوں سے اپنا دامن بچانا ہوگا۔

سب سے پہلے تو ہم کو اخلاقی اعتبار سے اپنے کو دوسرے برادران وطن کے مقابلہ کچھ بہتر ثابت کرنا ہوگا ایسا کرنا ہمارے دین کا تقاضہ بھی ہے اور حالات کی ضرورت بھی اس وقت مسلمانی معاشرہ جتنی تیزی کے ساتھ اخلاقی زوال کی طرف جارہا ہے اس کا مشاہدہ آپ ہر محلہ ہر بستی اور ہر گاؤں میں کر سکتے ہیں ہر طرف دنیا پرستی بدگمانی اور خود غرضی کا دور دورہ نظر آئے گا اور ہم دنیا کی محبت میں اتنا آگے چلے گئے ہیں کہ حلال و حرام کی ساری قیدیں

ہم نے اٹھا دی ہیں جب تک ہمارے دلوں سے دنیا پرستی اور حد سے بڑھی ہوئی دنیا طلبی نہ نکلے گی اس وقت تک کسی چھوٹے سے چھوٹے اجتماعی اور ملی حق کو بھی ہم حاصل نہ کر سکیں گے۔

دوسرے مسلکی جماعتی اور علاقائی اختلافات نے ہم کو زیادہ نقصان پہونچایا ہے۔

آپ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ ہمارے درمیان جو مذہبی، مسلکی، علاقائی اور یا جماعتی اور ذات برادری کے اختلافات ہیں۔ ان سب کے پیچھے ایک تاریخ ہے اب ہم اس تاریخ کو بالکلیہ بدل نہیں سکتے اور اگر ہم بدلنے کی کوشش کریں گے تو ہم ایک لاحاصل اور منفی کام میں اپنی قوت برباد کریں گے اس لیے ضرورت ہے کہ اسے اپنے مشترکہ مسائل کی کوششوں میں نہ صرف خارج نہ ہونے دیا جائے بلکہ ان کو وسعت قلب کے ساتھ برداشت کیا جائے دنیا ہم سب کو ان اختلافات کی نظر سے نہیں دیکھتی بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے دیکھتی ہے اس لیے ہمارا وزن اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم دوسروں کے سامنے ہوں تو اپنی یہی تصویر پیش کریں اس لیے اس وقت ہم کو تکفیر، تفسیق اور تضلیل کے جارحانہ انداز اور انداز تحریر کو ترک کر دینا چاہیئے اور مثبت اور تعمیری مسائل کو زیادہ سے زیادہ ابھارنے کی کوشش کرنا چاہیئے

اس سے پہلے ہم کئی مواقع پر اس کا مظاہرہ کر کے اس سے ملت کو فائدہ پہونچا چکے ہیں اس کی تفصیل کی اس وقت ضرورت نہیں ہے۔

آج سے چند سال پہلے عیسائیوں کے اتحاد کے لیے پوپ ششم نے ویٹکن سٹی اٹلی میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقوں کے پادریوں کی ایک میٹنگ بلائی تھی جس میں تقریر کرتے ہوئے پوپ پال نے کہا کہ اگر عیسائی اتحاد کے لیے ہمیں پوپ پال کے عہدے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا پڑے تو ہم اس کے لیے تیار ہے آج ہم یہاں آپ سب کی طرف سے یہی آواز چاہتے ہیں اور یہی آواز ہم کو ہندوستان کے ایک ایک مسلمان تک پہونچانی ہے۔

تیسری چیز منصوبہ بندی ہے جہاں تک منصوبہ بندی کا تعلق ہے عام طور پر

وہ ہمارے کاموں میں مفقود نظر آتی ہے۔ سر فضل حسین مرحوم جو انگریزوں کے زمانہ میں مرکزی حکومت ایگزیکیٹیو کے ممبر تھے انہوں نے ایک بار کہا تھا کہ برادران وطن جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اس کی پلاننگ دس بیس برس پہلے سے کرتے ہیں مگر مسلمان قوم فوراً سوچتی اور فوراً کرتی ہے اگر واقعی ہم کو اپنے کاموں کو باوقار بنانا ہے تو اس کے لیے پلاننگ اور منصوبہ بندی کرنی ہوگی۔ اور ہمیں فوراً سوچنے اور فوراً کرنے والی عادت کو بدلنا ہوگا۔

اس کانفرنس کا بنیادی مقصد انہیں تینوں کمیوں کو دور کرکے ملّت کے لئے کوئی لائحہ عمل دینا ہے آج کا مسلمان اس بکھری ہوئی تیلیوں کے مانند ہے جس کو کمزور سے کمزور آدمی بھی توڑ سکتا ہے یہ کانفرنس ان بکھری ہوئی تیلیوں کا ایک ایسا گٹھا بنا دینا چاہتی ہے جسے طاقتور سے طاقتور آدمی بھی نہ توڑ سکے۔

بزرگان ملّت اور عزیزانِ گرامی! آخر میں دو تین باتیں اور عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں پہلی بات تو یہ ہے کہ عہد نبویؐ اور عہد صحابہؓ کے علاوہ اسلامی تاریخ میں کوئی ایسا دور مجموعی حیثیت سے ایسا نہیں رہا ہے۔ جس میں معاشرہ کے افراد کی اکثریت پورے اسلام کا نمونہ رہی ہو اس پر سعادت دور میں ایک ہی وقت میں ایک شخص دن میں مجاہد بھی ہوتا تھا اور داعی اور معلم بھی اور رات میں رہبان فی اللیل ہوا کرتا تھا جو دن بھر کی اپنی سعی و جہد کو رات کی تنہائیوں میں بارگاہ رب العزت میں پیش کر کے مقبولیت کے لیے اپنے دونوں خالی ہاتھوں کو اٹھا دیتا تھا بعد کے زمانے میں وہ جامعیت باقی نہیں رہی زندگی کے مختلف شعبوں کو مختلف افراد نے سنبھال لیا کچھ لوگوں نے دعوت و جہاد کو اپنا شعار بنا لیا اور کچھ لوگ درس و تدریس میں لگ گئے کچھ لوگوں نے تزکیۂ نفس کی نازک ذمہ داریاں سنبھال لیں اور کچھ لوگ اسلام پر ہونے والے اعتراضات کی مدافعت میں لگ گئے وہ صورت آج تک باقی ہے تو میرے محترم بزرگو عرض یہ کرنا ہے کہ یہ سب دین کا کام ہے جو لوگ ان میں سے جس شعبے میں

بھی لگے ہوئے ہیں وہ سب دین کا کام کر رہے ہیں ان میں سے کسی کو وہ یا افراد کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ہم مکمّل اسلام کا کام سنبھالے ہوئے ہیں اور مکمّل اسلام کا نمونہ ہیں بلکہ ان تمام مختلف کاموں کے مجموعہ کا تابم مکمّل اسلام ہے اس لئے کسی شعبہ کا آدمی کسی دوسرے شعبے میں کام کرنے والے آدمی کو حقیر نہ سمجھے اور نہ اس کے کام کو کمتر سمجھے بلکہ فرورت اس بات کی ہے کہ سب کے درمیان ربط ہو، ہم ایک دوسرے کے لیے دعاگو ہوں اور توافق و توجیہ کی صورتیں ڈھونڈنے کا ذہن بنانے کی کوشش کریں۔ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے کہا کہ فلاں فلاں علّا دعوت تبلیغ میں لگنے کے بجائے سیاست میں پڑے ہوتے ہیں انھوں نے فرمایا اے بھائی وہ انگریزوں کے مقابلہ میں آزادی کی لڑائی لڑ رہے ہیں اس لیے انگریزوں کی ساری توجہ ان کی طرف ہے اور ہم لوگوں کو یہ موقع مل گیا ہے کہ دعوت کا کام آسانی سے کر رہے ہیں اگر وہ سامنے نہ ہوتے تو ممکن ہے کہ ہمارے کاموں میں بھی رکاوٹ پیدا ہوتی اس وقت ہر ایک کو یہی ذہن بنانے کی ضرورت ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم کو آپس میں ایک دوسرے سے حسن ظن سے کام لینا چاہیئے، بدگمانی اور نکتہ چینی اور بے اعتمادی کی فضا سے ہم اپنے دل و دماغ جس قدر دور رکھیں گے۔ اتنے ہی یہ چیز معاشرہ کے لیے نیک فال ہو گی۔ اور کام کرنے والوں کا حوصلہ بڑھے گا۔ گاندھی جی نے آزادی سے پہلے اپنی بیوی کستور با کے انتقال کے بعد کستور با فنڈ قائم کیا جس میں ۳ کروڑ روپے جمع ہوئے اس روپے سے شاید ایک ہسپتال دلی میں کستور با کے نام سے قائم کیا اور بقیہ رقم سے کئی ملیں قائم ہوئیں جس سے زیادہ تر ان کے خاندان ہی کے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں مگر ہندو قوم نے ایک دن بھی اس کے بارے میں کسی بدگمانی کا اظہار نہیں کیا مگر ہماری قوم کچھ دیئے بغیر اپنے رہنماؤں کے ساتھ بدگمانیوں اور نکتہ چینیوں کے نہ جانے کتنے پہاڑ کھڑا کرتی ہے جب تک ماننے کا ذہن نہیں بنے گا اس وقت تک ہمارے

سی کام میں کوئی طاقت پیدا نہ ہوگی۔

تیسری بات یہ ہے کہ آزادی کے بعد کئی مشترکہ فورم بنائے گئے مگر بعض اسباب
کی بنا پر وہ آہستہ آہستہ جمود کا شکار ہو گئے پھر اس وقت حالات پہلے کے مقابلے اور
زیادہ سنگین اور کام کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا ہے اس لیے ایک نئے فورم کی ضرورت محسوس
ہو رہی ہے اس لیے ہم سب کو آج اس بات کا عہد کریں کہ نو تشکیل شدہ ملی کونسل کو کسی سیاسی
استحصال کا شکار نہ ہونے دیں گے اور نہ ملی مفاد کے مقابلہ میں شخصی یا جماعتی مفاد پرستی
کا آلہ کار بننے دیں گے بلکہ اسے ایک اجتماعی قیادت کا پیش خیمہ بنائیں گے۔

بزرگو اور دوستو جو حضرات اس وقت یہاں موجود ہیں میں سمجھتا ہوں کہ آپ میں
سے ہر ایک کو اس بات سے خوشی محسوس ہو رہی ہو گی کہ حالات کی ناسازگاری اور ملت کی
زبوں حالی کو دیکھ دیکھ کر آپ کے دلوں میں برسوں سے جو کڑھن ہوتی رہی ہے اور مایوسی
جو فضا عام طور پر قلب و دماغ پر چھائی ہوئی تھی آج آپ اپنے دل و دماغ کی کڑھن میں
کمی محسوس کر رہے ہوں گے اور مایوسی کی فضا میں اُمید کی ایک کرن ضرور دکھائی دے رہی
ہو گی میں آپ کی صف کا ایک معمولی آدمی ہوں مگر اس موقع پر اپنی دلی کیفیت کا اظہار کر دینے
میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا بحمد اللہ یہ احقر دس برس سے مسلسل الرشاد کے اداریوں میں اتحاد ملت
کی طرف آواز لگاتا رہا ہے بلکہ خدا بہتر جانتا ہے کہ اس کے لیے نہ جانے کتنی بار اپنے دونوں
ہاتھوں کو بارگاہ رب العزت میں اُٹھاتا رہا ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طائف
میں بیچارگی کی دعا اللھم الیک اشکو ضعف قوتی وقلۃ حیلتی وھوانی علی اللہ
چشم نم کے ساتھ دعائیں مانگتا رہتا ہے اس لیے آج آپ حضرات کو یہاں جمع دیکھ کر
دماغ جذبات تشکر و خوشی و مسرت سے سرشار ہی نہیں ہے بلکہ دل و دماغ کا بوجھ
ہلکا ہو رہا ہے اور ووضعنا عنک وزرک الذی انقض ظھرک کی کیفیت

محسوس ہو رہی ہے مگر یہ مسرت یہ خیال کر کے تھوڑی سی غم انگیز بھی بنی ہوئی ہے کہ کہیں ہم اس کی ذمہ داریوں کو پورا نہ کر سکیں اور خدا کے حضور میں مجرموں کے کٹہرے میں نہ کھڑے کر دیئے جائیں اور ساتھ ہی ملت کی تاریخ میں ہم ایک نئے سیاہ باب کا اضافہ کا سبب نہ بن جائیں اس لیے ہم کو اپنی ظاہری کوششوں اور تدبیروں کے ساتھ اپنے اعمال کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی نصرت کا مستحق بنانے کی کوشش بھی کرتے رہنا چاہیئے بغیر اس کی نصرت کے ہم دین و ملت کا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی نہیں کر سکتے آپ کے لئے افغانستان کے نئے انقلاب میں بہت سے سامان عبرت ہیں۔

ایک آخری بات اور کہکر میں اس سمع خراشی کے لیئے معذرت چاہوں گا وہ یہ کہ اتحاد ملت کا کام کہنے میں تو بہت ہی دلکش اور خوش کن لگتا ہے مگر عملاً جب ہم اس کام کو شروع کریں گے تو قدم قدم پر ناکامی اور مایوسی سے بھی سابقہ پڑے گا اور بہت سی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں سے بھی دوچار ہونا پڑے گا اس لئے ہم کو بہت زیادہ اس خوش گمانی اور خوش فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیئے کہ اس کانفرنس کے بعد ہر طرف سے آمنا و صدقنا اور اہلاً و سہلاً کی آواز بلند ہونے لگے گی۔ بلکہ ہم کو یہ کہ آگے قدم بڑھانا ہے کہ ۔

ہے دشت اب بھی دشت مگر خون سے فیض
سیراب چند خار مغیلاں ہوئے تو ہیں

ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ملت کے افراد کی بہت بڑی اکثریت اس چالیس برس کے اندر اجتماعی احساس اور ملی شعور سے بہت دور چلی گئی ہے حالات کی مسلسل ناسازگاری نے انکی ہمت و جرأت کو بڑی حد تک پامال کر دیا ہے ہر شخص راحت و آرام کی زندگی کو اپنا شعار بناتا جا رہا ہے خاص طور پر علماء جو اس -

ہر ملی محاذ پر پیش پیش رہتے تھے اور اس ملک میں انہوں نے اپنی قربانیوں کی بڑی شاندار
تاریخ چھوڑی ہے وہ مصلحت پرست اور عافیت پسند ہوتے جا رہے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ
حضرات جن کو دو چار یا پانچ ہزار کی جگہ مل گئی ہے وہ اسے زندگی کی آخری معراج
سمجھے ہوئے ہیں اور علما اور خواص کو دیکھ کر عوام بھی دنیا پرستی کی طرف بگٹٹ بھاگے
جا رہے ہیں ایسی صورت میں نئے سرے سے اجتماعی شعور اور ملی احساس بیدار کرنا آسان
کام نہیں ہے اس راستہ کی دشواریوں کو آپ پہلے دن سمجھ لیجئے اور ہم اپنے اندر اس
کام کے لیے اپنے موجودہ مشاغل کو کچھ نہ کچھ چھوڑنے اور اپنی عزت وجاہت کو قربان
کرنے کا جذبہ رکھتے ہوں تو پھر قدم آگے بڑھائیں۔ ہم اس کام کو اپنے مشاغل میں ایک
ضمنی کام نہ سمجھیں بلکہ کچھ دنوں یہ کام آپ کا پورا وقت چاہے گا اگر ہم اس کو کانفرنسوں
اور جلسوں تک محدود رکھیں گے تو اس کے نتائج خاطر خواہ برآمد نہ ہوں گے ہم کو مرکز سے
لے کر گاؤں اور محلے کی سطح تک ایک اجتماعی قیادت کا احساس پیدا کرنا ہے اور
یہ کام دو چار دن کا نہیں بلکہ برسوں اس کے لئے جانکاہی کرنی ہوگی۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ اللھم
اعوذبک من شر نفسی وشر الشیطان وشرکہ۔

(اسلامی ہند ۱)

ہند کا اعتماد و حمایت حاصل ہو۔

اس اجتماعی پلیٹ فارم کو ملت اسلامیہ کے ان باصلاحیت افراد پر مشتمل ہونا
چاہیئے جو مختلف شعبہ جات اور سرگرمیوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

اس اجتماعی ہیئت کی تشکیل اس طرح کی جانی چاہیے کہ اس میں طرز فکر، مسالک
جماعتوں اور دیگر وابستگیوں کا لحاظ کئے بغیر ملت کے سبھی عناصر شامل ہوں۔

ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ مذکورہ بالا امر پر ہماری مدد فرمائے، آمین۔

ڈاکٹر محمد افضل اقبال
ریڈر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونی ورسٹی

حضرت غلام احمد کلیمیؒ اور ان کی علمی و ادبی خدمات

مشہور مفسر و محدث دکن حضرت شاہ غلام احمد کلیمی حیدرآباد کے ایک ممتاز مذہبی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے والد حضرت شاہ غلام غوث کلیم پوش قادری چشتی رحہ و اعلیٰ سرکار عالی حضرت سردار بیگ صاحب بلخی رحہ کے خلیفہ تھے اور دادا حضرت شاہ محمد مراد صدیقی دکن کے مشہور صوفی بزرگ حضرت شاہ سعد اللہ نقشبندی کے خلیفہ تھے۔

حضرت کلیمی نے مذہبی ماحول میں آنکھیں کھولیں، انہیں ابتدا ہی سے علوم دینیہ کا شغف تھا۔ شمالی ہند کی مختلف درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل، منشی فاضل اور مولوی فاضل کی اسناد حاصل کی تھیں۔ جامعہ دیوبند کے مدرسین سے حدیث و تفسیر کی تکمیل کی تھی۔ اور علوم باطنی کی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی تھی۔

حضرت کلیمی جید عالم دین تھے ان کی ساری زندگی اسلامی تعلیمات کی نشر و اشاعت میں بسر ہوئی۔ آپ کے بڑے صاحبزادے و جانشین حضرت شاہ احمد خسرو الخبیر توسیع حرم نبوی مدینہ منورہ بیان کرتے ہیں کہ جب سے انہوں نے ہوش سنبھالا ہے اپنے والد محترم کو مسلمانوں کی اصلاح اور بندگان خدا کو فیض یاب کرنے کی جستجو کرتے دیکھا۔

حضرت کلیمیؒ کی پوری زندگی ایک مشن تھی حیدرآباد میں تفسیر قرآن مجید کا ذوق انہوں نے

عام کیا۔ ماہ رمضان میں سماعت قرآن کے جلسے منعقد کرنے کی ابتدا بھی ان ہی سے ہوئی شائقین تصوف کے لئے انہوں نے برسوں مثنوی مولانا روم کی شرح بیان کی اور برسوں حدیث و فقہ حنفی کے درس بھی دیتے رہے سقوط حیدرآباد سے قبل شاہی سرپرستی میں مجلس شبان المسلمین نے آپ کو جب کہ آپ صرف ۲۵ سال کے تھے شمس اسلام کا لقب دیا تھا۔ ہزار سالہ جشن حضرت امام بخاری و امام بوصیری (صاحب قصیدہ بردہ) کے موقع پر قرآن و حدیث کی ترویج کے اعتراف میں آپ کو خلعت اور تمغہ پیش کیا گیا تھا۔ حضرت کلیمی نے نظم و نثر کی متعدد کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں جو ان کے فضل و کمال کی شاہد ہیں۔

نثری تصانیف : حضرت کلیمی کی حسب ذیل نثری کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

کنز معانی : یہ حضرت کلیمی کی مشہور تفسیر ہے اس میں تعوذ تسمیہ اور سورہ فاتحہ کی تفسیر بیان کی گئی ہے اس کے اب تک دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

۲ : **مقاصد بیعت :** اس پر آشوب دور میں دہریت مادیت اور بے دینی کا غلبہ ہے ظاہر پرست مانعین طریقت کے اعتراضات کے جوابات اور طریقت کی افادیت کے متعلق حضرت کلیمی نے کتاب مقاصد بیعت ۱۳۸۶ھ میں تصنیف کی تھی۔ ۱۴۱۱ھ میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ جدید ایڈیشن میں مضامین کے اضافہ کے ساتھ ساتھ ہر مسئلہ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔

۳ : احکام الاسلام و فتوح فاتحہ

اس کتاب میں اسلام کے احکام دین کے اجزائے ترکیبی بدعت حسنہ اور فاتحہ [illegible] کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی اس کے اب تک تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اس کتاب کے نسخے پاکستان عرب ممالک اور امریکہ تک منگوائے گئے

۴ : الصوم والزکوٰۃ :- اس کتاب میں روزہ دار اور زکواۃ کا تذکرہ ہے۔ یہ کتاب پہلی بار ۱۳۸۰ھ میں اور دوسری بار ۱۴۰۸ھ میں شائع ہوئی۔

۵ : تعبیر الرؤیا :- اس کتاب میں خواب کی حقیقت اور ان کی تعبیریں بیان کی گئی ہیں ۱۴۰۹ھ میں یہ کتاب شائع ہوئی اور مقبول ہوئی۔

۶ : کلمہ طیبہ :- اس کتاب میں کلمہ طیبہ کے معانی اور معارف بیان کئے گئے ہیں۔

شعری تصانیف :- حضرت کلیمی کی متعدد شعری تصانیف بھی شائع ہو چکی ہیں ان میں تین اردو دیوان تجلیات (۱۳۸۳ھ) انوارت ۔ ۱۴۰۲ھ اور لمعات ۱۳۸۹ھ کے علاوہ ظہور نور اسلام و نعت کا مجموعہ ۔ مصباح الحرم (مدحت نبی کریم صلعم کا مجموعہ) اور نور النور (نعتیہ کلام) قابل ذکر ہیں۔

شاعری :- حضرت کلیمی کو بچپن ہی سے شاعری سے لگاؤ تھا وہ شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے ۔ حضرت کلیمی جب ساتویں جماعت میں تھے تو والد محترم کی حسب ایما شعر گوئی کا آغاز کیا پھر عربی و فارسی تعلیم نے ان کے ذوق شعری کو اور نکھارا اور وہ بڑے قادر البیان شاعر تھے دقیق مضامین کو بڑی بے تکلفی اور بڑی عمدگی سے یہ شعر کا جامہ پہنا دیتے تھے ۔ دشوار زمینوں میں بھی بڑی سادگی اور بے ساختگی برقرار رکھی۔ حضرت کلیمی نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ غزل گو شاعر ہیں ان کے کلام میں حسن بھی ہے اور مضمون و معنی کی پاکیزگی و بلندی بھی۔ انہوں نے اسرار عشق کو شاعری کا قالب عطا کیا ان کا نعتیہ کلام محبان رسول صلعم کی زبانوں پر ہے اور ان کا عارفانہ کلام سماع کی محفلوں میں بڑا مقبول ہے۔ ایک مرتبہ مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے محفل سماع میں حضرت کلیمی کے اشعار سماعت فرما کر ان الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا۔

" آج حضرت مرزا سردار بیگ صاحب چشتی نظامی رحمہ کے ایک خلیفہ صاحب کے عرس میں گیا تھا۔ ان کے فرزند اور سجادہ نشین گلیمی صاحب صدر مجلس تھے قوالی پرکیف تھی۔ گلیمی صاحب کا کلام قوالوں نے گایا۔ بہت لوگوں حال آیا۔ گلیمی صاحب نوجوان ہیں مگر اپنے والد کے کمالات ظاہرو باطن کا مجموعہ ہیں۔ اپنے والد کے ساتھ ایک دفعہ مہاراجہ بہادر کے پھول خ۔ں مجھ سے مل چکے ہیں۔ ان کا اثر مجلس پر بھی تھا اور اس زمین پر بھی تھا جہاں ہم سب بیٹھے ہوئے تھے جس سے ظاہر ہوا کہ صاحب مزار کی روح اپنے فرزند کے ساتھ تھی اور ہم سب پر بھی متوجہ تھی " (منادی مورخہ ۱۴/۲۴ اپریل ۹۴ء ۱۹)

حضرت گلیمی شاعری پر مذہب کی گہری چھاپ ہے انکی شاعری اہل دل اہل حال کی شاعری ہے۔ مولانا حالی کی زبان میں سچے عاشق کی شاعری ہے اور نہ ہی ذہنی تفتیش ہے اردو کی روایتی صوفیانہ شاعری سے اس دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ تصوف اور معرفت کی نورانی فضا میں انہوں نے نشوونما پائی اسی کا اثر ان کی شاعری پر ہے حضرت خواجہ حسن ثانی نظامی رقمطراز ہیں'' شاہ صاحب (حضرت گلیمی) کا کلام صرف شاعری ہی نہیں ہے تعلیم اور تلقین اور باطنی کیفیات کا بھی آئینہ دار ہے۔ تزکیہ اور تہذیب کا جو کام ان کی تقریریں کرتی ہیں انشاء اللہ ان کے اشعار بھی یہ کام کریں گے اور اس کا اثر تقریروں سے زیادہ ہوگا۔

آخر میں حضرت گلیمی کی غزلوں اور ان کی نعتوں کے چند شعر پیش ہیں جن سے ان کے رنگ سخن کا اندازہ ہوگا۔ چند نعتیہ اشعار۔

لفظ لاالیب پہ گلیمی نہیں آیا ہرگز — میرے سرکار کے جیسا بھی سخی ہوتا ہے
تھے وصف نبی کے تو کافر بھی قائل — نبی تھے مکرم نبوت سے پہلے
دیکھتا کشتہ احمد کی حیات جاوید — پھر نہ دعوائے مسیحائی مسیحا کرتا

دل میں وہ رہا کرتے ہیں میرا آئے گلیمی ہاں آنکھ نہیں لائق دیدار محمدؐ
یہ مہک اٹھا دو عالم کہ ہے عطر کا خزینہ لیا قدسیوں نے بڑھ کر شہِ دیں کا پسینہ

اب ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

سماتا ہے کسی کا یوں تصور میری آنکھوں میں گلیمی جس طرح مینا سے مئے ساغر میں ڈھلتی ہے
ہاں بہت آسان ہے دم بھر میں مر مٹنا مگر اک مسلسل سوز میں جیتا ہے پروانہ ترا
او نشیلی آنکھ والے کیا کہوں مستی تری ہر نفس تیرے تصور میں شراب ہوتا رہا
شکایت درد دل کی کیا کریں اپنے مسیحا سے تمنا دور ہو جاتی ہے اظہار تمنا سے
زبان شیریں نظر اونچی تبسم جانفزا اس کا گلیمی مرد مومن کا نظارا ایسا ہوتا ہے

حضرت گلیمی نے مختلف اخبارات اور رسائل کے لیے بھی بے شمار مضامین لکھے نہ جانے کہاں کہاں ان کے رشحات قلم بکھرے پڑے ہیں۔ ریڈیو سے بھی ان کی کئی تقاریر نشر ہوئیں۔

غرض حضرت گلیمی کی گراں قدر علمی و ادبی خدمات کا احاطہ ایک مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ افسوس علم کی یہ روشن شمع جس نے کئی ذہنوں کو منور کیا ۲۰؍ اپریل ۱۹۹۲ کو ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔ ان کی وفات سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو کبھی پُر نہ ہوگا۔ سید عبدالقادر قادر قادری چشتی نے حضرت گلیمی کی وفات پر حسب ذیل قطعہ تاریخ کہا ہے۔

پیر احمد گلیمی سعید زمن
ہے قربان تجھ پہ مرے جان و تن
ملے فیض قادر کو دم سے ترے
چشمہ نور گلیمی چراغ دکن
۱۹۹۲ء

دعا ہے اللہ تعالیٰ حضرت گلیمی کو جنت الفردوس میں مقامات عالیہ سے سرفراز فرمائے۔

فون : 229161 جلد : {۹}

قیمت =/6 روپے شمارہ {۸}

اگست ۱۹۹۲ء

حیدرآباد

شاداب

ایڈیٹر : محمد قمرالدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر : رشید الدین • منیجنگ ایڈیٹر : کلیم الدین احسن

مجلس مشاورت

زر تعاون

ہندوستان	65 روپے	دو سال کیلئے 120 روپے	تاحیات 1500 روپے
بیرونی ممالک	200 "	360 "	3700 "
امریکہ	40 ڈالر	70 ڈالر	700 ڈالر
انگلستان	25 پونڈ	45 پونڈ	400 پونڈ
پاکستان	175 پاکستانی روپے	300 پاکستانی روپے	3000 پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ "ماہنامہ 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004

پرنٹر، پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے پبلک پرنٹرس چتہ بازار میں چھپوا کر دفتر "شاداب" ریڈ ہلز حیدرآباد دکن سے جاری کیا۔

فہرست

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

علم اور جہالت

حضرات ! پڑھے لکھے لوگوں نے دو لفظ سنے ہوں گے ایک اسلام اور دوسرے جاہلیت، یہ قرآنی اصطلاحات ہیں اور کثرت سے یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں، لیکن جاہلیت کا لفظ جب بولا جاتا ہے تو ذہن عہدِ رسالت کے قبل کے زمانہ کی طرف منتقل ہوتا ہے، رسالت سے قبل ساری دنیا میں جہالت پھیلی ہوئی تھی لوگ خدا کو بھول گئے تھے اور زندگی کے مقصد کو بالکل فراموش کر چکے تھے اور انسانیت کے منصب اور خدا سے اس کا جو تعلق ہونا چاہیئے تھا اس کو بھول گئے تھے عام طور سے لوگ اس کو ایک تاریخی عہد سمجھتے ہیں اور اسلام کے پہلے کے زمانہ کو عہدِ جاہلیت کہتے ہیں اس کے بعد کا دور اسلامی کہلاتا ہے۔

اسلام کے معنی اپنے کو اللہ کے حوالے کر دینا ہے اپنی تمام چیز دل، اپنی خواہشات پنے امنی اپنے فوائد، اپنے اغراض، اور اپنے ان مقدسات سے جو اس کے دل و دماغ پر ہی ہیں ان کے قابو سے نکل جانا، اور ان سے دست بردار ہو جانا ہے جسے انگریزی میں SURRENDER کرنا کہتے ہیں، اللہ اور رسول کے احکام پر چلنا یعنی خدا چاہی زندگی گذارنا سلام ہے اور جاہلیت کے معنی ہیں من مانی زندگی گذارنا جو دل میں آئے وہ کرنا،

جیسا ہو رہا ہے ویسا کرنا، جو لوگ چاہتے ہیں اس کے مطابق کرنا، جس میں آدمی فائدہ دیکھے وہ کرنا، جس میں شہرت ملے، عزت ملے، نام و نمود ملے وہ کرنا، جو جی میں آئے وہ کرنا، جس میں مزہ آئے اور جس میں فائدہ معلوم ہو، جس میں چرچا ہو، تذکرہ ہو، لوگ تعریفیں کریں جس میں لذت ملے اور عزت ملے وہ کرنا، لیکن جاہلیت کے متعلق آپ کے ذہن میں ایک بات یاد رہنا چاہیے کہ جاہلیت اجہالت کے لفظ سے ہے، اور جہالت جاہلیت پیدا کر دیتی ہے، اسلام قبول کرنے کے بعد، مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے کے بعد، اپنے کو مسلمان کہلانے کے بعد اگر آدمی نے دین کی ضروری اور بنیادی معلومات حاصل نہیں کیں، قرآن مجید کا مطالعہ نہیں کیا، ترجمہ کے ذریعہ، عالموں کے ذریعہ، واعظوں کے ذریعہ، مبلغین کے ذریعہ دینی کتابوں کے ذریعہ، اس کو اللہ و رسول کا منشا نہیں معلوم ہوا اور اس نے اس کی کچھ پرواہ نہیں کی تو وہ جاہلیت پھر آجائے گی، یعنی وہ جاہلیت جو گذر گئی، اس کے متعلق ہرگز نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ واپس نہیں آسکتی ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار فرمایا "أجاهلية بعد الإسلام" کیا اسلام کے بعد جاہلیت چاہتے ہو؟ اور ایک صحابی جن سے ایسی ہی غلطی ہو گئی تھی، ان کے متعلق آپ نے فرمایا "إنك امرؤ فيك جاهلية" (تم ایسے آدمی ہو جس کے اندر جاہلیت کی بو باقی ہے) تو معلوم ہوا کہ جاہلیت کوئی گذرا ہوا زمانہ نہیں ہے جو گذرے ہوئے وقت کی طرح واپس نہ آسکتی ہو، بلکہ جاہلیت ایک طرز زندگی کا نام ہے اور اس طرز زندگی کو بنیادی طور سے جو چیز جاہلیت بناتی ہے وہ جہالت ہے، تو اسلام کا جہالت کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے، اسلام کے لیے فرض ہے کہ بنیادی معلومات حاصل ہوں، اور آدمی کو معلوم ہو کہ کیا چیز اللہ تعالیٰ کو پسند ہے کیا چیز اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے کیا چیز اللہ و رسول کے منشا کے مطابق ہے کیا چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدہ ہے۔ کیا چیز مسلمان، ایمان، اور عقیدہ کے مطابق

اور کیا چیز مطابق نہیں ہے۔ تو اس کا علم حاصل کرنا اپنے لئے بھی اپنے بچوں کے لئے بھی آئندہ نسلوں کے لیے بھی اور اس کا انتظام کرنا ضروری ہے، اگر ہمیں قرآن مجید کی زبان سمجھ اور اللہ تعالیٰ کے کلام کی سطح اور شان سے واقف ہوں اور یہ معلوم ہو کہ اس کلام کا ایک ایک لفظ کتنی گہرائی رکھتا ہے، اور کتنی بلندی رکھتا ہے، اور اس کی کتنی اہمیت اور قدر و قیمت ہے، تو ہم کانپ جائیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ" "انما" کلمہ حصر ہے یعنی اس کے سوا کچھ نہیں، اللہ سے وہی ڈرتے ہیں، اللہ سے وہی ڈر سکتے ہیں وہی ڈریں گے جو علم رکھنے والے ہیں۔ اُردو زبان میں علماء سے مولوی صاحبان مدارس کے فضلاء - اللہ تعالیٰ ان کی تعداد میں اضافہ کرے اور ان کے علم سے فائدہ پہونچائے۔ مراد لیے جاتے ہیں، لیکن کلام الٰہی اور کلام نبوت میں ان کا علم محدود نہیں ہے، "العلماء" جب کہیں گے تو ہمارے سامنے بڑے بڑے علماء آئیں گے حکیم الاسلام حضرت تھانوی کا نام آئے گا، حضرت مدنی کا نام آئے گا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا کا نام آئے گا، مولانا سید سلیمان ندوی کا نام آئے گا۔ "العلماء" کے معنیٰ ہیں۔ جاننے والے، تب اللہ نے یہ فرمایا کہ اللہ سے علماء ڈریں گے اللہ سے وہی ڈر سکتے ہیں جو علم رکھتے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ دین جو ہم کو اسلام کے نام سے ملا ہے یہ علم سے جڑا ہوا ہے اس کا علم سے ایسا رشتہ ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا، علم اسلام کا ایک ضروری اور بنیادی عنصر ہے، اس میں صحیح عقائد کا علم ہو جائے فرائض کا علم ہو جائے اللہ تعالیٰ کی ضروری تعلیمات کا علم ہو جائے کیا چیزیں ہم پر فرض اور واجب ہیں، کیا اسلام ہے اور کیا کفر ہے، اس کا فرق معلوم ہو جائے اور کیا توحید ہے اور کیا شرک ہے کفر اور ایمان کا فرق معلوم ہو جائے بدعت و سنت کا فرق معلوم ہو، طاعت اور معصیت کا فرق معلوم ہو، حرام و حلال کا فرق معلوم ہو، جائز و ناجائز فرق معلوم ہو، اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات کا فرق معلوم ہو جائے۔

وہ علم جو اسلام کے لیے ضروری ہے وہ مواعظ کے ذریعہ، صحبت کے ذریعہ، تبلیغی جماعت میں شامل ہو کر، یا کوئی اور ایسا ماحول اور صحبت اختیار کر کے، ضروری علم حاصل کرنے، علم کے وسائل بہت ہیں اور الحمدللہ آسان ہو گئے ہیں اور مدرسوں کی وجہ سے اور بھی سہولتیں پیدا ہو گئی ہیں کتابوں کی کثرت ہے مدارس، فیض عام ہے، یہ مدارس کوئی معمولی چیز نہیں ہیں اللہ تعالیٰ ان کو قائم رکھے، ان کی وجہ سے ہندوستان کی ملت اسلامیہ اپنی خصوصیات کی وجہ سے باقی ہے آزادی سے قبل کا زمانہ مجھے یاد ہے جب انگریزوں کا اقتدار شباب پر تھا اس وقت خلیفہ شجاع الدین نے ایک رسالہ میں مضمون لکھا کہ اب ان مدرسوں کی کیا ضرورت ہے اب زمانہ بدل گیا ہے ان مدرسوں کو اسکولوں میں تبدیل کر دینا چاہیے اور وہاں انگریزی زبان پڑھائی جائے، اور سائنس کی تعلیم دی جائے، جیسا کہ آج کل بعض لوگ مطالبہ کرتے ہیں، علامہ اقبال نے کیمبرج اور جرمنی سے قانون، اقتصاد اور فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کیا تھا انہوں نے اس کا جواب دیا کہ خدا کے لیے تم یہ نہ کہو اگر دینی مدارس نہ رہے تو ہندوستان اسپین بن جائے گا، اسپین میں کیسے کیسے ولی اللہ مدفون ہیں، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی وہاں مدفون ہیں۔ فقہ مالکی میں ایک اصولی مسئلہ ہے کہ ان کے یہاں اہل مدینہ کا عمل حجت ہے، اس میں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے ویسے ہی ایک زمانہ میں یہ مسئلہ بن گیا تھا کہ عمل قرطبہ حجت ہے، وہاں علماء کے فیض اور عربی علوم کے اثر سے اور محققین کے پیدا ہونے سے اور گھر گھر عالموں کے ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی اسلام کے ڈھانچہ میں ڈھل گئی تھی کہ اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ قرطبہ میں ایسا ہوتا تھا جس ملک کا ایسا حال ہو وہاں کا عمل حجت تھا اور پوری شمالی افریقہ کی پٹی جو لیبیا اور سوڈان سے شروع ہوتی ہے اور مراقش تک جاتی ہے اور پھر اسپین تک جاتی تھی یہ سارے علاقے سو فی صد مالکی ہیں ایسا کوئی ملک نہیں جو سو فیصد حنفی ہو، وہ ملک مسلمانوں سے خالی ہو جائے۔

علم ہمارے لیے اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا اسلام کے ساتھ وابستہ رہنا اور اسلام
پورے طور پر چلنا اس کے بغیر ممکن نہیں بلکہ ناممکن ہو سکتا ہے اور کم سے کم (ہمارا ہندوستان)
ملک ہے جس کے چاروں طرف جہالت کی جو فضا ہے اور جو کفر و شرک اور دوسرے
ب، میتھالوجی (دیو مالائی) جو پھیلی ہوئی ہے اور اب آج کل ریڈیو، ٹی وی کے ذریعے
یں کے ذریعے، اور تاریخ کے ذریعہ اور ہر طرح سے وہ چیزیں پھیلائی جارہی ہیں، جو کبھی
ہندوستان میں تھیں وہ بھی سامنے لائی جارہی ہیں اس صورت میں دین کی تعلیم کی
ت ضرورت ہے گویا اس وقت اسلام کے باقی رہنے کا دارومدار اس پر ہے کہ آپ
گھر والوں کو، آپ کے بچوں کو ضروری دینی معلومات حاصل ہوں، اس کا انتظام
چاہیئے، بار بار کہا اور لکھا ہے کہ بچوں کی صحت، اور بچوں کے کپڑے بنوانے، بچوں کے
علاج کرنے، بچوں کو بیماریوں سے تحفظ فراہم کرنے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے کہ ان
اللہ و رسول سے واقف کرائیں اور ان کو کفر و ایمان کا فرق بتائیں، انہیں شرک و توحید
فرق بتائیں، ہماری ماؤں اور بہنوں پر فرض ہے اور گھر کے لوگوں پر فرض ہے کہ ان کے
یں ان سے گھن پیدا کریں، ایسی گھن جو گندی (پاخانہ، پیشاب سے ہوتی ہے) ۔

جب تک ہماری نئی نسل کے دل میں بت پرستی چاہے وہ کسی قسم کی بت پرستی
اس کائنات میں کسی کو متصرف ماننے، کسی کو کارساز ماننے، کارفرما ماننے، اور اپنی قسمت
بنانے والا اور بگاڑنے والا جاننے، اس سے جب تک گھن نہ آئے جیسے پاخانہ اور پیشاب
گندی چیزوں سے ہوتا ہے اس وقت تک اس کے ایمان کا اطمینان نہیں ہے کہ
ہ اپنے ایمان پر قائم رہے گا ۔

کفر اور شرک سے مسلمانوں کو ایسی نفرت ہونی چاہیئے جیسے آگ میں ڈالے جانے
سے نفرت ہو کفر اور شرک کی تمام شکلوں سے جب تک اس کے دل میں نفرت نہ ہو، اور

ہندوستان میں جو دیو مالائی چیزیں ہیں اور بت پرستی کی جو چیزیں ہیں اور یہاں کے دیوتاؤں کے بارے میں جو خیالات ہیں اس سے نہ صرف بچا رہے، یہ ایک بڑی نعمت ہے، بلکہ اس سے نفرت ہو، اور اس کے نام سے اس کا ذائقہ خراب ہو جائے اور اس کے دل و دماغ اور احساسات پر ایسا اثر پڑے جیسے کوئی گندی چیز کھالی ہے.

بچوں کو دینی تعلیم دینا اور ایسی دینی تعلیم کا انتظام کرنا جس سے اس کو دین کا ضروری علم حاصل ہو جائے۔ بلکہ کفر اور شرک سے ایک قسم کی نفرت، وحشت نہ پیدا ہو اس وقت تک اطمینان نہیں کہ وہ کفر وشرک کا کوئی کام نہ کر گذرے، مائیں ایسے قصے سنائیں جس سے کفر اور شرک کا فرق معلوم ہو، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ سنائیں حضرت ابراہیم علیہ السلام آذر کے گھر میں پیدا ہوئے جہاں صرف حکومت بت پرستوں کی نہیں تھی بلکہ ان کا معاش بھی اس سے وابستہ تھا یعنی اعتقادی اور اقتصادی دونوں طور سے بت سازی ان کے گھر میں تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو داعی کبیر بنایا تھا بلکہ امت کا بانی بنایا تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے کفر اور شرک کے فرق کو "یٰنَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلٰمًا" (اے آگ تو ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو) سے عیاں کر دیا ایسے قصوں سے ایسے واقعات سے بچوں میں، گھروں میں اور ماں میں کفر وشرک کا امتیاز پیدا ہوگا اور اسلام کا صحیح علم حاصل کرنے کی رغبت پیدا ہوگی اس علم کو اسلام کے ساتھ مربوط رکھا گیا ہے تاکہ مسلمان اسلامی تعلیمات کے ساتھ مسلمان ایمان و عقیدہ کے ساتھ مسلمان رہے۔

ترجمہ و تلخیص : محمد مصطفٰے خاں

مجھے اسلام پر کتنا فخر ہے

نومسلم حسین رؤوف (انگلستان)

کچھ لوگ جب اپنا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو ان کے اس فیصلے میں جذباتی، فلسفیانہ یا سماجی اسباب کارفرما ہوتے ہیں۔ میں بھی ایک ایسے عقیدہ کی تلاش میں سرگرداں رہا جو میرے فلسفیانہ ذہن اور سماجی تصورات سے ہم آہنگ ہو، چنانچہ میں نے دنیا کے تمام مروجہ اہم ادیان، ان کے اصول و مبادی اور ان کی مقدس کتابوں کا بغور مطالعہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے مسیحیت اور یہودیت کی تعلیمات کا تقابلی مطالعہ شروع کیا۔ کیونکہ میری نشو ونما ایک یہودی کیتھولک مخلوط خاندان میں ہوئی تھی۔ نوجوانی اور تعلیمی زندگی کلیسا کی تعلیمات اور اس کے رسم و رواج کے بیچ گذری تھی۔ دورانِ مطالعہ طرح طرح کے اشکالات پیدا ہوتے رہے۔ انجیل کے بے شمار دعوں اور نظریات سے مطمئن نہ ہو سکا عقیدہ تثلیث، کفارہ اور غفران گناہ میری عقل و فہم قبول نہ کر سکی۔ میں نے اللہ کے مفہوم کو یہودی مذہب میں

کتب انجیل کے برخلاف زیادہ باعظمت پایا۔

میں نے یہودی تعلیمات کا مطالعہ کیا لیکن اس کے بہت سے نظریات کو چھوڑ بھی دیا کیوں کہ انسان اگر یہودی مذہب کے تمام اصولوں اور تعلیمات کا پابند بن جائے تو اس کے پاس زندگی کے معاملات اور اس کے مطالبات پر توجہ کے لیے وقت نہیں بچے گا اور عقل لامحدود شعائر و مراسیم میں پھنس کر رہ جائے گی۔ مزید براں یہ کہ یہودی مذہب ایک اقلیت کا مذہب تصور کیا جاتا ہے جیسے وہ اپنے اندر ہی محدود ہونے کا دعویٰ رکھتا ہے، چناں چہ اس دین کے متبعین اور دوسری جماعتوں میں ایک عظیم بُعد پایا جاتا ہے۔

میں انگلستان کے کلیسا میں عبادت کے لیے برابر حاضر ہوتا اور یہودی عبادت گاہوں میں بھی برابر جاتا رہا۔ لیکن اس کے باوجود کسی مذہب سے بھی متعلق نہ ہوا کیوں کہ کیتھولک مذہب میں ہم نے انتہائی غیر معقول اور اندھی تقلید نیز مذہبی رہنماؤں کی طاقت کے سامنے خود سپردگی محسوس کی۔ جب کہ ان میں ایسی روحانی و اخلاقی بیماریاں موجود تھیں جو ان اخلاق و صفات سے کوئی مناسبت نہیں رکھتیں جو پوپ اور اس کے حواریوں کے خود ساختہ خدائی مقام کا تقاضہ ہیں۔

چنانچہ میں نے ہندو فلسفہ خصوصاً اپنشد اور ویدوں کی بعد والی تعلیمات پر مشتمل کتابوں کی طرف توجہ مرکوز کی۔ اس دوسرے مرحلہ میں بھی اس فلسفہ کے بے شمار افکار و نظریات کا مطالعہ کیا، کتنوں کا احترام کیا اور کتنوں کو ٹھکرا دیا۔ چناں چہ اس مذہب کے بہت سے سماجی امور سے متعلق نظریات کو میں کلیتہً مسترد کر دیا۔ اسی طرح طبقہ برہمن کے امتیازی حقوق اور اچھوتوں اور شودروں سے ان کے تنفر و بے تعلقی کو میں تسلیم نہ کر سکا جس کی بنیاد پر ذلت و پستی اچھوتوں کا مقدر تسلیم کی جاتی ہے اور ان کے لیے بہتر زندگی کی اُمید اسی پر منحصر سمجھی جاتی ہے کہ وہ اپنا

قابل رحم حالت پر صبر و تحمل کے ساتھ قائم رہیں قدامت پسند برہمنوں کے لیے عوام کو مطیع و فرمانبردار بنانے کا یہ بہترین طریقہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہندو مت میں دین کا مفہوم عجیب و غریب قالب اختیار کر گیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مذہب ایک اونچے طبقہ کو وجود بخشا ہے جو اپنے آپ کو خدائی مرتبہ پر فائز تصوّر کرتا ہے جس کا کام ذلّت و مصیبت میں گھرے عوام کو ارادہ الٰہی کا دلاسا دیکر قناعت کی تلقین نیز حالات و واقعات کے سیلاب میں بہنے کی دعوت ہوتی ہے

جہاں تک بدھ مذہب کا تعلق ہے تو اس سے مجھے عقل انسانی اور اس سے متعلق قوانین فطرت کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا اور یہ بھی پتہ چلا کہ کامنات کو سائنٹفک تجربوں کی طرح سادہ طریقہ پر ایک کل سمجھنے کا طریقہ کیا ہے اور اس کے لیے کون سی قربانیاں پیش کرنا ضروری ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ بدھ مذہب طبقاتی نظام کے خلاف شدید ردّ عمل کا مظاہرہ ہے لیکن افسوس کہ ہندو مت و بدھ مذاہب کسی میں متعین اخلاقی اصول نہ ملے میں نے اپنے اندر انسانی مرتبہ سے اونچا کرنے کی قوت پروان چڑھنے کا طریقہ تو پایا لیکن مجھے یہ بھی یقین ہو گیا کہ یہ غیر مادی طاقتیں ہمارے نفس روحانی مرتبہ پر فائز ہونے کی دلیل نہیں ہیں۔ اور اس ریاضت کی کاوشیں جذبات پر قابو پانے اور جذبات و خواہشات پر غلبہ حاصل کرنے کے ایک علمی طریقہ کے سوا کچھ نہیں ہے جیسا کہ قدیم زمانے کے رواقی فلاسفر نے کیا تھا، ان دونوں مذاہب میں اس کے خالق کا کوئی واضح تصوّر نہیں ہے بلکہ انہوں نے صرف اس طریقہ کو واضح کیا ہے جسے انسان اپنی نجات کے حصول کے لیے اختیار کرتا ہے باوجودیکہ بدھ مت کے اعلیٰ نمونے ایثار و قربانی کی تعلیم دیتے ہیں جس سے ہم بدھ مذہب میں روحانیت کا ایک پہلو محسوس کرتے ہیں چنانچہ بدھ مت نظری اعتبار سے اس عالم کو بچا سکتا ہے لیکن ذہن میں ایک

سوال ابھرتا ہے کہ جب یہ عقائد و افکار نظری اعتبار سے عالم کو بچانے پہ قادر ہیں تو عملی میدان میں ناکام کیوں رہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عقائد ایسے نہ تھے جن میں عوام و خواص شریک ہوتے، بلکہ ایک خاص جماعت میں منحصر تھے چنانچہ مسیحیت اور بدھیت دونوں نے معاشرتی مسائل کو بے وقعت سمجھ کر اس سے بے اعتنائی برتی، ایک طرف ہر مسیحی و بودھ صرف مادیت اور اس کے متعلقات ترک کرنے کا داعی ہے تو دوسری طرف معرفت حق کی تلاش میں مکمل نفس کشی پر زور دیتا ہے، مجھے یقین کامل ہے کہ ان جیسے اصولوں کے ذریعہ اگر جدوجہد سے کام لیا جائے تو خدائے تعالیٰ تک پہنچنا ممکن ہے لیکن مجھے ساتھ ہی یہ بھی یقین ہے کہ بنی نوع انسانی کی ایک عظیم تعداد کا اس طرح مشقت جھیلنا اور پابندی برداشت کرنا ناممکن ہے جیسا کہ میرا اعتقاد ہے کہ یہ تعلیمات جاہل کاشتکاروں کے حالات سدھارنے میں ناکام ہوں گی اسی وجہ سے ان کی معاشرتی قدر و قیمت بالکل مفقود نظر آتی ہے۔ اس طرح کی تعلیمات عالی روحانیت کے مالک چند غیر معمولی لوگوں کے لیے تو درست ہو سکتی ہیں لیکن عوامی سطح پہ مختلف طبقات کو مخاطب بنانے اور ان تک رسائی میں بدترین ناکامی کا شکار ہونگی، یقیناً اس طرح کے عقائد ایک پسندیدہ ذہنی عمل سے بڑھ کر کچھ نہیں ہیں لیکن ان میں قومی ترقی اور اس کے روحانی، عقلی اور مادی سطح کو مختصر وقت میں بلند کرنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی ہے۔

انتہائی تعجب کی بات ہے کہ مجھے بعض اوقات عرب ممالک میں بھی رہنے کا اتفاق ہوا لیکن اس کے باوجود میں دوسرے مذاہب کی طرح اسلام کو اہمیت نہ دے سکا لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ اسلام اور اس کی تعلیمات سے بے توجہی کا باعث روڈویل کا مسخ شدہ قرآنی ترجمہ تھا حسن اتفاق کہ انہیں دنوں میں لندن کے ایک مسلمان مبلغ سے واقف ہوا، یہاں میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ عظیم عرب ممالک نے اسلام کی تبلیغ

اور اس کی تعلیمات کی اشاعت کی کوشش ایسے ماحول میں انہیں کی جہاں اس کے نتائج متوقع تھے، یہ منطقی نتیجہ ہے اس حزم و احتیاط کا جو اکثر مشرقی ممالک کے لوگ اجنبی ممالک میں اختیار کرتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں بہت سے کام رازداری کے ساتھ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مجھے ایک مسلمان عالم کے ترجمہ و تفسیر کردہ قرآن کریم کے انگریزی نسخہ کے مطالعہ کا موقع ملا نیز میں نے اسلام سے متعلق اہم کتابوں کا بھی مطالعہ کیا جس سے اسلام کی واضح تصویر میرے سامنے آئی اور میں نے وہ متاع گرانمایہ پالی جس کی تلاش میں سالوں بھٹکتا رہا تھا حسن اتفاق مجھے نماز عید اور اس کی تقریبات میں شرکت کی بھی سعادت نصیب ہوئی اور قریب سے مسلمانوں کے عالمی اجتماعیت، آپسی میل ملاپ اور یکجہتی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں اسلام، عرب یا ترک یا کسی اور قوم تک محدود نہ تھا بلکہ وہ تو رنگ و نسل، زبان و لغت اور اجتماعی طبقاتی دیواروں کو توڑ کر عالمی انسانیت کو ایمان و یقین یکجہتی و اتحاد کا سبق دے رہا تھا۔ اس عظیم مجمع میں ہم نے امیر و غریب دونوں سے ملاقاتیں کیں، وہ تمام کبر و غرور، نفاق و خود ستائی، مد پسندی، خود غرضی و تمسخر تصنع و جانب داری سے کوسوں دور ظاہرانہ کے دسترخوان پر تشریف فرما تھے ان اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مجھے زندگی کے مختلف گوشوں اور پیچیدہ مسائل کا حل مل گیا جس سے تمام دوسرے افکار و نظریات قاصر تھے، تفصیل کا موقع نہیں صرف یہ تذکرہ کافی ہے کہ میں نے اسلام کو دنیا کے بڑے مذاہب کے مطالعہ اور انتہائی غور و فکر کے بعد اپنایا ہے۔ یہ الفاظ میرے مسلمان ہونے کے اسباب پر تو روشنی ڈال سکتے ہیں لیکن اسلام پر مجھے کتنا فخر و اعتقاد ہے اس کی ترجمانی نہیں کر سکتے۔ میں نے اسلامی تہذیب و ثقافت کا مطالعہ مغربی یونیورسٹی میں کیا جس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ اسلامی تہذیب یورپ کو قرون وسطی کی تاریکیوں سے نکالنے میں علمبردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور نئی دنیا اسلامی سرمایہ کا بہت زیادہ احسان مند ہے

مجھے ان لوگوں کی ناواقفی پر ہنسی آتی ہے جو میرے قبول اسلام پر رجعت پسندی کا الزام دیتے ہیں کیوں کہ انہیں سبب اور نتیجہ میں خلط مبحث ہو جاتا ہے۔ کیا آج مسلمانوں کے خارجی اسباب کی بنا پر کمزوری کے نتیجہ میں اسلام کی مذمت درست ہے؟ اگر معیار یہی ہے تو دور جدید کے عمدہ آرٹ بھی قبح و خرابی کا مرکز قرار پائیں گے کیوں کہ بہت سے موجودہ آرٹسٹ بے حیا اور عریاں تصویروں سے بچتے نہیں ہیں اور عہد وسطیٰ میں مسیحیوں کے ہاتھوں انجام پاتے جانے والے ہولناک حادثات نیز اسپانیا کے محکمہ تفتیش کے ذریعہ پیش آنے والی مصیبتوں کی وجہ سے مسیحیت ایک وحشی اور خون کا پیاسا مذہب شمار کیا جائے گا۔

میں نے بے شمار عرب ممالک کا بھی سفر کیا ہے مسلمان فقراء و مساکین اور کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک اور بہتر معاملہ کرتے ہیں اس لیے مجھے بالجزم کہنے کا حق ہے کہ مسلمان دنیا کی تمام قوموں میں سخاوت خودداری اور غربا پروری میں سب سے فائق اور برتر ملت ہیں جس کا مقابلہ روئے زمین کی کوئی دوسری ملت نہیں کرسکتی (بشکریہ تعمیر حیات لکھنؤ ۱۹۹۲ء)

(سلسلہ ۱۵)　　　(بشکریہ تعمیر حیات لکھنؤ ۱۹۹۲ء)

شروع کرسکے تاکہ وافر مقدار میں غذا، رہائشی کمرے اور درسی کتابیں مہیا ہوسکیں اور ایک اجتماع منعقد ہوا جس میں معزز بیگمات نے حصہ لیا۔

سمینار منعقد ہوئے جن میں غذا کی سپلائی تیاری اور صحیح مصرف کے بارے میں تفصیلات مرتب کی گئیں۔ سعودی سفارت خانہ نے اس قسم کی امداد پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دینی اور درسی تعلیم دینے والے اساتذہ اور استانیوں کے وظائف بھی مقرر کیے۔ اس پر کینیا کے ایک مسلم قائد نے مسکراتے ہوئے کہا انہوں نے اسے عیسائی بنانے کی کوشش کی لیکن اس نے بہت سی عورتوں کو مطمئن کر کے مسلمان بنا لیا۔ (بشکریہ ماہنامہ الفاروق کراچی)

(بشکریہ تعمیر حیات لکھنؤ ۱۹۹۲ء)

عیسائی راہباؤں کا قبول اسلام

آج کل نیروبی میں "فاطمہ غلام" نامی عورت کا چرچا عام ہے جسے نصرانی مبلغین کی جماعت نے مسلمان عورتوں کو عیسائی بنانے کیلئے متعین کیا اور اسے نیروبی میں عیسائی ماؤں کی انجمن کی نائب صدر بنادیا اور اسے "دار الحنان" نامی مسیحی تبلیغی ادارہ کی منتظمہ مقرر کر دیا۔

فاطمہ نے اسلام اور اسلامی اصولوں کی تشریح شروع کردی اور انسانی حقوق خاص طور پر حقوق نسواں کے بارے میں اسلامی نکتہ کو سمجھانا شروع کر دیا اور اسی دوران عربی زبان اور دین اسلام کی تعلیم بھی شروع کر دی اور وہاں پر نماز کے لیئے جگہ مقرر کردی اور اپنے ادارہ میں فاطمہ نے بعض عیسائی راہبہ عورتوں کو اس قدر مطمئن کیا کہ وہ مسلمان ہوگئیں ان کے علاوہ بھی اور بہت سی عورتوں نے اسلام قبول کر لیا۔

فاطمہ کے اس رویہ پر دوسری راہبہ عورتوں نے اعتراض کیا اور انہوں نے نصرانی تبلیغی اداروں سے شکایت کی جس کی بناء پر مذکورہ ادارہ کی امداد بند کردی گئی تاکہ وہ اپنا کام جاری نہ رکھ سکے۔ جس کی وجہ سے بہت سی عورتوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ فاطمہ کی اپیل پر بعض مسلمانوں نے ادارہ کی امداد کی۔ لیکن وہ تبلیغ اور اسلامی تعلیم جاری رکھنے کے لیے ناکافی تھی۔ لہٰذا فاطمہ نے امداد کے لیے نیروبی میں سعودی سفارتخانے سے رجوع کیا جس کے نتیجے میں اس سفارتخانے کی طرف سے فاطمہ کو مالی امداد ملنے لگی تاکہ وہ دوبارہ کام

(باقی صـ ۱۲)

ڈاکٹر میر محبوب حسین
بی ایس سی۔ ایم اے ایم فل
(سیاسیات) ایم اے پی ایچ ڈی (اردو)
شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد

دارالترجمہ عثمانیہ کی خدمات

تراجم کی اہمیت مسلّمہ ہے۔ اس کے ذریعہ دوسری زبانوں کے خزانوں کے موتیوں کو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھال لیا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف تجربے جو تمام دنیا میں ہوتے رہتے ہیں اس سے واقفیت کا موقع ملتا ہے۔ افکار کی ایک نئی دنیا ہمارے ساتھ لگتی ہے اور ہماری پرواز بلند اور موثر ہونے لگتی ہے ترجموں سے علوم و فنون میں ترقی ہوتی ہے۔ زبان و ادب کو عالمگیر سطح پر روشناس کرانے میں تراجم کا بڑا دخل ہے۔ ترجمہ کا کام بہت دشوار ہے۔ مصنف کے مفہوم کو اپنے الفاظ اور محاوروں میں ادا کرنے کے لیے دونوں زبانوں میں مہارت ضروری ہے

ابتدا میں اردو میں ترجموں کی انفرادی کوششیں ہوتی تھیں۔ ۱۷ ویں صدی میں میراں یعقوب، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر وغیرہ نے ترجمے پیش کیے۔ ۱۸ ویں صدی میں شاہ ولی اللہ قادری، فضل علی فضلی، میر عطا حسین تحسین نے ترجمے کیے۔ اردو میں باقاعدہ ترجموں کا آغاز فورٹ ولیم کالج میں ۱۹ ویں صدی کی ابتدا سے ہوا۔ یہاں سے کیے گئے ترجموں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے۔ اس کے بعد دلّی کالج میں سائنسی علوم کے اردو میں ترجمے ہوئے۔ دہلی کالج سے باہر بھی انفرا

علمی اور سائنسی کتابوں کے ترجمے کئے جن میں نیم چند کھتری، منشی سعد اللہ، منشی
برنجی لال قابل ذکر ہیں۔ سر سید احمد خاں کی قائم کردہ سائنٹیفک سوسائٹی نے
سائنسی اور علمی موضوعات پر تقریباً چالیس[۴] کتابوں کے ترجمے کئے۔ حیدر آباد دکن
بن نواب فخر الدین خاں شمس الامراء نے سلسلہ شمسیہ کے تحت ذاتی دارالترجمہ قائم کیا اور
پچیس سے زائد کتابوں کا ترجمہ پیش کیا۔ بیسویں صدی عیسوی میں سید علی بلگرامی،
دلوی سعید احمد دہلوی اور مولانا ظفر علی خاں کے تراجم قابل ذکر ہیں۔ انجمن ترقی اردو نے
علمی کتابوں کے تراجم پر زور دیا۔ علامہ شبلی نے دارالمصنفین اعظم گڑھ میں تراجم کا
سلسلہ شروع کیا اور فلسفہ اور نفسیات کی کتابوں کے ترجمے پیش کئے۔

سلاطین آصفیہ نے علوم و فنون کو ترجمی بنیادوں پر فروغ دیا۔ آصفیہ
دحکومت کا ایک عہد آفریں کارنامہ اردو کو سرکاری زبان قرار دینا اور دوسرا
امعہ عثمانیہ کا قیام اور جامعاتی سطح پر سب سے پہلے اردو ذریعہ تعلیم رائج کرنا تھا۔
س مقصد کے لیے آصفیہ سلطنت کے آخری فرمانروا نواب میر عثمان علی خاں
ف سابع نے ۱۹۱۷ء میں سر رشتہ تالیف و ترجمہ قائم کیا اور پھر جامعہ عثمانیہ کا
فاز ۱۹۱۹ء سے ہوا۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں کتب کا ترجمہ کرنے والے اور اصطلاحات
ضع کرنے والے دونوں قسم کے مترجمیں ہوا کرتے۔ دارالترجمہ کے ساتھ ہی ایک
س اصطلاحات کا انعقاد بھی عمل میں آیا۔ دارالترجمہ کے پہلے ناظم مولوی عبدالحق
ر ہوئے۔ دارالترجمہ میں ترجمہ کا کام ۱۹۱۷ء سے ۱۹۵۰ء یعنی (۳۳) سال تک ۱
ا رہا سب سے پہلی کتاب ۱۹۱۹ء میں اور آخری کتاب ۱۹۵۱ء میں شائع ہوتی
معہ عثمانیہ میں اردو ذریعۂ تعلیم کی برخاستگی اور انگریزی ذریعہ تعلیم کے آغاز کے فیصلے
ے علوم و فنون کی اردو میں منتقلی کا جو سلسلہ چل رہا تھا وہ باقی نہ رہا۔ بعد میں

مترجمین کو بھی ملازمتوں سے علحدہ کر دیا گیا۔

دارالترجمہ میں ملک کے مختلف حصّوں سے قابل ترین لوگوں کی خدمات حاص
کی گئی تھیں۔ جیسے ظفر علی خاں لاہور سے مدعو کیے گئے، عبداللہ عمادی جونپور سے،
وحیدالدین سلیم علی گڑھ سے، محمد الیاس برنی بلند شہر سے، قاضی تلمذ حسین گورکھ
مسعود علی فتح پور سے، سید محمد ابراہیم ٹونک سے، ڈاکٹر یوسف انتھولی سیالکوٹ
سید ہاشمی فریدآبادی فریدآباد سے، مرزا محمد ہادی رسوا لکھنؤ سے، محمد احسان احمد سہا
سے بلائے گئے۔ مترجمین کو اچھی تنخواہیں اور سہولیات میسّر تھیں۔

۱۸ راگست ۱۹۵۵ء کو دارالترجمہ کی عمارت کو آگ لگ گئی تھی جس کے باع
کافی ذخیرہ جل کر خاکستر ہو گیا۔ بعض کتابوں کے ترجمے ہونے کے بعد شائع نہ ہو سکے
تھے۔ یہ نادر مخطوطات ۱۹۶۸ء میں نظام ٹرسٹ لائبریری، حیدرآباد کو بطور تحفہ دی
جہاں وہ آج بھی محفوظ اور بہتر حالت میں موجود ہیں۔

وضع اصطلاحات کا کام ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۶ء تک جاری رہا۔ اس
مدت میں پچپن ہزار سے زاید اصطلاحات وضع کئے گئے۔ اس کے علاوہ آخری د
کے تقریباً دس ہزار اصطلاحوں کا ریکارڈ نہیں ملتا۔ بہرحال اردو میں الفاظ کا
کثیر ذخیرہ جمع ہو گیا جنہیں شائع کیا گیا۔ مختلف محققین نے دارالترجمہ کی جانب
ترجمہ کی گئی کتابوں کے اعداد و شمار مختلف دیے ہیں۔ اسکی تفصیل ڈاکٹر مجید بیا
نے اپنے وقیع تحقیقی مقالہ " دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی ادبی خدمات" میں دیا ہے۔
ڈپارٹمنٹ آف ٹرانسلیشن و پبلیکشن جامعہ عثمانیہ کے اعداد و شمار کے بموجب جم
(۳۰۶) کتابوں کے ترجمے ہوئے اور انہیں شائع کیا گیا جن میں طبیعات، کیمیا،
[illegible]الوجی، میڈیسن اور اس کے مختلف شعبے، انجنیرنگ، قانون، نفسیات، منط

اخلاقیات، ہندوستانی تاریخ، اسلامی تاریخ، تاریخ یونان وروم و یورپ الجبرا، جامیٹری، ٹریگنامیٹری، سماجیات، سیاسیات، معاشیات، جیالوجی وغیرہ شامل ہیں۔

مترجمین کی ایک طویل فہرست ہے جن میں چند نام یہ ہیں عبدالباری ندوی، مرزا محمد ہادی، شیو موہن لال، خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر محمد مجیب الرحمٰن، ڈاکٹر میر ولی الدین، مناظر احسن گیلانی، ہاشم ندوی، نظم طباطبائی، عبداللہ عمادی، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، پروفیسر ہارون خاں شروانی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، رائے بیج ناتھ، چودھری برکت علی، ڈاکٹر محمد عثمان خاں، ڈاکٹر غلام دستگیر و ڈاکٹر رضی الدین وغیرہ۔

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ نے ترجمہ کے ذریعے اردو کو علوم و فنون سے آراستہ کر کے اسے مالا مال کر دیا۔ یہ وہ بنیادی کام تھا جس کی وجہ سے جامعہ عثمانیہ میں اردو ذریعہ تعلیم دینے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ اس جامعہ کے فارغ طلبا نے ملک اور بیرون ملک اپنی قابلیت سے گراں قدر کارنامے انجام دیئے۔

دارالترجمہ کی خدمات کی وجہ عصر جدید کے علمی ہتھیار یعنی مغربی علوم سے ہندوستانیوں کو لیس ہونے کا موقع ملا۔ ترجمہ کی وجہ دنیا کی اعلیٰ تصانیف اردو میں منتقل ہوئیں، علم میں اضافہ ہوا۔ خیالات میں مزید وسعت پیدا ہوئی۔ مشرقی و مغربی علوم کے درمیان جو خلا حائل تھا اس کا خاتمہ ہوا، دونوں علوم میں باہمی رشتہ و ربط پیدا ہوا۔ قدیم و جدید خیالات کا حسین امتزاج رونما ہوا۔ اردو داں طبقہ میں مزید ذہنی نشوونما کا سامان پیدا ہوا۔ علمی، فنی اور سائنسی ترقی ہونے لگی جس کی قوم و ملک کو شدید ضرورت تھی۔ نصاب تعلیم کو ملحوظ رکھ کر تمام علوم و فنون

سے منتخب کتابوں کے ترجمے کروائے گئے۔ نصابی ضروریات کی تکمیل کے علاوہ کتابوں کے ترجمے بھی کروائے گئے جس سے جہالت، افلاس، کم ہمتی، کوتاہ، بد اخلاقی کے خاتمہ کی راہ نکلے، تعلیمی، ادبی، سماجی حالات بہتر ہو سکیں، امن کو فروغ ملے۔ دارالترجمہ نے اخلاقیات کے شعبہ کو شامل رکھا۔

ترقی یافتہ ممالک کی بڑھتی ہوئی ترقی کے راز میں جدید علوم و فنون سائنس و ٹکنالوجی میں تحقیقاتی کام اور نئی دریافتیں شامل ہیں۔ ان چیزوں کو اردو میں منتقل کر کے ہماری ترقی کا سامان فراہم کیا گیا۔ ہماری اعلیٰ تعلیم غیر زبان میں ہوتی تھی۔ اسلیے ان علوم و فنون کا ذخیرہ اردو زبان میں نہ تھا اس کی پابجائی دارالترجمہ عثمانیہ نے بڑی حد تک پوری کی اور ایسی کتابوں کو ترجمہ کے لیے منتخب کیا جو بنیادی اہمیت کی حامل تھیں اور عصری تقاضوں کی تکمیل کرتی تھیں۔ یہ کتابیں مشرق و مغرب کے مشہور مفکرین کی شاہکار تھیں۔

دارالترجمہ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ اردو میں اس کی اپنی اصطلاحات وضع کرنے کی استطاعت موجود ہے۔ علوم کی ترقی کے لیے ہی اصطلاحات کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ دارالترجمہ سے منسلک مجلس وضع اصطلاحات نے اردو ادب میں نئے الفاظ کو داخل کر کے اردو میں سائنسی علوم کی تعلیم کو ممکن ثابت کر دکھایا۔ اس سے قبل دلّی کالج اور سر سیّد احمد خاں کی سائنٹفک سوسائٹی میں اصطلاحات وضع کرنے کا کام ہوا تھا۔ یہ کام دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ نے زیادہ بڑے اور اعلیٰ معیار پر انجام دیا۔ وضع اصطلاحات کا کام متعلقہ علوم کے تعلیم یافتہ و ماہر حضرات اور لسانیات کے ماہرین مل کر انجام دیتے۔ ان میں مباحثہ ہوتا۔ علوم و فنون کے ماہر اپنے اپنے انوانا و اصطلاحا

اشرح کرتے اور زبان کے ماہرین ان کے اردو مترادفات تلاش کرتے، انہیں
کتے اور زبان کے سانچے میں ڈھالتے۔ ضرورت پڑنے پر ایک ایک اصطلاح
، لیے کئی کتابیں کھنگال ڈالتے۔ جن الفاظ پر اکثریت متفق ہوتی وہ اصطلاح
رپائی۔ ایسے الفاظ اصطلاح قرار پاتے جو عام فہم، سادہ اور معنی و مفہوم کی
ی نمائندگی کرتے ہوں ان میں نفس مضمون کے ساتھ لطافت بھی ہوا کرتی
ا۔ مترجمین نے جاذب و دلنشین اسلوب اختیار کیا۔ ان کے جامع اور بامحاورہ
جمے اصل تصنیف سے بہتر محسوس ہونے لگتے۔

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں ترجمہ کا اعلیٰ معیار تھا۔ ناظم دارالترجمہ اور
س وضع اصطلاحات کی بحثوں، ناظم ادبی و ناظم مذہبی کی تنقیدوں کے بعد ہی ترجمہ
ہوئی کتاب شائع ہوسکتی تھی۔ مترجم جس علم و فن میں ماہر ہوتا اسی فن کی
سا کا ترجمہ اس کے تفویض کیا جاتا تھا اس سے ہٹ کر دوسرے فن پر ترجمہ
نے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ فن کے علاوہ زبان پر بھی عبور ضروری تھا۔ بعض مترجمین سے
سا ایک کتب کا ترجمہ کرایا گیا۔

دارالترجمہ کا اردو زبان پر عظیم احسان ہے کیوں کہ اس ادارہ کی بدولت اسے
، ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد محققین نے مختلف کتب خانوں سے اردو کے
شاہکاروں کو تلاش کیا اور منظر عام پر لائے۔ دارالترجمہ نے مختلف علوم کو اردو
منتقل کیا۔ اس سے قبل جو لوگ زبان کی ترقی کا دار و مدار شعر و ادب کو سمجھتے تھے
وہ شعر و شاعری کے ساتھ علوم و فنون کے فروغ کے بارے میں سوچنے لگے اور
ی ذہن کے لیے ماحول سازگار ہونے لگا۔ میر حسن کے بقول دارالترجمہ کی مطبوعات
ر خیالات کے اظہار کے لیے گنجائش پیدا کر دی۔ (باقی صہ ۳۸ پر)

محترمہ شمیم الصباح
ایم اے، بی ایڈ (عثمانیہ)

اورنگ آباد کی ۸ تعلیم یافتہ بہنوں میں سے ایک

محترمہ عائشہ بیگم

وظیفہ کے بعد بھی توسیع و اشاعت تعلیم میں سرگرم

تقریباً پون صدی قبل اورنگ آباد کی ایک محترم خاتون نے اپنی آٹھ لڑکیوں کو تعلیم کی اہمیت و افادیت سے نہ صرف واقف کروایا بلکہ ایک ایسے زمانے میں جب کہ لوگ لڑکوں کو ہی تعلیم دلوانا ضروری سمجھتے تھے، اس زمانے میں اس انمول زیور سے جو کبھی پرانا تو کجا ہمیشہ اپنی رنگت کو نکھارتا ہی رہتا ہے۔ ان سب لڑکیوں کو تعلیم دلوانا اس کا انتظام کرنا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا واقعی قابل تعریف ہے ایسی ماں جس نے سر سید کی تحریک کو نہ صرف لبیک کہا بلکہ اپنی دانشمندی سے ہر طرح کی تکالیف اٹھا کر اپنی آٹھ لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست کروایا اور ان کی تعلیم مکمل ہونے تک ہر قسم کی ایثار و قربانی کے لیے کمربستہ، صبر و شکر کا پیکر بنی رہیں۔ خوش قسمت خاتون ہیں محترمہ رحیم النساء بیگم جنکی دوسری صاحبزادی محترمہ عائشہ بیگم صاحبہ ہیں۔

یہاں اس مضمون میں صرف عائشہ بیگم صاحبہ کی سماجی علمی و تعلیمی سرگرمیوں و جدوجہد کا ذکر کرنے کا مطلب ہرگز ایسا نہیں ہے کہ دوسری بہنوں نے صرف ایک کام یعنی تعلیم کی ذمہ داری کو نبھایا بلکہ حقیقت جو خود کو منوالیتی ہے۔ یہی ہے کہ ہر ایک بہن نے نہ صرف تعلیمی میدان بلکہ سماجی خدمات میں بھی ویسے ہی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ ابھی جنوری کے اواخر

...ار سیاست میں چھوٹی بہن مہرالنساء بیگم (مسز یزدانی) کا ایک انٹرویو شائع ہوا جس سے ...ین کرام کو اس بات کی آگاہی ہوئی تھی کہ وہ برطانیہ میں کسی قسم کے سماجی و تعلیمی خدمات ...ا حصہ لیا کرتی ہیں ۱۹۴۴ء میں عائشہ بیگم صاحبہ نے بی ایڈ کا امتحان پاس کیا جب وہ جالنہ ...انیہ نسواں کی صدر معلمہ ہوئیں تب اسکول میں بہت ہی کم طالبات تھیں۔ بمشکل ڈیڑھ سو۔

...احبہ نے لوگوں کے گھروں کو جانا شروع کیا اور تعلیم کے فوائد والدین بالخصوص عورتوں کو بتلائے۔ ...کا اثر اچھا ہوا ۲۰ راپریل ۱۹۴۹ء کو جب ان کا تبادلہ مدرسہ فوقانیہ نسواں پربھنی پر ہوا ...جالنہ فوقانیہ نسواں کی تعداد آٹھ سو سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ یہ محض عائشہ آپا صاحبہ کی جدوجہد ...ا تھا۔ یہ دور چار سالہ رضاکاروں کا تھا مسلمان بچیاں پردے میں رہتی تھیں ان ...لیے پردے کے ساتھ بیل بنڈیوں کا انتظام تھا۔ ہندو لڑکیاں عموماً پیدل گھر جاتیں۔ ...صاحبہ نے ہندو لڑکیوں کو بھی بیل بنڈیوں میں سختی سے آنے اور جانے کے لیے پابند کیا یہ انتظام ...یا محض اس لیے کرنا پڑا کہ اگر راستے میں کوئی بھی خراب بات ہو جاتی تو والدین مطلب غلط ...ر یا افواہوں پر کان دھر کر اچھی اچھی اسکول آتی ہوئی لڑکیوں کو پھر دوبارہ گھر بٹھا لیتے۔

...نگ آباد، جالنہ، پربھنی، بیڑ بلکہ مرہٹواڑہ ہی نہیں پونا، ناگپور، مالیگاؤں اور عظیم شہر حیدرآباد ...کئی مقامات ایسے ہیں جہاں اس محترمہ خاتون کے فیض سے طلبہ بالخصوص لڑکیاں مستفید ...ہوئی ہوں۔ اپنی زندگی کی ہر اس منزل پر جب وہ معلمہ، صدر معلمہ ترقی پاکر ایجوکیشن آفیسر ...اڈائرکٹر اور جوائنٹ ڈائرکٹر پونا اور وظیفہ حسن خدمت کی سبکدوشی پر چیرمن ایس ایس سی ...ڈ رہیں۔ انہوں نے تعلیم کو عام کرنے اور تعلیمی معیار اونچا کرنے کا کام جاری رکھا۔

مجھے آپا صاحبہ کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ کم ملا بعض وقت کسی تقریب میں بعض دفعہ کسی ...ہ میں مگر جب بھی موقعہ ملا میں نے بات چیت میں انہیں بہت ہی قریب پایا۔ ایک بار دو ...میں (BUSES) اسکول ٹرپ کے لیے اجنتا گئیں۔ ایک بس وقت پر واپس اسکول پہنچ گئی۔

دوسری خراب ہونے کی وجہ سے اسکول وقت پر واپس نہ پہنچ سکیں۔ والدین پریشان گھر تھے میں نے سوچا کہ تمہاری ہیڈ مسٹرس کے گھر پہونچ کر اطلاع دی جائے اتفاقاً وہ گھر پر نہیں تھیں بڑی بہن عائشہ آپا صاحبہ گھر پر موجود تھیں۔ انہوں نے مجھ سے آنے کی وجہ پوچھی۔ میں نے تفصیلات بتائیں۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں اور مجھ سے کہا چلو ہم ہیڈ آفس جاکر دریافت کرتے ہیں۔ اتفاقاً بس اسٹانڈ گھر کے سامنے تھا مگر بس آنے میں دیر تھی میں بار بار ان سے کہتی رہی کہ آپا ہم آٹو رکشا لے لیتے ہیں مگر آپ کو اسراف کہاں پسند تھا؟ کہنے لگیں دیکھو ابھی بس آتی ہے اتفاقاً بس بھی آگئی۔ ہم دونوں بس میں سوار ہوگئے۔ دونوں کو بس میں کھڑے رہنا پڑا۔ میں تھوڑی دیر کے بعد ہی کیا دیکھتی ہوں کئی خواتین جن میں تقریباً سب ہی ہندو خواتین تھیں کھڑے ہوکر ان سے کہہ رہی تھیں کہ آپ یہاں بیٹھ جائیے۔ بڑے اصرار کے بعد آپا صاحبہ جگہ پر بیٹھ گئیں۔ اور مجھے بھی جگہ مل گئی۔ اب کیا تھا ہر خاتون قریب آکر خیریت دریافت کر رہی ہے۔ آپا صاحبہ بھی کمروال مرہٹی میں ان سے گفتگو میں مصروف۔ مگر آپا صاحبہ نے گفتار سے زیادہ کردار کو اہمیت دی کردار کے معنوں کو انہوں نے عملی دوڑ دھوپ میں ضم کردیا انسانی زندگی کے اثبات استحکام اور اس کی توسیع کے لیے عمل، حرکت اور جد وجہد ضروری ہے۔ جد وجہد کا یہ عالم اگر وہ ہندوستان سے باہر بھی اپنے بچوں کے بار بار اصرار پر جاتی تھیں، تب وہاں بھی انکے سوچنے کا انداز اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ ترقی پسند ممالک اصولوں کو جو اچھے ہیں، انہیں ہمارے نوخیز بچوں کے لیے کس طرح کار آمد بنایا جائے۔ ۷ رمئی ۱۹۶۸ء کو ان کا مضمون " امریکہ کے مدارس" سے متعلق اخبار سیاست میں شائع ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے کتنی گہرائی سے اسکولوں کی عمارات کتب خانوں، سائنس لیباریٹری، گیمس، اسپورٹس، اسکول اسٹاف، بچوں کو لانے لیجانے کے انتظام اساتذہ والدین سرپرستوں کے تعاون، تحتانیہ مدارج میں اساتذہ کا بچوں پر انفرادی توجہ دینا سائنسی پراجکٹ میں بچوں کی تلاش و جستجو، بہرحال ہر ایک جز کا مشاہدہ کیا۔ اس مضمون میں

ں نے لکھا کہ "باصلاحیت اور ذہین بچے بلا لحاظ مذہب و ملت ملک و قوم کا سرمایہ اور ار کے وارث ہوتے ہیں۔ ان کو پروان چڑھانے کا فرض اور ذمہ داری ارباب اقتدار دانشور ملک کے مخلص حضرات پر ہوتی ہے۔"

آپا صاحبہ نے اپنی خدمت کا تمام تر حصّہ مہاراشٹرا میں لگائے رکھا جبکہ آپکے شوہر د یوسف الدین صاحب نے اپنی سروس کا زیادہ حصہ علاقہ تلنگانہ و آندھرا پردیش میں ۔و حسن خدمت کی سبکدوشی، دیگر خانگی مسائل نے آپا صاحبہ کو حیدرآباد میں رہائش پر مجبور کیا۔

۔ سے ان کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا۔ آپا صاحبہ کے جتنے بھی صاحبزادے و ہزادیاں ہیں خدا کے فضل سے ان کی عمدہ تربیت و عمدہ تعلیم سے جو جہاں ہے وہ چندے اب و چندے ماہتاب۔ یہاں اس مضمون میں سب کا ذکر شاید مضمون کی طوالت کا باعث یکن پھر بھی ڈاکٹر سید صلاح الدین اطہر کا ذکر کرنا اور تعارف کروانا بھی ضروری ہے جنکے سے آپا نے ایس ایس اطہر میموریل سوسائٹی رجسٹر کروائی۔ ڈاکٹر اطہر اپریل ۱۹۶۵ء میں ۔س میں فرسٹ مقام حاصل کیا۔ جنہیں دو گولڈ میڈل ملے ۱۹۷۴ء میں ایم بی بی ایس پاس ء امریکہ چلے گئے پٹس برگ میں ملازم ہونے ۱۹۷۹ء میں پٹس برگ میں کافی برف باری ۔ اس روز ڈاکٹر اطہر کو چھٹی تھی اتفاقاً انہیں ایک عمر رسیدہ ڈاکٹر کا فون آیا کہ اس ماری میں وہ اس ڈاکٹر کی ڈیوٹی انجام دیں۔ ڈاکٹر اطہر فوری رضامند ہوکر کار میں ڈیوٹی کے لئے ۔ ہوئے راستے میں ان کی کار برف سے پھسل کر مقابل سمت سے آنے والی ٹرک سے ئی۔ مشیت ایزدی کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ ماں باپ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ۔ بھائی نے ایک سال ۴ ماہ تک اس صدمے کو اپنے دل سے لگائے رکھا اور اس کے بعد قوت برداشت نے اپنی حد کو توڑ دیا۔

عائشہ آپا صاحبہ کے ہر دم کام کرنے کی جستجو نے اس صدمے کو بھی ایک نیا موڑ دیا۔ انہوں نے کہ اب اپنا وقت ایک اور اچھے کام کی طرف گذارنا چاہیے۔

گنوا دینا چاہیے۔ اسکول کے بچوں کے تعلیمی معیار بالخصوص اردو میڈیم کے اسکولوں میں بچے اپنی اپنی جماعتوں کے معیار کے مطابق پوری طرح نہیں اترتے۔ چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے اپنے مرحوم بیٹے کے نام پر سوسائٹی رجسٹر کروائی جماعت دہم کے بچوں کے لیے کوچنگ کلاسس کا انتظام کیا۔ یتیم خانہ عثمانیہ، محمد اکبر درگاہ یوسفین کی مسجد سلطان نواز جنگ کی مسجد ڈاکٹر مصطفیٰ احمد کے دواخانے کے اوپری حصے میں۔ مولانا آزاد ہائی اسکول اور اشرف المدارس ہائی اسکول میں ایک کے بعد ایک کوچنگ کلاسس کا انتظام کیا۔ تین چار سال تک پرانے شہر کے بچے اور اسکول کے بچوں نے تعاون زیادہ نہیں کیا جبکہ ابتدا یہ کلاسس فری چلائی جاتی تھیں جو بھی طلبا آتے ان کی لاپروائی اور بے حسی اتنی بڑھی ہوتی کہ انہیں دوسرے مضامین کی معلومات تو دور کی بات اردو بھی نہیں آتی تھی۔ سب سے پہلے آپا صاحبہ نے ان کی حاضری کی طرف توجہ دی۔ ان بچوں کے گھروں کو جانا شروع کیا۔ روزانہ کم از کم دو بچوں کے گھر جا کر ایک ایک گھنٹہ طالب علم کی ماں سے ملتیں اور انہیں تعلیم کی اہمیت کے ساتھ ساتھ بچوں کی غیر حاضری کے مضر اثرات سے واقف کرواتیں۔ رفتہ رفتہ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچوں کی تعداد حاضر رہنے لگی۔ مضامین کے لیے قابل اساتذہ کا انتظام بھی کیا گیا۔ چھٹیوں میں بھی کوچنگ کلاسس کا باضابطہ انتظام ہوتا ہے۔ نتائج حوصلہ افزا کبھی ۷۰٪ کبھی ۸۰٪ نکلنے لگے اور اس میں طلبا درجہ اول میں بھی پاس ہونے لگے۔ ان دو چار سالوں میں ۸۹-۹۰-۹۱ سوسائٹی سے ڈاکٹر اطہر میموریل سوسائٹی ۵ ہزار روپے سالانہ امداد بھی ملنے لگی۔ اس طرح یہ کلاسس اپریل ۱۹۹۰ء تک چلتی رہیں۔

۱۹۹۰ء میں ان کے ایک داماد نے اپنا آبائی مکان یہ کہہ کر دیا عائشہ بیگم صاحبہ اس مکان میں چاہے تو بورڈنگ قائم کریں چاہے تو کوچنگ کلاسس چلائیں لیکن ان کے والد مولوی امام بخش کے نام پر انسٹی ٹیوشن کا نام رکھا جائے۔ موصوفہ نے یہ بات بخوشی منظور کی۔ ۱۵ اگست ۱۹۹۱ء میں اس عمارت میں ایک مدرسہ کھولا گیا جس کا نام مولوی امام بخش میموریل ہائی اسکول ہے۔

اکثر طلباء پسماندہ علاقے سے تعلق رکھتے ہیں جن پر ہر طرح سے توجہ و محنت صرف کی جاتی ہے۔
دوسری کوشش ڈاکٹر ایس ایس اطہر ایجوکیشن ٹرسٹ کے تحت جو ہاتھ میں لی ہے وہ غریب
ذہین بچوں کا انتخاب اور ان کی اعلیٰ قسم کے مدارس میں تعلیم اخبار میں اشتہار دیا جاتا ہے
ذریعے نادار غریب طلباء جو ذہین لیکن معاشی بدحالی کی وجہ سے اسکولوں کو نہیں جا رہے ہیں۔
امتحان لیکر تعلیمی امداد کی جاتی ہے۔ بچے اپنے والدین کے ساتھ عائشہ بیگم کے پاس آتے ہیں موصوفہ
ان کا TEST لیتی ہیں۔ گھر جاکر حالات دریافت کرتی ہیں اگر دونوں اعتبار سے مستحق ہوں تو
اور پھر اطمینان بخش ہو تو اچھے اسکول میں تعلیم دلوانے کے لیے فیس، کتب کی فراہمی، کاپیوں کی
فراہمی، یونیفارم وغیرہ کا انتظام کر دیتی ہیں۔ مختلف بڑے بڑے اسکولوں میں ایسے ۸۰ بچے
تعلیم پا رہے ہیں جن کی جملہ ضروریات آپا صاحبہ پوری کرتی ہیں۔ یہ اسکیم تقریباً 3 سال سے
جاری ہے بچے ہر 3 ماہ بعد اپنی تعلیمی رپورٹ آپا صاحبہ کو بتاتے ہیں۔ ماہ رمضان کی آمد سے
پہلے ہی وہ اپنے تمام بچوں سے زکوٰۃ، امداد خیرات کے ذریعے رقومات لے کر ان نیک کاموں
پر صرف کرتی ہیں اس کے علاوہ بھی ان کے دوست اور ملاقاتی خواتین و حضرات بھی اس مخلص
خدمت کے ساتھ مسلسل تعاون کرتے رہتے ہیں۔ مولوی امام بخش میموریل ہائی اسکول سے
ایک ہاسٹل بھی ملحق کیا گیا ہے جہاں دور رہنے والے کچھ غریب بچے ہی رہتے ہیں۔ اس ہاسٹل
کی امداد میں انہیں انکی بیٹی ڈاکٹر شمیم سلطانہ کا زیادہ تعاون حاصل ہے۔ آپا کی جد و جہد کا مقصد
جیسا کہ اس سے قبل بیان کیا گیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے نوخیز نسل کی آبیاری ہے
سچ یہ ہے کہ مقصد سے زندگی بنتی ہے بڑھتی ہے تو قائم دائم بھی اسی مقصد کے
معاملہ دل کی صفائی کا کچھ یہ حال کہ آپا صاحبہ نے کدورت کسی سے نہیں رکھی۔ غلطیوں کو
نہ نظر انداز کیا بلکہ معاف کرنا ان کی ذات کا ایک وصف رہا۔ واقعی آدمی کی بڑائی اس کے
اخلاق، پاک سیرت، انکساری، خندہ پیشانی، سنجیدگی متانت، وقار میں ہوتی ہے۔

عزیز و اقارب کے علاوہ ضرورت مند سے محبت و خلوص سے پیش آتے تھیں، چھوٹوں سے شفقت اور ہمدردی اس حد تک کہ ایسا معلوم ہوتا کہ ہم پر کوئی چیز ہے جو اثر انداز ہو رہی ہے۔ ہم اچھائی و نیکی کا دامن تھامے آگے قدم بڑھا رہے ہیں۔ اگر کوئی بدسلوکی کر بھی دے تو مجال نہیں کہ وہ اس کے خلاف کچھ کہیں انکی گفتگو ہمیشہ غیبت اور کسی کی شکایت سے پاک رہی، شکوہ اور نہ کبھی غصہ۔

دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کو شاہانہ سرپرستی حاصل تھی جسکی وجہ ایک طویل عرصہ تک وہ عمدہ کام کرتا رہا۔ عہد آصفیہ کے اس درخشاں کارنامہ کو بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے اس طرح سراہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "احیائے علوم کے لیے جو کام آگسٹس نے روم میں، خلافت عباسیہ میں ہارون رشید اور مامون الرشید نے، اسپین میں عبدالرحمن ثالث نے، بکرماجیت اور اکبر نے ہندوستان میں، الفرڈ نے انگلستان میں، پیٹر اعظم اور کیتھرائن نے روس میں اور متسو ہٹو نے جاپان میں کیا وہی فرمانروائے دولت آصفیہ نے اس ملک کے لیے کیا۔

وجہ نہیں بتلاتی۔ ابتدا میں شریک معتمد ادارہ ادبیات اردو پروفیسر مغنی تبسم کے تعارفی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر جین ایک محقق و نقاد اور ایک کامیاب استاد کی حیثیت سے جو نیک نامی حاصل کی ہے وہ بہت کم اہل قلم کے حصہ میں آئی ہے۔ تحقیق و تنقید پر معرکۃ الآرا کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جناب رمن راج سکسینہ نے بھی مخاطب کیا۔ ادارہ کی جانب سے انصاری صاحب (پاکستان) کا بھی خیر مقدم کیا گیا۔ جناب ہاشم علی اختر نے پروفیسر جین کی علمی، ادبی، تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کو خراج پیش کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر جین اردو کے خدمت گزار ہی نہیں ایک کامیاب استاد اور نامور محقق و نقاد ہیں۔ میں پروفیسر جین صاحب کے تبصرہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ادارہ کی جانب سے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ پروفیسر جین نے اپنی پر اثر تقریر سے

مومن خاں شوق
اشرف ولا، ملے پلی حیدرآباد

ہماری ادبی سرگرمیاں

یکم جولائی ۹۲ء ۶-۳۰ بجے شام بمقام ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ انجمن ترقی پسند مصنفین کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ صدر انجمن جناب عاتق شاہ نے صدارت کی۔ ممتاز دانشور و مشہور قانون داں جناب عبدالقدوس نے تاثرات سفر ایران بیان کرتے ہوئے کہا ایران میرے خوابوں کا شہر ہے۔ جب میں علامہ خمینی کے برسی تقاریب کے سلسلے میں ایران پہنچا تو مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک ایسے اسلامی ملک کی سرزمین پر قدم رکھا جہاں ملت اسلامی کا تصور ابھر کر آتا ہے حکومت کے ذمہ داروں نے پرتپاک خیر مقدم کیا۔ اس تقریب میں ۸۰ ممالک کے وفود شریک تھے۔ میرے ہمراہ میرے اور بھی حیدرآبادی ساتھی تھے یہاں کے لوگوں میں مہمان نوازی، نرم گفتاری سادگی اور ڈسپلن پایا جاتا ہے۔ جناب عبدالقدوس نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اہل ایران ہندوستان سے فطری لگاؤ رکھتے ہیں وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک ایسے مرکز پر دیکھنا چاہتے ہیں جہاں انسانیت مساوات رواداری، اسلامی طرز حیات کی روشنی دکھائی دیتی ہو۔ ان کا یہ احساس ہے کہ ہر ملک کے

اپنے حالات ہوتے ہیں لیکن وطن سے وفاداری بہر حال باقی رہنی چاہیئے۔ علامہ خمینی کے انقلاب کے بعد ایران یکسر بدل گیا ہے۔ اسلامی اسپرٹ ان کے ہر عمل میں ظاہر ہوتی ہے۔ ابتداً میں شریک معتمد جناب صلاح الدین نیّر نے تعارفی وخیر مقدمی تقریر میں کہا کہ ہم نے آج کے اجلاس کو خصوصی حیثیت دی ہے۔ اس قسم کی تقاریب پر مناسب موقع پر منعقد کریں تاکہ ہمیں تنوع کے ساتھ دلچسپ اور خوشگوار تقریروں اور تحریروں سے استفادہ کا موقع ملتا رہے۔ صدر جلسہ جناب عاشق شاہ نے کہا کہ جناب قدوس اس روانی سے ایران کے حالات بیان کر رہے تھے کہ محسوس ہو رہا تھا کہ ہم لوگ بھی ان کے ساتھ ایران میں ہیں۔ مسز شاہ حسین، قدیر زماں، رئیس اختر، محسن فرخ اور محترمہ نجمہ نکہت نے کچھ سوالات کئے جن کا جناب قدوس نے تشفی بخش جواب دیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نے ایران کے عنوان پر ایک نظم سنائی جناب صلاح الدین نیّر نے شکریہ ادا کیا۔

○ یکم جولائی ہندی پرچار سبھا حیدرآباد نامپلی میں ہندی کی ممتاز خاتون ادیباؤں شریمتی شیلا جھنجھن والا اور شریمتی پشپا بھارتی کا استقبال کیا گیا۔ اس موقع پر شریمتی شیلا جھنجھن والا نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں خاتون ادیبوں اور ادیبوں میں کوئی فرق نہیں کرنا چاہتی۔ ادب میں کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہئے۔ ہندی میں اچھی تخلیقات ہو رہی ہیں، مگر ابھی کافی ترقی کرنا چاہیئے۔ شریمتی پشپا بھارتی نے کہا کہ نئی نسل اور پرانی نسل میں تضاد ہوسکتا ہے مگر ہمیں نئی نسل کو غلط نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بحث میں شریمتی گن مالا سومانی شریمتی للیتا دیوی شکلا ڈاکٹر آشا گپتا اور شری مشر ادکن سماچار نے حصہ لیا۔ اس گوشٹی کی صدارت شریمتی کملاوانی سنگھانیہ نے کی شریمتی ڈاکٹر ایلیا مصرا نے کارروائی چلائی۔ گوشٹی کے بعد ہندی اردو شعراء نے کلام سنایا

اس محفل شعر میں مسز ڈاکٹر پرتبھا گرگ، ہنسپال سنگھ ورما، شریمتی للیتا تھکلا،
اکٹر ایلیا امر، ثاقب بنارسی، فکری بدایونی، قوی سیف، شریمتی سعیدہ انور،
اکٹر آشا گپتا نے کلام سنایا۔ ڈاکٹر پانڈورنگ ڈھگے نے شکریہ ادا کیا۔

۱۴ر جولائی ۱۹۹۲ء گیت چاندنی کے ۱۰۰ ویں شعری اجتماع کے صدر
زرگ مجاہد آزادی پدم بھوشن انقلابی شاعر شری کالوجی نارائن نے اپنی صدارتی تقریر
میں کہا کہ ایک شہری ہونے سے کام نہیں چلتا بلکہ ایک اچھا شہری بننا ضروری ہے۔
چھا شہری اپنے حقوق کی حفاظت جانتا ہے۔ آزاد شہری کا مطلب قانونی آزادی
ہیں بلکہ ضمیر کی آزادی ہے۔ آج ضمیر کی آزادی اور حقوق کی حفاظت کا جذبہ کم ہوتا
ا رہا ہے۔ آج شاعر کا کام ہے کہ وہ عوام کو جگائے۔ حقیقت میں صحافت سرکار اور
عوام کا بھونپو نہیں ہونا چاہیئے۔ جس دن انکی اظہار کی آزادی ختم ہو جائے گی جمہوریت
ختم ہو جائے گی۔ شری کالوجی نارائن نے اس موقع پر اپنی تلگو نظم کا ترجمہ بھی سنایا جس میں
شعرائسے کہا گیا ہے کہ

اے شاعر قلم کے جادوئی جال مت بن　　ابن الوقت کی باتیں سب کرتے ہیں
کر سکتا ہے تو زہر کو پی نے اسے پھیلنے سے روک

اس محفل شعر میں ہندی اردو کے ۲۰ شعراء نے اپنا کلام پیش کیا۔ سکریٹری شری
ہنسپال سنگھ ورما نے گیت چاندنی کی مختصر رپورٹ پیش کی اور کارروائی چلائی۔ محفل شعر
میں مسز دولی چند ششی، ہنسپال سنگھ ورما، ثاقب بنارسی، گوبند رائے، چمن لعل زدی،
اجنند کمار، شریمتی پشپا ورما، پی آر روشن، اسمیع، نند امرا، ڈاکٹر سید حسن، ڈاکٹر
ونکیش ٹھاکر، ریوتی شرن واجپئی، دت بھارتی، ہرس رام ڈالمیا، وجے وشال،
نیلا سنگھ دیپک، سدرشن گپتہ، سریش گنگالیا، ٹی سنتوش کمار، رام نواس پراشر نے

کلام سنایا اور راج شرما کے شکریہ پر محفل کا اختتام ہوا۔

○ ۱۶ جولائی ۱۹۹۲ء ۷ ساعت شام پریس کلب میں اردو ہندی کا کامیاب مشاعرہ "سنگم شس کی آواز" منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت شری کونڈا بالوجی لکشمن سنگم شس کی آواز تنظیم نے کی مسٹر صلاح الدین نیر، ہنسپال سنگھ ورما، سامبا، رئیس اختر نے کارروائی چلائی۔ ممتاز شاعر مجاہد آزادی پدم شری کالوجی نارائن راؤ سنگم شس کی آواز (سہ لسانی مشاعرہ) کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کے اس طویل عرصے کے بعد بھی کروڑوں لوگ غربت اور افلاس کی حد سے باہر نہ آسکے آج بھی جاگیردارانہ نظام غیر محسوس طریقہ سے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہے۔ ایسے شعر کہئے کہ سماج یکسر بدل جائے۔ صدر جلسہ کونڈا لکشمن بالوجی نے کالوجی نارائن راؤ ایک اچھے شاعر ہیں اور ظلم و زیادتیوں کے خلاف انہوں نے آواز اٹھائی ہے۔ اس مشاعرہ میں ۴۷ شعراء نے کلام سنایا جیسے ڈاکٹر علی احمد جلیلی، منوہر لال جہاندار افسر، صلاح الدین نیر، رحمن جامی، رئیس اختر، منظور احمد منظور، صادق نوید، فیض الحسن خیال، عزیز بھارتی، علی الدین نوید، حسن فرخ، مومن خاں شوق، مسان منظور، گیان سنگھ شاطر، ڈاکٹر قمر الزماں نیر، قاضی انجم عارفی، شفیع اقبال، ظاہر گلشن آبادی، الطاف صمدانی، فاروق عارفی، راجندر کمار، بھرت رام قدیر الفاروقی، تجمل اظہر، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، نایاب سلطانہ، ڈاکٹر اندو وششٹ، دولی چند ششی، ہنسپال سنگھ ورما، ڈاکٹر وینکٹیشور ٹھاکر، سیتا موتی، سوریہ پرکاش، کامیشور، وینکٹیشور شرما، ستیہ نارائن، ایس مورتی اور دوسروں نے کلام سنایا۔ ہنسپال سنگھ کے شکریہ پر مشاعرہ کا اختتام عمل میں آیا۔

○ ۱۷ جولائی اردو مجلس کا ادبی اجلاس اردو ہال حمایت نگر میں منعقد

صدارت جناب صلاح الدین نیر صاحب نے کی۔ ادبی اجلاس میں محترمہ نجمہ نکہت نے
انی "میرلق" سنائی۔ جناب گوتم سروپ نے اپنی شعری تخلیقات پیش کیں معتمد اردو
جناب قدیم انصاری نے معتمدی کے فرائض انجام دیئے۔ محترمہ نجمہ نکہت کی کہانی پر
تے ہوئے جناب رحمٰن جامی نے کہا کہ کہانی بہت اچھی ہے۔ مسرز نفیس اختر
الدین، جواد معین، صادق نوید، ظہیر ناصری، منظور احمد منظور بھی مبصرین میں شامل
ترمہ نجمہ نکہت نے کہا کہ میں نے اپنی کہانی میں بہت سے بکھرے ہوئے لفظوں کو
ے مختلف ادوار کو یکجا کیا ہے جنگ ایک بدترین چیز ہے۔ دنیا بھر کے لوگ امن
ہیں۔ جناب گوتم سروپ نے دو خوبصورت نظمیں اور تین بہترین غزلیں سنائیں۔
لاح الدین نیر نے کہا کہ اردو مجلس میں ۱۷ برس تک معتمد عمومی کی حیثیت سے
ہا۔ میری وابستگی ہمیشہ اردو مجلس کے ساتھ رہے گی۔ گوتم سروپ کم آمیز
لگر اچھے شعر کہتے ہیں۔ محترمہ نجمہ نکہت ادب سے اپنے مضبوط رشتہ قائم رکھا ہے۔
لس جناب محمود انصاری کے شکریہ پر یہ محفل اختتام کو پہونچی۔

) ۱۸ / جولائی ۱۹۹۲ء ۳۰-۶ ساعت شام ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں
مختلف) کا ادبی اجلاس بصدارت پروفیسر اشرف رفیع صدر شعبہ اردو
یر منعقد ہوا۔ جسمیں پروفیسر مجاور حسین رضوی نے " انیس کے مرثیوں میں ایک
سا معنی " کے عنوان سے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ خالق حقیقی نے لفظ " کن "
ے تخلیق کیا۔ لفظ کے ذریعہ جذبات و احساسات کو اظہار شخصیت کا انکشاف
ذات ہوتا ہے۔ انہوں نے اشعار کے ذریعہ ان کے نظریہ شعری کی وضاحت کی اور
شعری روایات کی پاسداری اور صناعی کو ضرور سمجھتے تھے۔ مرثیہ میں ڈرامائی
تا ہے اس کے لئے شاعر بعض الفاظ کا استعمال مختلف انداز میں کرتا ہے۔

انیس نے ایک لفظ "بیس" سورنگ میں باندھا ۔ یہ لفظ کبھی گھوڑے کو روکنے کے لئے استعمال ہوتا ہے کبھی تعریف کے اختتام پر ۔ انیس نے امام کے سراپا میں آنکھ کی تعریف میں ۱۲۹ صفات بیان کی ہیں لیکن آخر میں کہتے ہیں بس اے انیس پر نظر بد کا خوف ہے ۔ یہاں اس لفظ کی معنویت بدل جاتی ہے ۔ پھر جب عون و محمد اس بات کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ انہیں لشکر کا علمدار بنایا جائے ۔ والدہ ماجدہ حضرت زینب انہیں سمجھاتی ہیں تو انیس اس لفظ کا استعمال مختلف انداز میں کرتے ہیں اس میں عرب کی ماں کا پورا انداز وہ ساری کیفیات جسے اخلاقیات کا اعلیٰ ترین باب کہتے ہیں موجود ہے ۔ انہوں نے کہا کہ لفظوں کو برتنے کا جو سلیقہ انیس کے پاس ہے وہ اردو کے کسی شاعر کے پاس نہیں مسز مضطر مجاز ، علی ظہیر اور مصحف اقبال توصیفی نے مباحث میں حصّہ لیا ۔ پروفیسر اشرف رفیع نے صدارتی تقریر میں کہا کہ انیس کی شاعری میں جو فصاحت و بلاغت ہے مجاور صاحب کی تقریر اس سے پوری مطابقت رکھتی ہے انہوں نے انیس کی مرثیوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ بلاشبہ حلقہ ایک ایسا ادارہ ہے جہاں دانشور جمع ہوتے ہیں اور کھلے ذہن کے باشعور و پرمغز مباحث ہوتے ہیں ۔ ڈاکٹر بیگ احساس نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا ۔

○ ۱۹ ؍ جولائی ۱۱ بجے صبح مولانا ابو الکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں محفل خواتین کا ادبی اجلاس و مشاعرہ منعقد ہوا ۔ جس کی صدارت محترمہ مسز زاہدہ یعقوب نے کی ۔ محترمہ خدیجہ ہاشمی (پاکستان) دختر نصیر الدین ہاشمی کا خیر مقدم کیا گیا ۔ صدر خواتین محترمہ سلطانہ شرف الدین نے خدیجہ ہاشمی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ خدیجہ اپنے والد محترم ممتاز محقق جناب نصیر الدین ہاشمی کی تربیت میں علمی ادبی ذوق کو پروان چڑھایا ۔ خدیجہ ایک بہترین افسانہ نگار ، شاعرہ ، ادیب اور مقرر ہیں ،

حیدرآباد میں خواتین دکن کا کتب خانہ نہایت عمدگی سے چلاتی رہیں۔ محترمہ قادرہ بیگم سابقہ پرنسپل ویمنس کالج نے صدرِ محفل محترمہ مسز برہان الدین کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ مسز برہان الدین نے سماجی فلاحی خدمات کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا ہے ان کے ہاں وہ تمام اعلیٰ صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک بے لوث خدمت گزار کا وطیرہ رہتا ہے۔ ونیز محترمہ خدیجہ ہاشمی نے اپنے مضمون "باتیں ادھر کی" سنا کر داد تحسین حاصل کی پاکستان میں خواتین کی علمی ادبی سماجی و تہذیبی سرگرمیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہاں کی عورتیں زندگی کو زندگی سمجھ کر زندگی گذارتی ہیں۔ صدرِ جلسہ نے محفل خواتین کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ اس محفل کی وجہ سے حیدرآباد میں پڑھی لکھی خواتین میں اچھا خاصا ادبی ذوق پیدا ہو چکا ہے۔ محترمہ انور حیدر الدین نے دکنی زبان میں مزاحیہ خاکہ سنا کر داد تحسین حاصل کی محترمہ رضیہ سلطانہ شاہین نے مضمون پڑھا۔ ادبی اجلاس کے بعد محفل شعر میں ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید سلطانہ شرف الدین از حیدر، نایاب سلطانہ، ع۔ یزدانی صبا، فاطمہ تاج، منظور النساء ناز، آر با نوادر رضیہ سلطانہ شاہین نے کلام سنایا۔ یہ خوشگوار محفل محترمہ فاطمہ عالم علی خاں معتمد محفل خواتین کے شکریہ پر اختتام کو پہونچی۔

○ ۱۹ر جولائی ۱۹۹۲ء پاسبانِ ادب کے زیرِ اہتمام غیر طرحی مسالمہ بمکان جناب محمود احمد فریدی نزد درگاہ شاہ خاموش نامپلی زیرِ نگرانی جناب سید غلام محی الدین ابرو منعقد ہوا۔ جناب رؤف رحیم نے نظامت کے فرائض انجام دیئے مسالمہ میں مسرور نقیب، محمود شرقی، عزیز ناگپوری، رؤف رحیم، ڈاکٹر سید حسن، داؤد مومنی، احمد فریدی، ساقی ایوبی، کامران حیدر، ع۔ یزنے واقعاتِ کربلا پر روشنی ڈالی۔ جناب صدر بزم پاسبان ادب کے شکریہ پر مسالمہ کی یہ مبارک محفل اختتام کو پہونچی

آئندہ مشاعرہ ۲۳؍ اگست ۱۹۹۲ء کو ہوگا جس کے لیے طرح دی گئی ہے ۔" یاد اب بھی نہیں ہے کہ کہاں رہتے تھے"

○ ۱۹؍ جولائی ۱۹۹۲ء انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی جانب سے آئے ہوئے مہمان شاعر پروفیسر کلیم احمد عاجز کا ایک خیر مقدمی جلسہ بمقام اردو ہال حمایت نگر ڈاکٹر سید عبدالمنان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سعید باغزال نے مہمان کی حیثیت سے شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب نے خیر مقدمی تقریر میں کہا کہ پروفیسر کلیم احمد عاجز غزل کے باکمال شاعر ہیں۔ ان کی شاعری دلوں کو چھو لینے والی ہوتی ہے ۔ بعد ازاں محفل شعر منعقد ہوئی ۔ میزبان شعرا میں مسرز رحمٰن جامی، منظور احمد منظور، قدیر انصاری، صادق نوید نے کلام سنایا۔ مہمان شاعر پروفیسر کلیم احمد عاجز نے پانچ خوبصورت غزلیں سنا کر بے پناہ داد حاصل کی۔ ان کے ہر شعر کو سامعین نے بار بار سنا۔ آخر میں صدرِ محفل ڈاکٹر سید عبدالمنان کے شکریہ پر یہ پُراثر محفل شعر اختتام کو پہونچی۔

○ ۲۶؍ جولائی ۱۹۹۲ء ادارہ ادب اسلامی حیدرآباد کا ماہانہ طرحی مشاعرہ پتھر بازار میں بصدارت ممتاز شاعر جناب کلیم قریشی منعقد ہوا۔ مولانا عبدالعزیز نائب امیر جماعت اسلامی ہند نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی ابوالفاروق شعور نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ تلاوت و ترجمانی قرآن اور مسرز حیری القادری، ڈاکٹر غیاث عارف، کمال صدیقی، خالص صدیقی اور ابوالفاروق شعور کے طرحی نعتیہ کلام کے بعد غزل کے دور کا آغاز ہوا۔ صدر مشاعرہ جناب کلیم قریشی کے علاوہ مسرز روحی قادری، نیلم علی عدیل، داؤد نصیب، ابوالفاروق شعور، نذیر نیر، خواجہ ضمیر، راغب فاروقی، محمود شریف محمود، مسعود جاوید ہاشمی، ستار صدیقی، کلیم ـ لبق، قاضی سعید فیضانی، حبیب گونڈیاوی، اقبال ہاشمی، حلیم رضا، سرفراز سحر

قمر رضا، اسماعیل ظریف، رؤف رحیم، شاہد عدیلی، بے تس الہ آبادی، مظہر محی الدین، مظہر
ڈاکٹر خورشید ماجد، ڈاکٹر سید حسن، محبوب علی منصور، شمس زماں اور شمیم حیدر آبادی نے
کلام سنا کر داد پائی۔ آخر میں مہمان خصوصی نے خطاب کرتے ہوئے شعراء کے کلام کو سراہا
اور تعمیری ادب کو فروغ دینے کی ضرورت پر زور دیا۔ جناب محمود شریف محمود نے صدر
مشاعرہ کو تحفتاً "اسوۂ حسنہ" کتاب نذر کی اور شکریہ ادا کیا۔ ادارہ کا آئندہ
مشاعرہ ۱۶؍ اگست ۹۲ء کو جناب رؤف خلش کی صدارت میں بطرح "قہقہوں کے بعد آنکھوں
میں نمی رہ جائے گی" منعقد ہوگا۔

○ ۲۷؍ جولائی ۹۲ء مرکز ادب حیدر آباد کے زیر اہتمام مومن خاں شوق
(اشرف ولا) ملے پلی منعقد ہوا۔ جسکی صدارت ممتاز شاعر جناب صلاح الدین نیر
صاحب نے کی۔ ڈاکٹر سراج الحسین مہمان خصوصی تھے۔ ادبی اجلاس و مشاعرہ کی
کارروائی مومن خاں شوق معتمد عمومی ادارہ نے بڑی عمدگی سے چلائی۔ ابتداء میں
جناب محمد قمر الدین صابری نائب صدر ادارہ نے مہمانوں کا استقبال اور خیر مقدمی
تقریر کی۔ جناب منظور احمد منظور نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر
سراج الحسین امریکہ جیسے ملک میں رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو تہذیبی، مذہبی
اور سماجی خدمات سے وابستہ رکھا ہے۔ کلیولینڈ (امریکہ) میں آپ نے "بزم ادب"
قائم کیا اور پابندی سے وہاں ادبی اجلاس و مشاعرہ منعقد کراتے آرہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب
اسلامک یونیورسٹی جیسے بڑے پراجیکٹ کو بلند ہمتی سے چلا رہے ہیں اور آج کل وہ
اس یونیورسٹی کے صدر ہیں۔ اردو میں اچھے شعر کہتے ہیں آپ کا تخلص مسیحا ہے۔ آپ کا
وطن حیدر آباد ہے اور آپ ممتاز شاعر جناب ع۔ ز۔ بھارتی کے برادر حقیقی ہیں۔
ڈاکٹر سراج الحسین نے اپنی تقریر میں وہاں کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ

جناب گوہر مراد آبادی کے ساتھ اردو بزم ادب کو چلا رہے ہیں اور وہاں اردو ماحول کو بنائے رکھے ہیں انہوں نے کہا کہ شگاگو میں اردو کے بین الاقوامی مشاعرے ہوتے رہتے ہیں مگر انہیں تعجب ہے کہ ان مشاعروں میں حیدرآباد کے شعرا کو مدعو نہ کیا جاتا ہے جبکہ حیدرآباد میں کئی قابل و نامور شعرا موجود ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا وہ امریکہ میں ایسا ماحول پیدا کریں گے کہ حیدرآبادی شعرا بھی وہاں مدعو کئے جا رہیں۔ جناب صلاح الدین نیر صدر ادبی اجلاس و مشاعرہ نے اپنی صدارتی تقریر میں خاص طور پر ڈاکٹر سراج الحسین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے شہر حیدرآباد کی علمی ادبی تہذیبی سرگرمیاں سارے ملک کے لیے مثالی ہیں اور شعر و ادب کی سرگرمیوں کا تسلسل جو ہمیں ورثے میں ملا ہے آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری ہے۔ ادبی اجلاس کے فوری بعد غیر طرحی مشاعرہ ہوا جس میں صدر مشاعرہ جناب صلاح الدین نیر، مہمان خصوصی ڈاکٹر سراج الحسین کے علاوہ مرزا منظور احمد، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، عزیز بھارتی، صادق نوید، گیان سنگھ شاطر، ڈاکٹر مسعود جاوید ہاشمی، محمد قمر الدین صابری، مومن خاں شوق، منان منظور، علیم (محبوب نگر)، حلیم رضا اور ڈاکٹر سید حسن نے اپنا منتخب کلام سنایا اور داد تحسین حاصل کی۔ اس خوشگوار محفل کا اختتام مومن خاں شوق کے شکریہ پر ہوا۔

۲۸ر جولائی ۹۲ء ۱۱ بجے دن شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد میں پروفیسر سیدہ جعفر صدر شعبۂ اردو کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا جس میں پروفیسر گیان چند جین نے اردو کے مشہور نقاد شمس الرحمن فاروقی کی تصنیف "شعر شور انگیز" پر تبصرہ کیا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے پروفیسر جین کے بارے میں کہا کہ وہ شعبۂ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد کے اولین معماروں میں سے ہیں۔ گذشتہ چار دہائیوں میں

پروفیسر جین نہایت منکسر المزاجی، خاموشی اور خلوص کے ساتھ اردو کی خدمت میں منہمک ہیں۔ ان کی بیش بہا تصانیف اُردو کے تحقیقی سرمائے میں یقیناً قابل قدر اضافہ ہیں۔ پروفیسر جین نے شعر شور انگیز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب اپنے تنقیدی شعور اور علمیت کے اعتبار سے اُردو کے ایک منفرد اور ممتاز نقاد ہیں۔ انھوں نے اپنی اسی تصنیف میں میر کے کلام کی جس انداز سے تشریح کی ہے وہ فکر انگیز بھی ہے اور بصیرت افروز بھی۔ لیکن انھوں نے میر کے بعض ایسے اشعار کو بہت سراہا ہے جو ان کے بہترین کلام میں شامل نہیں ہے اور انھوں نے ہر غزل کے تین اشعار تک اپنے انتخاب کو محدود رکھا ہے۔ پروفیسر مجاور حسین رضوی نے کہا کہ شعر شور انگیز میں میر کی بعض نمائندہ غزلوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر رحمت یوسف زئی لکچر شعبہ اردو کے تشکر پر یہ ادبی محفل اختتام کو پہنچی۔ اس جلسہ میں ڈاکٹر محمد انوار الدین ریڈر شعبۂ اُردو ڈاکٹر میر محبوب حسین کے علاوہ ریسرچ اسکالرز طلباء طالبات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

○ ۲۸ جولائی ۹۲ء ۶ بجے شام ادارہ ادبیات اُردو کی جانب سے ایوان اُردو میں ایک ادبی و خیر مقدمی جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی صدارت جناب سید ہاشم علی اختر صدر ادارہ ادبیات اُردو اور سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد نے کہا کہ حیدرآباد ایک جنت نشان شہر ہے مجھے اپنے ساتھی اساتذہ شاگرد شہر کے دانشور اور خاص طور پر یہاں کی پُر اثر فضا نے جو کچھ دیا ہے میں فراموش نہیں کر سکتا۔ پروفیسر جین نے اس تقریب میں پروفیسر آل احمد سرور کی خود نوشت کے ہر حصہ پر کھل کے تبصرہ کیا اور کہا کہ پروفیسر آل احمد سرور نے اپنی زندگی کے مختلف پہلوں اور ادوار پر اس انداز سے خامہ فرسائی کی ہے کہ بہت سی نجی باتیں بھی ضبط تحریر لائی گئی ہیں۔ پہلے وہ ترقی پسندوں کی تائید میں رہے پھر جدیدیت کو پسند کیا لیکن ایسا کیوں کیا کوئی خاص

محمد نہال احمد صدیقی، پی ایچ ڈی اسکالر
سنٹرل یونی ورسٹی آف حیدرآباد

سوال آپ کے جواب ہمارے

اس ماہ سے ہم نے "شاداب" کو مزید دلچسپ اور متنوع بنانے کے لئے سوال و جواب کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ ادبی، سیاسی اور معلوماتی سوالات مختصراً روانہ کرسکتے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ آپ کے سوالات کا جواب دیا جائے۔ فلمی اور غیر اخلاقی و فحش سوالات کے جوابات نہیں دیئے جائیں گے۔ ہماری درخواست پر جناب محمد نہال احمد صدیقی پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر حیدرآباد یونی ورسٹی نے جوابات دینے کی ذمہ داری قبول کی ہے جس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔ (ایڈیٹر)

(۱) محمد راشید۔ قلعہ گولکنڈہ حیدرآباد

س: آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کون تھے؟

ج: مولانا ابوالکلام آزاد جو اردو کے بھی ایک عالم اور ادیب تھے۔

---

(۲) محمد شکیل احمد، سلطان شاہی، حیدرآباد

س: آزادی کے بعد ہندوستان میں دستور کی تیاری کے لیے قائم کی گئی کمیٹی کی صدارت کس نے کی تھی؟

ج: بابا صاحب ڈاکٹر بھیم راؤ رامجی امبیڈکر نے

---

(۳) سید رفعت محمود، چنچل گوڑہ، حیدرآباد

س　آزادی کے بعد بھارت کے ترنگے کو پہلی بار بنا کر مہاتما گاندھی کو کس نے پیش کیا تھا؟

ج　شری پنگلی وینکیا۔ جن کا تعلق ہماری ہی ریاست آندھرا پردیش سے تھا۔

---

(۴) محمد جیون ــ چنچل گوڑہ، حیدرآباد

س　غیر سماجی رسم "ستی" کو کس نے مٹایا تھا؟

ج　شری راجہ رام موہن رائے نے

---

(۵) محمد مسعود، ملک پیٹ، حیدرآباد

س　مشرقی پاکستان کا نیا نام کیا ہے؟

ج　بنگلہ دیش

---

(۶) محمد حامد صدیقی۔ گلبرگہ (کرناٹک)

س　بھارت رتن ایوارڈ حاصل کرنے والی پہلی ہندوستانی خاتون کون تھیں؟

ج　شریمتی اندرا گاندھی

---

(۷) سید پاشاہ ۔ جہاں نما، حیدرآباد

س　شانتی نکیتن کو کس نے قائم کیا تھا؟

ج　شری رابندر ناتھ ٹیگور نے

---

(۸) رفیق احمد کھڑکی بوڑملی شاہ، حیدرآباد

س　"جے جوان اور جے کسان" کا نعرہ کس نے دیا تھا؟

ج　شری لال بہادر شاستری جی نے جو ہمارے ملک کے دوسرے وزیر اعظم تھے۔

۹ محمد عبدالغفور، خیریت آباد، حیدرآباد

س علامہ اقبال کا کوئی مشہور شعر جو کہ نوجوانوں سے متعلق ہو سنائیں!

ج سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

---

۱۰ محمد فاروق۔ راج بھون، حیدرآباد

س آزادی کے بعد بھارت میں پہلی خاتون گورنر کون تھیں؟

ج شریمتی سروجنی نائیڈو جن کا تعلق ہمارے ہی شہر سے تھا اور جو اترپردیش کی گورنر تھیں۔

---

۱۱ سید عبدالرشید پیراں، وجے نگر کالونی حیدرآباد

س حیدرآباد کے مشہور کمیونسٹ قائد کون تھے؟

ج جناب مخدوم محی الدین جو اردو کے ممتاز شاعر بھی تھے۔

---

۱۲ محمد قیم علیم الدین، ریسرچ اسکالر

س عالمی ریکارڈ قائم کرنے والی حیدرآباد کی دو مشہور شخصیتیں کونسی ہیں!

ج جناب محمد اظہر الدین (کرکٹر)
شری راکیش شرما (خلا باز)

---

۱۳ محمد کامران رفیق۔ آصف نگر، حیدرآباد

س خدمت خلق کو اپنی زندگی کا نصب العین بنانے والی ہندوستان کی عالمی شہرت یافتہ خاتون کون ہے۔

ج مدر ٹریسا

---

(۱۴) درگا پرشاد۔ اے سی گارڈ، حیدرآباد
س اُردو غزل کی طرح پہلی بار تلگو میں غزل کی ایجاد کس نے کی ؟
ج ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی نے جنہیں گیان پیٹھ ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

---

(۱۵) حمیدہ بیگم، ملے پلی، حیدرآباد
س آزادی کے بعد پہلی بار ہندوستان نے کس ملک سے اور کب جنگ لڑی ؟
ج چین سے ۱۹۶۲ء میں

---

(۱۶) محمد الیاس۔ حمایت نگر حیدرآباد
س ریاست آندھرا پردیش کے وہ کونسے گورنر ہیں جنہیں سب سے زیادہ وزراء کو حلف دلانے کا اعزاز حاصل ہے ؟
ج مسٹر کے۔ سی۔ ابراہم۔

---

(۱۷) کریم الدین خاں، نظام آباد
س آندھرا پردیش کے پہلے وزیر اعلیٰ کون تھے ؟
ج نیلم سنجیوا ریڈی

---

(۱۸) رشیدہ خاتون، عثمانیہ یونیورسٹی
س ہمارے ملک میں مسلمان نائب صدر جمہوریہ کون ہوتے ہیں ؟
ج جسٹس محمد ہدایت اللہ صاحب

---

(۱۹) پریم کمار۔ راجندر نگر
س وہ کونسے پہلے مرکزی وزیر ہیں جنہوں نے اخلاقی ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے کابینہ سے استعفیٰ دیدیا تھا ؟
ج مسٹر لال بہادر شاستری

(۲۰) محمد سیف الملک صلاح الدین مگر - لکڑی کا پل، حیدرآباد۔

س "آزادی میرا پیدائشی حق ہے"۔

اس نعرہ کو کس نے بلند کیا تھا؟

ج شری بال گنگا دھر تلک نے جو مہاراشٹر کے ممتاز مجاہد آزادی تھے۔

---

(۲۱) میر مجاہد علی، حبیب نگر، حیدرآباد

س "اندرا میری بہن ہے" کس نے کہا تھا؟

ج پی ایل او کے صدر جناب یاسر عرفات نے

---

(۲۲) ایم۔اے۔ باسط۔ زمستان پور۔ حیدرآباد

س "شیر پنجاب" کا پورا نام کیا تھا؟

ج شری لالہ لجپت رائے۔

---

(۲۳) محمد عارف الدین۔ نارائن گوڑہ، حیدرآباد

س حال ہی میں ہماری ریاست کے مشہور مجاہد آزادی کو نکسلیٹوں نے

ہلاک کر دیا تھا، ان کا نام؟

ج شری ٹی۔ ہیگریوا چاری

---

(۲۴) محمد معراج الدین مسعود۔ پان منڈی

س ہماری ریاست کے کس شاعر کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

ج ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی کو

---

(۲۵) محمد محی الدین۔ ٹولی چوکی۔ حیدرآباد

س تعمیر ملت کے لیے اپنی جان کی بے نقد قربانی کس نے پیش کی تھی؟

ج نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے

محی الدین ۔ نارائن گوڑہ، حیدرآباد۔
ڈگری کالجس میں انٹرنس ٹیسٹ کو برخواست کرنے والے وائس چانسلر کا نام ؟
جناب سید ہاشم علی اختر، آئی اے ایس

عبدالقادر، کاروان، حیدرآباد
حیدرآباد کے پہلے اردو ناول نگار کون تھے ؟
مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد

افسر، شاہ عنایت گنج، حیدرآباد
آندھرا پردیش کے پہلے مسلم وزیر داخلہ کا نام کیا تھا ؟
نواب میر احمد علی خاں صاحب

نسیم آنسہ ۔ گجی باولی، حیدرآباد
حیدرآباد کے ۴۰۰ سالہ تقاریب کو کیوں ملتوی کردیا گیا ؟
سیاسی حالات ناسازگار ہونے کی بنا پر

شاہدہ بیگم، حبیب نگر، حیدرآباد
بابری مسجد اور رام جنم بھومی کی متنازعہ مقام پر کس وزیراعظم کے دور میں شیلانیاس کا آغاز عمل میں لایا گیا تھا ؟
شری راجیو گاندھی کے دور وزارت عظمیٰ میں انہیں کی اجازت سے ۔

آپ کے خطوط

ادارہ "شاداب" کو ہر ماہ گزشتہ شمارہ کے بارے میں خطوط موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس شمارہ سے قارئین کے چند منتخبہ خطوط شائع کریں یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ (ایڈیٹر)

اظہار الحق ۔ اورنگ آباد

" شاداب" کا انجمن ترقی اردو ریاستی کنونشن نمبر نظر سے گزرا۔ بہت پسند آیا۔ آپ نے اس شمارہ میں کتابت کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ دی اس معیار کو آئندہ بھی جاری رکھیئے۔ آپ کا رسالہ آتے دو چھ ماہ میں دس سال مکمل کرے گا۔ یہ کسی اور رسالہ کے لئے بہت بڑا کارنامہ ہے۔ زیر نظر شمارہ میں اُردو کے تعلق سے آپ نے جو مواد دیا ہے وہ خوب ہے۔ خصوصاً ڈاکٹر سید حامد حسین " اُردو کیوں پڑھیں کیوں پڑھائیں " مجھے بہت پسند آیا۔ مصطفےٰ شیروانی کا ' حاجی عبیدالرحمن خاں شیروانی پر مضمون بھی پسند آیا ان سے ایسے شخصیات پر اور بھی مضامین لکھوایئے۔

شیخ ظہور ۔ ناندیڑ

ایک لائبریری میں " شاداب" کا مئی ۹۲ء کا شمارہ نظر سے گزرا اس سے قبل بھی گاہے ماہے " شاداب " نظر سے گزرتا رہتا ہے۔ زیر نظر شمارہ میں آپ کا مضمون " جہیز اور قانون " پسند آیا۔ رشید الدین کی بچوں کے لیے تصنیف " خیالی پلاؤ " پر تبصرہ

تھا۔ ان ہی کے بارے میں سیدہ مہر صاحبہ کا مضمون بھی اچھا رہا۔ محبوب راہی اور
ن نظام آبادی کی غزلیں پسند آئیں آپ اس میں ادبی و سیاسی نیز عام نوعیت کے
الات و جوابات کا سلسلہ بھی شروع کریں تو بہتر ہوگا۔

منظور عالم ۔ الوت مال

آپ کا پرچہ نظر سے گزرتا رہتا ہے ۔ اس کی ایک بات مجھے بہت اچھی لگی کہ اسے
، پابندی کے ساتھ شائع کرتے رہتے ہیں۔ حالیہ شمارہ انجمن ترقی اردو ریاستی کنونشن
صاحبہ کے مندرجات پسند آئے۔ آپ اس میں ادبی جلسوں کی رودادیں اور سماجی
سرگرمیوں کی جو رپورٹیں پیش کرتے ہیں میں انہیں دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں جس سے
علوم ہوتا ہے کہ اُردو کے شہر حیدرآباد میں کیا ہو رہا ہے ۔ اس شمارہ میں بھی
ن خاں شوق کے کلام اور صادق نوید کے مضمون پر جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں
ے گئے پر رپورٹ نظر سے گزری۔

سید محمود انور

میں "شاداب" کا سالانہ خریدار ہوں اور ہر ماہ اسے پابندی سے پڑھتا ہوں۔
دفعہ ڈاک کی خرابی سے پرچہ نہیں مل پاتا تو ایک عجیب سی کمی کا احساس ہوتا ہے ۔
اُردو کی جو خدمت اس پر آشوب زمانہ میں کر رہے ہیں وہ قابل تعریف ہے ۔
احساس ہے کہ اس زمانہ میں اُردو کے ادبی رسالے نکالنا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔
ن بعض شوریدہ سر آج بھی یہ کام انجام دے رہے ہیں ۔ آپ سے گذارش ہے کہ
حالات کچھ بھی ہوں آپ "شاداب" کو جاری رکھئے ۔ ہم جیسے لوگ آپ کے ساتھ ہیں ۔

وہاب انصاری ۔ مالیگاؤں

یہاں کی اُردو لائبریری میں "شاداب" آتا ہے ۔ میں اسے وہیں پڑھتا ہوں۔

تو بہت چاہتا ہے کہ میں اس کا سالانہ خریدار بن جاؤں اور گھر بیٹھے اطمینان کے ساتھ اس کا مطالعہ کروں۔ لیکن طالب علم ہوں۔ مجبور ہوں - پہلے ہی ماں باپ پر میری تعلیم کا بار ہے۔ ایسی صورت میں انہیں مزید زیر بار نہیں کرنا چاہتا لیکن چونکہ ادب کا شوق ہے اس لیے اسے لائبریری کے ذریعہ پورا کر لیتا ہوں۔

رونق افروز۔ دیگلور

میں "شاداب" بہت عرصہ سے پڑھتا ہوں۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک ایسا پرچہ ہے جو ایک ساتھ ادبی بھی ہے سماجی بھی ہے اور معلوماتی بھی۔ خصوصاً آپ اس میں اُردو کے بارے میں جو مواد دیتے ہیں اس سے آپ کی اُردو دوستی کا پتہ چلتا ہے ویسے بھی اس زمانہ میں اُردو کا رسالہ نکالنا بہت مشکل کام ہے میری نیک تمنائیں آپکے اور آپکے پرچہ کے ساتھ ہیں۔ لیکن ایک گزارش بھی ہے۔ آپ اسے مزید دلچسپ بنانے کی کوشش کریں۔ بعض شمارے بہت روکھے پھیکے جاتے ہیں۔

رشید تنویر۔ جالنہ

میرے شہر کو میں اُردو کا شہر تو نہیں کہہ سکتا لیکن یہ میرا تجارتی شہر بھی نہیں ہے۔ یہاں اُردو کا ماحول ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میرے شہر سے یوسف ناظم اردو کا بڑا مزاح نگار تعلق رکھتا ہے۔ ملکِ جالنوی بھی اسی شہر کے تھے اور منظر جالنوی بھی اسی شہر میں رہتے ہیں۔ یہاں اُردو کے تعلیمی ادارے بھی ہیں جہاں سے تعلیم پائے ہوئے آج بڑی بڑی خدمات پر ہیں۔ میں بھی جالنہ ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ بہت دن سے آپ کو خط لکھنا چاہ رہا تھا لیکن انجمن ترقی اردو ریاستی کنونشن نمبر دیکھ کر مزید رک نہ سکا۔

خالدہ ضیاءُ۔ پربھنی

چونکہ مجھے ادب سے فطری ذوق ہے اس لیے "شاداب" پڑھتی رہتی ہوں۔ اسے آپ بہت ماہنہ شائع کریں اور مضامین [illegible]

قد ترکتُ فیکمُ الثقلین کتاب اللہ و سنّتی (فرمانِ رسولؐ)

ثقلین نمبر

(کتاب اللہ و سنت رسولؐ نمبر)

شاداب

فون نمبر 229161

ایڈیٹر
محمد قمر الدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر
رشید الدینؔ

مینیجنگ ایڈیٹر
کلیم الدین احسنؔ

حیدرآباد

ر (9) شمارہ (9)

ستمبر ۱۹۹۲ء

قیمت عام شمارہ =/6 زر تعاون قیمت شمارہ ہذا =/15

دستان	65 روپے سالانہ	120 روپے	تاحیات 1500 روپے
ممالک	200 〃	360 〃	3700 〃
یکہ	40 ڈالر	70 ڈالر	700 ڈالر
لستان	25 پونڈ	45 پونڈ	400 پونڈ
ستان	175 پاکستانی روپے	300 پاکستانی روپے	3000 پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ شاداب 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004

پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار سے چھپوا کر دفتر شاداب ریڈ ہلز حیدرآباد ۴ سے جاری کیا۔

فہرست

مولانا عبدالحق حقانی دہلوی

دین کی بنیاد

پس دین میں چار چیزیں اصل اصول ہیں۔ یہ [illegible] جن چیزوں پر کہ شرع کی بنیاد ہے وہ چار چیزیں ہیں جو ان چار سے ثابت نہیں وہ دین میں شمار نہ کی جاوینگی ان میں سب سے اول قرآن مجید ہے قرآن سے مطلب سمجھنے کی چار صورتیں ہیں عبارۃ النص، اشارۃ النص، دلالۃ النص، اقتضاء النص۔ کس لئے کہ اگر قرآن کے الفاظ سے خاص مقصود کے لیے بولے گئے ہیں یا یہ کہ ان سے مقصود تو کچھ اور ہے لیکن اس کے ضمن میں کچھ اور وہ بھی ثابت ہو جاتا ہے پس قسم اول کو عبارۃ النص اور قسم دوم کو اشارۃ النص کہیں گے جیسا کسی نے کسی چیز کو دیکھا اور اس کے گوشہ چشم سے اس کے آس پاس کی چیزیں بھی مقصود دیکھنے سے نہ تھیں نظر آگئیں۔ پس اس چیز مقصود بالذات کا دیکھنا بمنزلہ عبارۃ النص کے ہوا اور آس پاس کے چیزوں کا دیکھنا بمنزلہ اشارۃ النص کے مثال ان کی قرآن کی یہ آیت ہے وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ۔ الآیۃ معنی اس کے یہ ہیں اور جس کی اولاد ہے اسی پر ان کے مرضعات کا

کھانا اور کپڑا لازم اور واجب ہے یعنی لڑکے کے باپ پر دودھ پلانے والی کا کھا
اور کپڑا واجب ہے یا تو اسلئے کہ وہ اس کی بیوی ہے یا اسلئے کہ اس کے بیٹے کو دودھ
ہے۔ بہرطور اللہ تعالیٰ کا ان الفاظ سے یہ مقصود ہے کہ باپ پر اولاد کی پلائی کا کھ
اور کپڑا واجب ہے پس یہ مضمون عبارۃ النص سے سمجھا گیا ہے اور اس کے ضمن میں ا
بھی سمجھا گیا ہے کہ لڑکا باپ ہی کا ہے یہ مضمون اشارۃ النص سے سمجھا گیا اور یا
سے استدلال نہیں بلکہ معنے سے ہے اب یہ بھی دو حال سے خالی نہیں یا تو با اعتبار
لغت کے ان معنی سے کوئی اور چیز سمجھی جاوے گی تو وہ دلالۃ النص ہے یا ان معنی
صحت کسی چیز پر موقوف ہے خواہ بطور عقل کے خواہ بطور شرع کے پس یہ چیز کہ جو
ان معنی کی صحت موقوف تھی اقتضاء النص سمجھی جاوے گی اور اس دلالت کو اقتضاء النص کہ
مثال دلالۃ النص کی یہ ہے قال تعالیٰ ولا تقل لهما اف ولا تنهرهما یعنی ماں
باپ کو اف نہ کہہ اور نہ جھڑک عبارۃ النص سے تو ماں باپ کو اف کہنا اور جھڑکنا م
سمجھا گیا اور اس سے ان کو تکلیف دینا جو لازم معنی تھا وہ بھی بطور دلالۃ النص ح
سمجھا گیا پس ماں باپ کو مارنا اور تکلیف دینا بطور دلالۃ النص کے حرام سمجھا گیا۔ م
اقتضاء النص کی قال تعالیٰ اقیموا الصلوٰۃ یعنی نماز پڑھو پس نماز کا پڑھنا بطور ع
ے سمجھا گیا لیکن شرع میں نماز بدون طہارت کے صحیح نہیں یہ طہارت کہ جس پر ن
صحت موقوف ہے اس قول سے با اقتضاء النص سمجھی گئی یا کسی نے اپنے نوکر سے
یہ کہا کہ مجھے پانی پلا پس پانی کی طلب بطور عبارۃ النص کے سمجھی گئی لیکن یہ پانی پ
اصلاً اس پر موقوف ہے کہ وہ کسی برتن میں پلاوے پس اس کلام سے
برتن کہ جس میں اپنے آقا کو پانی پلا سکے اقتضاء النص سمجھا گیا۔
پھر قرآن کی تعلیم کے بہت سے اقسام ہیں۔ عام۔ خاص۔ اوّل

ظاہر، نص، مفسر، محکم وغیرہ کہ کل بیس قسم ہوتے ہیں اور پھر ان کی تفصیل اور احکام وغیرہ علم اصول فقہ میں بہت شرح بسط کے ساتھ لکھے ہیں جسے زیادہ تحقیق منظور ہو وہاں دیکھ لے ف قرآن مجید کی تخمیناً پانسو آیت احکام کے لئے اصل ہیں کہ انہیں سے احکام الٰہی مستفاد ہوتے ہیں اور باقی قرآن میں کافروں کے عذاب اور ہلاکت اور مومنوں کے ثواب وغیرہ امور مذکور ہیں

دوم سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اصل دوسری سنّت نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ سنّت رسول سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول اور فعل اور کسی امر کو دیکھکر سکوت کرنا ہے۔ اول کو سنّت قولی دوسری کو فعلی اور تیسری کو تقریری کہتے ہیں سنّت قولی اس طرح پر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان مبارک سے کچھ فرمایا ہو۔ اور سنت فعلی یہ ہے کہ کوئی کام کیا ہو اور تقریری سنت یہ ہے کہ حضرت صلعم کے روبرو کسی نے کوئی کام کیا ہو۔ اور حضرت صلعم نے دیکھکر اسے منع فرمایا ہو سو یہ سب قسمیں سنت کی دلیل دین کی ہیں۔ اس طرح صحابی کا قول بھی اور فعل بھی سنت میں داخل ہے اور جمہور محدثین خاص قول اور فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حدیث کہتے ہیں اور باقی کو اثر۔ جو ملوک اور سلاطین کا حال بیان ہو اس کو خبر کہتے ہیں پھر مطلق سنت کی دو قسمیں ہیں ایک سنت الہدیٰ کہ جس کے ترک سے گنہگار ہوتا ہے اور اسی کو سنت مؤکدہ بھی کہتے ہیں جیسے جماعت اور اذان وغیرہ دوسری سنت الزوائد کہ جس کے ترک سے گناہ لازم نہ آوے جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس اور قعود قیام کی روش ف جن احادیث سے احکام ثابت ہیں تخمیناً تین ہزار ہیں۔ سوال یہ اتفاق جمہور علماء نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے تھے حکم الٰہی سے فرماتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں خبر دیتا ہے وما ینطق عن الھویٰ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی خواہش اور

خواہش سے بدون امر الٰہی کے دین میں اور نہیں بولتے پس کتاب اللہ بھی امر الٰہی ہے
اور سنت رسول اللہ صلعم بھی پھر کتاب اللہ کا اول مرتبہ کیوں مقرر کیا؟ اور سنت کو دوسرے
مرتبہ میں کیوں رکھا؟ دوسرے قرآن بھی حضرت صلعم کی زبان سے ہمکو پہنچا ہے اور سنت
بھی آپ ہی سے ثابت ہے جواب کتاب اللہ قطعی الثبوت ہے اور سنت بطور ظن کے
ثابت ہے اور ظنی چیز پر یقینی کا مرتبہ مقدم ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
سے جو بطور سند کے صحیح کے ہم تک پہنچتی ہے تو وہ مقبول ہوتی ہے اور سند صحیح یہ ہے
کہ ہم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک جس قدر روایت کرنے والے ہیں سب عاقل اور
دیندار اور صحیح الحافظہ ہوں اور ایک دوسرے سے متصل روایت کرے بیچ میں نہ کوئی
رہ جاوے مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم ابوہریرہؓ صحابی کسی حدیث کو نقل کریں اور پھر ان سے
اسی حدیث کو اعرج اور پھر ان سے ابی الزناد اور پھر ان سے امام مالکؒ روایت کریں
پس امام مالکؒ تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والے ابی ہریرہؓ صحابی اور
اعرج اور ابی الزناد ہیں اور یہ تینوں شخص عاقل اور دیندار اور صحیح الحافظہ ہیں اور
ایک دوسرے سے نقل کرتا ہے ان کے بیچ میں کوئی اور چوتھا شخص نہیں رہ گیا
سو اس سند کو سند صحیح کہتے ہیں اور اس حدیث کو مرفوع کہتے ہیں اگر کسی راوی
صحابی تک ہی سند پہنچائی تو اس حدیث کو موقوف کہتے ہیں اور اگر تابعی تک پہنچا
اور آگے صحابی تک سند نہ چلی تو اسکو منقطع کہتے ہیں کہ بیچ سے سلسلہ کٹ گیا حضرت
تک نہ پہنچا ہاں اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاوے گی تب اس کو حدیث متصل
کہیں گے کہ حضرت تک اس کا اتصال ہو گیا اور اگر بیچ میں کوئی راوی کم عقل یا بے دین
یا خراب حافظہ کہ بھول جانے کی اسکو عادت ہو آ جاویگا تو یہ حدیث متصل بھی ضعیف کہلاویگی
اور حدیث کو قوی جب کہیں گے کہ اس کے راوی قوی ہوں گے علیٰ ہذا القیاس جس طرح

جس قدر معتبر اور قوی راوی ہوں گے اُسی قدر وہ حدیث قوی ہو گی اسی لیے حدیث کی کتابوں میں صحیح بخاری سب سے قوی اور معتبر ہے اس کے بعد صحیح مُسلم اس قسم کے اعتبارات سے احادیث کے بہت سے اقسام ہیں کہ اُن کو علم اصول اور حدیث میں علما نے خوب صراحت سے لکھا ہے حدیث کی ایک ہی سند ہو تو اس کو غریب کہتے ہیں اور جس کی دو سند ہوں اُسکو حدیث عزیز جس طرح امام مالکؒ مثلاً ایک حدیث کو اُسی پہلی سند سے روایت کریں اور دوسری سند اسکے یوں لادیں کہ امام مالکؒ نافع سے نافع عبداللہ بن عمرؓ صحابی سے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کریں اور جس کی دو سے زیادہ تین۔ چار۔ پانچ۔ دس۔ بیس سند ہوں لیکن گنتی کی ہوں اُسکو حدیث مشہور کہتے ہیں اور تینوں قسم کو آحاد کہتے ہیں جسکی بے شمار سند ہوں اور ہر مرتبہ میں بے شمار راوی روایت کرتے ہوں اور عقل اس قدر آدمیوں کا جھوٹا ہونا محال سمجھے تو اس کو حدیث متواتر کہتے ہیں اور خاص متواتر قطعی الثبوت ہے بخلاف عزیز اور غریب و مشہور کے کہ اُن کے ثبوت میں ظن ہے جیسے شہر مکّہ یا مدینے کے موجود ہونے کو بے شمار لوگ بیان کرتے ہیں کہ سب کو عقل جھوٹا نہیں جانتی لیس اس خبر متواتر سے شہر مکّہ یا مدینہ کے موجود ہونے کا یقین ہو جاتا ہے جس قدر احادیث ہیں وہ خبر آحاد سے ثابت ہیں ہاں دو یا تین حدیثیں خبر متواتر سے ثابت ہیں اور قرآن مجید حرف بحرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خبر متواتر سے ثابت ہے اس سبب سے قرآن مجید کا ثبوت حضرت صلعم سے یقینی ہے اور احادیث کا ثبوت ظنی اس لیے کہ قرآن کو مقدم رکھا ورنہ قرآن بھی ہمکو حضرتؐ سے پہنچا اور احادیث بھی اس میں دونوں برابر ہیں یا قرآن کے الفاظ و معنی دونوں من اللہ ہیں بخلاف سنت[1] کے

---

[1] کہ اس کے فقط معانی اللہ کی طرف سے ہیں ۱۲ منہ

کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اپنی حیات میں احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ
کو لکھنے کی حاجت نہ تھی۔ بعد ان کے تابعین اور تابع تابعین نے جب یہ دیکھا کہ
اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب اٹھ گئے اب کوئی نہیں کہ اس سے دریافت
کیا کریں اور اب چند روز میں یہ دور بھی گذرنے والا ہے پھر زمانہ حضرتؐ سے
دور جا پڑے گا حضرتؐ کی احادیث پچھلے لوگوں کو صحت سے پہنچنی مشکل پڑ جائیں
اب زمانہ قریب اور اسناد میں راوی کم ہیں مناسب ہے کہ جو احادیث حضرتؐ
سند ہم کو پہنچی ہیں ان کو لکھ دیا جائے سو ان محدثین نے لکھنا شروع کیا پھر فن
میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن باعتبار صحت اور شہرت و قبولیت کے ان
چار طبقے ہیں صحت سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس کتاب کا مصنف التزام کرے کہ ا
میں سوائے حدیث صحیح یا حسن کے اور نہ لاوے اور اگر لاوے تو اس کے راوی کا حال
بیان کرے اور شہرت سے یہ مراد ہے کہ اہل حدیث طبقۃً بعد طبقۃٍ اس کتاب
سے مشغول ہوتے ہوں کہ اس کی احادیث کو روایت کرتے ہیں اور اس کی وضاحت
اور شرح کرتے ہوں اور قبول سے یہ مراد ہے کہ نقاد حدیث نے اس کو مانا ہو اور
اس پر اعتراض نہ کیا ہو اور صاحب کتاب کو ان احادیث میں مصیب جانتے ہوں
اور بلا انکار فقہا اس کی احادیث کو سند اور تمسک بناتے ہوں پس جس کتاب
یہ تینوں وصف کمال خوبی کے ساتھ پائے جائیں گے۔ وہ طبقہ اولیٰ میں شمار کی جائے
اور اس طبقہ میں محققین کے نزدیک تین کتابیں ہیں، اول موطا امام مالک رحمۃ اللہ
کہ سب سے اول تصنیف ہوا اور قریب ہزار شخص امام محمدؒ اور امام شافعیؒ اور یحییٰ
یحییٰ مصمودیؒ اور یحییٰ بن یحییٰ تمیمی اور قعنبیؒ کے اس کو روایت کرتے ہیں اور
جس قدر حدیث مرفوع اس میں ہیں اکثر صحیح بخاری میں ہیں گویا صحیح بخ

اس کی احادیث مرفوعہ کو مشتمل ہے گو آثار صحابہ و تابعین موطأ میں زائد ہیں دوم صحیح بخاری کہ جسکو امام عبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ نے تصنیف کیا بہت سے علما نے اس کو بخاری سے روایت کیا ہے سوم صحیح مسلم کہ جسکو امام ابوالحسنؒ مسلمؒ بن حجاج نیشاپوری نے تصنیف کیا سب اہل حدیث نے اُن کو قبول کیا ہے اور نہایت شہرت ان کی ہوئی ان تینوں کتابوں کی شرح میں کتاب مشارق الانوار بہت عمدہ لکھی ہے طبقہ دوم میں وہ کتابیں ہیں کہ ان تینوں صفحات میں صحیحین کے درجے کو نہ پہنچیں لیکن اُن کے قریب ہوں اور وہ یہ کتابیں ہیں جامع ترمذی ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی کی تصنیف، سنن ابوداؤد ابوداؤد اور سلیمان بن اشعث سجستانی کی تصنیف سنن نسائی ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی کی تصنیف اور ان چھ کتابوں کو صحاح ستہ کہتے ہیں ابن الاثیر نے جامع الاصول میں ان چھ کتابوں کی احادیث کو جمع کیا ہے اور ان کی مشکلات کی شرح اور غریب کا ضبط اور اسماالرجال وغیرہ متعلقہ کو خوب بیان کیا ہے گویا یہ کتاب صحاح ستہ کی شرح ہے۔

سوم اجماع اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا السلام تیسری اصل دین میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کا اجماع ہے پس جس امر میں اُمت[1] کا اتفاق ہو گیا وہ حق اور درست ہے کس لیے کہ یہ اُمت گمراہی پر کبھی متفق نہ ہوگی قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کنتم خیر اُمۃ تم اے اُمت محمدیہ اچھی اُمت ہو پس اچھی اُمت گمراہی پر متفق نہ ہوگی ورنہ اچھی نہ رہیگی اور تکذیب قرآن لازم آویگی اور علما جانیں ہے ومن یتبع غیر سبیل المومنین نولہٖ ما تولّیٰ و نصلہٖ جہنم وسآءت مصیرًا

---

[1] اُمت سے مراد علما وصلحا ہیں نہ عوام نہ جہلا ۱۲ منہ

یعنی جو شخص مومنین سے الگ ہو کر اور راہ چلے گا تو ہم اسکو وہی راہ چلا دیں گے اور پھر جہنم میں بٹھلائیں گے اور بلا وہ بُری جگہ ہے اس سے ثابت ہوا کہ مومنین جس راہ پر ہیں وہ درست ہے اور اُن کے خلاف پر چلنے والا گمراہ ہے جہنم میں جاویگا۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے لَن تَجتَمِعَ اُمَّتِی عَلیٰ ضَلَالَۃٍ یعنی میری اُمت کبھی کسی گمراہی پر متفق نہ ہو گی۔ وَ یدُ اللّٰہِ عَلیٰ الجَمَاعَۃِ وَمَن شَذَّ شُذَّ فِی النَّارِ اور جہاں کسی امر میں مسلمانوں کو باہم اختلاف ہو تو جس طرح کثرت ہو اُس راہ چلو کیونکہ جماعت پر اللہ کا ہاتھ رہتا ہے یعنی اللہ اُن کا طرفدار رہتا ہے پھر جو اُن سے الگ ہوتا ہے تو وہ اکیلا جہنم میں جاویگا۔ اور بہت احادیث صحیحہ اس امر میں وارد ہیں اور یہ خاص اس امت کو شرف حاصل ہے اور وجہ بھی اس کی ظاہر ہے کہ ایک دلئے دوسرے کی رائے کے ملنے کے بہت قوی ہو جاتی جس طرح بہت سے بال ملنے ایک قوی رسّی ہو جاتی ہے کہ توڑنے سے نہیں ٹوٹتی اگرچہ ایک ایک بال کو جدا جدا کر کے ہر کوئی توڑ سکتا ہے اسی طرح ایک ایک شخص اگرچہ غلطی کر سکتا ہے لیکن جب بہت سے ہونگے تو ایک کی رائے سے مل کر قوی ہو جاویگی۔ اجماع کے اقسام اور اسباب وغیرہ اصول فقہ میں مفصّل ہیں یہاں اُن کے ذکر حاجت نہیں

(چہارم قیاس مجتہدین) قیاس ایک حکم کو بسبب اشتراک علّت دو

---

۱ قیاس کو بعض نہیں مانتے وہ فرقہ ظاہریہ ہے جن کا سردار داوٗد ظاہری اصفہانی تھا اور اس کا ابن تیمیہ اور ابن حزم اور حال میں قاقا ملا کا تھا آج کل جو فرقہ غیر مقلد ہے وہ انہیں کا معتقد ائمہ مجتہدین کے مسائل اجتہادیہ میں تقلید یا پابندی ضروری نہیں جانتے اور عجیب ہے کہ ہر کسی کو آزادی عطا کرتے ہیں خواہ وہ قرآن و احادیث میں تدبیر کرنے کی لیاقت ہو یا نہ ہو اور سلف اہل سنت کو وہم بہم کرتے ہیں آج کل مسلمانوں میں اس جھگڑے نے اور بھی نفاق پیدا کر دیا۔ ۱۲ منہ

ثابت کرنا مثلاً تاڑی یا بھنگ یا افیون کو شراب کی طرح بسبب نشہ کے وہ دونوں
میں مشترک ہے حرام کر دینا حکم مخفی کو ظاہر کر دیتا ہے اور یہ قیاس کبھی قرآن پر مبنی
ہوتا ہے جیسا کہ شراب کو قرآن میں حرام کیا ہے اور اس کی حرمت کی وجہ نشہ معلوم
ہوئی پس جس جس چیز میں نشہ دیکھا سب کو حرام قرار دیا۔ اور کبھی سنت پر چنانچہ
حدیث شریف میں آیا ہے کہ گیہوں اور جو اور خرما اور نمک اور سونا اور چاندی
کو دست بدست بدون زیادتی کے فروخت کرنا چاہیئے۔ زیادتی سود ہے پس جو
گیہوں کو گیہوں سے فروخت کرے تو ادھار نہ بیچے نہ زیادہ لے جس قدر اس کے گیہوں
ہوں خواہ اچھے ہوں خواہ بُرے برابر اتنے ہی لیوے پس ان چھ چیزوں پر چونے
گلی وغیرہ اشیاء ہیں کہ جہاں دونوں ایک جنس اور ایک قدر کے ہوں قیاس کیا
اور حکم دیا کہ یہاں بھی اور زیادتی سود ہے اور کبھی اجماعِ امّت پر مبنی ہوتا ہے
مثلاً تمام اُمّت کا اس پر اجماع ہے کہ جس لونڈی سے صحبت کرے اس کی ماں
سے صحبت کرنا حرام ہے پس اس پر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے قیاس کر لیا کہ جس
زنا کیا ہو اس کی ماں سے بھی صحبت کرنا حرام ہے پس جو امر علماء نے قیاس سے ثابت
کیا ہے وہ بھی ہمارے دین میں مستند ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا
ہے فاعتبروا یااولی الابصار یعنی اے نگاہ والو عبرت پکڑو کفار کے حال کو
دیکھ کر اور عبرت کہتے ہیں کسی چیز کو اس کے مثل کی طرف رد کرنے کو گویا کہ یوں فرمایا
ان کے حال کو قیاس کرو اور قیاس عام ہے خواہ عذاب کا عذاب پر خواہ فروع شرعیہ
کا ان کے اصول پر ابوداود ترمذی اور دارمی نے روایت کیا ہے کہ معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ
کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن میں قاضی بنا کر بھیجنا چاہا تو پوچھا کہ
اے معاذ کیونکر فیصلہ کیا کرے گا جب کوئی جھگڑا تیرے پاس آوے گا عرض کی کتاب اللہ سے فیصلہ کروں گا۔

حضرتؐ نے فرمایا اگر وہ مسئلہ تجھے کتاب اللہ میں نہ ملا تو کیا کرے گا عرض کیا سُنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیصلہ کروں گا فرمایا اگر وہاں بھی نہ ملا تو کیا کر[ے گا] عرض کیا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور بند نہ ہوں گا۔ پس نبی صلی اللہ علیہ و[سلم] نے معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینہ پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ سب تعریفیں اس اللہ [کو] ہیں کہ جس نے اپنے رسول کو ایسی توفیق دی کہ جس سے رسول اللہ خوش ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ؕ یعنی اگر تم کو بات معلوم نہ ہو تو جاننے والوں سے دریافت کر لو مجتہد اہل ذکر ہیں کیونکہ باتفا[ق] علماء اہل الذکر سے اس آیت میں اہل علم مراد ہیں اور وہ آئمہ مجتہدین ہیں و[قولہ] تعالیٰ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ[۱] یعنی اللہ تعالیٰ کی تا[بعداری] کرو کہ کتاب اللہ پر عمل کرو۔ اور رسول کی تابعداری کرو کہ سُنّت رسول پر چلو اور اولی الامر یعنی مجتہدین کی اطاعت کرو کہ وہ اللہ اور رسول کا طریقہ اور وہ مسائل جو خفیہ [اور] معلوم نہیں بتلاتے ہیں پس گویا ان کی اطاعت کرنا عین اللہ اور اس کے رسول کی ا[طاعت]

---

[۱] واضح ہو کہ اولی الامر سے مراد یہاں مجتہد ہیں کیونکہ اول فرمایا اللہ کی اطاعت کرو اطاعت پس اگر سب سے ایک ہی چیز مراد ہوتی تو ایک ہی ذکر کافی تھا۔ اور یہاں تین کا ذکر جدا جدا کیا ہے کہ اللہ کی اطاعت سے کتاب اللہ کا ماننا مراد ہے اور رسول کی اطاعت مراد ہے سنّت رسول کی اطاعت ان مواضع میں کہ جہاں کتاب اللہ میں اس کی صرا[حت] نہ ہو اور بعد اس کے اگر سنّت رسول سے کوئی بات معلوم نہ ہو تو وہاں مجتہد کی ا[طاعت] اطاعت کرو چنانچہ حدیث معاذ کی بھی صاف اس پر دلالت کرتی ہے اور دو[سرے] صاحب حکم اول ہے پھر رسول پھر رسول کا نائب جس کو کمال علمی اور عملی بھی حاصل [ہو] یہ مرتبہ مجتہد کا ہے اور کامل اولی الامر بھی ہے ۱۲ منہ ف گو اولی الامر عام ہے کو بھی شامل ہے مگر زیادہ تر یہ علما مجتہدین پر صادق آتا ہے۔ ۱۲ م

مولانا محمد احتشام الحق کاندھلویؒ

اسلام

اسلام کے لفظی معنیٰ اطاعت اور فرماں برداری کے ہیں چونکہ دین محمدیؐ میں خدا تعالیٰ کے احکام کی پوری پوری اطاعت اور فرماں برداری کی جاتی ہے۔ اس لیے اس دین کا نام "اسلام" ہے۔

اسلام زندگی بسر کرنے کا مکمّل دستور العمل ہے۔ جو زمین اور آسمان اور تمام مخلوقات کو پیدا کرنے والے خدا نے اپنے سچّے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دنیا میں بھیجا تاکہ دنیا میں بسنے والے انسان اس کی پابندی کریں اور اس کے موافق عمل کرکے دنیا اور آخرت کی فلاح و بہبود حاصل کریں اور کامل انسان بن جائیں۔

اسلام کے پانچ رُکن ہیں۔ اول کلمۂ شہادت کا دل سے یقین رکھنا اور زبان سے اس کی [illegible] دوسرے نماز پڑھنا

تیسرے رمضان شریف کے روزے رکھنا۔ چوتھے زکواۃ دینا۔ پانچویں حج کرنا
اسلام کے پانچ رکن ہیں۔ جس قدر ان کو مضبوط پکڑو گے اسلام قوی ہوگا۔ اور
ان میں سستی کروگے تمہارے اسلام میں اسی کی بقدر کمزوری واقع ہوگی۔

دل میں اس بات کا یقین رکھنا کہ صرف اللہ تعالیٰ کی غلامی اور بندگی
کی جائے۔ اس کے سوا کوئی غلامی اور بندگی کے لائق نہیں اور زبان سے اس
اقرار کرنا اس کو "توحید" کہتے ہیں۔

تمام پیغمبروں نے مخلوق کو توحید کی تعلیم دی اور بتلایا کہ خدا ایک
اس جیسا کوئی دوسرا نہیں وہ تمام کمالات میں یکتا اور بے مثل اور ہر عیب ا
نقص سے پاک ہے وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا نہ اس کی ابتدا ہے ا
انتہا، نہ اس پر عدم (نیستی) طاری ہو سکتا ہے نہ اس کو کسی نے پیدا کیا بلکہ
خود بخود موجود ہے۔ اور ہمیشہ موجود رہے گا اور وہ اپنے کسی کام میں دوسر
محتاج نہیں بلکہ خود مختار ہے جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔

جس شخص کو خدائے تعالیٰ مخلوق کی رہبری اور رہنمائی کے لیے
فرمائے اور اس کے ذریعہ مخلوق کے پاس اپنا پیغام بھیجے وہ "رسول" اور "نبی" ہے
اور نبی خدا تعالیٰ کے فرماں بردار بندے اور کمالِ انسانیت کا بہترین نمونہ ہوتے
خدا تعالیٰ انہیں مخلوق کی ہدایت اور اصلاح کے لیے اور احکام خداوندی کو مخلو
پہنچانے کے لیے مقرر فرماتا ہے تاکہ ہر انسان اس نمونہ کے مطابق اپنی زندگی گ
اور ان کے ذریعہ مخلوق کو ان باتوں کا علم ہو جائے جن سے خدا وند کریم خوش یا نا
ہوتا ہے اور ترقی اور فلاح و بہبود کا وہ سیدھا راستہ معلوم ہو جائے جس پر
انسان حقیقی کمال حاصل کرتا ہے اور دونوں جہان کی سرخروئی اور شادمانی حا

وہ سچے ہوتے ہیں کبھی جھوٹ نہیں بولتے اور کبھی خدا کی نافرمانی نہیں کرتے خدا تعالیٰ کے ہر پیغام کو پورا پورا پہنچاتے ہیں اس میں کمی بیشی نہیں کرتے اور نہ کسی پیغام کو چھپاتے ہیں وہ گناہوں سے پاک ہیں اور خدا تعالیٰ کے حکم سے مخلوق کو معجزے دکھلاتے ہیں۔

نبی اور رسول میں تھوڑا سا فرق ہے اور وہ یہ کہ رسول اس پیغمبر کو کہتے ہیں جس کو نئی شریعت اور کتاب دی گئی ہو اور نبی ہر پیغمبر کو کہتے ہیں چاہے اس کو نئی شریعت اور کتاب دی گئی ہو یا نہ دی گئی ہو بلکہ وہ پہلی شریعت اور کتاب کا تابع ہو۔

مخلوق کی ہدایت اور اصلاح کے لیے خدا تعالیٰ نے بکثرت نبی اور رسول بھیجے سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخر میں تمام نبیوں کے سردار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی اور رسول بنا کر بھیجا آپ کے بعد کوئی نبی اور رسول نہ ہوگا

آپ کی بعثت کے بعد کوئی شخص آپ پر ایمان لائے بغیر نجات اور فلاح نہیں پا سکتا۔ آپ خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور کامل انسان تھے خدا تعالیٰ کے بعد آپ تمام مخلوقات سے افضل ہیں۔

آپ گناہوں سے معصوم ہیں۔

آپ پر خدا تعالیٰ نے قرآن مجید نازل فرمایا۔

آپ کو شب معراج میں خدا تعالیٰ نے آسمان پر بلایا اور جنت و دوزخ وغیرہ کی سیر کرائی۔

آپ نے خدا تعالیٰ کے حکم سے بہت سے معجزے دکھائے۔ آپ خدا تعالیٰ کی بہت زیادہ عبادت کرتے تھے۔

آپ کے اخلاق و عادات نہایت اعلیٰ درجے کے تھے۔

آپ نے تمام مخلوق کو اچھے اخلاق اور اچھی عادت کی تعلیم دی
آپ کو خدا تعالیٰ نے بہت سی گذشتہ اور آئندہ باتوں کا علم عطا فرمایا جن
آپ نے اپنی اُمّت کو خبر دی۔
آپ کو خدا تعالیٰ نے تمام مخلوق سے زیادہ علم عطا فرمایا لیکن خدا تعالیٰ کی طرح
آپ عالم الغیب نہ تھے۔
آپ انسان اور جنّات سب کے رسول ہیں۔
آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام آسمان سے نازل ہو کر آپ کا اتباع
اور آپ کی اُمّت کی رہبری کریں گے۔
آپ قیامت کے روز خدا تعالیٰ کی اجازت سے گنہگاروں کی شفاعت فرمائیں
اور خدا تعالیٰ آپ کی شفاعت کو قبول فرمائے گا۔
آپ نے جن باتوں کا حکم فرمایا ہے ان پر عمل کرنا اور جن باتوں سے منع فرمایا
ان سے باز رہنا اور جن واقعات کی خبر دی ہے ان کو اسی طرح ماننا اور یقین کرنا ہر
کے لیے ضروری ہے۔
آپ کے ساتھ محبّت رکھنا اور آپ کی تعظیم و تکریم کرنا ہر مسلمان کے ذمّہ فرض ہے
آپ کے تمام صحابہؓ اور اہل بیت اور ازواجِ مطہرات کے ساتھ محبّت رکھنا ا
عظمت اور بڑائی کو ملحوظ رکھنا ان کے ساتھ حسنِ ظن کے ساتھ قائم رکھنا ہر
کے لیے ضروری ہے
معجزے کے معنی ہیں عاجز کرنے والی چیز اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ہاتھ
کبھی ایسی خلاف معمول باتیں ظاہر کرا دیتا ہے۔ جن کے کرنے سے دنیا کے اور لوگ عاجز ہو
ہیں تاکہ لوگ ان باتوں کو دیکھ کر سمجھ لیں کہ یہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغام بر ہیں ایسی با

پیغمبروں نے خدا تعالیٰ کے حکم سے بے شمار معجزے دکھلائے ہیں چند مشہور
…ر سے یہ ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ایک لکڑی تھی وہ سانپ بن جایا کرتی تھی۔
…ت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں حق تعالیٰ ایسی چمک پیدا کر دیتا تھا کہ اس کی روشنی
…اب کی روشنی پر غالب ہو جاتی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے دریائے نیل کے
…یان خشک راستے بن گئے اور وہ مع اپنے ہمراہیوں کے ان راستوں سے گذر گئے
…فرعون اور اس کا لشکر ان راستوں سے گذرنے لگا تو پانی مل گیا اور تمام لشکر ڈوب گیا۔
…ت عیسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ مادر زاد
…وں کو بینائی دیتے تھے۔ کوڑھیوں کو اچھا کر دیتے تھے۔ مٹی کی چڑیا بنا کر انہیں
…ندہ کرکے اُڑا دیتے تھے۔

رسولوں کے سرتاج حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت
…رسالت چونکہ قیامت تک کے لیے تھی اس لئے آپ کو وہ معجزہ عطا کیا گیا جو
…مت تک باقی ہے۔ وہ معجزہ قرآن مجید ہے جس کی نظیر دنیا بھر میں نہیں۔
…ے تیرہ سو برس سے زائد گذر چکے لیکن آج تک عربی زبان کے تمام بڑے بڑے
…انی باوجود اپنی پوری جدوجہد کے بھی قرآن کریم کی چھوٹی سے چھوٹی سورت
…ل بھی نہ بنا سکے اور نہ قیامت تک بنا سکیں گے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
…کا علمی اور معنوی معجزہ ہے اس کے علاوہ بہت سے حسّی اور ظاہری معجزے بھی ہیں
…یث و سیرت کی کتابوں میں مفصل لکھے ہیں۔

قرآن شریف کی بعض خصوصیات یہ ہیں۔
اول یہ کہ قرآن مجید کا ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف اور نقطہ اور حرکات و سکنات

محفوظ ہیں اس میں ایک نقطہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی اور پہلی کتابوں پر لوگوں نے بہت تغیر و تبدل کر دیا۔

دوسرے یہ کہ قرآن مجید کی عبارت ایسی اعلیٰ اور سہل ہے کہ آج تک کوئی شخص ایسی عبارت نہیں بنا سکا۔

تیسرے یہ کہ قرآن مجید آخری کتاب ہے جو خدا تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے قانون بنا کر مخلوق کی رہبری کیلئے بھیجا ہے اور دوسری کتابیں ایک خاص زمانہ یا خاص قوم کی ہیں اس لئے ان کے بعض احکام اب منسوخ اور نا قابلِ عمل قرار دیے جاچکے۔

چوتھے یہ کہ قرآن مجید ہزاروں اور لاکھوں مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ ہے ہمیشہ محفوظ رہا اور آئندہ بھی محفوظ رہے گا اور دوسری کتابوں کے اصل صحیح اور نسخوں کا ایک بھی پتہ نہیں۔

پانچویں یہ کہ قرآن مجید کے تمام احکام ایسے معتدل اور سہل ہیں کہ ہر زمانہ ہر قوم کے مناسب ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں کہ وہ قرآن مجید کے احکام پر عمل سے عاجز اور قاصر ہو۔ چونکہ قرآن مجید کے احکام ہر زمانہ اور ہر قوم کے مناسب ہیں اب کسی دوسری شریعت اور آسمانی کتاب کی حاجت نہیں رہی اور رسول اللہ صلی اللہ کی رسالت قیامت تک آنے والی تمام مخلوق کے لیے عام کر دی گئی۔

سلسلہ ...

لیکن "نقشِ قدم" موجود ہیں صاحب خلقِ عظیم آج "رفیق اعلیٰ" کی رفاقت میں لیکن "خلق عظیم" کی امانت انسانوں کے سینوں اور کتب خانوں کے سفینوں میں محفوظ پیامبر کا پیام زندہ ہے، کام زندہ ہے، نام زندہ ہے، اور خاک کا ہر پتلا اپنے ظرف اور لباط کے مطابق، اس گنج نور سے کسب فیض کر سکتا ہے۔

رج احمد قادری قسط (۲۰)

اسلامی تصوف

صبر

صبر کے لغوی معنی حبس و منع کے ہیں یعنی کسی کو کسی چیز سے روک دینا، شرعی اصطلاح کے لحاظ سے صبر اس قوت، کیفیت اور حالت کا نام ہے جو انسان کو نفسانی خواہشات پر چلنے اور شیطانی مطالبات کو ماننے سے روک دیتی ہے۔ امام غزالیؒ علمی مقدمات کی ترتیب کے ساتھ نہایت عالمانہ و عارفانہ انداز میں صبر کی حقیقت بیان کی ہے ہم یہاں اس کی تلخیص پیش کرتے ہیں:

صبر، مقامات دین میں سے ایک مقام اور رہروانِ راہِ حق کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے۔ دین کے جتنے مقامات ہیں ان کی تنظیم تین امور سے ہوتی ہے۔ ۱۔ معارف۔ ۲۔ احوال۔ ۳۔ اعمال۔ معارف اصول کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے احوال پیدا ہوتے ہیں اور احوال کا ثمرہ اعمال ہوتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھو کہ معارف (علوم) درخت ہیں، احوال شاخیں ہیں اور اعمال پھل ہیں۔ صبر کی تنظیم بھی انہیں تین امور سے ہوتی ہے۔ صبر سے پہلے بہت سی چیزوں کا علم و یقین ضروری ہے اس سے ایک پائدار حالت پیدا ہوتی ہے اور اسی حالت کا پھل ہے جسے ہم صبر کہتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے

کہ اللہ کی جاندار مخلوقات میں صبر صرف انسان کا خاصّہ ہے۔ یہ جانوروں میں نہیں پایا جاتا اور نہ فرشتوں کو اس کی ضرورت ہے جانور مکلف مخلوق نہیں ہیں اس لیے ان کے لیے شرعی اوامر و نواہی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ انہیں صبر کی ضرورت پیش آئے۔ فرشتے اطاعت امر الٰہی کے مکلّف ضرور ہیں لیکن اس پر ایسی کوئی خواہشِ نفس مسلّط نہیں کی گئی ہے جو انہیں اطاعت سے روکے اس لیے انہیں بھی صبر کی ضرورت نہیں ہے۔ جو انسان کی خصوصیت اس لیے ہے کہ اس میں مَلکیّت اور بہیمیّت جمع کر دی گئی ہے اور اس لیے یہ اوامر و نواہی دونوں کا مکلّف ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ دو فرشتے مقرر کیے ہیں ان میں کا ایک اسے راہِ ہدایت دکھاتا رہتا ہے اور دوسرا اس کو تقویت پہنچاتا ہے ـــــ انسان کو اللہ و رسول کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اسے ان مصالح کا علم بھی دیا گیا ہے جن کا تعلق نتائج و عواقب سے ہے اور اسے اپنے ہر فعل کے بارے میں یہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی گئی ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ اسی نورِ ہدایت سے انسان کو یہ معرفت حاصل ہوتی ہے کہ خواہشات و شہوات کی پیروی کے نتائج نہایت خراب ہیں لیکن یہ معرفت کافی نہیں ہے جب تک اسے ایسی قوت و قدرت بھی حاصل نہ ہو جس کے ذریعے وہ مضر چیزوں سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ اسی ضرورت کی بنا پر اللہ نے اس کو ایک ایسی قوت دی ہے جس سے وہ مضر خواہشات کے منہ میں لگام ڈال سکتا ہے اور ان سے لڑ سکتا ہے۔ اللہ نے دوسرا فرشتہ اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ اس لڑائی میں اپنے لشکروں سے انسان کی مدد کرے

جنہیں آنکھیں نہیں دیکھتیں، یہ لشکر، شہوت کے لشکر سے جنگ کرتا ہے اور یہ جنگ مسلسل جاری رہتی ہے۔ ہم اس صف کا نام باعثِ دینی رکھتے ہیں جس کی وجہ سے انسان خواہشات کی شکست وریخت میں جانوروں سے ممتاز ہے یعنی ایک ایسا دینی محرک جو انسان کو احکامِ دین کی تعمیل پر ابھارتا ہے۔ اسی طرح ہم خواہشات اور اُن کے مقتضیات کا نام باعثِ ہوٰی رکھتے ہیں یعنی ایک ایسا نفسانی محرک جو انسان کو احکامِ دین کی خلاف ورزی پر ابھارتا ہے۔ اس محرکِ دینی اور محرکِ نفسانی کے درمیان جنگ چھڑی رہتی ہے اور اس جنگ کا میدان انسان کا قلب ہے۔ محرکِ دینی کی مدد فرشتوں کا لشکر کرتا ہے جو حزب اللہ کی مدد کے لئے مقرر کیا گیا ہے اور محرکِ نفسانی کی مدد شیاطین کی فوج کرتی ہے جس کا کام دشمنانِ خدا کی تائید و حمایت ہے۔ اب صبر کی حقیقت بتانے کا وقت آگیا تو سمجھ لو کہ صبر کا نام ہے محرکِ شہوت کے مقابلے میں محرکِ دینی کے ثبات و استقامت کا ـــــــ اگر محرکِ دینی محرکِ شہوت پر غالب آجائے تو انسان صابرین کے گروہ میں داخل ہو جاتا ہے اور اگر مغلوب ہو جائے تو حزب الشیطان میں جا گھستا ہے۔ اب اُوپر کی ترتیب کے لحاظ سے یوں سمجھو کہ خواہشِ نفسانی کے مطابق افعال کا ترک کرنا وہ عمل ہے جو حالتِ صبر کا پھل ہے اور یہ حالت اس علم و یقین سے پیدا ہوتی ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کی پیروی انسان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں ہی جگہ مضرت رساں ہے۔ یہ علم و یقین جتنا قوی ہوگا اسی کی نسبت سے وہ حالت قوی ہوگی جسے ہم نے صبر کہا ہے اور پھر اسی کی قوت کے اعتبار سے خواہشاتِ نفسانی کے مقابلہ میں کامیابی ہوگی (۱)

(۱) احیاء علوم الدین ج ۴ بیان حقیقۃ الصبر

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ صبر کے بغیر نہ تو انسان راہ حق میں مجاہدہ کر سکتا نہ اسے حزب ا
کے مقابلے میں فتح حاصل ہو سکتی ہے اور نہ اسے تقویٰ کی نعمت مل سکتی ہے۔ یہی وجہ
قرآن میں بار بار صبر اور نماز سے استعانت طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

صبر کی فضیلت

امام قیشری، امام غزالی، امام نووی، شیخ الاسلام ابن اللہ اور سید مصطفیٰ عروسی نے صبر کی فضیلت میں متعدد آ پیش کی ہیں۔ ہم یہاں احیاء العلوم سے آیتیں پیش کر رہے ہیں امام غزالی نے لکھا ہے اللہ تعالیٰ نے متعدد اوصاف کے ساتھ صابرین کا ذکر کیا ہے اور قرآن میں ستر سے ز مقامات پر صبر کا ذکر ہے اور اکثر درجات و خیرات کو اللہ تعالیٰ نے صبر کی طرف منسوب کیا ہے اور انہیں اسی کا ثمرہ قرار دیا ہے۔ اس سلسلے کی چند آیتیں یہ ہیں:

(۱) وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا يُوقِنُونَ
(السجدہ ع ۳)

اور جب انہوں نے صبر کیا اور ہماری آیات پر یقین لاتے رہے تو ان کے اندر ہم نے ایسے پیشوا پیدا کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے۔

(۲) وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا ۖ
(الاعراف ع ۱۶)

اور بنی اسرائیل کے حق میں تیرے رب کا وعدہ خیر پورا ہوا کیوں کہ انہوں نے صبر سے کام لیا تھا۔

(۳) وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ
(النحل ع ۱۳)

اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے۔

(۴) أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا (القصص ٦٤)

یہ وہ لوگ ہیں جن کا اجر دوبارہ دیا جائے گا اس صبر کے بدلے جو انہوں نے دکھایا۔

(۵) إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ (الزمر ٢٤)

صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر نیکی کا اجر ایک اندازے اور حساب کے مطابق ملتا ہے ر کے سوا۔ روزہ چونکہ صبر ہی کی ایک مخصوص قسم ہے اس لیے روزے کے بارے میں بھی یث قدسی میں فرمایا گیا ہے۔ الصّوم لی وانا اجزی بہ (روزہ میرے لئے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا) اللہ نے روزے کو تمام عبادات کے درمیان اپنی طرف منسوب کیا کہ تمام عبادتیں اسی کے لیے ہیں اسی طرح اس نے اس کے اجر کو بھی اپنی طرف منسوب کیا لکہ تمام نیکیوں کا اجر وہی عطا کرے گا۔ اس نسبت سے صبر کی بڑی فضیلت نکلتی ہے۔ طرح اللہ نے صابروں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ہے:

(۶) وَاصْبِرُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (الانفال ٦٤)

اور صبر کرو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اللہ نے اپنی نصرت اور مدد کو بھی صبر پر معلق کیا ہے، سورۂ آل عمران میں ہے

(۷) بے شک اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اس آن تمہارا رب پانچ ہزار صاحبِ نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا (آل عمران ١٣٤)

"عورت"

ارشادِ نبیؐ رحمتؐ

خیر متاع الدنیا المرأة الصالحة

دنیا کی سب سے بہترین پونجی نیک عورت ہے۔

نیز فرمایا۔ حبیب الیّ النساء وجعلت قرة عینی فی الصلوة:

عورت کی محبت میری فطرت میں داخل کی گئی اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے
اس حدیث میں عورت کی محبت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کی ٹھنڈک
تشبیہ دے کر عورت کی روحانی اور مقدس حیثیت کو دوبالا کر دیا ہے۔

آپ نے عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی سخت تاکید فرمائی اور فرما
"استوصوا بالنساء خیرا" عورتوں کے ساتھ بھلائی کرنے کی تاکید کرو۔ آ
اور شرافت کا معیار ہی یہ قرار دیا کہ جو لوگ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک ک
وہی معاشرہ میں عزت و سلوک کے مستحق ہیں۔ فرمایا خیرکم خیرکم لاھلہ
خیرکم لاھلی تم میں بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ بہتر ثابت ہوا
اپنے بیوی بچوں کے ساتھ سلوک میں سب سے بہتر ہوں آپ کی زندگی کا آخ
آپ کا دم نکلا عورتوں کے بارے میں حسن سلوک کی تاکید کے بارے میں
الصلوٰة وما ملکت ایمانکم نماز اور اپنی بیویوں کا خیال رکھنا۔

شمس الحق ندوی

اسوۂ نبوی ﷺ

"ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ وسنتی" فرمان رسول ﷺ ہے کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں تم جب تک ان پر قائم رہو گے راہ سے بھٹکو گے نہیں۔

کتاب و سنت یہ دین کی دو بنیادیں ہیں ان دونوں کے مجموعہ سے دین اپنی اصلی شکل میں پایا جاتا ہے اور دونوں کی عملی شکل ہی حقیقی عبادت ہے لیکن عبادت کے مفہوم میں عام طور پر روزہ نماز وضو وغیرہ سے متعلق اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے اور عمل کیا ہے اس کو تو لوگ سنت سمجھتے ہیں، اور بڑی حد تک ایک طبقہ اس پر عمل کرتا ہے اس کی تلقین بھی کرتا ہے ترغیب بھی دلاتا ہے لیکن اخلاقیات ومعاملات حقوق العباد، اور عہد ومیثاق کی پابندی سے متعلق جو سنتیں ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے جو اسوہ اور نمونہ چھوڑا ہے اور جو اپنے اندر کشش وتاثیر کی مقناطیسی صلاحیت رکھتا ہے جیسے سنت سے خارج ہے، ارشاد ربانی۔ وَلَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُو اللهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللهَ كَثِيرًا (رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے تمہارے یعنی اس کے لئے

جو ڈرتا ہو اللہ اور روزِ آخرت سے اور ذکر الٰہی کثرت سے کرتا ہو ۔) اس اسوۂ حسنہ کے مجموعہ میں جو چیزیں آتی ہیں کیا وہ سب کی سب سنت نہیں ہیں ؟ ۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک شخص کو دیکھتے ہیں کہ مسجد میں بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ نوافل پڑھ رہا ہے ۔ اوابین، اشراق، چاشت حتیٰ کہ تہجد کا بھی پابند ہے ۔ لیکن عبادت سے فارغ ہو کر جب وہ زندگی کے جھمیلوں میں داخل ہوتا ہے تو وہاں کی سنتوں اور سلوک نبوت کو بالکل بھول جاتا ہے کسی سے معاملہ کرتا ہے، کاروبار میں شریک ہوتا ہے ۔ لین دین کرتا ہے، کسی سے کچھ وعدہ کرتا ہے تو اس کی قطعاً کوئی پروا نہیں کرتا یہاں کی سنتیں کیا ہیں ان مواقع پر اللہ کے رسول نے کیا کیا اور دیتا ہے یہ کیا کیا ہدایت دی ہیں، اسی طرح زوجین کے باہمی حقوق، والدین کے حقوق و اطاعت، لڑکیوں کے حقوق اور میراث وغیرہ کی تقسیم کا طریقہ جو سنت کے مطابق ہو یہ سب فراموش کر دیا جاتا ہے، اس کو سنت نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح اپنی ساری عبادتوں اور ریاضتوں کے باوجود غیبت، چغل خوری، دوسروں کی عیب جوئی، اپنے کو دوسروں سے برتر سمجھنا اور دوسروں کو حقیر و پست سمجھنا، ان باتوں کو بالکل خلاف سنت نہیں سمجھا جاتا۔

کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ۲۴ گھنٹے کے ہر قسم کے معمولات سنت نہیں کہلاتے؟ آپ کے شب و روز اپنے پڑوسیوں کے ساتھ کیسے گزرتے تھے آپ عہد و پیمان کا کیسا خیال رکھتے، اہل خانہ اور ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کا سلوک کیسا تھا، اولاد کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں آپ کی کیا ہدایات و تعلیمات ہیں، اپنے ماحول و گرد و پیش سے باخبر رہنے کی کیسی فکر رہتی تھی ۔ لڑنے جھگڑنے والوں کے اختلاف کو حل کرنے کا کیا طریقہ اپناتے تھے اور اس کی کتنی فکر رکھتے دوسروں کو اس سلسلے میں کیا ہدایات فرماتی ہیں، بندۂ مومن کے احترام و اکرام کی کیا کیا تاکیدیں فرمائیں ہیں، اور اس کی اہانت و بے حرمتی

اکیا وعیدیں سنائی ہیں، ایک دوسرے سے حسد کرنے، باہم رنج وعداوت رکھنے،
دوسرے کی ٹوہ اور عیب تلاش کرنے میں لگے رہنے سے کس زور کے ساتھ منع فرمایا
ود عمل کر کے دکھایا ہے ان سنتوں کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ جیسے یہ خارج دین
بن ہیں۔ حالاں کہ یہی وہ اصل چیزیں ہیں جو ماحول ومعاشرہ کو قدراتی رنگ میں
اور دین اسلام کو اس کی صحیح شکل میں پیش کرتی ہیں۔

مسجد میں اور عرفی ذکر وعبادت میں بندہ اپنے رب سے عجز ونیاز کرتا ہے ماضی
تاہیوں پر اظہار ندامت کرتا ہے اور مستقبل میں توفیق عمل مانگتا ہے عمل وہی
جو مسجد تک محدود ہو، بلکہ وہ زندگی کے ہنگاموں میں پیش آتا اور اسوۂ رسول اپنانے
قائم ہوتا ہے اگر ہماری زندگی میں وہ سب ویسے ہی پایا جاتا ہے جیسا
ملی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور کر کے دکھایا ہے تو یہ اس بات کی دلیل اور ثبوت ہے کہ
مسجد کی عبادت قبول ہوئی ذکر تلاوت نے اپنا اثر دکھایا اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو
ہونا چاہیئے۔ کہ ہماری نمازیں کیا کھوٹ وکمی ہے؟ ایسا تو نہیں کہ ہماری نماز ایک
ن ورزش یا روٹین کا ایک کام بن کر رہ جاتی ہے جس میں نہ شوق عبدیت ہے نہ
ہا ہے بلکہ مزید دوری اور حجاب کا سبب بن رہی ہے۔ اسوۂ رسولؐ میں ہم کو کیا نہیں
ہم نے صرف ظاہری عبادتوں پر قناعت کر کے باقی سنتوں کو طاق نسیان پر رکھ دیا ہے
ماکہ ہمارے ماحول ومعاشرہ میں جو بگاڑ پایا جارہا ہے کیا وہ اسوۂ رسول کی
ے غفلت وپہلو تہی کرنے ہی کے نتیجہ میں نہیں ہے، ہم میلاد النبیؐ کے اس مبارک موقع
جائزہ لیں اور اپنے اندر تبدیلی لانے کی فکر کریں۔ یہی ہے ماہ ربیع الاول کی اصل
اور اس کا تقاضا۔

کی محمدؐ سے وفا تونے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

مولانا سید سلیمان ندوی

اُسوۂ حسنہ

ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفہ انسانی اور ہر حالت انسانی کے
مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو، صرف محمد رسول اللہ
کی سیرت ہے اگر دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر، اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کر
غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو، اگر باد
سلطان عرب کا حال پڑھو، اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو، اگر
بدر و حنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ، اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکہ احد
حاصل کرو، اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفہ کی درسگاہ کے معلم قدس کو دیکھ
ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ، اگر واعظ اور ناصح ہو تو
کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو، اگر تنہائی و بیکسی کے عالم میں
منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یار و مددگار نبی کا اسوہ
سامنے ہے، اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو
ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو، اگر اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا نظم
کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر، خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم

ہو، اگر یتیم ہو تو عبداللہ و آمنہ کے جگر گوشہ کو نہ بھول، اگر بچہ ہو تو حلیمہ سعدیہ رضہ
لے بچے کو دیکھو، اگر تم جوان ہو تو مکہ کے چرواہے کی سیرت پڑھو، اگر سفری
ار میں ہو تو بصرہ کے کارواں سالار کی مثالیں ڈھونڈھو، اگر عدالت کے قاضی
نایتوں کے ثالث ہو تو کعبہ میں نور آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث
ہو، جو حجر اسود کو کعبہ کے گوشہ میں کھڑا کر رہا ہے، مدینہ کی کچی مسجد کے صحن میں
والے منصف کو دیکھو، جس کی نظر انصاف میں شاہ و گدا اور امیر و غریب برابر
اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہ رضہ اور عائشہ رضہ کے مقدس شوہر کی حیات پاک
الو کرو، اگر اولاد والے ہو تو فاطمہ رضہ کے باپ اور حسن رضہ حسین رضہ کے نانا کے حال
غرض تم جو کوئی بھی ہو، اور کسی حال میں بھی ہو، تمہاری زندگی کے لئے نمونہ، تمہاری
ی کی درستگی و اصلاح کے لیے سامان، تمہارے ظلمت خانہ کے لیے ہدایت کا چراغ
رسول صلعم کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے۔

بدعت اور بدعتی

دین کے اندر کوئی ایسی نئی بات پیدا کرنا جو قرآن و حدیث میں مذکور نہ ہو بدعت ہے
اگر بدعت کی طرف سے صفائی پیش کرنے اس کا دفاع کرے تو اس کے عقیدۂ توحید
ہو جانے کا اندیشہ ہے، اس لیے کہ وہ گویا دین کو ناقص سمجھتا ہے جب کہ اللہ
العالمین نے اس کے کامل ہونے کا اعلان فرما دیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے
ے میں بھی گویا وہ اس بات کا قائل ہے کہ آپ نے کما حقہ دین کی تبلیغ نہیں کی پورے
لوگوں تک نہیں پہنچایا، جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت کا حق ادا کر دیا، دین

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

اُسوۂ رسولؐ

دُنیا میں اب تک جتنے مصلح اور بزرگ پیدا ہوئے ہیں۔ سب نے . . . زندگی کی کسی ایک ہی صنف یا شاخ تک اپنی اصلاحوں کا دائرہ محدود رکھا ہے۔ لیکن وہ بے نظیر ہستی، جو معرکۂ بدر میں سپہ سالار بھی ہو، اور بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھ باندھ کر صبر کر… بھی، جو ایک کامیاب و معاملہ فہم تاجر بھی ہو، اور ساری رات عبادت کے لیے کھڑے ہو کر کاٹ دینے… بھی، جو ناصح بھی ہو، اور زندہ دل بھی، جو فقر و توکل کا بھی بوریہ نشین ہو، اور آئینِ جہاں بانی کا معلم بھی، علم و حکمت کا درس بھی دیتا ہو، اور عشق و محبت کے گُر بھی سکھاتا ہو، جو ایک ہی وقت میں عقل و فہم کی د… کا استاد بھی ہو، جذبات کے چمن کا سب سے زیادہ لطیف، شاداب اور سدا بہار پھول بھی ہو، اور سعی و… کے میدان میں سب کا سردار بھی ہو، ایسی جامع اور لاشریک لہٗ ہستی تو صرف اسی مصلحِ اعظمؐ کی ہوئی ہے

جس کی تصدیق کسی وقتی معجزہ اور ہنگامی کرامت پر منحصر نہیں، بلکہ جس کی سچائی پر (نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ) دوات اور قلم، اور ان کے لکھے ہوئے دفتر علوم و فنو… کی خاموش زبانیں ہمیشہ کے لیے گواہِ ناطق رہیں گی !

رسول اکرمؐ آج چشمِ ظاہر سے مستور ہیں، لیکن "اسوۂ رسولؐ" مستور نہیں۔ وہ آ… جن پریشانیوں کا گڑتا ہمارے لیے اوجِ سعادت تھا، آج ہماری نظروں سے او…

باقی صفحہ ۱۸ پر

ڈاکٹر محمد حمید اللہ

عہد نبوی کا نظام تعلیم

سب جانتے ہیں کہ اسلام کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب حضرت
رصلی اللہ علیہ وسلم پر چالیس سال کی عمر میں خدا کا پیام پہلی دفعہ وحی ہوا، مورخوں کے
ا یہ مسلم ہے کہ نو عمری میں آپ کو لکھنے پڑھنے کا کوئی موقع نہ ملا اور زمانہ جاہلیت میں
بسا ئی ہی رہے، ان حالات میں یہ کس قدر ولولہ انگیز اور متاثر کنندہ واقعہ ہے کہ خدا
پاس سے آپ کو جو سب سے پہلے وحی آئی اس میں آپ اور آپ کے متبعین کو "اقرا"
لا پڑھنے کا حکم تھا اور قلم کی یہ کہکر تعریف کی گئی کہ جملہ انسانی علم اسی سے ہے۔

اسم ربک الذی خلق ٥
انسان من علق ٥ اقرا و
لاکرم ٥ الذی علم بالقلم ٥
سان مالم یعلم ٥ والقرآن
۹، العلق آیت: ۱ تا ۵

"پڑھ اپنے رب کے نام سے جو خالق ہے
جس نے انسان کو ایک جمے ہوئے قطرہ خون
سے پیدا کیا، پڑھ کہ یہ تیرا بزرگ آقا
ہی ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی اور
انسان کو وہ چیز سکھائی جو وہ نہ جانتا تھا۔

ایک حدیث میں رسول اکرم نے بیان فرمایا ہے کہ "خدا نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا۔ کیوں نہ ہو کہ مخلوقات کی تقدیر اور قسمت لکھنے کے لیے اسی کی ضرورت تھی"

مطالعہ قرآن پر یہ عجیب بات نظر آتی ہے کہ قریب قریب وہ تمام آیتیں جن میں پڑھنے لکھنے یا علم سیکھنے کا ذکر وہ مکی آیتیں ہیں اس کے برخلاف مدنی آیتوں میں کام کرنے اور تعمیل کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ پہلے علم پھر عمل کہ جاہل کا عمل در خور التفات نہیں ہوتا۔ کسی قوم میں کسی نبی پیغمبر کا مبعوث ہونا اشاعت تعلیم کے سوا کسی اور غرض کے لیے نہیں ہوتا۔ چنانچہ حیرت نہ ہونی چاہئے کہ ایک حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہے کہ "میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں (بُعِثْتُ مُعَلِّمًا)

حقیقت میں تبلیغ اور تعلیم ایک ہی چیز ہیں" خاص کر ایسی شخصیت کے لیے جو مذہب و سیاست کو بالکل الگ اور ایک دوسرے سے آزاد چیزیں نہ سمجھتی ہوں اور جس کا مطمح نظر یہ ہو۔

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً	"اے ہمارے آقا ہمیں اس دنیا میں بھی
وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا	بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی اور ہمیں
عَذَابَ النَّارِ سورہ ۲ آیت (۲۰)	آگ کے عذاب سے بچا"

بیعت عقبہ ثانیہ جیسے ابتدائی زمانے میں، جو ہجرت سے بھی سوا سال پہلے عمل میں آئی تھی اور کوئی درجن بھر مدینے والوں نے اسلام قبول کیا تھا تو ان کی خواہش پر رسول اکرم نے ان کے ساتھ مکے سے ایک تربیت یافتہ معلم (مصعب بن عمیر) کو روانہ فرمایا تھا۔ جو انہیں قرآن مجید کی تعلیم دے سکے۔ دینیات اسلام سے واقف کرا سکے، معترضوں کے جواب دے سکے اور تبلیغ اسلام کر سکے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس ابتدائی زمانہ میں تعلیم سے مراد صرف مبادی دین اور عبادت کے طریقے کی تعلیم ہی ہو سکتی تھی اور نصاب تعلیم میں صرف ایک

مگر جامع) کتاب تھی یعنی قرآن جیسا کہ آگے توضیح کی جائے گی ان معلم مصعب بن عمیر کو
دینہ پہنچے چند ہفتہ ہی ہوئے تھے کہ مکہ سے انہیں رسول اکرمؐ نے ایک حکم بھیجا کہ جمعہ کے دن
ہر کی نماز کی جگہ دو رکعت والی ایک نماز با جماعت پڑھو، اور اس میں ایک خطبہ بھی دو
دی ابن سعد نے صراحت کی کہ وہاں اس وقت بارہ مرد مسلمان تھے (ظاہر ہے کہ مدینہ ابھی
ار السلام نہ بنا تھا) یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس زمانے میں خطبہ کا منشا بھی تعلیم ہی
تا تھا۔ یہ نہیں کہ خود خطیب صاحب کو بھی پتہ نہ ہو کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

زمانۂ قبل ہجرت کی سب سے اہم چیز جو اس سلسلہ میں بیان کی جاسکتی
ہے وہ یہ کہ رسول اکرمؐ نے کاتب مقرر فرما رکھے تھے، جن کا کام یہ تھا کہ جیسے جیسے
ن نازل ہوتی جائے اس کو لکھ لیں اور اس کی نقلیں کریں اور سارے مسلمانوں میں
ن کو پھیلائیں، چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ جب تقریباً ۸ قبل ہجرت میں) حضرت
نے اسلام لانے لگے تو انہیں قرآن مجید کی کم از کم تین سورتیں اپنی بہن کے گھر میں
ہوئی ملیں۔ اور وہاں خباب بن الارت نامی ایک معلم کو بھی پایا اور بظاہر ان کی
فاطمہ بنت الخطابؓ بھی پڑھا جاتی تھیں، یہ امر شاید قابل ذکر ہے کہ قرآن یعنی
کتاب اور اللہ کے کلام کے متعلق پیغمبر اسلام کی یہ پالیسی کہ وہ گھر گھر پھیلے اور مرد عورت
سارے مسلمان اسے براہ راست پڑھیں سمجھیں اور برتیں، یہ ایک انقلابی طرز عمل
رز سابقہ مذاہب ہندو ہو کہ یہودی یا پارسی مذہبی کتب کو پجاریوں کے طبقہ ہی
دود رکھتے تھے اور عوام اہل ملت کا کام بے چون و چرا آنکھ بند کر کے پجاریوں
جو تشریح کو قبول کرنا اور اس کی تعمیل کرنا تھا، اسلام ایک عوامی مذہب بنا،
تک محدود نہ رہا

اس سلسلے میں بالآخر یہاں شاید ایک قصے کی طرف اشارہ بے محل نہ ہوگا جو

قرآن مجید کی ایک اہم سورت (کہف) میں مذکور ہے اور پورے کا پورا طالب علم سفر و سیاحت اور تجارت کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ موسیٰ نام کا شخص تھا، ایک ملازم کے ہمراہ سفر اور تلاش پر (جس میں ایک سنگم کے پاس پکی ہوئی مچھلی آبِ حیات کے قطروں کے پڑنے سے زندہ ہو کر دریا میں چھلانگ لگا گئی) اسے ایک بڑے عالم کی صحبت نصیب ہوئی جو موسیٰ کو اس شرط پر اپنے ساتھ رکھنا منظور کرتا ہے کہ وہ تماشا تو کرے لیکن اعتراض اور دخل اندازی نہ کرے، ہمسفری میں عالم نے ایک مرتبہ بھری کشتی کو بیچ سمندر میں خطرناک نقصان پہنچایا، پھر ایک نوعمر لڑکے کو قتل کر دیا، نیز ایک مہمان نوازی سے انکار کرنے والے مقام پر ایک گرتی دیوار کا معاوضہ (اجرت) مانگے بغیر مرمت کر دی، پھر ان میں وہ حیرت زدہ موسیٰ کو بتاتا ہے۔

"مجھے معلوم تھا کہ آنے والی بندرگاہ کا ظالم بادشاہ جو اچھی کشتی دیکھتا ہے ضبط کر لیتا ہے اسی لیے ضبطی سے بچنے کے لیے کشتی کو خراب کرنا پڑا، سارے لوگ جانتے تھے کہ نوجوان بدکار و بدطینت ہے اور اپنے والدین کے لیے مصیبت کا باعث بننے والا ہے، گرتی دیوار کے نیچے ایک نیکوکار شخص نے اپنے یتیموں کے لیے ایک خزانہ دفن کیا تھا جس سے عالم الغیب "خدا" کے سوا کسی کو واقفیت نہ تھی اور خدا ہی نے چاہا کہ خزانہ قبل از وقت برآمد نہ ہو، ورنہ مستحق بچے محروم ہو جائیں۔ اس طرح علم غیب کے تین درجے بتلائے۔ یعنی ایک آدمی کا، بہت سے آدمی اور صرف خدا کا علم، غرض سفر اور تجربہ کار لوگوں کی صحبت سے آدمی بہت کچھ سیکھتا ہے۔

مذہبی دور یعنی بعد ہجرت زمانے کے متعلق جو مواد پایا جاتا ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ اسے سینہ وار کی جگہ فن وار مرتب کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً مدارس کا انتظام، طلبا کی اقامت خانے، اجنبی زبانوں کی تعلیم، عام نصابِ تعلیم، عورتوں کی تعلیم، اصلاح

مدرسہ جات میں تعلیم دلانے اور تفتیش کرنے والے افسر تعلیمات وغیرہ

ابھی اوپر بیان کیا گیا ہے کہ رسول اکرم نے ہجرت سے بھی پہلے ایک معلم کو مدینہ منورہ بھیجا تھا جس کے کارنامے تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں جب ہجرت کے بعد خود آنحضرتؐ بھی مدینہ پہنچے تو آپ نے بے شمار دفاعی اور سیاسی مصروفیتوں کے باوجود تعلیم کے لیے وقت نکالا۔

ہجرت کے بعد سب سے پہلا کام یہ تھا کہ ایک بڑی عمارت تعمیر کی جائے جس کا ایک حصہ عبادت گاہ کا کام دے تو دوسرا حصہ تعلیم گاہ کا۔ مسجد نبوی میں شامل اس تعلیم گاہ ی صفہ کا ابھی ذکر کیا جائے گا۔ علاوہ بریں اپنی شدید مشغولیتوں کے باوجود رسول اکرمؐ ل کا وقت نکال لیا کرتے تھے کہ مدینہ منورہ سے ناخواندگی اور جہالت کو دور کرنے کام کی شخصی طور پر نگرانی کرسکیں۔

چنانچہ اس سلسلہ میں آپ نے الحکم (یعنی عبداللہ بن سعید بن العاصؓ) کو معلم کی یثت سے) مقرر فرمایا کہ لوگوں کو لکھنے اور پڑھنے کی تعلیم دیں یہ بہت اچھے خوش نویس تھے رسول اکرمؐ خواندگی کو اتنی اہمیت دیتے تھے کہ ہجرت کے ڈیڑھ سال کے بعد جب مکہ لڑنے والے جنگ بدر میں گرفتار کرکے مدینے لائے گئے تو آپ نے ان قیدیوں کی جو ان تھے رہائی کا فدیہ مقرر فرمایا کہ ہر شخص مدینے کے دس دس بچوں کو لکھنا سکھائے۔

عبادہ بن الصامت بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے مجھے صفہ میں اس غرض سے فرمایا تھا کہ لوگوں کو لکھنے پڑھنے اور قرآن مجید کی تعلیم دوں

مکے سے ہجرت کرنے اور قبا میں چند دن اقامت کرنے کے بعد جب رت مدینہ تشریف لائے تو میزبانی کے خواہشمند خاندانوں میں سے کسی کی بھی دل شکنی کے لیے آپ اونٹنی پر سوار ہو کر فرمانے لگے۔ یہ خود جہاں ٹھہرے گی ہم وہیں اتریں گے

[illegible]

نے اسے ایڑھی مار کر اٹھایا تو بمشکل چند قدم چلی، پھر پلٹ کر پرانی جگہ آ کر دوبارہ بیٹھ
یہ ایک کھلا میدان تھا اور قبیلہ خزرج کی ملکیت میں تھا۔ آنحضرت کے دادا عبدالمطلب
ماں والی قبیلہ کی تھیں گویا اتفاق سے رشتہ داروں ہی میں ٹھہرنے کا موقع ملا۔ میدان کے
حضرت ابوایوبؓ (مدفون استانبول، ترکی) کا مکان تھا، اس لیے عارضی اقامت تو انہی
گھر میں فرمائی لیکن میدان کو مول لیا اور وہیں مسجد نبوی، صفّہ اور اپنے کنبے کی رہائش کے
چند کمرے تعمیر فرمائے

اس تعلیم گاہ کا نام پرانے مورخ صفّہ بھی بیان کرتے ہیں اور ظلّہ بھی (مثلاً
مسعودی جلد اول حصہ دوم صفحہ ۴۲ عبدالرحمٰن الاصم البکائی من اصحاب الظلّۃ۔ ترجمہ عبدالرحمٰن
اصحاب ظلّہ سے ہیں) ان دونوں لفظوں کے معنے ہیں "سایبان" یعنی ایسا ہموار و مسطح
جس پر جھونپڑی کی طرح چھت بھی ہو۔ یہ اصل میں مسجد نبوی کے گوشے میں ایک چبوترہ
تھا جو اس غرض کے لیے مختص کر دیا گیا تھا کہ باہر سے تعلیم کے آنے والوں بلکہ خود مدینہ کے نادار
بے گھر طالب علموں کے لیے دارالاقامہ کا کام دے۔ یہاں نیز خود مسجد نبوی کے
نماز میں درس و تدریس کا انتظام کیا گیا تھا۔ لکھنے پڑھنے کی تعلیم بظاہر مبتدیانہ معلوم
لیکن بالغ اور بڑی عمر کے لوگ محض اس ابتدائی تعلیم ہی سے اس قابل ہو جاتے تھے کہ
قرآن مجید کا مطالعہ کر کے اس سے استفادہ کر سکیں۔ اس مدرسے میں علاوہ بریں قرآن قرات
سکھائے جاتے کہ قرآن مجید کی سورتیں زبانی یاد کرائی جائیں۔ فن تجوید کے اصول بتا
جاتے کہ قرآن مجید کی تلاوت میں کس طرح کسی فن لطیف (موسیقی وغنا) کا لطف پیدا ہو
جائے۔ اسلامیات کی اس تعلیم کی نگرانی رسول اکرمؐ شخصی طور پر فرماتے۔ اساتذہ کو ہدایات
دیتے اور حسب موقع خود بھی تدریس کا کام انجام دیتے۔ اور ہر ممکنہ طریقہ سے تعلیم کی
حوصلہ افزائی فرماتے چونکہ اصل تعلیم قرآنیات کی ہوتی، اس لیے یہ تعلیم یافتہ قاری کہ

صفہ نشینوں کی غذا (طعام) کا بندوبست بھی اس زمانہ کی بے وسائل حکومت اسلامی نے یوں کیا تھا کہ شہر کے خوش باش لوگوں نے چند لوگوں کی روزانہ خوراک کی ذمہ داری اپنے سر لی تھی۔ چند طلبہ کو خود رسول اکرمؐ اپنے ساتھ شریک طعام فرما لیتے تھے۔ حتی الامکان ان میں کوئی بھی دوسروں پر بار نہیں بنتا تھا، اور درس کے اوقات کے باہر یہ طلب روزگار میں بھی مصروف ہو جاتے تھے اور جو کماتے اس کو اپنے دوسرے رفیقوں کے ساتھ مل کر کھاتے (نیز مسجد نبوی میں پانی وغیرہ بھی بھرا کرتے) کوئی پانی ڈھوتا، کوئی لکڑیاں کاٹتا یعنی تو آہستہ آہستہ پس انداز کر کے کچھ اندوختہ بھی جمع کر لیتے۔ لیکن اگر ایسے پیسے والے لوگ دوسروں کی فیاضی کو بھی تکتے اور صدقہ قبول کرتے تو رسول اکرمؐ اس پر سرزنش فرماتے صفہ والے چونکہ دنیا کے سارے دھندے چھوڑ کر تعلیم پانے میں مشغول رہتے تھے اس لیے ان کسب معیشت کا بار گھٹانے کی کوشش بہرحال کی جاتی تھی۔

درسگاہ صفہ میں مقیم طلبا کے علاوہ ایسے لوگ بھی حاضر ہوا کرتے ہوں گے جن کے مدینے میں اپنے مکان تھے وقتاً فوقتاً عارضی طور پر درسگاہ میں شریک ہونے والوں کی بھی کمی نہ تھی، مقیم طلبہ کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ بعض بیانوں سے واضح ہوتا ہے کہ صفہ والوں کی تعداد چار سو بلکہ نو سو تک پہنچ گئی تھی یہ ٹھیک طور سے معلوم نہیں ہوتا کہ اس سے یا طلبہ حاضری مراد ہے یہ (جیسا کہ ہمارا گمان ہے) یا ان صحابہ کی تعداد ہے جن کے نام بطور اصحاب تاریخ میں محفوظ رہے ہیں یا یہاں کے کل فارغ التحصیل لوگوں کی؟

صفہ میں بھی رسول اکرمؐ کی تنظیم پسند طبیعت نے ایک باقاعدگی اور نظام پیدا کر دیا تھا اور یہاں کے لوگوں کا ایک "عریف" نمائندہ ہوا کرتا تھا جو اپنے ساتھیوں کی ترجمانی کرتا۔ ایک زمانے میں حضرت ابو ہریرہؓ کو اس خدمت پر فائز رکھتے ہیں (سنہ ہجری کے آغاز میں یمن سے مدینہ آ کر مسلمان ہوئے تھے) اس سے پہلے جب وہاں بیس آدمی تھے تو

وقتاً فوقتاً یہ فریضہ انجام دیتے تھے۔ وہاں کی غزا کی نگرانی پر معاذ بن جبل بھی مامور نظر آتے ہیں۔ یہاں کے تعلیم یافتوں میں ہم کو بعض بہت بڑی شخصیتیں بھی ملتی ہیں، مثلاً مشہور فقیہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، مشہور قاری حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ، مشہور محدث حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ مشہور صوفی و اہل دل حضرت ابوذر غفاریؓ حضرت صہیب رومیؓ۔ حضرت سلمان فارسیؓ حضرت ابو ، حضرت ابن ام مکتومؓ، مؤذن نبوی حضرت بلال حبشیؓ، غسیل الملائکہ حضرت حنظلہ بن ابی عامرؓ الراہب، فاتح عراق حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ، حضرت حذیفہ بن الیمانؓ وغیرہ وغیرہ، ان شخصیتوں نے مسلمانوں کے دلوں میں وہ عقیدت پیدا کی ہے کہ نہ صرف اولیاء اللہ کے قاموس اعلام (سوانح عمریوں کے کسی مجموعے) میں ان کے نام سر فہرست آتے ہیں کہ بلکہ ان کے ناموں کی فہرستوں ہی پر متعدد تصنیفیں ملتی ہیں۔ ایک کتب خانہ شیخ الاسلام عارف حکمت مدینہ منورہ میں۔ ایک دارالکتب المصریہ قاہرہ میں میری نظر سے گزری ہیں اختصار ذکر میں ان میں سے بعض کی خصوصیتیں بھی بیان ہوئی ہیں کہ کسی نے باتیں کرنی چھوڑ دی تھیں کوئی ایسا تھا کہ کبھی ہنستا ہی نہ تھا۔ کوئی ایسا تھا کہ خوف خدا سے ہر وقت روتا ہی رہتا تھا، حارثہ بن امیہ کے متعلق لکھا ہے کہ دوستوں سے ملنے جلنے کو وہ "سیئ العبادات" سمجھتے اور تنہائی بیدار باشی میں وہی فرق سمجھتے جو انفرادی نماز اور با جماعت نماز میں۔ غرض ہر گل را رنگ و بوئے دیگر است غالباً یہ عادتیں جناب رسالتؐ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد مستحکم ہوتی گئی ہوں گی، چونکہ اسلامی تصورات میں روح اور بدن کو الگ نہیں کیا جاتا اس لیے روحانی اور مادی ضرورتیں ایک ہی شخص پورا کر سکتا ہے چنانچہ اہل صفہ ہم کو فوجی مہمات کے سلسلہ میں بھی رضاکارانہ شرکت کرتے نظر آئینگے جس طرح جہاد و ریاضت میں وہ پیش پیش رہیں گے۔

مکہ معظمہ کے علاوہ دور دراز قبائل کے لوگ بھی یہاں آئے اور اپنا ضروری نصاب

تکمیل کر کے اپنے وطنوں کو واپس ہو جاتے۔

رسول اکرم ﷺ اکثر اپنے ہاں کے تربیت یافتہ صحابیوں کو قبائلی وفود کے ساتھ ان کے مسکنوں کو روانہ فرماتے کہ ان کے علاقوں میں دینیات و قرآن کی تعلیم کا بندوبست کریں کام ختم ہونے کے بعد وہ مدینہ واپس آ جاتے۔ یہ فریضہ عام طور پر اہل صفہ کے سپرد کیا جاتا، جو علائق دنیوی میں کم پھنسے ہوئے ہوتے جیسا کہ رجیع اور بئر معونہ کے سلسلے میں صراحت سے ذکر ملتا ہے بئر معونہ کے موقع پر ستر قاری بھیجے گئے تھے۔ اس کثیر تعداد کی وجہ شاید یہ تھی کہ بہت وسیع علاقے اور بہت بڑے قبیلے میں کام کرنا تھا (یا یہ کہ حفاظت مطلوب تھی دو چار آدمیوں کے لیے خطرہ زیادہ ہوتا)

ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی یہ مستقل سیاست تھی کہ جب مدینہ کے باہر کے لوگ اسلام لاتے تو ان کو حکم دیا جاتا کہ ترک وطن کر کے مرکز اسلام کے قریب آ بسیں۔ یہاں ان کو اپنی آبادی بسانے کے لیے سرکاری زمینیں بھی دی جاتیں۔ ترک وطن کے اس حکم میں کئی مصلحتیں تھیں مسلمانوں کی فوجی قوت میں اضافہ ان نومسلموں کو ان کے غیر مسلم وطن میں مذہبی ایذا رسانی سے بچانا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی تعلیم و تربیت کا زیادہ آسانی سے انتظام کر سکنا (ایک دو آدمی کی تعلیم کے لیے خصوصی معلم کا ارسال کرنا آسان بھی نہیں۔

ایک مرتبہ یمن کے قبیلہ عبس میں جو نیا نیا مسلمان ہوا تھا ایک معلم روانہ کیا گیا جس نے اپنے ہدایت نامے پر زور دینے کے لیے کہنا شروع کیا کہ جو ہجرت نہ کرے وہ مسلمان نہیں قبیلہ والے پریشان ہوئے مگر تھے سمجھدار انہوں نے اپنا ایک وفد مدینہ روانہ کیا تاکہ براہ راست رسول اکرم ﷺ سے معلوم کریں کہ ہجرت کے حکم کا منشا کیا ہے اور یہ عرض کریں کہ انہیں اپنا وطن چھوڑنے میں کس قدر معاشی نقصان ہے رسول اکرم ﷺ نے ان کی مشکلات

کوشش کہ انہیں اجازت دی کہ وہ اپنے وطن ہی میں رہیں اور فرمایا کہ ان کے ساتھ وہی سلوک ملحوظ رکھا جائے گا جو اسلامی سرزمین میں ہجرت کر آنے والوں کے ساتھ کیا جاتا ہے

نو واردوں کے باعث مدینے کی آبادی بڑھتی گئی ناگزیر مدارس میں بھی اضافہ کرنا پڑا۔ ہر مسجد ایک مدرسہ کا کام دیتی تھی۔ جو عہد نبوی میں مرکزی مسجد نبوی کے علاوہ کم از کم نو دیگر مسجدوں کا پتہ چلتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ اپنے ہمسائے کی جگہ مرکزی مدرسہ کو ابتدائی تعلیم کیلئے بھی بہ وجہ ترجیح دیتے تھے جس کے باعث غیر ضروری ہجوم ہو جاتا تھا۔ اسی سلسلے میں رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ لوگوں کو کیا ہوا ہے کہ اپنے پڑوسیوں سے تعلیم نہیں پاتے۔

قبا کا گاؤں مدینہ کے جنوب میں دو ڈھائی میل پر واقع ہے۔ یہاں کی مسجد کی قرآن میں بھی تعریف آئی ہے۔ یہ بھی مروی ہے کہ آنحضرتؐ پابندی سے ہر ہفتہ وہاں تشریف لے جایا کرتے تھے اور وہاں کی تعلیم و تربیت کی شخصی نگرانی فرمایا کرتے تھے

ان مسجدوں میں جو کچھ گذرتا اس کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہو سکتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے کہ ایک دن جب رسول کریمؐ مسجد نبوی میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں لوگ دو گروہوں میں بیٹھے ہوئے ہیں کچھ لوگ نفلی نمازیں پڑھتے اور خدا کی عبادت کرنے میں مشغول ہیں تو کچھ اور تعلیم و تعلم میں منہمک آپ نے ارشاد فرمایا دونوں ہی گروہ اچھا کام کر رہے ہیں۔ البتہ ایک کا کام زیادہ اچھا ہے چنانچہ جو لوگ خدا سے کچھ مانگ رہے ہیں ان کے متعلق خدا مالک و مختار ہے چاہے تو دے چاہے نہ دے۔ البتہ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو علم حاصل کرتا اور جہالت دور کر رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ خود میں بھی معلم ہی بنا کر بھیجا گیا ہوں یہ کہتے ہوئے آپ نے اس حلقے میں اپنے لیے جگہ بنالی جہاں درس ہو رہا تھا۔

یہاں اس مشہور و متداول حدیث کی طرف بھی اشارہ کیا جاسکتا ہے جس میں
ل اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ ایک عالم شخص، شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ سخت گزرتا ہے۔
آنحضرتؐ تعلیم کی جس طرح نگرانی فرماتے تھے، اس کا اندازہ ایک اور حدیث سے
گا جس میں بیان ہوا ہے کہ ایک دن مسجد نبوی میں قضا قدر پر بحث ہونے لگی اور آواز بلند
ں، آنحضرتؐ نے سنا تو اپنے حجرے سے باہر آئے غصے سے آپ کا چہرہ تمتما رہا تھا
ر راوی کے الفاظ میں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ انار کا رس رخساروں اور پیشانی پر نچوڑ دیا
ہے۔ پھر آپ نے اس موضوع پر بحث مباحثے سے منع فرمایا اور کہا بہت سی گذشتہ
یں اس مسئلہ میں الجھ کر گمراہ ہو گئیں۔

رسول اکرمؐ کی یہ ایک طے شدہ اور مستقل سیاست تھی کہ کسی مسجد میں امامت وہی
ے جو اس علاقے، اس مقام کا سب سے بڑا سیاسی افسر ہو، قبیلے کا سردار، فوج کا
سپہ سالار، صوبہ کا عامل یعنی گورنر وغیرہ) اور یہ عہدہ اس شخص کو دیا جائے جو قرآن و سنت
یادہ سے زیادہ ماہر ہو۔ اس اصول کی بنا پر اگر نوجوانوں کو معمروں پر ترجیح دینی پڑے تو
ا میں بھی تامل نہیں کیا جاتا تھا۔ "قرآن و سنت" کے معنے دینیات، اخلاق، قانون،
ن سارے اسلامی تمدن کے ہیں۔

قرآن کو نزول کے ابتدائی ایام ہی سے بیک وقت سہ گونہ طور پر محفوظ کرنے کی کوشش
گئی (۱) ماہر استاد سے سیکھنا (۲) لکھنا اور (۳) زبانی یاد کرنا کسی عبارت اور کسی متن
محفوظ کی اس سے زیادہ مکمل کوشش ہو بھی نہیں سکتی اور ان میں تین اصولوں میں سے
یک دوسرے کی مدد کرتا ہے کہ کسی وقت حافظہ مدد نہ دے تو تحریر کی طرف رجوع کرنے
ے یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اگر کسی تحریر میں سہو کتابت ہو تو حفظ کی مدد سے اس کو
ٹھیک اور درست کیا جاسکتا ہے اور ماہر استاد مبتدیوں کی ساری فطری کوتاہیوں کی تلافی

کرتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی مذہبی کتاب کی تاریخ عالم حفاظت اور نسل بر نسل اس انتہائی صحت کے ساتھ روایت کی دیسی نظیر ہی نہیں ملی جو قرآن مجید کے متعلق آغاز سے آج تک ملحوظ رکھی جا رہی ہے۔

چونکہ قرآنی احکام کی تفصیل و توضیح سنت و حدیث نبوی سے ہوتی تھی، اس لئے قرآن کی طرح حدیث کا تحفظ بھی ضروری تھا، تعلیم کی کمی کے باعث دونوں کے گڈمڈ ہو جانے کا خوف بھی تھا، اس لیے احتیاط لازمی تھی۔ بہر حال قرآن اصل تھا تو حدیث اس کی فرع، اس لیے قرآن کے تحفظ پر جناب رسالت مآب ؐ نے خود توجہ فرمائی جیسا کہ ابھی بیان ہوا کہ حدیث پر بھی رسول اکرم ؐ خود توجہ فرماتے تو یہ انکسار و تواضع کے خلاف ہوتا اور ناپسندیدہ ہوتی، اس لیے رسول اکرم ؐ نے اپنے ارشادات کی تدوین پر خود توجہ نہ فرمائی لیکن بعض صحابہ عہد نبوی ؐ میں مشغول ہو گئے۔ تفصیل کی تو یہاں گنجائش نہیں۔ صرف یہ بیان کر دینا شاید کافی ہو گا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے آنحضرت ؐ کی اجازت سے حدیث مرتب کرنی شروع کی اور اپنی اس تالیف کو "صحیفہ صادقہ" سے موسوم کیا۔ ایک انصاری کو بھی رسول اکرم ؐ نے یہ ہدایت فرمائی کہ "اپنے داہنے ہاتھ سے مدد لے" تاکہ یاد رکھنے کی قابل حدیثیں بھول نہ جائے۔

حضرت عمرو بن حزم رض کو یمن کا عامل (گورنر) بنایا گیا تو ہدایت کی تحریری ہدایتیں دی گئیں انہوں نے نہ صرف یہ ہدایت نامہ محفوظ رکھا بلکہ مختلف لوگوں کے نام لکھے ہوئے بیس ایک دیگر مکتوبات نبوی کی نقلیں بھی فراہم کیں، اور ان سب کا مجموعہ کتابی صورت میں مرتب کیا جو تا حال محفوظ ہے۔

حضرت انس بن مالک رض، رسول اکرم ؐ کے خادم خصوصی تھے اور دن رات محل مبارک ہی میں رہتے تھے، یہ بھی نہ صرف آنکھ دیکھی اور کان سنی باتیں لکھا کرتے بلکہ وقتاً فوقتاً

اپنا مسودہ رسول اکرمؐ کو سنایا کرتے تاکہ سہو یا غلط فہمی ہوئی ہو تو اصلاح ہو جائے۔ حضرت علیؓ کے پاس بھی کئی مکتوبات نبوی کا ایک پلندہ تھا۔ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد بہت سے دیگر صحابہ نے بھی حدیث کی تدوین پر توجہ کی۔

بہرحال رسول اکرمؐ کی تعلیمی کوششیں رائگاں نہ ہوئیں اور خواندگی میں اس قدر تیزی سے ترقی ہوئی کہ ہجرت پر چند مہینے ہی گذرے تھے کہ قرآن مجید نے حکم دیا کہ ہر وہ تجارتی معاملہ جس میں رقم ادھار ہو صرف تحریری طور سے انجام پائے اور ایسے دستاویز پر کم از کم دو اشخاص کی گواہی بھی ثبت ہوا کرے۔ اس کا منشا قرآن ہی کے الفاظ میں یہ تھا۔ اس طرح کی تحریری "شہادت" خدا کے نزدیک زیادہ منصفانہ ہے اور شہادت کے اغراض کے لئے زیادہ مستحکم وسیلہ ہے اور شبہات پیدا ہونے کی صورت میں رفع شک کا بہترین ذریعہ ہے۔

مدینہ منورہ میں خواندگی کی کثرت ہو گئی ہو گی ورنہ ایسا حکم نہیں دیا جاتا جو ناقابل عمل ہوا۔ بہرحال یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص خواندہ ہو گیا ہو۔ خود مذکورہ آیت قرآنی میں پیشہ ور کاتبوں کی طرف اشارہ ہے جن کے وجود کا اور طور بھی پتہ چلتا ہے۔ خواندگی آنے کے بعد جب تک پڑھنے کی چیزیں موجود نہ ہوں یہ علم نہ صرف بیکار ہو گا بلکہ جلدی ہی آدمی اسے بھول بھی جائے گا۔ اس زمانے میں نہ کتابیں تھیں نہ اخبار۔ اس خلاء کو بھی قرآن مجید پورا کر رہا تھا، سرکاری ضرورتیں بھی باقاعدہ طور پر بڑھائی جاتی رہیں، سیاسی معاملات، ہمسایہ قبائل وغیرہ سے زبانی کی جگہ تحریری ہونے لگے۔ مدینہ میں ایک شہری مملکت قائم کی گئی جس میں مسلمانوں اور غیر مسلم سارے باشندوں کی شرکت ناگزیر تھی، اس طرح راعی و رعایا کے فرائض طے کر کے لکھے گئے اور دستور مملکت تحریر کیا گیا جو تاریخ عالم کا سب سے پہلا تحریری دستور مملکت ہے۔

ہجرت کے اسی ابتدائی زمانے میں مسلمانوں کی مدینے میں مردم شماری کرائی گئی۔ رسول اکرمؐ کے حکم سے یہ بھی تحریری طور پر انجام دی گئی، فوجی مہمیں بھیجی جانے لگیں تو فوج قائمہ کی غیر موجودگی میں ہر وقت رضاکاروں کی بھرتی ہونی ناگزیر تھی، یہ کام بھی تحریری ہوتا اور ہر رضاکار اپنا نام و پتہ لکھواتا، تاکہ ایک طرف حکومت کو اطمینان ہو کہ کتنا تعداد میں سپاہی موجود ہیں اور دوسری طرف ان رضاکاروں کو اطلاع بھی دی جا سکے کہ کب اور کہاں جمع ہوں، مختلف "دشمن علاقوں" میں خفیہ نامہ نگار مامور کئے گئے، تحریری طور پر رسول اکرمؐ کو مقامی حالات خاص کر فوجی تیاریوں سے باخبر رکھا کرتے تھے، مکہ، خیبر، نجد، اوطاس وغیرہ کا اس سلسلے میں تاریخ میں صراحت سے پتہ چلتا ہے۔

اسلامی مملکت کا آغاز تو ہوا شہر مدینہ کے چند احاطوں سے لیکن وہ رفتہ رفتہ سارے جزیرہ نمائے عرب اور عراق و فلسطین کے چند جنوبی علاقوں پر عہد نبوی ہی میں پھیل گئی اور اس کا رقبہ تقریباً انیس بیس لاکھ مربع میل (یا تیس لاکھ مربع کیلومیٹر) پر مشتمل تھا۔ رسول اکرمؐ کو بذات خود یہاں دس سال تک حکمرانی کے فرائض انجام دینے پڑے اور معاہدوں کے علاوہ گورنروں اور دیگر قبائلی سرداروں وغیرہ سے خط و کتابت کی روز افزوں ضرورت ہی ہوتی گئی۔ مجھے تاریخی کتابوں میں ایسے تین سو سے زائد مکتوبات نبوی کا پتہ چلا ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مرسل الیہم عرب کے ہر حصے کے ہیں، دوسرے الفاظ میں عربی و مکی) خط پھیلتا جا رہا تھا اور ہر جگہ خواندگی مسلسل بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا عربی خط اصل میں بیرونی زبانوں کی ابجد میں حرف بھی عربی سے کم تھے ان کا سرمایہ اصوات "قرشت" پر ختم ہو جاتا تھا۔ عربی میں "ثخذ" "ضظغ" چھ مزید حروف درکار تھے۔ ان کے لئے ابتداءً (ت، ح، د، ص، ط، ع) ...

کام چلایا جاتا رہا، اور سیاق و سباق اور شکل سے پڑھ لیا جاتا تھا بلکہ خود بعض حروف میں بے نقطہ نہ ہونے کے باعث (ب، ت، ث، ج، ح، د، ذ، ر، س ش، ف ق، اور خود (ب ت) ن اور ی) میں خاص کر ابتدائی اور درمیانی حالت میں التباس ہو جاتا تھا۔ قرأت ای دو کی مثال ہے، چنانچہ خود عہد نبوی میں عربی خط میں جا لیا تھا تلفظ سے بھی، اور ایسے التباسات کو دور کرنے کے لیے بھی تو بہ شروع ہو گئی۔

حضرت معاویہ ۸ھ مسلمان ہو کر مدینہ آئے رسول اکرمؐ نے اس نوجوان میں ذہانت دیکھی تو اپنے کاتبوں میں تحریک فرما لیا۔ ایک روایت بھی قابل ذکر ہے:

عن معاویة إنه كان كتب بين يديه فقال له: ألق اله واة و حرف القلم وانه الباء وجرس السين ولا تعور الميم وحسن الله ومد الرحمن وجود الرحيم۔

حضرت معاویہؓ سے مروی ہے کہ وہ حضورؐ کے سامنے بیٹھے لکھ رہے تھے، رسول اکرمؐ نے ان سے فرمایا دوات میں سیاہی درست کر، اور قلم کو آڑھا رکھ اور (بسم اللہ الرحمن الرحیم) لکھتے وقت "ب" کو کھڑا کر اور "س" کو واضح کر اور "م" کو کانا مت بنا اور "اللہ" کو خوبصورت لکھ اور "الرحمن" کو لمبا کر، اور "الرحیم" کو سنوار کر (اس پر گلکاری نہ کر)

ایک اور مختصر روایت یہ ہے کہ، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا اختلفتم فی الیاء والتاء فاکتبوھا بالیاء (یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تمہیں (ی) اور (ت) میں اختلاف ہو تو (ی) سے لکھا کرو (مثلاً یعلمون، تعلمون)

ان روایتوں سے اندازہ ہو جائے گا کہ عربی خط کی بنیادی اصلاح یعنی ہم شکل حرفوں میں نقطے کے ذریعے سے امتیاز اسی زمانے میں شروع ہو گیا۔ جس کے باعث ہر آواز کے لیے الگ حروف وجود میں آ گیا۔ اور وہی نظام اب تک جاری و کارآمد ہے۔ نیز خطاطی کا

وابستہ کھل گیا اور یہ ذہن نشین کر دیا گیا کہ تحریر کا منشا یہ ہے کہ پڑھنے والا نہ دشواری محسوس کرے اور نہ تذبذب۔ اس سلسلے میں یہ حدیث بھی قابلِ ذکر ہے کہ "اپنی تحریروں پر ریگ ڈال دیا کرو۔" جاذب کی غیر موجودگی میں ریگ سے عبارت خشک کیے بغیر اگر کاغذ موڑ لیا جائے تو حروف کے مٹ جانے کا خوف ہوتا ہے اور ایک حدیث ہے کہ "لکھتے ہوئے اگر کچھ رکنا پڑے تو کاتب کو چاہیے کہ قلم اپنے کان پر رکھ لے۔ کیوں کہ لکھوانے والے کو زیادہ آسانی سے یاد دہانی ہو جاتی ہے۔ یا تو اس حدیث کا منشا یہ ہے کہ کاتب زبان سے کچھ نہ کہے ورنہ لکھوانے والے کے خیالات پراگندہ ہو کر جملہ بگڑ جائے گا اور ظاہر ہے کہ لکھوانے والا چند الفاظ کہنے کے بعد انتظار کرے گا کہ کاتب ان کے لکھنے سے فارغ ہوتا کہ عبارت کی تکمیل کرائے تا اسی طرح اس حدیث کا یہ منشا بھی ہو سکتا ہے کہ سیاہی بھرا قلم زمین پر نہ ڈال دیا جائے کہ فرش پر دھبے لگ سکتے ہیں اور بے خیالی میں کوئی شخص دیکھے بغیر گذرے تو اسے روند سکتا ہے۔ بہر حال ان سارے احکام کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے وہ زمانہ پیش نظر رکھنا چاہیے "جب محض لکھنا پڑھنا ایک بڑا کمال سمجھا جاتا ہو۔ اور فن کا آغاز ہو رہا ہو۔" یہ بھی کہ یہ تعلیم نبیؐ امی سے مل رہی ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ انسانی معاشرہ ایسے افراد کا مجموعہ ہے ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں، اسی طرح متخصص سے متخصص ایک فنی آدمی کو مختلف علوم کا ذیلی و ضمنی طور پر ضرورت پڑتی رہتی ہے، اس قدرتی صورتِ حال کے باعث تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے، پہلے بنیادی معلومات جن کا پانا ہر متمدن انسان، خاص کر مسلمان کے لیے ناگزیر ہے، اور دوسرے تفصیلی و تحقیقی معلومات جو کسی علم یا فن میں اعلیٰ مہارت حاصل کرنے کے لیے درکار ہوتی ہیں۔

پہلی یعنی ہر شخص والی اساسی تعلیم میں عقائد، طریقہ عبادات، مبادیات حفظانِ صحت

غذا، طہارت، لباس، رہائش وغیرہ) معمولی نوشت وخواند تھوڑا بہت حساب اور
سباق الاشیاء یعنی جس دنیا میں ہم رہتے ہیں، وہاں کے کارفرما قوانین قدرت کی
ام واقفیت شامل کی جا سکتی ہے اور فرشتہ خصائل زاہدوں سے قطع نظر کریں تو اوسط
بنیادار انسان کے لیے دل بہلائی اور راحت (مثلاً قصہ کہانی، موسیقی یا فنون لطیفہ) کا
، اعتدال کے ساتھ لحاظ کرنا پڑے گا نیز فنون دفاع کا کہ ہم جنسوں کی افتاد طبع کے
ث اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

دوسری یعنی اختصاص پیدا کرانے اور اپنے فن کا ماہر بنانے والی تعلیم ہے بنیادی
م کے بعد تجربہ، مطالعہ اور متعلقہ معلومات حاصل کرنے کے لیے ہر وقت شغل میں مزید
دھن کے سوا کوئی اور وسیلہ نہیں! آدمی مجبور ہے کہ تن، من، دھن سے اپنے مقصد
، لگا رہے اور فضولیات میں وقت ضائع نہ کرے۔ اول الذکر یعنی اساسی تعلیم کے
پہلو ہیں۔ نظری تعلیم اور عملی تربیت! اس بارے میں عہد نبوی میں کیا انتظام تھا،
، کا معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں۔

اس اساسی یا بنیادی تعلیم کے دو طریقے ممکن ہیں یا تو یہ کہ ہر ضروری فن پر الگ
۔ رسالہ لکھایا اور پڑھایا جائے، یا یہ کہ سارے ضروری علوم پر ایک جامع کتاب تیار
، وہی پڑھائی جائے اور معلومات اس طرح سمو دیے جائیں کہ طالب علم کو چاہے
تا ہو یا نہ ہو، سارے ضروری معلومات اس کے کان پر پڑ جائیں، ہر فن کے معلومات
لگ الگ ابواب میں رکھے جائیں تو لوگ بعض ابواب کو پڑھیں اور بعض کو نہیں، اس لیے
لومات کو منتشر اور مدغم کر دیا جائے۔ جس فن سے کسی کو دلچسپی نہیں، اس کی بھی
بہ سی چیزیں، ادھر ادھر دلچسپی کی چیزوں کے اندر آجائیں تاکہ ذرا بھی
گزرے۔

عہدِ نبوی میں قرآن مجید کے سوا کوئی کتاب پائی نہیں جاتی‘ قرآن کو ہم اللہ کا کلام اور وحی مانتا ہے۔ لیکن عہدِ نبوی میں چونکہ لوگوں کو مدارس میں روز قرآن مجید ہی پڑھایا جاتا تھا‘ اس لیے تدریسات کے نقطۂ نظر سے اس کو پہلے غور کرنا بیجا نہ ہوگا۔ اور اس جسارت کو بے ادبی نہ سمجھا جائے گا۔

قرآن مجید ایک بڑی کتاب ہے جو اوسط تقطیع کے چار پانچ سو صفحوں کا ہے اگر کوئی چھوٹا رسالہ دس بیس صفحوں کا ہو اور نہایت دلچسپ افسانہ بھی آدمی پندرہ بیس بار پڑھنے کے بعد بیزار ہو جائے اس کے برخلاف پانچ سو صفحوں ضخیم کتاب کو آدمی ساری عمر مطالعہ میں رکھ سکتا ہے‘ اگر ہر روز‘ نہ بھی پڑھے بلکہ وقتاً فوقتاً چند صفحے تو تکمیل کو مہینوں لگ جائیں گے تکمیل کے بعد پھر از سرِ نو ش کیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ طبیعت پر بار کے بغیر ساری عمر جاری رہ سکتا ہے

قرآن مجید میں عقائد بھی ہیں تاکہ آدمی اپنے خالق کو پہچانے اور اپنے وجو زندگی کا مقصد سمجھے) عبادت کا طریقہ بھی (کہ عبد و معبود کے باہمی تعلقات اور رقا ملحوظ رکھیں)، حفظانِ صحت کی تعلیم بھی (کہ کونسی غذائیں صحت کے لیے اور کونسے استنجا اور غسل کی ضرورت کب ہے وغیرہ) سماجی اور اجتماعی تعلقات کے اصول (مثلاً "لا ضرر ولا ضرار" نہ خود ضرر اٹھاؤ اور نہ دوسرے کو ضرر پہنچاؤ) چاہے یہ تجارت‘ یا معاملات معاشی ہوں یا غریبوں کی امداد وغیرہ‘ اس ضمن میں سود‘ ج لاٹری‘ بیمہ‘ سرمایہ داری‘ اشتراکیت‘ اور مماثل چیزوں کے متعلق اسلام کا بنیا بیان ہوا ہے) اس میں قوانین ملکی بھی (مثلاً نکاح‘ طلاق‘ وراثت‘ حیاتیات‘ وغیرہ کے مبادی جن کا جاننا ہر فرد کے لئے ضروری ہے‘ نماز‘ روزے کے لیے طلوع غروب اور سحر و شفق کا پہچاننا ناگزیر ہے تو قبلہ معلوم کرنے کے لئے علم جغرافیہ‘

ذریعے کے لیے علم تشریح الابدان کا قرآن مجید میں ایک تو ان کی طرف اشارے ہیں کہ طلبا ان کی تشریح سمجھ پاتا ہے۔ یہ اشارے گویا معلوم چیزوں کے نوٹ اور ان کا خلاصہ یادداشت کے طور پر ہے، دوسرے بار بار یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ ساری کائنات چاند، سورج، ستارے، سمندر، بادل، ہوا، زمین سب ہی انسان کے لیے پیدا کئے گئے ہیں، اور انسان کے مسخر ہو سکتے ہیں، ہر شخص کو اس کی اپنی محنت و کوشش کے مطابق دنیوی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔

قرآن مجید کے قصے بھی کثرت سے ہیں اور سبق آموز حتیٰ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی سرگزشت کو "احسن القصص" کہا گیا ہے، اس میں حسن و عشق بھی ہے، تریا چرتر بھی، عفت و اصول پسندی بھی، جاسوسی و غداری کا برا اور اصول پسندی و دیانتداری کا اچھا انجام بھی، والدین کی محبت، غربا پروری، حکمرانی میں سیاسی دور اندیشی وغیرہ وغیرہ اور ضمناً تبلیغ دین اور تذکیر فرائض انسانی بھی اس قصے میں آ گئے ہیں۔

قرآن مجید کو تجوید و ترتیل سے پڑھیں تو دنیا کا بہترین گانا بجانا بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ قرأت قرآن میں آواز کا ترنم، سُر، لے، اتار، چڑھاؤ ایسے ہیں کہ سننے والا اس کی (عربی) زبان کا محتاج نہیں رہتا بلکہ قرآنی قرأت کی موسیقی انسان کو محض اپنی آواز ہی سے مسحور کر لیتی ہے۔

نفسیات کی جدید ترین تحقیق بتاتی ہے کہ سننے والے کی توجہ ہمیشہ ایک نقطے پر مرتکز نہیں رہتی، اور غالباً دماغی کو روکنے کے لیے ایک آہنگی کو بار بار توڑنے کی ضرورت ہوتی ہے (اسکول اور ریڈیو کی تقریریں خاص کر دعائیے، پروپگنڈے وغیرہ کی تقریروں میں اس کا جو لحاظ رکھا جاتا ہے وہ روزمرہ کا مشاہدہ اور ہر شخص کی جانی بوجھی چیز ہے) اس کا قرآن مجید میں بھی بڑا لحاظ ہے، غرض اسی لیے میں نہیں اس کے نزدیک

چونکہ مکہ کی معاشی زندگی کا دار و مدار بڑی حد تک خارجی تجارت پر تھا' اس لیے اس طرح کی اہمیت نوعمروں کے لیے جیسے کچھ تھی ظاہر ہے' بیرون ملک (بیرون عرب) کا سفر بے آب و گیاہ صحرا کا ہفتوں' مہینوں میں عبور' تاریخ اور لٹیرے رہزنوں کا قدم قدم پر وجود' آب و ہوا کے باعث دن کی جگہ رات میں سفر اور ایسے علاقے میں سفر جہاں شہ روشنی نہ سڑک اس کی جرأت نہ اکار کر سکتا ہے اور نہ بغیر تربیت کے' رسول اکرم کو بھی اس کا موقع ملا تھا۔

عہد نبوی میں بھی نوعمروں اور معمروں کی تعلیمی ضرورتوں کے فرق کو محسوس کر لیا گیا تھا چنانچہ احادیث میں واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ بچوں کو کن چیزوں کی تعلیم دی جائے "نشانہ اندازی" اور پیراکی خاص طور سے بچپن ہی سے سکھائی جاتی تھیں' اسی طرح نماز پڑھنے کا طریقہ سکھاتا اور نماز کا عادی بنانا بھی بچپن ہی سے ملحوظ رکھا جاتا' اور حکم تھا کہ سات برس کی عمر کے بعد بچے نماز نہ پڑھیں تو انہیں سزا دی جاتی رہے۔

عورتوں پر خصوصی توجہ کی گئی اور جائیداد کی ملکیت' نکاح میں اظہار رضامندی اور دیگر فرائض و ممنوعات میں مردوں کا ہم پلہ قرار دے کر انہیں اپنی شخصیت کا احساس پیدا کرایا گیا۔

مدینہ آنے پر حضور اکرم نے ہفتہ میں ایک دن عورتوں کی تعلیم کے لئے مقرر فرما لیا تھا۔ آپ پابندی سے عورتوں کے مخصوص مجمع میں تشریف لے جاتے' ان کو تعلیم دیتے اور ان کے سوالات کا جواب دے کر تشفی کا سامان کرتے۔

بے کاری کے اوقات میں عورتوں کے لئے چرخہ کا تننا آنحضرت نے دل بہلانے کا بہترین سامان اور اچھا مشغلہ بتایا (جس طرح آج کل سلیقہ مند شریف زادیاں سوزن کاری کا کروشیا' ٹیٹنگ وغیرہ کا مشغلہ رکھتی ہیں)

خود لونڈیوں کے متعلق ایک مشہور حدیث میں بیان ہوا ہے کہ جس کسی کے پاس کوئی لونڈی ہو، اور اُسے تعلیم دے اور وہ بھی اچھی تعلیم اور اس کی تربیت کرے اور وہ بھی اچھی تربیت، پھر اُسے آزاد کر کے اس کی مرضی سے باضابطہ نکاح کر لے تو اسے دگنا ثواب ملے گا۔

رسول اکرمؐ کی بیویاں سب سلیقہ مند اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں، قرآن مجید نے صراحت سے امہات المومنین پر ایک خصوصی فریضہ عائد کیا ہے کہ وہ قرآن و حکمت کی دوسروں کو تعلیم دیا کریں۔ بعد کے زمانے میں ان ازواج مطہرات کو محدث کی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے اور رسول اکرمؐ کے اقوال و افعال کی انہوں نے کثرت سے روایت کی ہے۔

ان میں سے بی بی حفصہؓ کے متعلق صراحت ملتی ہے کہ وہ لکھنا اور پڑھنا دونوں جانتی تھیں۔ بی بی عائشہؓ اور بی بی اُم سلمہؓ کے متعلق بھی صراحت ملتی ہے کہ وہ پڑھنا جانتی تھیں اگرچہ اپنے ہاتھ سے خود کبھی کچھ لکھا نہیں، دیگر ازواج مطہرات نے بھی قرآن مجید کی تلاوت کے لیے پڑھنا ضرور سیکھا ہوگا۔ بی بی عائشہؓ کو فقہ، علم تقسیم ترکہ (کے حساب) دیگر اسلامی علوم، ادب، شاعری، انساب و تاریخ اور طب میں بھی بڑا دخل تھا۔ ایک دوسرے شعبۂ حیات میں بی بی صفیہؓ کا پکوان بہت مشہور ہے۔

عہد نبوی کی مملکت اسلامیہ پہلے پہل شہر مدینہ کے بھی صرف ایک حصہ پر مشتمل تھی، اور رفتہ رفتہ پھیل کر حضور اکرمؐ کی وفات کے وقت کوئی اٹھارہ، انیس لاکھ مربع میل (انتیس لاکھ مربع کیلومیٹر) کے رقبے پر ممتد ہو چکی تھی نہ صرف خانہ بدوش، بدویوں بلکہ شہروں میں مستقل سکونت رکھنے والے عربوں نے بھی روز افزوں تعداد میں اسلام قبول کرنا شروع کیا تھا۔ ایک نئے دین سے واقف کرانے کی ضرورت کے معنے یہ تھے کہ ایک وسیع تعلیمی نظام قائم ہو، چونکہ یہ سارا علاقہ اور یہاں کی ساری آبادی ایک ساتھ حلقہ بگوش اسلام نہ ہوئی بلکہ بتدریج اور ارتقاً سے سابقہ رہا۔ اس لئے اسلامی حکومت اس سے بہ آسانی عہدہ برآ ہو سکی،

عموماً طریقہ یہ تھا کہ صفہ کے "مدرسہ تعلیم المعلمین" کے چند آدمیوں کو نئے ملحق شدہ علاقہ میں کچھ عرصہ کے لیئے بھیج دیا جاتا۔ یہ عقائد و دینیات کی تعلیم کے سوا قرآن کی جامع کتاب نصاب سے مقامی آدمیوں کو واقف کرادیتے تھے اور پھر مدینہ واپس چلے آتے، بعض وقت صوبائی لوگ مرکز حکومت (مدینہ) آتے اور چند ہفتہ تا چند مہینے تعلیم و تربیت حاصل کرکے وطن واپس ہو جاتے (صحیح بخاری وغیرہ میں قبیلہ عبد القیس کے متعلق جو خلیج فارس پر آباد تھا اس کی صراحت ہے)

نظم ونسق کی ترقی پر جب صوبوں میں گورنر (عامل) مامور ہونے لگے تو ان کے فرائض منصبی میں یہ امر صراحت کے ساتھ شامل کیا جاتا کہ وہ اپنے ماتحت علاقوں میں تعلیمی ضرورتوں کا مناسب بندوبست کریں۔ یمن کے عامل حضرت عمرو بن حزم کے نام جو طویل تقرر نامہ (تقرری ہدایت نامہ) رسول اکرم ؐ نے لکھ کر دیا تھا، اسے تاریخ نے محفوظ رکھا ہے اس میں صراحت سے ذکر ہے کہ لوگوں کو قرآن، حدیث، فقہ، دینیات اور اسلامی علوم و اخلاق کی تعلیم کا بندوبست کریں، اسی دستاویز میں ایک دلچسپ جملہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی اور دنیوی تعلیم میں کس طرح فرق کرنا چاہیئے۔ اور وہ جملہ یہ ہے کہ لوگوں کو اس بات کی زیادہ سے ترغیب دو کہ وہ دینیات کی تعلیم حاصل کریں، عاملوں (گورنروں) کو جس تعلیم کے بندوبست کا حکم تھا اس میں دینیاتی ضرورتوں میں سے وضو، جمعہ کا غسل، نماز با جماعت، روزہ اور حج کعبہ کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔

صوبہ وار درس گاہوں کا معیار بلند کرنے کے لیے رسول اکرم ؐ نے صوبہ یمن میں ایک عہدہ ناظر تعلیمات مقرر فرمایا تھا جس کا کام یہ تھا کہ مختلف اضلاع و تعلقات میں مسلسل دورہ کرتا رہے اور وہاں کی تعلیم اور تعلیم گاہوں کی نگرانی کرے اور اس خدمت پر مشہور عالم معاذ بن جبل انصاری رضی کو مامور کیا تھا۔ یمن سارے عرب میں اپنی مردم خیزی اور سرسبزی کا بھی

نظیر نہیں رکھتا۔ اسے یمن شاید کہتے ہی اس لیے ہیں کہ وہاں یُمن و برکت ہے اور اسی مفہوم کو ترجمہ کر کے فرنگی زبانوں میں اسے (ARABIA FELIX) کہتے ہیں۔ وہاں کی شادابی نے تمدن و تہذیب کی بھی آبیاری کی اور اتینا د (ایتھنس) اور روم کے شہروں کے کتنے سے کہا پہلے یہاں والوں نے اپنی ثقافت کو جو شاندار ترقی دے لی تھی، تو اس کی روایتیں ہزار بنگلوں اور اجنبی نسلیوں کے باوجود ناپید ہو سکتی تھیں اور نہ وہاں کے باشندوں کے علاوہ قدرت اور ذکاوت و حساسی کی فطری صلاحیتیں مٹ سکتی تھیں، تعجب نہ ہو جب پہلے پہل یمنی لوگ اسلام لانے لگے اور اس کا آغاز ہجرت سے بھی پہلے ہوتا ہے۔ تو رسول اکرمؐ نے بے ساختہ فرمایا "الایمان یمان والحکمۃ یمانیۃ والفقہ یمان (ایمان و دینداری یمنی چیز ہے حکمت و فرزانگی یمنی چیز ہے علمی سمجھ یمنی چیز ہے) غالباً یہی وجہ ہے کہ یمنیوں کے علمی ذوق و شوق کے باعث وہاں تعلیم کے انتظام بھی زیادہ ہوئے اور قابل ترین صحابہ مدینے سے وہاں بھیجے گئے علاوہ حضرت معاذ بن جبلؓ کے حضرت علیؓ اور حضرت عمرو بن حزم بھی وہاں مختلف عہدوں پر مامور ہوتے رہے۔

ایک حدیث میں مذکورہ اس دعا ماثورہ پر یہ بیان ختم کیا جاتا ہے

اَللّٰھُمَّ اِنِّیٓ اَسْاَلُکَ عِلْماً نَافِعاً وَرِزْقاً طَیِّباً وَعَمَلاً مُتَقَبَّلاً ۔ اے اللہ! میں تجھ سے نفع بخش علم اور پاک روزی اور مقبول عمل کی التجا کرتا ہوں۔

نعت شہ کونینؐ

ڈاکٹر منشا

نام احمد جو کان میں آئے
جان در اصل جان میں آئے

بارشِ نور ہو گئی ہر سو
آپ جب اس جہان میں آئے

سب خدا کی مصلحت ہے کہ آپؐ
لامکاں سے مکان میں آئے

خاک کی عظمتیں بڑھانے کو
آپؐ اس خاکدان میں آئے

رتبۂ عالیِ شہ کونین
کیسے وہم و گمان میں آئے

ایسی رفعت کسے نصیب ہوئی
نام نامی اذان میں آئے

اللہ اللہ شان لطف و کرم
دشمنِ جاں امان میں آئے

سیرِ افلاک اِک کرشمہ ہے
جا کے بس ایک آن میں آئے

پھر کرم کیجئے کہ منشا پھر
بطحٰی کے گلستان میں آئے

نعت

محمدؐ
منظور
احمدؐ
منظور

ں کی دھڑکن میں ہے ارمانِ محمدؐ
ہے لاریب ثنا خوانِ محمدؐ

دیکھو میری آنکھوں سے اگر دیکھنا چاہو
ہے کینِ بہاراں بہ گلستانِ محمدؐ

کو جینے کا سلیقہ ہے سکھایا
ہے یہ انسان پہ احسانِ محمدؐ

ہر آن رہے پیشِ نظر مرضیٔ مولا
بڑھتا ہی رہے نشۂ عرفانِ محمدؐ

کے غازی نے کیا سحر کچھ ایسا
ں ہوا جاتا تھا قربانِ محمدؐ

یہ بارگہِ سیدِ کونین ہے منظور
یاں سب کے لیے عام ہے فیضانِ محمدؐ

نعت شریف

صلاح الدین نیّر

مسند پہ بٹھا دیتا ہے احسانِ محمدؐ
کس درجہ بلندی پہ ہے دربانِ محمدؐ

ہر سانس میں رہتا ہے سفر عرشِ بریں کا
کب فرش پہ رہتے ہیں غلامانِ محمدؐ

اس واسطے اب تک بھی معطر ہیں فضائیں
خوشبو میں بسا رہتا ہے دامانِ محمدؐ

اس گھر کے غلاموں کی طرح ہم بھی کھڑے ہیں
دامن میں سمیٹے ہوئے فیضانِ محمدؐ

حالات رہیں کچھ بھی بدلتا نہیں موسم
مہکا ہوا رہتا ہے گلستانِ محمدؐ

اس دہر میں اک ایسا بھی وقت آئے گا نیّر
ہر شخص کو ہو جائے گا عرفانِ محمدؐ

نعت شریف

عزیز بھارتی

میری بخشش کا ہیں بس آپ وسیلہ آقا
آپ سے ہٹ کے نہیں ہے کوئی دوجا آقا

غیر ممکن ہے کرے تشنہ لبی کا شکوہ
جس کو مل جائے گا کوثر کا پیالہ آقا

میری نظروں کی یہ تقدیر نہیں تو کیا ہے
میری نظروں میں ہے بس آپکا روضہ آقا

نرم ہوتے رہے پتھر بھی قدم کو چھو کر
معجزہ آپ نے ایسا بھی دکھایا آقا

اس کی قسمت میں وہی خار بنے تارِ اجل
راہ میں آپ کی جس نے تھا بچھایا آقا

اس سے بڑھ کر کوئی خیرات نہیں مطلوب عزیز
آپ کے فیض کا مل جائے جو صدقہ آقا

آرزوئے شوق

مومن خاں شوق

فقط حضورؐ کا دیدار اور کچھ بھی نہیں
فضائے طور کے انوار اور کچھ بھی نہیں

غمِ حیات، نشاطِ حیات بن جائے
نگاہِ لطف ہو اک بار اور کچھ بھی نہیں

بس ایک بار اِدھر بھی وہ چشمِ رحمت ہو
صدائے قلبِ گنہگار اور کچھ بھی نہیں

ازل سے آنکھوں کو دیدار کی تمنا ہے
عطا ہو طاقتِ دیدار اور کچھ بھی نہیں

تھکا ہوا ہوں محبت کی شاہراہوں سے
ذرا سا سایۂ دیوار اور کچھ بھی نہیں

پکارتی ہے مجھے نامِ شوقؔ سے دنیا
حضورؐ کا ہے پرستار اور کچھ بھی نہیں

○

نعت شریف

حلیم بابر

ل ہمارا یاد میں سرکار کی مسرور ہے
پنے آقا کی محبت سے بڑا معمور ہے

پوچھتے کیا ہو مدینہ میں، تم انوارِ رسول
نور کا عالم جدھر دیکھو، ادھر ہی نور ہے

بصیرت تجھ میں ہے ایمان کی تو دیکھ لے
ہ ذرہ میں محمد مصطفےٰ کا نور ہے

جگمگاتی عظمتیں، عنبر فشاں، بادِ صبا
سارے عالم میں مدینہ کی فضا مشہور ہے

پ کا بابر ہے رحمت کی نظر کا منتظر
تو محتاجِ کرم ہے اور پھر مجبور ہے

نعت شریف

محمد قمرالدین صابری

شاہِ یثرب کا تصور میں سراپا دیکھوں
کاش جی بھر کے جمالِ رُخِ زیبا دیکھوں

فضلِ رب سے اسے میں دیکھ چکا ہوں لیکن
پھر تمنا ہے کہ دوبارہ وہ روضہ دیکھوں

جس سے ہوتی ہے فرشتوں کی بھی تسکینِ نظر
پھر سے اِک بار وہی گنبدِ خضریٰ دیکھوں

میں مدینہ میں جدھر جاؤں جہاں تک پہنچوں
ہر طرف رُوئے محمدؐ کا اُجالا دیکھوں

کیا کہوں کتنے مقاماتِ تجلّی ہیں یہاں
سخت مجبور ہوں دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

چشمِ نظارہ مچلتی ہے تسلّی کے لئے
آرزو ہے کہ نبیؐ کا رُخِ زیبا دیکھوں

یہ سعادت مرے مولا مجھے ہو جائے نصیب
بند آنکھوں کو کروں کعبہ کا کعبہ دیکھوں

رہبری کی مجھے جس وقت ضرورت پیش آئے
بعد قرآن فقط آپؐ کا اُسوہ دیکھوں

اے قمرؔ زیست میں جنت کا مزہ آجائے
جا کے جو بارِ دگر گلشنِ بطحیٰ دیکھوں

شاداب

جلد (۹) شمارہ (۱۰)
اکتوبر ۱۹۹۲ء
حیدرآباد
قیمت 6/-
فون : 229161

○ ایڈیٹر: محمد قمر الدین صابری
○ جائنٹ ایڈیٹر رشید الدین — مینجنگ ایڈیٹر محمد نہال احمد صدیقی

مجلس مشاورت

زر تعاون

ہندوستان	65 روپے سالانہ	120 روپے	تاحیات 1500 روپے
خلیجی ممالک	200 "	360 "	3700 "
امریکہ	40 ڈالر	70 ڈالر	700 ڈالر
انگلستان	25 پونڈ	45 پونڈ	400 پونڈ
پاکستان	175 پاکستانی روپے	300 پاکستانی روپے	3000 پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ: ماہنامہ شاداب 11-5-3/117 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004 ● ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمر الدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس سکھ پبلک پرنٹرس چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر شاداب ریڈ ہلز حیدرآباد سے جاری کیا۔

فہرست

ہاشم علی اختر

جامعہ عثمانیہ اور اردو

تعلیم کو زمانے کے سیاسی معاشی اور سماجی تقاضوں کا ہم آہنگ ہونا چاہیئے اور ساتھ ہی ساتھ ملک کے باشندوں کی زبان ہی ذریعہ تعلیم ہو سکتی ہے لیکن ہندوستان میں جہاں کئی بڑی زبانیں اور بیسیوں بولیاں ہیں مقامی زبانوں کے بجائے حکمرانوں کی زبانوں یعنی سنسکرت۔ فارسی، انگریزی، فرانسیسی اور پرتگالی زبانوں کو زمانہ دراز تک سرکاری زبانوں کی حیثیت حاصل رہی حکومتوں کی طرف سے تعلیم کا انتظام اس انداز کا نہیں ہوا کرتا تھا جیسے آجکل ہے۔ کیونکہ اب ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم حکومت کے متعلق میں داخل ہے انگریزوں کے آنے سے پہلے اور اس کے بعد بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی درسگاہیں سنسکرت، عربی، اور فارسی کی تعلیم دیتی تھیں اور ان کی نوعیت زیادہ تر مذہبی تعلیم کی ہوتی تھی مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں فارسی سرکاری زبان رہی اور گو ہندی اور برج بھاشا کے اختلاط سے ایک ایسی زبان عوام استعمال کرنے لگے تھے جس میں ہندی کی مٹھاس اور فارسی کی شیرینی شامل ہو کر ایک خوبصورت زبان بن چکی تھی لیکن مغلیہ دور یا اس سے پہلے

اس زبان کو جو حکمرانوں کی زبان میں ہندی کہلاتی تھی اور بعد میں اردو، ہندوستانی یا رواداری، وسیع آغوش، کہلائی کبھی سرکاری زبان کا درجہ حاصل نہیں ہوا یہ زبان مذہب اور مغرب اردو کے طرفداروں اور سنسکرت آمیز ہندی کے پرستاروں کی تنگ نظری کا شکار ہوتی اور رسم خط کے جھگڑے کی وجہ سے ایسی زبان جو قومی یکجہتی اور دو تہذیبوں کے قریبی ارتباط کی وجہ سے ہندوؤں کی زبان اور مسلمانوں کے رسم الخط کے امتزاج سے بنی تھی اختلافات کا شکار ہو گئی۔

انگریزوں نے شمالی ہند پر اپنے تسلط کے بعد ۱۸۲۵ء میں فارسی کی سرکاری حیثیت ختم کی اور انگریزی کو سرکاری زبان بنایا۔ اور اپنے مشاہدہ کی بنا پر اردو کو رابطہ کی زبان تسلیم کرتے ہوئے ضلع اور نچلی عدالتوں میں اس کو رائج کیا اور اپنی سہولت کی خاطر فوج میں استعمال کے لیے اور انگریز عہدیداروں کے لیے زبان اور رسم خط میں اسے اسی طرح لکھا جانے لگا جس طرح مسلمان حکمرانوں کے زمانے میں برج بھاشا فارسی رسم خط میں لکھی گئی تھی ملکہ وکٹوریہ نے جب ہندوستانی زبان سیکھنے کی خواہش کی تو انہیں فارسی رسم خط میں اردو ہندوستانی سکھائی گئی تعجب تو یہ ہے کہ خود حیدرآباد میں فارسی کے بجائے اردو زبان کو سرکاری زبان ۱۸۸۴ء میں سالار جنگ کی وفات کے بعد بنایا گیا۔ انگریزوں کے آنے کے بعد تعلیم کے بارے میں نئے تصورات در آمد ہوئے انگریزی زبان سائنس کے نئے تصورات اور مغربی علوم کے بغیر اب ہندوستانی نئے حکمرانوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۳ء میں حکومت سے سنسکرت کالج کے بجائے ایک جدید تعلیمی کالج قائم کرنے کی درخواست کی اور یوروپین اور ہندو علوم کی تعلیم کو یکجا کرنے کی خواہش کی ۱۸۳۵ء میں میکالے کی مشہور رپورٹ میں یہ بتایا گیا کہ ہندوستان کی کسی زبان میں جدید علوم کی تعلیم دینے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس لیے انگریزی زبان کو اختیار کیا

سرسید نے جب ان بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی تو ان کو اردو زبان میں علمی کتابوں کی کمی کا اندازہ ہوا اور انہوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کے ذریعہ انگریزی کتابوں کے اردو ترجموں کا کام شروع کر دیا۔ اور ۱۸۶۷ء میں اردو یونیورسٹی کے قیام کی خواہش کی لیکن حکومت نے کتابوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے اسے نامنظور کر دیا۔ سرسید نے ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جس میں انگریزی اردو عربی فارسی کے مدارس قائم کئے لیکن ۱۸۹۶ء میں انہوں نے انگریزی ذریعہ تعلیم کا تصفیہ کیا ۱۹۰۴ء میں حکومت نے انڈین یونیورسٹیز ایکٹ نافذ کیا اور ۱۹۱۵ء میں یہ طے کیا کہ یونیورسٹی کی تعلیم ہندوستانی زبانوں میں نہ ہو سکے گی اسکے بعد بنارس ہندو یونیورسٹی ۱۹۱۶ء میں عثمانیہ یونیورسٹی ۱۹۱۸ء میں اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی۔

لیکن صرف عثمانیہ یونیورسٹی کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ آزادی سے تیس سال قبل اور انگریزوں سے سیاسی غلامی حاصل کرنے سے تیس سال پہلے اس نے علم کو غیر زبان کی غلامی سے آزاد کیا اور ہندوستان کی رابطہ کی زبان اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا لیکن آزادی کے بعد کے لسانی تعصب اور سیاسی ضروریات کی وجہ سے خود جامعہ عثمانیہ سے شائع شدہ مطبوعات میں اسے ہندوستان کی پہلی اردو یونیورسٹی اور اردو کو علاقائی زبان سرکاری زبان بتایا جا رہا ہے اور یہ شاید عاشقان اردو کے اس جوش کا جواب ہے جس کی بنا پر وہ اسے ہندی سے غیر متعلق بتانے کی کوشش کرتے رہے اور عاشقان ہندی اسے غیر ملکی زبان کا نام دے دیا اس الزام کے جواب میں عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں جو تاریخی حقیقتیں اور پالیسی کارفرما تھی اس کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اردو کے بارے میں گاندھی جی نے کہا " قومی زبان کل ہند بول چال کے لیے ہندوستانی

زبانوں میں سے ایک زبان کی فروغ ہے جس کو ہندوستان کے زیادہ سے زیادہ لوگ جانتے ہیں اور بولتے ہیں اور دوسرے آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔ یہ زبان بلاشبہ ہندی ہے۔ یہ شمالی ہندوؤں اور مسلمانوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جب اردو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے تو اردو کہلاتی ہے۔ کانگریس نے ۱۹۲۵ء کے کانپور سیشن میں اس مروجہ زبان کو ہندوستانی کہا ہے اور دونوں رسم خط کا ذکر کیا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام سے چار سال پہلے قواعد اردو (۱۹۱۴ء) میں لکھا ہے اردو ہندی نژاد ہے اور قدیم ہندی یا پراکرت کی آخری اور سب سے شائستہ صورت برج بھاشا اور فارسی کے میل سے بنی ہے۔ اردو کے ہندی نژاد ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے کیوں کہ بیرونی زبانوں کا اثر صرف اسما اور صفات پر ہوا ہے ورنہ زبان کی بنیاد ہندی پر ہے ضمیریں سب کی سب ہندی ہیں۔ ۔۔ افعال سب ہندی ہیں تمام حروف فاعلی مفعولی، اضافت نسبت، ربط وغیرہ ہندی میں ہیں ہندی الفاظ میں دل نشینی کا خاص اثر ہے اور عربی اور فارسی الفاظ میں شان و شوکت اور زبان کے لئے ان دونوں عنصر کا ہونا ضروری ہے جامعہ کے قیام کے لیے اپنی عرضداشت میں مسٹر اکبر حیدری معتمد داخلہ و تعلیم نے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے اسباب یہ بیان کئے ہیں ۔

1 - اردو زبان کا چلن ہندوستان میں دوسری زبانوں کی نسبت بہت زیادہ عام ہے۔

2 - اردو ریاست کی سرکاری زبان ہے۔

3 - یہ ایک آریائی زبان ہونے کے ناتے ملک کی دوسری زبانوں سے راست تعلق رکھتی ہے۔

4 - اردو ایک ایسی زبان ہے جس کو ریاست کی آبادی کا بہت بڑا حصہ سمجھتا۔ اعلیٰحضرت حضور نظام نواب میر عثمان علی خان آصف سابع نے ڈسمبر 39ء میں آرڈ

ی حسین اور شاندار عمارت کے افتتاح کے موقع پر جو تقریر فرمائی تھی اس میں کہا تھا۔

"اس جامعہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تعلیم اردو زبان میں دی جاتی ہے جو ہندو اور مسلم اقوام کے میل جول اور آپس کے دوستانہ تعلقات سے پیدا ہوئی اور جو مساوی طور پر دونوں قوموں کی مشترکہ میراث ہے اور جو ہندوستان میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

اب میں اس سلسلے میں کہنا چاہتا ہوں کہ اس عمارت کا طرز تعمیر بھی اردو زبان کی طرح ہندو اور مسلمان قوموں کے طرز سے مرکب ہے اور اس کے ستونوں اور دیوار کے نقش و نگار میں دونوں قوموں کی کاریگری اور ان کے تہذیب و تمدن کی جھلک نظر آتی ہے اس طرح یہ یہ عمارت بھی ایک علامت ہے اس باہمی میل جول اور باہمی دوستانہ رسم اور خوشگوار تعلقات کی جو صدیوں سے میری ریاست کے مختلف قوموں میں چلے آتے ہیں اور جس کی وجہ سے یہاں کے باشندے ہمیشہ ہمیشہ شیر و شکر ہو کر رہے ہیں"

یہ اقتباسات اس لیے دیے گئے ہیں۔ کہ ان سے یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ ایک ایسی ریاست میں جس میں رعایا تین علاقائی زبانوں تلگو، مرہٹی اور کنڑی زبان کے تھے اور دوسری زبانیں بھی تھیں اردو کو جو سرکاری یا حکمراں کی زبان تھی ذریعہ تعلیم بنایا گیا عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک سابقہ طالب علم کی حیثیت سے میرا یہ تجربہ رہا ہے کہ ان تینوں زبانوں کے طلبا جب ساتھ ہوتے تھے تو ہمیشہ اردو میں بات کرتے تھے اب یہ ایک ستم ظریفی ہے کہ انگریزوں کے جانے کے چالیس سال بعد اب ہم سب ایسے موقعوں پر انگریزی میں باتیں کرتے ہیں غرض اردو محض علاقائی زبان نہیں تھی بلکہ قومی زبان تھی مگر اس جگہ جہاں ہندی بولی جاتی تھی وہیں اردو بھی موجود تھی۔' متحدہ ہندوستان میں اردو زبان' بنگال سے صوبہ سرحد تک اور کشمیر سے جنوبی ہند تک ملک کی زبان ہونے کا ایک اور ثبوت اس سے ملتا ہے کہ ایسٹ انڈیا

کمپنی کے زمانے میں جس کا صدر مقام بنگالی علاقہ کلکتہ تھا ۱۹ویں صدی عیسوی کی ابتداء میں ایک دیسی نیٹو میڈیکل اسکول ۱۸۳۵ء میں قائم ہوا۔ جہاں اردو میں تعلیم ہوتی تھی بعد میں آگرہ اور لاہور میں بھی اسی طرح کے اسکول قائم ہوئے اور اساتذہ بنگالی ہندو تھے ۱۸۴۶ء میں حیدرآباد میڈیکل اسکول قائم ہوا جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اردو بھی ایک ایسی زبان ہے جس میں جدید علوم کی اصطلاحات اور خیالات کی ترجمانی ممکن نہیں تھی اس لیے کہ جدید علوم سب یوروپی زبان میں تھے اور ان کا ترجمہ کرنے کے لیے ایک منظم کوشش کے ساتھ دونوں زبانوں سے اچھی واقفیت ضروری تھی اور شاید اسی لیے گو حیدرآباد میں اردو کی ترویج اور اردو میں تعلیم کی تحریکات ۱۹ویں صدی عیسوی کے آخر میں بشیر الدولہ، رفعت یار جنگ، فخر الملک، مولوی عبدالحق وغیرہ نے شروع کی تھیں لیکن مہاراجہ رام سنگھ نے جے پور، کشن گڑھ ریاست میں اردو کو ۱۸۴۲ء میں دفتری زبان کے طور پر اختیار کیا تھا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے اس کو حیدرآباد میں ۱۹۱۷ء تک انتظار کرنا پڑا، اس لیے کہ قدیم طریقہ تعلیم کے حامی جدید تعلیم اور عربی اور فارسی کے بجائے اردو کے رواج کے حامی نہیں تھے محکمہ تعلیم کے عہدیداروں نے کوئی عملی اقدام نہیں اٹھایا بالآخر سر اکبر حیدری جو اس وقت محمد اکبر نذر علی حیدری تھے معتمد داخلہ تھے جن کے تحت محکمہ تعلیمات بھی تھا۔ سر اکبر حیدری نے اردو جامعہ کے قیام کے لیے 22 اپریل ۱۹۱۷ء کو ایک عرضداشت اعلیٰ حضرت حضور نظام آصف سابع نواب میر عثمان علی خان بہادر کی خدمت میں پیش کی اور 26 اپریل ۱۹۱۷ء کو عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کا فرمان جاری ہوا۔ حیدری صاحب نے اس حکم کو عملی شکل دینے کے لیے شعبہ ترجمہ کے قیام کی عرضداشت ۱۳ اگست ۱۹۱۷ء کو پیش کی جس پر دوسرے ہی دن یعنی ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو اعلیٰ حضرت کا فرمان جاری ہوا اس طرح انگریزوں سے سیاسی آزادی کے ۳۰

یعنی 15 اگست ۱۹۴۷ء سے ٹھیک تیس سال پہلے حیدرآباد نے انگریزی زبان میں تعلیم سے آزادی حاصل کی۔ افسوس یہ ہے کہ ۱۹۹۲ء کے یوم آزادی کے سیاست کے شمارے کے لیے اس مضمون کے لکھتے وقت یعنی اس تعلیمی آزادی کے ٹھیک 75 سال بعد انگریزی کی غلامی کا طوق پھر سارے ملک پر لگ گیا ہے۔ سر اکبر کی عرضداشت اعلیٰ حضرت کے فرمان جامعہ عثمانیہ کے افتتاح کی تقریر کی سنگ مرمر پر کندہ تختیاں اور جامعہ عثمانیہ کی کتاب الملۃ وغیرہ میں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے گودام میں گرد آلود حالت میں پڑی پائیں جب عثمانیہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے میں نے گودام کا معائنہ کیا۔ یہ ساری چیزیں اب عثمانیہ کی لائبریری میں VISION OF OSMANIA کے میوزیم میں رکھی گئی ہیں۔ جو میرے زمانے میں ادبی ٹرسٹ اور عابد علی خاں کی امداد سے بنایا گیا اس کی سخت مخالفت ہوئی لیکن موجودہ صدر جمہوریہ جناب شنکر دیال شرما کی مہربانی سے جو اس وقت آندھرا پردیش کے گورنر تھے اس کی تکمیل ہو سکی۔ ہوا یہ کہ اس میوزیم کی تکمیل سے قبل میرا تقرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری پر ہوا اور مجھے اپریل ۱۹۸۱ء میں وہاں جانا پڑا۔ میں نے جناب شرما صاحب سے درخواست کی کہ اگر میں چلا جاؤں گا تو یہ کام تکمیل نہیں ہو سکے گا اس لیے وہ اس کے افتتاح کی تاریخ مقرر فرما دیں تاکہ اس کا کام مکمل ہو جائے۔ انہوں نے ازراہ مہربانی میری درخواست قبول کر لی اور 26 اپریل ۱۹۸۱ء کو اس کا افتتاح ہوا جس میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا۔ اس میوزیم میں ...کی ابتدائی 'تاریخ' 'عرضداشت' 'فرمان' 'اعلیٰ حضرت کی تقریر' 'عثمانیہ کا اصلی EMBLEM' وغیرہ محفوظ کر دیئے گئے ہیں۔

دارالترجمہ کے پہلے ناظم مولوی عبدالحق مقرر ہوئے اور ہندوستان کی بڑی بڑی ہستیوں نے ترجمے کے کام میں حصہ لیا اور تیس سال کے عرصہ میں مختلف مضامین بشمول

سائنس، انجینئرنگ، اور طب، تقریباً پانچ سو کتابوں کے ترجمے ہوئے۔ راج گوپال چاری نے اس کام کی بنا پر عثمانیہ کو "اصلی ودیا پیٹھ" کا نام دیا۔ سی پی راماسوامی ایر نے دارالترجمہ کو جامعہ عثمانیہ کی بنیاد قرار دیا جس پر بالائی عمارت تعمیر ہوئی ہے۔

مامون الرشید کے بعد جنہوں نے دوسری زبانوں کی کتابوں کے بے شمار عربی ترجمے کروائے تھے یہ ایک دوسری منظم کوشش تھی جس کے ذریعہ جدید علوم ایک ہندوستانی زبان میں منتقل ہوئے اور بقول جسٹس جگن موہن ریڈی (سابق چیف جسٹس آندھرا پردیش اور جج سپریم کورٹ) آزادی کے وقت اردو ہی وہ واحد ترقی یافتہ زبان تھی جو ایک بٹن کے دبانے پر نظم و نسق، عدالتوں اور اعلیٰ تعلیم کی زبان بن سکتی تھی، لیکن اردو والوں کے غیر لچکدار طرز عمل سے اُردو ہندوستانی کے نام اور دیوناگری رسم الخط میں ملک کی قومی اور سرکاری زبان بننے سے محض ایک ووٹ سے ہار گئی اس غیر لچکدار طرز عمل کے بارے میں دو تین مثالیں کافی ہیں مولانا سلیمان ندوی نے 1938ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی یونین کے جلسے میں فرمایا تھا کہ اگر روس کی زبان روسی اور جاپان کی زبان جاپانی، فرانس کی زبان فرانسیسی ہے تو ہند کی عام زبان کا نام اردو کیوں ہے ہندی کیوں نہیں، لیکن اس تجویز کی مخالفت ہوئی اسی طرح آزادی سے قبل سردار پٹیل کی تحریک کہ ہندوستانی دیوناگری رسم خط میں ہندوستان کی زبان ہو مسلم لیگ نے رد کردی، اس لیے کہ اُردو والے گاندھی جی کی دو رسم الخط والی تجویز کو رد کر چکے تھے خود جامعہ عثمانیہ کی دارالترجمہ کی اصطلاحوں میں ابتداً میں عربی اور فارسی کے الفاظ اتنے استعمال ہوئے کہ جس طرح آج کل سنسکرت زدہ سرکاری ہندی عوام کی زبان نہیں ہے اسی طرح عربی اور فارسی کے الفاظ سے بوجھل ہوئی سرکاری زبان اس عام ہندوستانی سے مختلف ہو گئی جس میں آج کل ٹیلی ویژن ریڈیو اور سینماؤں کے سارے پروگرام ہوتے ہیں اس بات کو خود یونیورسٹی نے محسوس کیا

اور زیادہ سلیس زبان میں ترجموں کی کوشش کی گئی، لیکن اس وقت تک ہندوستان کی آزادی اور حیدرآباد پر پولیس ایکشن جیسے ماحول میں ہوا اس باہمی نفرت کا شکار اردو بھی بنی۔ جامعہ عثمانیہ کا تجربہ کامیاب رہا اس کے طالب علم ہر میدان میں کامیاب رہے اور علمی دنیا میں نام پیدا کیا اسی تجربہ کی کامیابی کی بنا پر خود جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کے علاوہ تلگو، ہندی، مراٹھی اور اردو ذریعہ تعلیم میں اب تعلیم ہو رہی ہے لیکن سیاسی تبدیلی، بادشاہی کے خاتمہ، جمہوریت کی ابتدا اور باہمی عدم اعتماد کے نئے ماحول میں اردو ہندوستانی وسیع آغوش ہندی جس کو خود ہندوستان کی قومی زبان کا درجہ ملنا چاہیئے تھا حیدرآباد کی سرکاری زبان نہیں رہی۔ اس زمانے کے وائس چانسلر علی یاور جنگ نے تجویز کی کہ اردو کے بجائے ہندوستانی کو اختیار کیا جائے جو دیوناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں لکھی جائے اور اگر ہندوستان ہندی کو قومی زبان بنائے تو اس میں آسانی ہو گی انہوں نے اپنا یہ ایقان ظاہر کیا کہ ہندوستان کا قومی رسم خط فارسی نہیں بلکہ دیوناگری ہوگا یہ ایک دور اندیشانہ تجویز تھی جس کی اردو والوں نے مخالفت کی اور ریاستی حکومت نے بھی۔ اردو والوں نے دونوں رسم خط سے قدیم مخالفت کے باعث اور ریاستی حکومت نے اس خوف سے کہ اس طرح اردو کو باقی رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے ادھر جب مجلس دستور ساز میں شدہ ہندی کے حق میں فیصلہ ہوا تو ہندی کے عاشقوں نے جواباً عرض ہے کہ مصداق ایسی مصنوعی ہندی ایجاد کی جس کے بارے میں کم از کم چار وزیر اعظموں نے کہا کہ وہ "انہیں سمجھ میں نہیں آتی ہے" ۹ راگسٹ ۱۹۹۲ء کو ہندوستان چھوڑ دو تحریک کی پچاس سالہ سالگرہ کے دن صدر جمہوریہ ہند جو خانگی گفتگو فصیح اردو میں کیا کرتے ہیں سرکاری ہندی میں ایسی تقریر کی کہ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا ان کی یہ تقریر سرکاری ہندی میں لکھی ہوئی تھی اس کے برخلاف وزیر اعظم کی بمبئی اور دہلی کی دونوں تقریریں اس زبان میں ہوئی

جیسے اُردو والے اردو کہیں گے اور فراخدل ہندی بولنے والے ہندوستانی کہیں گے" اور حکومت ہند کا فلمی سنسر بورڈ ہندی کہے گا انہوں نے اُردو کا ایک مصرعہ " بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں" بھی استعمال کیا۔

بہرحال جیسے کہ میں نے مضمون کی ابتداء میں یہ عرض کیا تھا کہ "تعلیم کو زمانے کے سیاسی معاشی اور سماجی تقاضوں کا ہم آہنگ ہونا چاہیئے" جامعہ عثمانیہ اس امتحان میں پوری اتری ہے" جامعہ عثمانیہ نے اردو کو اس وقت ذریعہ تعلیم بنایا جب اردو سرکاری زبان تھی، اور اُردو زبان کے تعلیم یافتہ اشخاص کو روزگار آسانی سے مل سکتا تھا ہندوستان کی جدوجہد آزادی جاری تھی اور امید تھی کہ اردو جو غیر سرکاری طور پر قومی زبان تھی سرکاری طور پر ہندوستان کی قومی زبان بن جائے گی۔ حیدرآباد کے حالات تبدیل ہوئے تو جامعہ عثمانیہ نے ہندوستانی اور دونوں رسم خط کو اختیار کرنے کی کوشش کی اور یہ جب ممکن نہ ہو سکا تو انگریزی کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کیا اس لئے کہ ریاست حیدرآباد کی دوسری زبانیں تلگو مراٹھی اور کنڑی ابھی اعلیٰ تعلیم دینے کے قابل نہیں تھیں اور جب یہ اس قابل ہو گئیں تو انہیں بھی ذریعہ تعلیم بنا لیا، جامعہ عثمانیہ نے حالات کا ساتھ دیا اور اس کی جیت ہوئی اس کے جرأت مندانہ تجربہ نے سارے ہندوستان میں ہندوستانی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کی زبان بنانے کی تحریک دی اور ان سب کو شاعری اور بازاروں کی زبان سے سائنس اور ٹکنالوجی کی زبان بنانے کا راستہ دکھایا اور اگر اردو نے اپنا مقام کھویا اس کے لئے اردو والوں کے ساتھ ساتھ حکومت اور ملک کا معتصبانہ ماحول بھی ذمہ دار ہے۔

ڈاکٹر احمد کنعان
(سعودی عرب)

قصر الحمرا

ایک اسلامی یادگار

"ان لوگوں کے گھروں میں داخل مت ہو کہ مبادا تم پر بھی وہ عذاب آجائے جو ان پر آیا تھا۔ ہاں مگر روتے ہوئے گزرو"

"حجر" نامی مقام سے گزرتے ہوئے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا تھا پھر اپنے سر کو جھکا کر نہایت تیزی سے اس وادی سے آگے نکل گئے تھے۔

تو میں کیا اندلس کی سرزمین سے روتا ہوا تیز نکل جاؤں یا کچھ ٹھہر جاؤں؟

عرصے سے میرے دل میں یہ تمنا مچل رہی تھی کہ اندلس کی اسلامی تہذیب کو میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔ آج وہ میری دیرینہ آرزو حقیقت کے روپ میں میرے سامنے تھی۔ خلاؤں کی ایک طویل مسافت طے کر کے میرا جہاز "میڈرڈ" اتر چکا تھا۔ اترنے کے ساتھ ہی سب سے پہلے مجھے شمسی اوقات کا فرق محسوس ہوا۔ مدینہ منورہ جہاں سے میرے سفر کا آغاز ہوا تھا اور میڈرڈ کے درمیان ساڑھے چار گھنٹے کا فرق تھا۔ مسافت سفر کا یہ فاصلہ میرے ذہن کو تاریخ کے اس زریں عہد کی طرف پھیر دیا۔ جس وقت اسلامی تہذیب عروجات کے سایہ میں پورے کرۂ ارض کے بڑے حصے پر اتنی قلیل مدت میں پھیل گئی تھی۔ جو تاریخ کی عمر کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی

میڈریڈ میں صرف اسی قدر ٹھہرا کہ سفر کے تھکان سے بلکا ہو جاتا، کیونکہ میری منزل تو آگے تھی، شہر میڈریڈ بھی بڑا ہنگامہ خیز اور فحاشی سے بھرا ہوا نظر آیا، بلکہ میڈریڈ اور ان یورپین شہروں میں بڑی حد تک یکسانیت ہی نظر آئی جنہوں نے اپنے چہرہ سے شرم کا لبادہ اتار پھینکا ہے زندگی میں خواہشوں کی حکمرانی ہے اور قیادت کی باگ ڈور شیطان کے سپرد کر دیا ہے

میڈریڈ سے بذریعہ ٹرین غرناطہ کے لیے روانہ ہوا۔ غرناطہ میں میرے بچپن کا ایک دوست میرا منتظر تھا۔ اس سے ملاقات کر کے بڑی خوشی محسوس کی، اور میں نے فوراً ہی اپنی یہ تمنا ظاہر کی کہ مجھے قصرالحمرا چلنا ہے، یہی قصر شہر کی زینت ہے اور اندلس میں اسلامی تہذیب کی عظیم الشان نشانیوں کی ایک بچی ہوئی یادگار ہے، میرے دوست نے میری تمنا پر اتفاق کا اظہار کیا اور ہم اسی وقت "قصر حمرا" کے لئے روانہ ہو گئے، ہماری گاڑی پہاڑی راستوں سے گزر رہی تھی دونوں جانب بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ گھیرے ہوئے تھے۔ شروع سے میرے دل میں خیال آیا تھا یا۔ میں ایک ایسی دنیا کو دیکھنے جا رہا ہوں جو ہماری دنیا سے بہت مختلف ہے۔ جو اسلامی تہذیب کی عظمت کا شاہکار ہے میرے دل نے کہا، یقیناً یہ سرزمین اپنی عظمت رفتہ کی بازیافت چاہتی ہے

پھر اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں تاریخ کی یادوں میں کھو گیا ہوں۔ قصر کے اطراف سے عنبریں خوشبو پھیل رہی ہے، ہر طرف شادابی ہے، خوشگوار سایوں سے انسیت ٹپک رہی ہے اور نہایت پرسکون ماحول ہے پھر میرے کانوں میں اندلس کی موشحات کی طرب انگیزیاں رس گھولنے لگیں اور دل پہلوؤں میں رقص کرنے لگا، بے اختیار میری زبان سے نکلا "نجرا! کیا وہ زمانہ تھا"۔ میں اپنے اندرون کے ان احساسات کو چھپا نہ سکا اور میں نے اپنے دوست سے کہا: "ایسا لگتا ہے کہ

گی میں قدم رکھ رہا ہوں" یہ سن کر میرا دوست ہنس پڑا اور جواب میں بولا: "تھوڑی
کے بعد آپ کے سامنے ایسے مناظر آئیں گے جن کا آپ نے خواب بھی نہیں دیکھا
ا۔" میں تعجب کے ساتھ اٹھا کر "کیا اس سے بھی عمدہ اور خوبصورت مناظر ہیں؟"
نے جواب دیا۔ "ہاں اس قدر خوبصورت جس کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے"

اور پھر اگلے لمحوں نے بتایا کہ میرے دوست نے بالکل سچ کہہ دیا تھا، ہم مختلف
کی مرمریں چوکھٹوں سے گزر رہے تھے، اور ہمارے قدم اس راستے پر تھے
سے چل کر ہم کشادہ صحن میں پہنچے، اچانک خوشبوؤں کا ایک تیز جھونکا آیا۔
نے خوشبوئیں بکھیرتے دلکش رنگ برنگے پھول تھے، باخرام کے ہلکے جھونکے ہمارا پرتپاک
قبال کر رہے تھے، اور پھر اس سحر انگیز ماحول میں ایسی دنیا میں بھٹکنے لگا جہاں
ت اور خیال پہلو بہ پہلو نظر آ رہے تھے ہم اس کے سبزہ زاروں پر چلنے لگے اور
ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہمارے پہلوؤں میں زندگی کی ایک لہر دوڑ رہی ہے،
بگہ بہتی صاف و شفاف جھیلیں ہماری تصویریں اتار رہی تھیں، خوش لحن پرندے
ں پر محو ترنم تھے اور قدرت کی شاہکار تتلیاں شاخ در شاخ رقص کر رہی تھیں،
لمحوں کے لئے اس پرکشش ماحول میں ان آرائش اور زینت سے غافل ہو گئے
جو قسم کی دیواروں اور ستونوں پر اپنی شاہکاریاں پیش کر رہی تھیں، یہ آرائش اور
ونگار بے مثال ہم آہنگی لئے ہوئے تھے، اور اپنیت و امن جگہ جگہ سے نمایاں
بس امن کے آغوش میں اہل زمانہ نے ٹھنڈی سانسیں لی تھیں، بخدا کیا وہ زمانہ تھا"

زبان سے اس زور سے نکلا کہ میرے دوست نے مجھے اشارہ سے بتایا کہ
لگ سیاح تمہیں گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ میں نے ان نگاہوں کی کوئی پرواہ
اپنی سیاحت جاری رکھی، میرا ذہن سوچ رہا تھا کہ ... [illegible]

قبل قصور و محلات بھی دیکھے ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی محل میں داخل ہوتا تو ایک گ
اور تنگی محسوس ہوتی، میرے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو رہا تھا کہ واقعی وہ محلات اس
خاطر آراستہ کئے گئے تھے کہ لوگ ان میں زندگی کے خوش کن ایام گذاریں، بھلا کس
کو ایسے محل میں انس و سکون مل سکتا ہے جس کی دیواریں اس قدر موٹی کہ جیسے و
قلعہ ہو، کھڑکیاں اتنی تنگ کہ ہوا کا گذر بھی مشکل ہو رہا ہو۔ اور پھر چاروں طر
سے لوہے کی مضبوط سلاخوں سے بنا ہوا احصار تنگی کو اور دو چند کر رہا ہو۔
برج بھی زمین سے اتنی اونچائی پر کہ وہ خود ایک گوشۂ تنہائی بن جاتے ہوں، ا
محلات میں رہنے والے یقیناً سکون و امن کی لذت سے محروم ہوں گے۔

لیکن قصر حمرا کو دیکھئے، دیواریں اس قدر باریک کہ وہ کسی شاعر کے ا
ہوں، روشن دان وسیع کشادہ اور کھلے ہوئے، زمین سے ان کی اونچائی بھی لفا
مقدار میں، گویا چمن کے رنگین پھولوں نے ان سے عہد کر لیا ہو، اور پھر دونوں ا
حسین خواب کے عالم میں ہم آغوش ہو جاتے ہوں۔

قصر حمرا ایک الفت، ایک سکون اور ایک احساس ہے سچ ہے اس بے
قصر کے مکینوں پر سکون کی پُر بہار بارش برستی ہو گی۔

میں اپنی نگاہیں اٹھائے گھور کر چھت کو دیکھے جا رہا تھا اس کے نقش
نگار میری آنکھوں کو مسحور کر رہے تھے۔ میرا دوست مجھ سے ہمکلام ہوا کہ کیا اگر میں
چھت کی یہ گلکاری و آرائش اس قدر ہم آہنگی و ترتیب کے ساتھ اب بھی نایاب
تو کیا آپ مجھ سے اتفاق کریں گے؟

میں نے پوچھا: آخر ایسی کیوں! بولے: اس کا تجربہ کیجئے چھت کی جا
نگاہ کر کے ایک لیٹ جائیے اور چھت کی آرائش میں محو ہو جائیے، آپ کو م

چھت کی آرائش میں محو ہو جاتے آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کہیں اور ہیں" میں ہنسنے لگا اور بولا، ابھی قصر کی دوسری چیزیں دیکھنی باقی ہیں، ورنہ میں آپ کی نصیحت پر عمل کرتا، پھر ہم دونوں ہنستے ہوئے آگے بڑھے اور اس جھیل تک پہنچے جس میں شیروں کے مجسمے تھے میرا دوست مستقل میرے پیچھے چلتے چلتے کافی حد تک تھک چکا تھا، اور تکان کے آثار چہرہ پر نمایاں تھے. وہ کہنے لگے: یہ کس قدر حسین جھیل ہے" میں نے کہا: "سنا ہے کہ یہ جھیل اپنے ساتھ ایک راز بھی رکھتی ہے، آثار کے شائقین اس راز کو حل نہیں کر سکے، آپ مجھے اس راز کے متعلق بتائیے" میرا دوست نہ صرف آثار قدیمہ کا عاشق تھا بلکہ ان کی تاریخ سے پوری واقفیت رکھتا تھا، میرے اس سوال پر انہوں نے کہا ہاں ضرور بتاؤں گا، یہ جھیل ایک گھڑی کا کام کرتی ہے آپ دیکھ رہے ہوں گے کہ اس جھیل کے اندر شیروں کے بارہ مجسمے ہیں یہ بارہ گھنٹوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں. دن و رات کے تمام اوقات میں کسی خاص شیر کے منہ سے پانی کی موجیں ابل رہی ہوتی ہیں. جب ایک گھنٹہ مکمل ہونے لگتا تو پانی کی موجیں آہستہ ہونے لگتیں اور پھر گھنٹہ مکمل ہوتے ہی اس شیر کے منہ سے پانی نکلنا بند ہو جاتا اور دوسرے شیر کے منہ سے پانی کا ابال شروع ہو جاتا اور اس طرح دوسرے گھنٹہ کا آغاز ہو جاتا" میں اپنے اس عظیم سرمایہ کے مٹنے پر اپنی حیرت کو نہ چھپا سکا اور دوست کی بات کاٹتے ہوئے بولا "اف! ہم کیسے اور کس شان کے تھے؟" میرے دوست نے ایک دردناک آہ بھر کر میرے جملہ کو دہراتے ہوئے کہا: "یقیناً ہم کس شان کے تھے؟" پھر میں نے دیکھا کہ وہ غم اور خاموشی کے سمندر میں ڈوب گیا ہو. دونوں آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور غم انگیز آواز میں کہنے لگا کاش کہ ہماری تہذیب کی حکمرانی عقلوں پر جاری رہتی اور اللہ رب العزت کا خوف ہمیشہ رہتا، میں نے تعجب سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "کیا آپ عقلوں کی ملت

رہے ہیں، کیا یہ عقلوں ہی کا کارنامہ نہیں تھا کہ ایسا حسین منظر وجود میں آگیا"
انہوں نے سخت نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بتایا کہ میرا یہ مطلب نہیں ہے میں آپ کی
توجہ ایک ایسی چیز کی طرف لے جانا چاہتا ہوں جو یہاں آنے والے اکثر سیاحوں کی نظروں
سے اوجھل ہو جاتی ہیں، اور پھر وہ چیز تمام حیرتوں اور استعجابوں کا پردہ چاک کر دیتی
ہے۔ یہ کہہ کر وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر ایک طرف بڑھے اور کہا: میں آپ کو اس عظیم الشان
قصر کی مسجد دکھاتا ہوں، مجھے تعجب ہو رہا تھا۔ چلتے ہوئے ہم ایک کنارہ کی جانب جا پہنچے،
سامنے ایک نہایت چھوٹا کمرہ تھا جس میں بمشکل چند آدمیوں کی گنجائش تھی۔
دوست نے بتایا کہ یہی اس محل کی مسجد ہے، اب آپ کیا خیال کرتے ہیں؟ میں کچھ جواب
نہ دے سکا، ایسا لگا کہ ایک تیر میرے سینہ میں آکر پیوست ہو گیا ہے، میں نے اپنے دل
میں کہا کہ یہ مسجد نہیں ہو سکتی، پھر میں نے اپنے دوست سے کہا کہ "شاید آپ مذاق
کر رہے ہیں، جو محل ایسی شان اور ایسی جاہ و عظمت والا ہو، ضرور اس کی مسجد بھی اپنی
آرائش و زیبائش اور کشادگی میں اپنی شان کے مطابق ہو گی"
میرے دوست نے یہ سن کر کہا: لیکن صد افسوس! کہ حقیقت یہی ہے، اور شاید آپ
سمجھ رہے ہوں گے کہ ہماری اس تہذیب کو کس نے معدوم کر دیا" میں نے اپنے سر کو ہلایا،
رنج و غم کی شدت سے میرا دل پگھل رہا تھا، زبان سے آواز نکلی: "ضرور۔۔۔۔
ضرور۔۔۔۔ ہم دونوں مسجد میں داخل ہوئے اور دو رکعات تحیۃ المسجد پڑھی، پھر اس
غم انگیز موضوع پر مصروف گفتگو ہو گئے۔

کچھ عرصہ قبل اقوام کے زوال و عروج کے موضوع پر میں نے مطالعہ کیا تھا، اس
دوران اس کی کچھ اہم باتوں کی طرف اشارہ کرنا مفید ہوگا، مالک بن نبی نے اپنی کتاب
"شروط النہضۃ" میں لکھا ہے کہ تہذیب تین مرحلوں سے گزرتی ہے، پہلا مرحلہ روح کا

ذہب اس ابتدائی مرحلہ میں جنسی خواہشوں سے آزاد ہوتی ہے لوگوں کی زندگی میں
قیدہ کی گرفت مضبوط ہوتی ہے، پھر عقل کا مرحلہ آتا ہے اور آہستہ آہستہ روح کو
ثری غرائز پر غلبہ حاصل نہیں رہتا۔ خواہشوں کو آزادی مل جاتی ہے، اور معاشرہ کا
باؤ کسی فرد پر باقی نہیں رہتا یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے، انسان کی بے راہ روی پر کوئی
کنے والا نہیں ہوتا، اور عقیدہ کی اجتماعی کارکردگی متاثر ہوتی چلی جاتی ہے، جب یہ
راہ روی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تب تیسرا مرحلہ آتا ہے، جس میں جنسی خواہشات
ھلے عام سڑکوں پر آجاتی ہیں۔ معاشرہ ان کو روکنے سے عاجز ہو چکا ہوتا ہے اور اس
حلہ میں تہذیب انتہائی کھوکھلی ہو کر تاریکی میں کھو جاتی ہے۔

یہ سن کر میرے دوست نے کہا! "بالکل صحیح ہے" ایسے عظیم الشان قصر کے پہلو میں
ی ٹوٹی پھوٹی تنگ و تاریک مسجد تمہاری باتوں کی صداقت کا ثبوت پیش کر رہی ہے،
سلامی تہذیب کے آخری دور میں جنسی خواہشات نے شدت اختیار کر لی تھی لوگوں کے
گ ریں سرکشی داخل ہو چکی تھی گویا اس جاہ و جلال والے قصر کی روح مردہ ہو چکی تھی
وہ ختم ہو چکا تھا، اور اس روحانی دنیا کا ایک نمونہ "مسجد" کا نام لے کر باقی رہ گیا تھا۔
کیا آج کے مسلمان اندلس کے اس واقعہ سے کوئی سبق لیں گے، اور ہر چیز کا اس
ق دینے کی کوشش کریں گے کہ ہماری تہذیب کا دور شباب پھر لوٹ آئے، اس
لمت رفتہ کی بازیافت ہو! یا ۔۔۔ ؟ میرے اس سوال پر میرا دوست خاموش
، اس کے چہرہ پر آنسو کے قطرے چمک رہے تھے۔

(بشکریہ البلاغ بمبئی جولائی ۱۹۹۲ء)

ڈاکٹر عبدالعلی
ہاسٹن ٹیکساس، امریکہ

امراض قلب کا جدید ترین علاج

انجیو پلاسٹی، موثر اور کامیاب طریقہ

ممتاز ماہر امراض قلب ڈاکٹر عبدالعلی سارڈیالوجی کنسلٹنٹ امریکہ نے کہا ہے دنیا میں کینسر سے کہیں زیادہ پیچیدہ مرض قلب ہے اس سلسلہ میں معمولی سی لاپرواہی بھی جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلی نے آج نمائندہ سیاست سے بات چیت کرتے ہوئے امراض قلب کی وجوہات پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے بتایا کہ امراض قلب کی وجوہات میں سگریٹ نوشی، ہائی بلڈپریشر، شکر جن میں ضرورت سے زیادہ حرارت، موٹاپا اور چربی میں اضافہ وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ امراض قلب کی بنیادی وجہ بداحتیاطی ہے اور یہ بداحتیاطی غذا سے بھی ہوسکتی ہے اور سگریٹ نوشی جیسی عادت کے باعث بھی ہوسکتی ہے۔

بداحتیاطی، عموماً کھانے پینے کی چیزوں میں بداحتیاطی کی جاتی ہے اور تیل، گھی کے علاوہ چربی دار اشیاء کا کثرت سے استعمال، انسانی جسم میں کولیسٹرول ترجیحات زندگی

کرنے کم سے کم اور چھوٹی موٹی بھی حرکت نہ کرنا بھی بڑا احتیاطی کہلاتا ہے۔

احتیاطی اقدامات :- غذاؤں میں احتیاط برتنا، چربی دار غذاؤں سے بچنا اور جسمانی ورزش کی اہمیت پر زور دینا شامل ہیں۔ ڈاکٹر عبدالعلی ایم ڈی ایف اے سی سی، ڈپلومیٹ امریکن بورڈ آف انٹرنل میڈیسن اینڈ کارڈیالوجی، اور کارڈیاک کیتھرائزیشن اینڈ کارونری انجیو پلاسٹی۔

DR. ABDUL ALI. M.D. F.A.CC
DIPLOMATE AMERICAN BOARD OF
INTRNAL MEDICINE AND CARDIOLOGY
CARDIAC CATHTERIZATION AND
CORONARY ANGIOPLASTY HOUSTON TEXAS, U.S.A

ہیوسٹن، ٹیکساس امریکہ میں حیدرآباد اور جامعہ عثمانیہ کے ایک نامور سپوت ہیں۔ ڈاکٹر عبدالعلی ۵ اگست ۱۹۴۳ء میں حیدرآباد کے پرانے شہر میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ۱۹۶۷ء میں جامعہ عثمانیہ سے ایم بی بی ایس کی تکمیل کی۔ بعد ازاں انہوں نے برطانیہ میں ۱۹۷۱ء میں ایم آر سی پی کی ڈگری حاصل کی۔ جہاں سے وہ امریکہ منتقل ہو گئے اور امریکہ میں ۱۹۷۸ء تک انہوں نے عالمی شہرت یافتہ ماہر امراض قلب ڈاکٹر ڈینٹن کولی DR. DENTAN KO کے ہاں کارڈیالوجی کی ٹریننگ پائی۔ ڈاکٹر علی ان دنوں بطور ڈپلومیٹ امریکن بورڈ آف انٹرنل میڈیسن اینڈ کارڈیالوجی کی حیثیت امریکہ میں کارگزار ہیں اور انجیو پلاسٹی کے طریقہ علاج میں دنیا کے چند ممتاز ماہرین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر علی نے حیدرآباد میں اپنے مختصر قیام کے دوران امراض قلب کے سلسلے میں مختلف مقامات پر معلوماتی لکچرس بھی دیے اور کئی مریضوں کا معائنہ بھی کیا۔ انہوں نے کہا کہ انجیو پلاسٹی امراض قلب کے لئے ایک آسان اور کارآمد طریقہ علاج ہے اور امریکہ میں اس وقت عوام میں جو رجحانات پائے جاتے ہیں۔

اسکے مطابق بائی پاس سرجری کے برخلاف انجیو تھراپی پر مائل نظر آتے ہیں اور گزشتہ ۵ سالوں میں قلب کے زیادہ سے زیادہ کیسس کے بجائے بائی پاس سرجری کے انجیو پلاسٹی کے ذریعہ علاج کیا گیا۔ انجیو پلاسٹی ایک ایسا طریقۂ کار ہے جسمیں مریض کی عمر اور اس کی جسمانی صحت ہر حالت میں موافق ہو سکتی ہے اور جسمیں جسم کو چیر پھاڑ کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ مریض کے جسم میں ایک باریک سوراخ کے ذریعہ ایک دھاگہ نما تار داخل کیا جاتا ہے جسکے سرے پا ایک بیلون (BALOON) ہوتا ہے۔ اس کو دل کے بند خلیے اور قلب کو خون پہنچانے والی رگیں جن کے وال VALVE بند ہو جاتے ہیں یا خون کے دوران میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اور ان تمام کو کمپیوٹر کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے اور ان بند رگوں تک جب دھاگہ پہنچتا ہے تو انجیو پلاسٹی مشین کے ذریعہ دھاگے کے سرے پر غبارہ نما بیلون کی مدد سے ہوا کے دباؤ کے ذریعہ خون کی بند نالیوں کو کھولا جا سکتا ہے۔ جبکہ بائی پاس سرجری میں زیادہ وقت درکا ہوتا ہے اور ۲ تا ۳ دن کے اندر مریض کو آرام ہو جاتا اور وہ اپنے روزمرہ کے فرائض انجا دے سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ بائی پاس سرجری صرف ۲ مرتبہ ہی کرسکتے ہیں جبکہ انجیو پلاسٹی کو متعدد مرتبہ کیا جا سکتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ انجیو پلاسٹی طریقۂ علا کا ۱۹۷۵ء میں امریکہ اور دیگر بیرونی ممالک میں آغاز ہوا۔ لیکن ہندوستان میں اس طریقۂ علاج کے لیے ایک طویل عرصہ درکار رہا اور گزشتہ ۲ تا ۳ سال کے عرصہ میں ا ہندوستان میں اس طرز کے طریقہ علاج کی شروعات ہوئیں اور یہ طریقہ علاج ملک بھ میں نظامس انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس حیدرآباد آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس نئی دہلی، جے بی پنت میڈیکل انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، اپولو ہاسپٹل مدراس، اور جسلوک ہاسپٹل بمبئی میں دستیاب ہے اور انجیو پلاسٹی طریقہ علاج کی مشینوں کو امریکہ کی مشہور میڈیکل الیکٹرونکس کمپنی BACIUCI ہر ممالک کو سربراہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالعلی نے دل کے

مریضوں کو باقاعدہ جسمانی ورزش کرنے کا مشورہ دیا۔ اور کہا کہ اگر کوئی بھی فرد یا مریض اپنے جسم میں ہائپر ٹینشن HYPER TENSION محسوس کرنے کی صورت میں فی الفور کسی بہتر فزیشن سے رجوع ہوں۔ انہوں نے کہا کہ عبادات کرنے سے بھی دوران خون میں اضافہ ہوتا ہے اور عبادت بھی ایک ورزش ہی کہلائی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر کسی شخص یا فرد کو امراض قلب کے سلسلہ میں کسی قسم کا وہم یا شک وشبہ پایا جاتا ہو تو وہ فی الفور ایک سے زاید بہتر اور ماہر امراض قلب سے رجوع ہو کر مشورہ حاصل کریں۔ بالخصوص حیدرآباد میں ایمرجنسی جیسی صورتحال میں عرف اور صرف نظامس انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس حیدرآباد سے رجوع ہوں جہاں دل کے امراض کا بہتر طور پر علاج کیا جاتا ہے اور وقت کو ضائع کئے بغیر اولین وقت میں ڈاکٹروں سے رجوع ہوں تاکہ قیمتی جان کو بچایا جاسکے۔ انہوں نے امراض قلب کے مریضوں سے خواہش کی کہ وہ زیادہ تر ترکاریوں، پھل اور میوؤں کے استعمال کو ترجیح دیں۔

سلسلہ نمبر ۵

خواجہ محی الدین، مراد نگر حیدرآباد

س: میں پولینڈ، زامبیا کے صدر مقام کے نام جاننا چاہتا ہوں؟

ج: پولینڈ کا صدر مقام وارسا اور، زامبیا کا صدر مقام لوساکا ہے۔

نعیم الدین، چھاتا حیدرآباد

س: سی۔ راجگوپال چاری، اور سی۔ آر داس کس نام سے مشہور ہیں؟

ج: پہلے "راجہ جی" اور دوسرے "دیش بندھو" کے نام سے مشہور ہیں۔

ڈاکٹر زیب حیدر
ریڈر فارسی، عثمانیہ یونیورسٹی

پروفیسر غلام دستگیر رشیدؒ

دردِ دل کا یہ تقاضا ہے کہ فریاد کروں
ضبطِ غم حلق دباتا ہے کہ آواز نہ ہو

۲۹ر اپریل کی صبح میرے لیے بہت ہی منحوس پیغام لائی جب اخبار سیاست پر نظر پڑی تو دماغ پر ایک سناٹا سا چھا گیا ابھی ابھی سیاست میں ڈیڑھ ماہ قبل رشید صاحب کی شریک حیات محترمہ عابدہ بیگم صاحبہ کے سانحہ ارتحال کی خبر شائع ہوئی تھی اور اکثر و بیشتر ہمارا موضوع سخن آجکل رشید صاحب اور انکی بیگم صاحبہ ہی تھیں کہ یکایک رشید صاحب کے انتقال کی خبر جانکاہ اخبار میں پڑھی دماغ پر ایک اور سناٹا چھا گیا۔ رشید صاحب میری ملاقات اس وقت ہوئی جبکہ ایم۔ اے سال دوم کی طالبہ تھی میرے ذہن رشید صاحب کی ایک قدآور شخصیت تھی میں نے اکثر رسالوں میں انکے مضامین پڑھے تھے اور ریڈیو سے گفتار پرستی تھی لیکن جب رضیہ آپا صاحبہ نے تعارف کروایا تو آپ دبلے پتلے چھوٹے سے قد کے پروفیسر تھے۔ لیکن پہلی ہی ملاقات میں یہ اندازہ ہو آپکا قد تو بظاہر چھوٹا ہے لیکن خیالات قدآور ہیں۔ رشید صاحب کو کبھی میں نے پینٹ پہنتے نہیں دیکھا ہمیشہ شیروانی اور پائجامہ میں ملبوس نظر آتے سر پر کالی ایک ہاتھ میں چھتری اور ایک ہاتھ میں بیاگ ہوتا اگر کوئی ان سے ان دونوں سے ایک چیز مانگتا تو منع کر دیتے اور فرماتے کہ ان دونوں چیزوں سے تو اذن ہے۔ آپکی نظر بہت وسیع تھی اور آپکی شخصیت میں گیرائی بھی تھی اور گہرائی بھی

بذلہ سنج زندہ دل منکسرالمزاج، ہمدرد اور خدا پرست تھے۔ آپ کی نظر نہ صرف علوم دنیوی پر گہری تھی بلکہ علوم دینی میں بھی آپکو درک حاصل تھی آپ نے مذہبی معاملات پر بہت سیر حاصل مضامین لکھے ہیں خصوصاً تصوف اور صوفیائے کرام کے بارے میں آپکے معلومات بہت تھے رومی کے آپ عاشق تھے اقبال کے دلدادہ اکثر صوفیائے کرام مثلاً خواجہ بندہ نواز نظام الدین اولیا اور خاندان چشتیہ کے کئی صوفیاء کے ملفوظات آپکو ازبر تھے اور جس وقت تصوف پڑھاتے تو بڑی تفصیل سے ایک ایک بات کے رموز و نکات بہت ہی گہرائی سے سمجھاتے خصوصاً جس وقت اقبال و رومی پڑھاتے تو نفس مضمون میں ڈوب جاتے کلاس میں ایک خاص قسم کی فضاء چھا جاتی اور سننے والا اپنے آپ کو عالم بالا میں تصور کرتا۔

جس وقت ناچیز نے ایم اے کا امتحان دینے کا ارادہ کیا تو اسوقت میں مجبوبیہ جونیر کالج میں بحیثیت فزیکل ڈائرکٹر کام کر رہی تھی۔ اور CANDIDATE TEACHER کی حیثیت سے امتحان میں شریک ہونا چاہتی تھی۔ رفیعہ آپا صاحبہ جو میری مشفق استاد ہیں انہوں نے ازراہ مہربانی مجھے کلاس اٹینڈ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی جو اس وقت صدر شعبہ تھیں۔ لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ میں اسکول کے اوقات کے بعد کالج جاتی تھی اسکول ۱ بجے تک کام کرتا تھا مجھے یونیورسٹی پہنچتے پہنچتے ایک بج جاتا تھا چونکہ پروفیسر رشید صاحب اور پروفیسر قادری کلیم اللہ حسینی صاحب کی کلاس ۱۲ بجے کی ساعتوں میں تھی اس لیے ان دونوں بزرگ اساتذہ سے خاطر خواہ استفادہ نہ کر سکی۔ رشید صاحب نے اس وقت میری ہمت بندھائی اور مجھے اپنے گھر آنے کی اجازت دی مجھ سے فرمایا کہ جس وقت بھی تمہیں اپنی ملازمت سے فرصت ملے میرے گھر آ جاؤ میں تمہاری مدد کروں گا۔ اندھا کیا چاہتا ہے دو آنکھیں میں بھی ان کے گھر جانے لگی۔ رشید صاحب اور آپکی بیگم صاحبہ دونوں بہت ہی ہمدرد اور خوش خلق

پیش آتے خوب خاطر مدارت ہوتی جاتی ہی موسم کے لحاظ سے چائے یا شربت پلایا جاتا اور پھر پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوتا۔ تصوف۔ حسن سنجری زبور عجم ا SPECIAL AUTHORED کی مثنوی مولانا روم و منطق الطیر کے کچھ منتخب حصے رشید صاحب کے ذمے تھے یہ سب وقت کی کمی کی وجہ سے میں خود پہلے اپنے طور پر پڑھ لیتی اور ان میں سے جو بھی چیزیں میری عقل سے ماوراء ہوتیں رشید صاحب سے پوچھ لیتی اور آپ بڑی خوشی سے ایک ایک نکتہ اور ایک ایک امر پر روشنی ڈالتے کوئی گوشہ ایسا نہیں ہوتا جس پر کہ رشید صاحب نے روشنی نہ ڈالی ہو اس طرح سے راز ہائے نہاں عیاں ہو جاتے تھے۔ پروفیسر قاری کلیم اللہ حسینی صاحب کی جماعت میں نہیں شریک ہو سکتی تھی لہذا میں نے رباعیات خیام کی تشریح اپنے طور پر کی اور اسکو رشید صاحب کے ملاحظہ کیلئے پیش کی بہت خوش ہوئے فرمانے لگے مجھے تمہارا چھوٹے چھوٹے جملے لکھنا بہت پسند آتا ہے۔ ایک دفعہ فرمانے لگے کہ تمہارے مضامین میں MATTER جتنا خوبصورت ہوتا ہے اتنا ہی اسکے اظہار کا طریقہ بدصورت ہے میں نے ڈرتے ڈرتے استفسار کیا کہ وہ کیا ہے فرمانے لگے تمہارا خط اتنا خراب ہے کہ مجھے بیٹھ کر کے پڑھنا پڑتا ہے اور وہ صرف اس لیے پڑھتا ہوں کہ اس میں MATTER بہت ہوتا ہے۔ اس سے میری خودستائی نہیں بلکہ رشید صاحب کی بڑائی عالمانہ شان اور بزرگی کا اظہار مقصود ہے۔ آپ اکثر کلاس میں چھوٹے چھوٹے چٹکلے بیان کرتے یا کوئی چھوٹی موٹی مزیدار کہاوت سنا دیتے جس سے تمام طلباء بے ساختہ ہنس پڑتے اس میں ایک حکمت یہ پوشیدہ تھی کہ تصوف ایسا مضمون ہے جو سب کیلیے باعث دلچسپی نہیں ہوتا بعض اس سے بور بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر اس طرح بیچ میں کوئی بذلہ سنجی یا ظریف بات کردی جائے تو ایسے طالب علموں کے بدل جاتا تھا اور وہ پھر اونگھتے اونگھتے چاق و چوبند ہو جاتے تھے۔

گھر میں ہمیشہ رشید صاحب کے پاندوسماوار رکھا ہوتا آپ چائے کے بہت شایق تھے اور وضع وقطع کی چاء نوش فرماتے تھے تقریباً ہر گھنٹہ سے چاء نوشی کی جاتی اکثر یہ چاء بلا دودھ کے ہوتی ۔ کبھی اس میں لیمو ین کے چند قطرے ڈالے جاتے۔ کبھی الائچی کبھی پودینہ۔ یہ چاء آپ خود اپنے ہاتھ سے بناتے تھے خود بھی پیتے اور دوسروں کو بھی پیش کرتے ایک دفعہ آپ نے مجھ سے فرمایا دو زیب کبھی تم نے "غبار خاطر" کی چائے پی ہے" میں نے جواب دیا کہ جی نہیں تو ایک چاء جس میں پودینہ اور الائچی تھی مجھے دی اور فرمانے لگے کہ لو یہ چائے پیو غبار خاطر" کی چائے ہے" آپکو پالک کے بھجیے بہت مرغوب تھے۔ اور مزیدار کھانا کھانے سے زیادہ مہمانوں کو کھلانے کا شوق تھا۔ آپ کھانا بہت کم نوش فرماتے تھے مجھے کئی بار دوپہر کا کھانا آپکے پاس کھانے کا اتفاق ہوا آپ مہمانوں کی آمد سے بہت خوش ہوتے تھے مجلسی اور یار باش آدمی تھے۔ اور آپ کا حلقہ احباب مخصوص اصحاب پر منحصر تھا۔ جو زیادہ تر ادب فلسفہ تصوف اور اسلامیات سے تعلق رکھتے تھے۔ عربی زبان وادب پر بھی آپ کو عبور حاصل تھا۔ میں نے بھی شدبدہ عربی آپ سے ہی پڑھی جو ایم اے کے پرچے کیلیے ضروری تھی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ آپنے بعض سورتوں کی تفسیر بھی بتلائی تھی۔ ایم اے میں آپ کا مقالہ رومی پر تھی اور ڈاکٹر اقبال آپکے ممتحن تھے۔ جنہوں نے آپ کی بہت ہی اچھی رپورٹ لکھی ہے آپ کی نظر اقبال پر بہت گہری تھی۔ اقبال پر علمی وادبی کام کرنے اور نوجوانوں میں اقبال کو سمجھنے اور پڑھنے کا شعور بیدار کرنے کی بنا پر آپ کو اقبال ایوارڈ عطا کیا گیا اور فارسی ادب کی خدمات کے صلہ میں آپکو راشٹرپتی ایوارڈ بھی عطا کیا گیا تھا آپ بہت سے ہندوستانی جامعات میں ممتحن رہ چکے تھے اور آپ کو انٹرویو بحیثیت ماہر فارسی بلوایا جاتا تھا آپ کے مکان پر ہی تحقیقی کام ہوتا جس میں دوسرے لوگ بھی شریک کار ہوتے آپ نے خسرو پر بھی کام کیا ہے۔

اور گھر ہی پر ایسی محفلیں منعقد ہوتیں جس میں مخصوص احباب جمع ہوتے علمی، ادبی، تہذیبی اور ثقافتی مسائل پر گفتگو ہوتی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ قرآن و حدیث کے معاملات پر بھی سیر حاصل بحث و مباحث ہوتے۔ ایک سال قبل جب میں آپ سے نیاز حاصل کرنے کے لیے گئی تو دیکھ کر میرے آنسو نکل پڑے تھے۔ آپ بہت نحیف و ناتواں ہو گئے تھے اور جس شخص کو ہزار ہا رومی، غالب، اقبال، حافظ، عرفی وغیرہ کے اشعار یاد تھے اور جو اپنی گفتگو میں بے تکلف ان اشعار کو استعمال کرتے تھے اب بالکل ہی خاموش تھے۔ یہاں تک کہ آپ کی یادداشت بھی ختم ہو گئی تھی مجھے تو آپ نے پہچانا بھی نہیں البتہ پروفیسر بشیر النساء صاحبہ کو پہچان لیا۔ مجھے نہیں پہچاننے کے باوجود بھی آپ نے میری خیریت دریافت کی اور ملازمت سے متعلق پوچھا لیکن آپ کو دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کو کوئی غم اندر ہی اندر کھا رہا ہے۔ اور جب تک میں بیٹھی رہی دونوں ہاتھ ملتے رہے گویا کف افسوس مل رہے ہیں۔ بڑے آدمیوں کی قوت احساس بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے اور ان کے غم بھی اتنے ہی بڑے ہوتے ہیں لیکن وہ اظہارِ غم سے احتراز کرتے ہیں۔ رشید صاحب کو دیکھ کر یہ شعر ذہن میں گردش کرنے لگا۔

درد دل کا یہ تقاضا ہے کہ فریاد کروں
ضبط غم حلق دبا تا ہے کہ آواز نہ ہو

رشید صاحب کے انتقال کو نہ صرف عثمانیہ بلکہ ہندوستان کی دوسری یونی ورسٹیوں میں ایک حادثہ جانکاہ سمجھا جائے گا۔ اس وقت شعبہ فارسی عثمانیہ یونی ورسٹی میں جو اساتذہ ہیں سب ہی نے آپ سے اکتساب فیض کیا ہے۔ کسی نہ کسی طرح آپ کی علمی و ادبی خدمات سے مستفید ہوتے ہیں۔

مرزا ظفر الحسنؒ کا خط

مسز یٰسین اصغر کے نام

'مرزا ظفر الحسن مرحوم اردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں
ان کا تعلق یوپی سے تھا مگر ان کا خاندان حیدرآباد میں مقیم ہو گیا تھا۔
وہ برسوں دکن ریڈیو سے وابستہ رہے اور پولیس ایکشن کے بعد (جسے وہ
سقوط حیدرآباد کی اصطلاح سے یاد کرتے تھے) کراچی منتقل ہو گئے۔
یوں تو انہوں نے کئی کتابیں لکھیں لیکن "ذکر یار چلے" ان کی ایک یادگار
کتاب ہے جس میں انہوں نے اپنے قیام حیدرآباد، جامعہ عثمانیہ اور اپنے
دوستوں کا تذکرہ بہت تفصیل سے اور بہت موثر انداز میں پیش کیا ہے
وہ اشفاق حسین مرحوم کے بہت گہرے دوست تھے جن کی صاحبزادی مسز
یٰسین اصغر ہیں جنہوں نے اردو سے درجہ اول میں جامعہ عثمانیہ سے ایم اے
کیا ہے اور ان دنوں دفتر ترجمہ صیغہ اردو آندھرا پردیش حیدرآباد میں
سینیر مترجم ہیں۔ ظفر الحسن مرحوم نے انہیں جملہ تین خطوط لکھے تھے جن میں
سے ایک خط "شاداب" کے اس شمارہ میں شائع کیا جا رہا ہے۔ دو خطوط
(جو قدرے مختصر ہیں) آئندہ شمارہ میں شائع کئے جائیں گے (ایڈیٹر)

ناظم آباد - کراچی - ۱۸   مورخہ ۲۷ر مارچ ۱۹۷۹ء

نسیم بیٹی!

دعا - تمہارا خط اور اس کے ساتھ "سرور رفتہ"[1] کا ایک نسخہ اور ایک خط محمود خاور[2] کا مرسومہ ہے۔ معلوم نہیں تم نے یہ سب کب بھیجا تھا کیونکہ خط پر تاریخ درج نہیں ہے۔

محمود خاور کا خط "دوشیزہ"[3] کے پتے پر روانہ کر دیا ہے مگر یہ ان کا اصلی پتہ نہیں ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ انہیں ملتا بھی ہے یا نہیں۔ یہ بھی علم نہیں کہ وہ ابھی تک کراچی میں ہی ہیں یا وطن واپس ہو گئے ہیں[4]۔ کوئی مہینہ پہلے بہادر یار جنگ اکیڈمی کے ایک جلسہ میں جو سلیمان خطیب کی یاد میں کیا گیا تھا محمود خاور آئے تھے۔ دور سے صاحب سلامت ہوئی تھی۔ چائے کے وقت میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ غالب لائبریری میں مجھ سے ملیں مگر وہ نہیں آئے۔ اسلیے میرا گمان ہیکہ وہ پانچ کتابیں جو تم نے ان کے خسر کے ذریعہ مجھے بھجوائی تھیں وہ اب نہیں ملیں گی۔ اگر ملنے والی ہوتیں تو اب تک مل جاتی۔ چھوٹی بھائی کو تم نے جو کتاب بھجوائی وہ بھی اب غالباً نہیں ملے گی۔

---

۱ اشفاق حسین مرحوم کے مضامین اور دوسری تحریروں کا مجموعہ جسے ان کی صاحبزادی نے اپنے والد کے انتقال کے بعد مرتب کیا تھا

۲ اردو کے شاعر اور صحافی جن کا تعلق حیدرآباد سے تھا جو مستقل طور پر پاکستان منتقل ہو گئے (ایڈ)

۳ کراچی سے نکلنے والا ڈائجسٹ جس میں کچھ عرصہ تک محمود خاور نے کام کیا تھا

۴ محمود خاور کی اہلیہ ان کی چچازاد بہن ہیں۔ وہ ایسے پاکستان گئے کہ گھر واپس حیدرآباد نہیں لوٹے۔ چند سال انہوں نے جدہ میں بھی گزارے۔

کیونکہ مہدی بھائی اکیڈمی کے صدر ہیں اور محمود خاور کو اس کا علم ہے اور سلیمان خطیب والے جلسہ کی صدارت مہدی بھائی ہی نے کی تھی۔ ذرا یہ تو بتاؤ کہ تم نے کس طرح مہدی علی صدیقی کو مہدی بھائی لکھا جب کہ وہ میرے اور اشفاق کے بھی سینیر ہیں[1]

مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم نے یہ کتاب[2] شائع کر دی۔ میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اس سلسلہ میں تمہیں کتنی زحمت ہوئی ہو گی۔ تمہاری تمام کاوش و کاہش کا یہ صلہ کیا کم ہے کہ زمین کی بات اگر عالم ارواح تک جاتی ہے تو اشفاق کتنا خوش ہوا ہو گا کہ اس کی بیٹی نے تن تنہا یہ سارا کام کیا اور کتاب چھاپ دی رہی تشہیر کی بات تو کچھ کتابیں اور بھیج دو تو چند شہر سے چھپوا کر وہ رسالے اور اخبار جن میں تبصرے شامل ہونگے تمہیں بھجوا دوں گا۔

سعید بن محمد نے بڑا اچھا ٹائٹل بنایا ہے[3]۔ اشفاق کی تصویر بھی بہت اچھی چھپی ہے۔ یہ تصویر اگر کہیں اور دیکھنے کو ملتی تو میں اپنے پیارے کو نہ پہچان سکتا تھا کیوں کہ اس میں وہ بہت بدلا ہوا ہے۔ ہمارے زمانے کا منشی اشفاق تو ہمیشہ کا شیروانی پوش تھا۔ یہاں تو صاف بہادر نظر آتا ہے۔ کرکٹ جوبلی میں اس نے ایسا سوٹ پہن کر یقیناً بادشاہی کی ہو گی۔ جیسا کہ اس نے ایک خط میں لکھا ہے۔

تم نے اچھا کیا کہ "ذکر یار چلے" کا اقتباس کتاب میں دے دیا[4]

---

[1] مہدی علی صدیقی مسز یسلمین اصغر کے جیٹھ ہیں۔

[2] "سرد رقص" کی طرف اشارہ ہے جو ۱۹۷۸ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی تھی اور جسے مسز یسلمین اصغر نے مرتب کیا تھا (ایڈیٹر)

[3] حیدرآباد کے مشہور آرٹسٹ جواب اس دنیا میں نہیں ہے

[4] مسز یسلمین اصغر نے "ذکر یار چلے" میں جہاں جہاں اشفاق صاحب مرحوم کا ذکر تھا اسے ایک جگہ جمع کر لیا اور اسے کتاب میں دے دیا یہ خیال انہیں زینت آپا (زینت ساجدہ) نے دیا تھا۔

اس وقت کتاب میرے سامنے نہیں ہے مگر مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ مکمل نہیں ہے کیوں کہ اس خاکہ میں ایک جگہ میں نے LBW کا ذکر کیا ہے اور وہ حصہ یہاں نظر نہیں آیا ہے[۱]۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میر حسن، شہاب اور دو ایک دوسرے دوستوں کے علاوہ اشفاق پر میں نے اپنی کتاب[۲] میں جو کچھ لکھا ہے وہ مجھے بہت عزیز ہے میں نے بڑے پیار سے لکھا ہے۔ جب بھی ان دوستوں کی یاد مجھے ستاتی ہے اور اکثر ستاتی رہتی ہے وہ کتاب پڑھنے لگتا ہوں۔ بیٹی ایک بات اور بھی تمہیں بتاؤں اشفاق، میر حسن، مخدوم اور شہاب، سکندر علی وجد وغیرہ پر جتنا اور جو کچھ میں نے لکھا ہے۔ اب اور کوئی اور نہیں لکھ سکتا۔ میں خود بھی نہیں لکھ سکتا کیوں کہ یہ مضامین میں نے نہیں لکھے یوں سمجھو مجھ پر اوپر سے نازل ہوئے ہیں۔

اب ایسے نزول کا سلسلہ رک گیا ہے۔ اس باعث جب تم نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اشفاق پر کوئی نیا مضمون لکھ دوں تو میں نے ٹال دیا۔ ٹالنے میں سوائے اس کے کوئی مصلحت نہیں تھی یہ مضمون مجھے اتنا عزیز ہے اور اس کے ساتھ مجھ میں یہ احساس پیدا ہے کہ اب میں اشفاق، میر حسن اور شہاب وغیرہ پر اس سے بہتر نہیں لکھ سکتا۔

تم نے اپنے حق کا لکھا ہے۔ تمہارے حقوق مجھ پر اتنے زیادہ ہیں جتنے کہ میرے بچوں شاہین، جاوید اور کاشف کے ہیں بلکہ ان سے زیادہ ہیں کیوں کہ مجھے کوئی بیٹی نہیں ہو اور تم ہی میری بیٹی ہو۔

---

۱ شاید ایک آدھ پیراگراف چھوٹ گیا ہو۔

۲ "ذکر یار چلے" کی طرف اشارہ ہے (ایڈیٹر)

"یادِ غمگسار کی بات" [1] کے سلسلہ میں تمہیں ایک وارننگ اس خیال سے دینا چاہتا ہوں کہ تمہیں بہت زیادہ غم نہ ہو۔ یہ کہ تم اشفاق کے دوستوں پر بہت زیادہ انحصار نہ کرو بہت کم دوست مضامین لکھیں گے۔ یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ تم مخدوم اور میر حسن پر لکھے گئے مضامین کی تعداد گن لو۔ ان کے معیار کا اندازہ لگاؤ اور دیکھو کہ ان کے دوستوں نے کتنا لکھا اور کیا لکھا۔ خیر میر حسن کو بھی چھوڑو کہ وہ شاعر یا سیاسی آدمی نہیں تھا۔ مخدوم جس نے کل ہند اہمیت حاصل کر لی تھی اس پر کیا لکھا گیا۔ اس کے قریبی دوستوں میں سے کتنوں نے لکھا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم اپنی کوشش ترک کر دو۔ کوشش کرو ضرور۔ صرف یہ کہ بہت زیادہ کامیابی نہ ہو تو غم نہ کرنا۔ اردو دنیا کا یہی دستور رہا ہے کہ وہ اپنے محسنوں کو بھلا دیتی ہے۔ میں نے ایک مضمون شروع کیا ہے کہہ نہیں سکتا کہ کب مکمل ہو گا۔ اور میرے اشفاق کے شایانِ شان ہو گا بھی یا نہیں [2]۔ اگر کوئی بات بنی اور مضمون مجھے پسند آیا تو تمہیں بھیج دوں گا۔ اسی طرح ڈاکٹر معین الدین عقیل سے بھی

---

[1] "افسردہ رقہ" کے بعد مسز یسمین اصغر اپنے والد مرحوم پر ان کے دوستوں کے لکھے ہوئے مضامین کا ایک اور مجموعہ "یادِ غمگسار کی بات" کے عنوان سے چھپوانا چاہتی تھیں۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور ظفر الحسن مرحوم کی یہ بات بعد میں بہت صحیح ثابت ہوئی۔ کیوں کہ اس مجوزہ کتاب کے لیے انہیں ایک بھی مضمون دستیاب نہیں ہوا۔

[2] یہ مضمون بھی ظفر الحسن مرحوم نے پورا نہیں کیا اور نہ اپنے جن دوستوں کا انہوں نے ان خطوں میں تذکرہ کیا ان سے اشفاق حسین مرحوم پر مضامین لکھوا سکے۔ حالانکہ وہ اور ان کے دوست بہت معروف لوگ تھے۔ (ایڈیٹر)

ایک مضمون لکھوا دوں گا۔ عقیل بہت اچھے قلم کار ہیں لیکن بہت مصروف رہتے ہیں۔ اس لیے ابھی تک کچھ نہیں لکھ سکے۔ ان سے ضرور لکھواؤں گا۔ اسی طرح ایک اور صاحب ہیں ڈاکٹر آغا سہیل۔ لاہور کے ایف سی کالج میں اردو کے استاد ہیں انہیں "مقام اقبال" اور "اقبال اور انسان" بھیج کر ایک مضمون لکھوا لیں گا۔ "اشفاق حسین کا مطالعہ اقبال"۔ "یار غمگسار کی بات" کی ضخامت بھرتی کے مضامین سے بڑھانے کی کوشش نہ کرنا۔ ایک سو چوالیس یا ایک سو ساٹھ صفحات کی کتاب کافی ہے۔ مغنی تبسم اور وحید اختر سے بھی ابھی لکھواؤ۔ یوسف ناظم کا مضمون جو ان کے کسی مجموعہ میں شامل ہے "یار غمگسار کی بات" میں بھی شامل کر لو۔ یہ اچھا مضمون ہے اگر یوسف کوئی نیا مضمون لکھ سکیں تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ سکندر[2] کے مضمون کا انتظار بے کار ہے۔ وہ خط نہیں لکھتا مضمون کیا لکھے گا۔ اسے میری طرف سے لکھو کہ وہ کیسٹ ریکارڈر سامنے رکھ کر اپنی یادیں ریکارڈ کرا دے اور اس کیسٹ کو سن کر مضمون بنا لو یا مجھے بھیج دو پھر تیار کر دوں گا۔ میں بھی سکندر کو لکھوں گا۔ پروفیسر ابوظفر عبدالواحد صاحب کراچی آگئے ہیں۔ میں ان سے بھی کہوں گا کہ وہ بھی کچھ لکھ دیں۔ زینت[3] نے "سرو رفتہ" کے لئے

---

[1] اشفاق حسین مرحوم کی کتابوں کے نام

[2] سکندر علی وجد کی طرف اشارہ ہے

[3] مسز شمیم امتیاز نے بڑے اصرار کے بعد اپنی استاد ڈاکٹر زینت ساجدہ سے سرو رفتہ کا دیباچہ لکھوایا تو جب زینت ساجدہ نے اپنے شوہر نقاد اور محقق ڈاکٹر حسینی شاہد مرحوم کو دکھایا تو انہوں نے پڑھ کر اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ "یہ مضمون اشفاق حسین کے شایان شان نہیں۔ محنت کر کے اچھا مضمون لکھو۔" یہ جملہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

جو لکھا تھا اسے حسینی شاہد یا زینت ساجدہ سے لے لو۔ مجھے یقین ہے کہ مضمون اچھا ہوگا۔ اسے بھی شامل کر سکتی ہو۔

بیٹی! تم نے میری صحت کا پوچھا ہے تو تمہیں یاد دلا دوں کہ اشفاق کہتا تھا تو لکڑی کا ٹکڑا ہے۔ "تجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا"۔ حیدرآباد میں دو تین بار صحت خراب ہوئی تھی[1] مگر [illegible] سے یہاں کراچی میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ وہی لکڑی کا ٹکڑا جس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ صبح تین چار گھنٹے گھر پر اور شام غالب لائبریری[2] میں چار پانچ گھنٹے کام کرتا ہوں۔ نہ تھکن نہ عمر کے آثار۔

اپنی امّی کو بہت بہت سلام کہنا اور بھائی بہنوں کو پیار۔ تم نے شکایت کی ہے کہ میں تمہارے گھر نہیں آیا۔ شکایت سر آنکھوں پر۔ میں تمہارے گھر آتا اور میری آنکھیں اشفاق کو ڈھونڈتیں اور پرنم ہو جاتیں۔ بس اس غم سے دور رہنے کے خیال سے نہیں آیا ورنہ اشفاق کا گھر تو میرا گھر ہے جیسا اس کا گھر میرے لئے تھا اور اب تم لوگوں کے لیے ہے۔ کراچی آؤ اور میرے یعنی اپنے گھر میں رہو۔

نوٹ: اشفاق کا ایک یار محمد احمد سبزواری ہے۔ کراچی میں رہتا ہے میرے پتہ پر اپنے اس چچا کو بھی لکھو۔ میں پہنچا دوں گا اور اس سے مضمون لکھوا کر تمہیں بھیج دوں گا۔ مخلص: ظفر الحسن

---

[1] ظفر الحسن صاحب پاکستان جانے کے بعد ایک ہی بار حیدرآباد آئے تھے اور کافی دن رہے تھے۔ سیاست میں نیرالدین کا لکھا ہوا ایک مضمون بھی ان پر اسی زمانے میں شائع ہوا تھا (ایڈیٹر)

[2] ظفر الحسن مرحوم غالب لائبریری سے وابستہ تھے جو کراچی کی ایک بہت بڑی ادبی لائبریری ہے۔ یہ لائبریری ادارہ یادگار غالب کے تحت تھی بلکہ ہے۔ اس ادارہ سے "غالب" نامی ایک سہ ماہی رسالہ بھی نکلتا ہے جس کے مدیر اعلیٰ اردو کے مشہور شاعر فیض احمد فیض تھے اور مدیر مرزا ظفر الحسن تھے۔ وہ اس ادارہ کے معتمد بھی تھے جب کہ صدر فیض احمد فیض تھے۔ مرزا ظفر الحسن نے فیض پر ایک بہت اچھی کتاب لکھی تھی۔ اس طرح کراچی میں وہ ایک فعال اور معروف ادبی زندگی گزار رہے تھے۔

مومن خان شوق
اشرف ولا اسٹے پلی حیدرآباد۔

ہماری ادبی سرگرمیاں

یکم اگست ۱۹۹۲ء حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) کا ادبی اجلاس ۷ بجے شام ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا۔ "مطالعہ کتاب" کے عنوان سے یوسف کمال کی ترجمہ شدہ کتاب "آسمان میں کمیں گاہیں" پر مضامین پیش کئے گئے۔ یہ کتاب پروفیسر شیو کے کی انگریزی نظموں کے مجموعے "ٹریپ فالس ان دی سکائی" کا اُردو ترجمہ ہے۔ پروفیسر سید سراج الدین نے صدارت کی۔ ابتداء میں مضطر مجاز نے اپنے تنقیدی مضمون میں کہا کہ تخلیق سے کہیں زیادہ محنت طلب کام ہے کیوں کہ مترجم کے سر دو زبانوں کی عصمت و عفت کی پاسبانی سپرد ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا انگریزی شاعری کا اُردو شاعری دور کا علاقہ بھی نہیں کیوں کہ انگریزی شاعری اپنی علاحدہ دنیا رکھتی ہے۔ لیکن یوسف نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ انہوں نے تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کا بھرپور جائزہ پیش کیا۔ ڈاکٹر رحمت یوسف زئی نے کہا کہ یوسف کمال نے ایک ایک لفظ پر محنت اور بہت ڈوب کر ترجمہ کیا ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے کہا کہ کمال صاحب کی شاعری ا

کے لیے ایک لمحۂ فکر ہے کہ زندگی کے تجربات کا بڑا حصہ ہم نظر انداز کر رہے ہیں۔ کمار صاحب کی دو طرح کی نظمیں ہیں ایک تو راست اور واضح انداز میں ہے دوسرا تہہ داری والا انداز ہے اور کہیں پوری نظم علامت بن کر ابھرتی ہے۔ کمار صاحب کی شاعری ایک صحت مند انسان کی شاعری ہے ان کی بعض نظمیں منظوم کہانی معلوم ہوتی ہیں۔ پروفیسر شیو کمار نے منفرد و مخصوص شگفتہ انداز میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو سے مجھے محبت ہے میں ذہنی خوراک کے لیے اردو شاعری پڑھتا ہوں۔ یہ میری نظموں کا پانچواں مجموعہ ہے میں نے زندگی کے قریب آنے کی کوشش کی ہے۔ ترجمہ ایک طرح کی جگل بندی ہے انہوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ کلاسیکی یا موجودہ شاعروں کا انگلش ترجمہ کروں خاص طور پر میر کی شاعری کا ترجمہ۔ اردو شاعروں کو بین الاقوامی سطح پر روشناس کروانا ہو تو ان کی تخلیقات کا انگریزی ترجمہ کرنے سے بہتر اور کوئی کام نہیں۔ یوسف کمال نے کہا کہ پروفیسر کمار کی شاعری موضوعات اور مواد کے اعتبار سے عصریت سے مملو ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنا دراصل ایک زبردست تہذیبی و تخلیقی سفر ہے کمار صاحب کا تعلق پنجاب سے ہے۔ اس لیے زندہ دلی اور عاشقی کمار صاحب کی شاعری میں موجود ہے۔ ڈاکٹر بیگ احساس جنرل سکریٹری حلقہ نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

—— بھارت گن وردھک سنستھا شاخ علی بندہ میں کیرالا کے مشہور ہندی ادیب ڈاکٹر وشوناتھ ایر کے اعزاز میں یہ تقریب منعقد کی گئی تھی۔ ڈاکٹر ایر نے کہا کہ ہندی اردو شاعروں کو دیکھ کر کیرالا میں بھی اچھی نظموں کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ حیدرآباد جہاں خوبصورت محلات، میناروں کا شہر ہے وہیں دکنی اور ہندی اردو شاعر یہاں کی خوبصورتی کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ انہوں نے تلسی داس کو اس صدی کا عظیم شاعر قرار دیا۔ انہوں نے ملالکوی اوین وی گروپ کی نظم کا ہندی کا ترجمہ سنایا۔ اس جلسہ کی صدارت مشہور

سماجی لیڈر شری سکھ دیو آریہ نے کی۔ اس موقع پر ہندی شاعر جناب نہپال سنگھ ورما کی گلپوشی کی گئی۔ بسلسلہ جیم آف حیدرآباد ایوارڈ جو حیدرآباد ۴۰۰ سالہ جشن کے سلسلے میں سی آئی ٹی ڈی کی جانب سے انہیں عطا کیا گیا۔ جناب علی الدین نوید اُردو شعرا کی جانب سے مبارکباد دیتے ہیں کہا کہ پرانے شہر کے علاقوں میں شاعروں کا انعقاد قومی یکجہتی اور امن کو فروغ دینے میں مدد کرے گا۔ انہوں نے حیدرآباد کے ماحول میں ہندی اُردو کو قریب لانے کی کوششوں کے لیے شری نہپال سنگھ ورما اور شری صلاح الدین نیر کی کوششوں کو سراہا۔ اس موقع پر منعقدہ محفل شعر میں سرز نہپال سنگھ ورما، علی الدین نوید، شری بھیم پرشاد ورما، سرلیش گلیا، سدرشن کھنہ کالیا، اس کا شیکر، پربھاکر راؤ رنگ والے نے کلام پڑھا۔ شری نہپال سنگھ ورما نے معتمدی کے فرائض انجام دیئے۔ کنوینر شری کالیا اس کا شیکر نے استقبال کیا اور شکریہ کا فریضہ انجام دیا۔

۱۵ر اگسٹ ۱۹۹۲ء ۳-۶ بجے شام انجمن ترقی پسند مصنفین کا ایک ادبی اجلاس ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت جناب منظور احمد منظور نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے فراق کی ایک غزل کا تنقیدی جائزہ پیش کیا اور جناب طاہر گلشن آبادی نے "بحران" کے عنوان سے ایک افسانہ سنایا۔ علی احمد جلیلی نے فراق کی مشہور غزل "شبِ وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست

ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی"

ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے بہت عمدگی سے جائزہ لیا۔ غزل کے بعض اشعار پر زبان و بیان جزوی بحث کی۔ ان کی نشاندہی کی۔ یہ بھی کہا کہ فراق کی شاعری نے ایک نسل کو متاثر کیا۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلی کے جائزہ پر اور جناب طاہر گلشن آبادی کے افسانہ پر مسرز نصرت محی الدین، وسیم عباس، رئیس اختر، صلاح الدین نیر، صادق نوید، گیان سنگھ شاطر، ذکی شاداب

ڈاکٹر سید حسن، محمود حامد، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، نجمہ نکہت، قمر جمالی نے اظہار خیال
کیا اور یہ مجموعی تاثر دیا کہ کسی شاعر کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے متعلقہ شاعر کے کلام
کی فنی خوبیوں اور خامیوں سے بھی صرف نظر نہیں کیا جانا چاہیے۔ تخلیق کار کا اصل
جوہر اس کی تخلیقی صلاحیت ہوتی ہے۔ اچھی تخلیق دیر پا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ فراق گورکھپوری
اردو کے ان نامور شاعروں میں سے ایک تھے جن کا تذکرہ تاریخ اردو ادب میں نمایاں
حیثیت سے محفوظ رہے گا۔ فراق کی بلند قامتی ہمیشہ باقی رہے گی۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلی
اور جناب طاہر گلشن آبادی نے مبصرین کے سوالات کا اپنے اپنے انداز سے جواب دیا۔
صدر جلسہ جناب منظور احمد منظور نے ڈاکٹر علی احمد جلیلی کی ناقدانہ بصیرت کو سراہتے ہوئے
کہا کہ ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے اپنے والد محترم فصاحت جنگ جلیل سے بہت کچھ سیکھا ہے۔
اجلاس کی کارروائی جناب صلاح الدین نیر شریک معتمد نے چلائی اور شکریہ ادا کیا۔
— ۸ راگست ۱۹۹۳ء ۱۱ بجے دن محفل خواتین کا ادبی اجلاس بمقام انڈین کانفرنس
آف سوشیل ویلفیر سنٹر ریڈ ہلز میں بصدارت محترمہ قادری بیگم سابق پرنسپل عثمانیہ یونیورسٹی
ویمنس کالج نے کی۔ ابتداء میں محترمہ سلطانہ شرف الدین صدر محفل نے تعارفی خطاب کیا
محترمہ ساجدہ نے کہا کہ وہ ۱۹۶۸ء سے لندن میں مقیم ہیں لیکن ترک وطن کے باوجود انہوں نے
اپنی تہذیب و تمدن و مذہبی و سماجی روایتوں کو فراموش نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کہ لندن میں
بھی ہندوستانی خواتین نت نئے مسائل سے دو چار ہیں جنہیں حل کرنے کے لیے مسلم ویمنس
ایسوسی ایشن ہر محاذ پر شب و روز کوشاں ہے ساتھ ہی ساتھ اس بات کی بھی کوشش
جاری ہیں کہ اردو کو فروغ دیا جائے سرکاری مدارس میں اردو تعلیم کا بھی معقول
انتظام ہے۔ محترمہ فاطمہ عالم علی نے "مخدوم صاحب چند خوشگوار یادیں" زیر عنوان ایک
مقالہ سنایا جسے بہت پسند کیا گیا۔ محترمہ فاطمہ تاج نے "بات چل نکلی ہے" کے

کے زیر عنوان ایک چونکا دینے والا مضمون سنایا۔ محترمہ صفیہ شاہین کا مضمون کیوں بھلا دلچسپی کے ساتھ سنا گیا۔ ڈاکٹر اختر سلطانہ نے دکنی شاہین تھا کوئی سنسار میں قرۃ العین حیدر کے اس مصرعہ کی تشریح کرتے ہوئے الفاظ کے روزن کے زیر عنوان معلوماتی و تاریخی مضمون سنایا۔ محفل شعر میں محترمہ سلطانہ شرف الدین، نایاب سلطانہ، فاطمہ تاج، مظفر النساء ناز، رضیہ سلطانہ شاہین، حنا شہیدی، صفیہ شاہین، نسیم نیازی نے اپنا کلام سنا کر بے پناہ داد حاصل کی آخر میں محترمہ قادری بیگم نے اپنی صدارتی تقریر میں محفل خواتین کی پیش کردہ تخلیقات پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور خواتین کی علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات کو سراہا اور کہا کہ خواتین کی علمی ادبی سرگرمیوں کو تیز تر کر دینا چاہیے خواتین کو خود اعتماد اور حوصلہ مند ہونا چاہیئے تاکہ ان کی گود میں پلنے والے بچے ملک کے بہترین مستقبل کی ضمانت بن سکے۔ معتمد محفل خواتین محترمہ فاطمہ عالم علی نے شکریہ ادا کیا اس موقع پر باذوق خواتین کی کافی تعداد شریک تھی۔

—— ۸ر اگست ۱۹۹۲ء ۷ بجے شام مرکز ادب کا ادبی اجلاس و موضوعاتی نظموں کا مشاعرہ بمکان محمد قمر الدین صابری، ماہنامہ "شاداب" ریڈ ہلز حیدرآباد منعقد ہوا جس کی صدارت ممتاز شاعر جناب رئیس اختر صاحب نے کی۔ ابتداء میں صدر ادارہ جناب عزیز بھارتی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ معتمد عمومی مومن خاں شوق نے ادبی اجلاس و مشاعرہ کی کاروائی بڑی عمدگی سے چلائی۔ ادبی اجلاس میں محترمہ نجمہ نکہت صاحبہ نے اپنا افسانہ "دو غنڈے" پیش کیا۔ جس پر مسرز منصور احمد منظور، صلاح الدین نیر، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، صادق نوید اور قمر الدین صابری نے اظہار خیال کیا اور یہ مجموعی تاثر دیا کہ محترمہ نجمہ نکہت ایک منفرد افسانہ نگارہ ہے۔ جو مقصدی افسانے لکھتی ہیں جس کا مرکز خیال ترقی پسندانہ ہوتا ہے جس میں زندگی کی سچی عکاسی نظر آتی ہے۔ انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کو قریب دیکھا ہے اور

افسانوں میں ڈھالا ہے۔ آج کا افسانہ پُراثر تھا جسمیں کردار کی تصویرکشی اچھے انداز میں
کی ہے۔ جناب صلاح الدین نیر نے محترمہ نجمہ نکہت کی ادبی خدمات کو سراہا۔ انہوں نے
اردو کے جرائد بشمول ماہنامہ "شاداب" کے مدیر کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے جرائد میں وقتاً فوقتاً
ان ادیبوں اور شاعروں کا بھرپور تعارف شائع کریں اور ان کے فن پاروں کو بھی
جگہ دیں۔ صدر محفل جناب رئیس اختر نے مبصرین کے خیالات سے اتفاق رائے
کرتے ہوئے کہا کہ محترمہ نجمہ نکہت ایک پاکیزہ نثر نگار ہیں فن پر کافی محنت کرتی
ہیں اسلئے ان کے افسانے قابلِ قدر نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں جس کے لئے وہ
قابل مبارکباد ہیں۔ ادبی اجلاس کے فوری بعد موضوعاتی نظموں پر مشاعرہ ہوا جس میں
صدر محفل جناب رئیس اختر، مسرز صلاح الدین نیر، منظور احمد منظور، ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید
عزیز بھارتی، صادق نوید، قمرالدین صابری، مومن خاں شوق، منان منظور۔
مصطفیٰ سراج محمود، ابوالفاروق شعور اور ڈاکٹر سید حسن نے مختلف موضوع پر خوبصورت
اچھوتی اور شاہکار نظمیں سنائیں اور داد تحسین پائی۔ اس خوشگوار محفل کا اختتام
محمد شریف محمود شریک معتمد کے شکریہ پر ہوا۔

— ۱۴ اگست ۱۹۹۲ء ۶ بجے شام زیرِ اہتمام محفل ادب بہ مسرت جشن یومِ آزادیٔ ہند
سرسید ہاؤس علی گڈھ کلب ڈاکٹر حامد علی ٹرسٹ آفس بشیر باغ ادبی محفل اور
محفل شعر منعقد ہوئی۔ پروفیسر یوسف سرمست صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے ادبی محفل کی
صدارت کی۔ ڈاکٹر غلام یزدانی خاں چیف میڈیکل آفیسر نظامیہ طبیہ کالج چارمینار نے
بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ جناب حامد لطیف ملتانی قادری صدرنشین محفل ادب نے
خیرمقدمی تقریر کی۔ ڈاکٹر مسعود علی خاں نے جدوجہد آزادی میں حیدرآباد کے مسلمانوں
کا حصہ کے موضوع پر ایک مقالہ پڑھا ڈاکٹر غلام یزدانی خاں نے

"حیدرآباد کی رواداری" پر ایک پُر اثر مضمون پیش کیا۔ جناب اطہر افسر نے اپنے مضمون "یادِ نہرو" میں نہرو خاندان کے بارے میں تفصیلات پیش کیں۔ جناب عزیز آصف نے اپنے مقالہ "آزاد ہندوستان تاریخی اور ثقافتی تناظر میں" کے ذریعہ ملک کے شاندار ماضی کا ذکر کر کے موجودہ دور میں قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی فروغ اور اہمیت پر زور دیا۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی نے اپنی تقریر میں آزادی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کے مسائل کا جائزہ لیا اور انقلاب زندہ باد کا نعرہ اردو زبان نے ہی دیا اسکا ذکر کیا۔ ڈاکٹر یوسف سرمست نے اپنے صدارتی خطاب میں نوجوانوں اور طلبا میں شعر ادب کی ترغیب کے علاوہ اُردو زبان سے واقفیت و دلچسپی سے متعلق امور کا جائزہ لیا۔ بعد ازاں مشاعرہ ڈاکٹر علی احمد جلیلی کی صدارت میں آراستہ کی گئی اور پرنس نقی علی خان ثاقب نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔

—— ۱۵ اگست ۹۲ء بعد ظہر بمقام جمال رحمت اسلامیہ ماڈل اسکول بیدوالہ بیگم بازار انجمن بقائے ادب حیدرآباد کے زیر اہتمام مشاعرہ بہ سلسلہ جشنِ آزادی منعقد ہوا جسکی صدارت حکیم خواجہ ضمیر نے کی۔ جناب مرزا محمد مجاہد اللہ بیگ صدر نشین جمال رحمت اسلامیہ ایجوکیشنل سوسائٹی نے پاکستانی مہمانِ شاعر جناب فاروق عابدی کی گلپوشی کی۔ محمد عارف الدین صدر انجمن بقائے ادب نے دیگر مہمان شعرا جناب ابوالفاروق شعور، جناب حلیم بابر شاعرِ وابستگی اور ڈاکٹر منیر الزماں منیر کی گلپوشی کی۔ مشاعرہ کی کارروائی کا آغاز کمسن قاری محمد حسان کی قرات کلام پاک سے ہوا۔ ممتاز بزرگ نعت گو شاعر جناب محمد شرفی اور جناب بے ہوش محبوب نگری کی نعت شریف کے بعد مشاعرہ کا آغاز ہوا جسمیں حضرت داود نقیب، بے ہوش محبوب نگری، حبیب گوندیاوی، ثاقب بنارسی، نذری بدایونی، حلیم رف

ڈاکٹر سید حسن، عزیز ناگپوری، غوث الدین ابرار، مومن کوثر، محمود مشرق، ساقی ایوبی شمس الدین، جلیل ہمتا آبادی، محبوب علی خان منصور، مہمان خصوصی ابوالفاروق شعور حلیم بابر، ڈاکٹر نیر الزماں نیر، فاروق عابدی، معتمد مشاعرہ ضیا عرفان اور صدر مشاعرہ حکیم خواجہ ضمیر نے کلام سنایا۔

—— ۱۶ راگست ۱۹۹۲ء ادارہ ادب اسلامی حیدرآباد کا ماہانہ طرحی مشاعرہ ممتاز شاعر جناب روف خلش (جدہ) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب اعتماد صدیقی (جدہ) اور جناب انتظار نعیم سکریٹری جنرل ادارہ ادب اسلامی ہند نے بھی بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ ابوالفاروق شعور نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ تلاوت و ترجمان قرآن کے بعد ڈاکٹر غیاث عارف و ابوالفاروق شعور کے نعتیہ کلام سے مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ غزل کے دور میں صدر مشاعرہ جناب روف خلش اور معتمد ابوالفاروق شعور کے علاوہ مسرز ڈاکٹر علی احمد جلیلی، لطیف علی عدیل، روحی قادری، داؤد نصیب خواجہ ذاکر گوہر شاہی، اعتماد صدیقی (جدہ)، انتظار نعیم (دہلی)، محمد بن حسین نقیب، احمد معین الدین بزمی، کلیم قریشی، محمود شریف محمود، اکمل حیدرآبادی، غیاث متین، راغب فاروقی، رضا وصفی، قوی سیف، علی الدین نوید، حمید حاصل، حلیم بابر (محبوب نگر) حلیم رضا، طاہر گلشن آبادی، اسمعیل ظریف، روف رحیم، شاہد عدیلی، ستار صدیقی، محسن جلگانوی، ڈاکٹر خورشید ساجد، اعظم علی خان اعظم، نادر اسلوبی، سرفراز سحر، ناہر قادری، باسط نقوی نے طرحی کلام سنایا۔

سوال آپ کے جواب ہمارے

محمد نہال احمد صدیقی پی ایچ ڈی اسکالر
سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد۔

محمد شمس الدین ۔ کشن باغ حیدرآباد

س : فراق کا پورا نام کیا تھا؟

ج : فراق کا اصل نام رگھوپتی سہائے تھا وہ فراق تخلص کرتے تھے اور گورکھپور کے رہنے والے تھے

نجم النساء ۔ ہمدی ہشتم حیدرآباد

س : کیا مسجد میں عورت کا داخل ہونا حرام ہے؟

ج : جی نہیں ۔ یہ خیال غیر درست ہے۔ عورتیں مساجد میں آسکتی ہیں۔ البتہ عورتوں پر جماعت جمعہ، عیدین واجب نہیں عورتوں کی نماز مسجد سے زیادہ گھر میں افضل ہے۔ بلکہ گھر کے بھی اندرونی حصہ میں اسلئے عورتیں گھروں ہی میں نماز پڑھیں

نوشین فاطمہ ۔ ملک پیٹ حیدرآباد

س : میں شادی شدہ ہوں میرے والد محترم صاحب جائیداد ہیں جب بھی ان کی جائیداد میں سے حصہ طلب کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں لڑکیوں کا جائیداد میں کوئی حصہ نہیں ہوتا کیا یہ صحیح ہے؟

ج : یہ بالکل غیر درست ہے ۔ لڑکی شادی شدہ ہو یا کنواری شرعی قانون کے مطابق

والد کی جائیداد میں اس کا بھی حصہ ہوتا ہے البتہ بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹی کا حصہ نصف ہوتا ہے۔ عورت پر کسی قسم کی مالی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ جبکہ مرد پر جملہ متعلقین کی ذمہ داری ہوتی ہے بشمول اس عورت کے جسے وراثت میں حصہ ملا ہو یا اور اس طرح صاحب جائیداد ہو۔

رفعت جہاں آغا پورہ حیدرآباد

س : حیدرآباد کے پہلے کمشنر آف پولیس اور موجودہ کمشنر آف پولیس کے نام کیا تھے۔

ج : حیدرآباد کے پہلے کمشنر آف پولیس آنجہانی راجہ بہادر وینکٹ رام ریڈی تھے۔ اور موجودہ کمشنر آف پولیس شری ایم۔ وی بھاسکر راؤ ہیں۔

محمد منور۔ ضلع نلگنڈہ

س : آریا ورت سے کیا مراد ہے؟

ج : آریا ورت ہندوستان کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو بحر عرب سے خلیج بنگال تک پھیلا ہوا ہے، اس کا رقبہ پانچ لاکھ مربع میل ہے۔ یہاں سب سے پہلے آریہ آکر ٹھہرے تھے اس لیے اسے یہ نام دیا گیا۔

محمد ممتاز۔ کاماریڈی

س : کامیابی و ترقی کے لیے انسان کو کیا کرنا چاہیئے؟

ج : کامیابی و ترقی کے لیے انسان کو کام ہی کام کرنا چاہیئے کیوں کر کام کرنا ہی کامیابی ہے، عزم مصمم اور جہد مسلسل سے ہم کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔

سلیم ۲۳

آپ کے خطوط

(گذشتہ شمارہ سے ہم نے آپ کے موصولہ خطوط کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس شمارہ کے لیے بھی ہمیں کچھ خطوط موصول ہوئے ہیں یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رکھا جائے گا۔ قارئین "شاداب" سے خواہش ہے کہ وہ پرچہ پڑھ کر یوں ہی خاموشی اختیار نہ کریں بلکہ اپنی رائے سے ہمیں نوازیں تاکہ ہم آپکے رسالہ کو زیادہ سے زیادہ اچھا بنا سکیں اور آپ کی پسند اور ناپسند کا ہمیں پتہ چلتا رہے۔ ایڈیٹر)

افسری بیگم - اورنگ آباد

محترمہ عائشہ بیگم (جو ہمارے شہر میں عائشہ آپا کے نام سے جانی جاتی ہیں) پر لسٹ کے شمارہ میں ایک مضمون نظر سے گزرا جو مجھے پسند آیا۔ البتہ مصنف نے اپنے مضمون میں یہ ذکر نہیں کیا کہ ان آٹھ بہنوں کا ایک بھائی بھی ہے جن کا نام بشیر الدین صاحب ہے اور جو اورنگ آباد ہی میں رہتے ہیں۔ یہ خاندان نہ صرف اورنگ آباد بلکہ دور دور تک اپنے علم و تعلیم کے لیے مشہور ہے جس کا سلام امریکہ اور لندن تک درازہے۔ آپ نے یہ مضمون شائع کرکے ایک اچھا کام کیا۔

نصیر اختر - حیدرآباد

"شاداب" کا اگست کا شمارہ نظر سے گذرا۔ اس میں آپ نے دو نئے اچھے سلسلے شروع کیے۔ ایک آپ کے خطوط اور دوسرے سوال و جواب۔ مجھے سوالات کے جوابات بہت معلوماتی نظر آئے۔ آپ کے دو سلسلے پہلے سے چل رہے ہیں۔ ایک ماہانہ دینی سرگرمیاں اور دوسرے ماہانہ ثقافتی سرگرمیاں۔ اگر آپ مہینہ بھر کی اہم سیاسی اور سماجی خبروں کا سلسلہ بھی شروع کردیں تو قارئین کو مہینہ بھر کا اخبار ایک ہی شمارہ میں پڑھنے کو مل جائے گا۔ توقع ہے کہ آپ میری اس تجویز پر غور

نثار احمد ۔ جالنہ

"شاداب" کا تازہ شمارہ نظر سے گزرا۔ اس میں دو مضامین خاص طور پر مجھے پسند آئے
: "مجھے اسلام پر کتنا فخر ہے" اور دوسرا "عیسائی راہبوں کا قبول اسلام" علی میاں کا
ن "علم اور جہالت" بھی اچھا ہے جسے آپ نے پہلا نمبر بجا طور پر دیا ہے۔ مجھے اسلامی
عات سے دلچسپی رہی ہے اور آپ کے پرچہ میں اکثر ان موضوعات پر مضامین شائع
تے رہتے ہیں۔ آپ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رکھیے۔

عزت پاشا ۔ گولکنڈہ

"شاداب" میں اکثر ادبی موضوعات پر مضامین شائع نہیں ہوتے لیکن یہ شمارہ میں
ڑ میر محبوب حسین کا "دارالترجمہ عثمانیہ کی خدمات" پر اچھا مضمون نظر سے گزرا۔ آئندہ بھی
ادبی مضامین پر توجہ دیجئے۔ کیونکہ آپ کے رسالہ میں ادبی مواد کم ہوتا ہے۔ یہ بات
نثر کی حد تک کہہ رہا ہوں ورنہ غزلیں تو اس میں بھی ہوتی ہیں۔

جہانگیر عالم ۔ ناندیڑ

اتفاقیہ طور پر ایک ہم سفر کے پاس (جو میرے لیے اجنبی تھے) "شاداب" نظر سے
ا۔ جب انہوں نے پرچہ پڑھ کر ایک طرف رکھ دیا تو میں نے ان کی اجازت سے
لیا اور اس کا مطالعہ شروع کیا۔ غالباً یہ واقعہ سنگاریڈی اسٹیشن کا ہے
سے "ناندیڑ" تک برابر "شاداب" میرا وقت کاٹتا رہا۔ پرچہ اچھا ہے گو اس میں
دہ تر ادق موضوعات پر مضامین تھے لیکن سفر میں مجھے یہ بھی اچھے لگے۔ ناندیڑ
آپ کو خط لکھ رہا ہوں ان اجنبی ہم سفر کا نام پوچھنا بھول گیا۔ اس لیے ان سے
ت اور آپ کے شکریہ کے ساتھ خط ختم کر رہا ہوں۔

غزلیں

حلیم بابر

نہ جانے زندگی کو لوگ کیوں قاتل سمجھتے ہیں
ہمارا ظرف یہ ہے ہم اسے منزل سمجھتے

گذرتی ہے ہماری جستجوئے شوق میں یارو
ہم اپنی گمرہی کو جادۂ منزل سمجھتے

عجیب دستور دیکھا ہم نے یہ شہرِ محبت کا
مسیحا کو نہ جانے لوگ کیوں قاتل سمجھتے

اسی سے آپ کر لیجے ہمارے غم کا اندازہ
کوئی ٹوٹی ہوئی شے ہو ہم اپنا دل سمجھتے

جو توڑا دل کسی کا یوں سمجھ کعبہ کو توڑا ہے
کرے جو دل کی عظمت ہم اسے کامل سمجھتے

ہم اہلِ عزم ہیں طوفان کیا ہمکو ڈرائینگے
کہ ہم طوفان کی ہر موج کو ساحل سمجھتے

ترے اشعار میں لذت غموں کی خوب ہے بابر
ہم ایسی شاعری کو درد کا حاصل سمجھتے ہیں

خورشید حسین مضطر (۲)

تا ہم کو صیاد کا انعام بہت ہے
جو رزق میسر ہے تہِ دام بہت ہے

منزل مجھے آسان ہے آرام بہت ہے
کیا زادِ سفر لوں کہ ترا نام بہت ہے

مشکل نہیں فطرت کے تلوّن کو سمجھنا
نیرنگیٔ حسنِ سحر و شام بہت ہے

آ کسائیں اگر آپ تو کچھ بات بنے گی
مایوس ہمارا دل ناکام بہت ہے

میخانے کو لے ڈوبے گی آوارہ خرامی
یہ جوشش مے تا بہ خطِ جام بہت ہے

پیمانۂ خالی سے چھلک اٹھیں گے پیاسے
چھو جائے جو ہونٹوں سے ترے جام بہت ہے

سن لیتے ہیں مضطر کہ یہ انداز تجاہل
وہ داد نہیں دعا نوم بہت ہے

شاداب

جلد [۹] شمارہ [۱۰]

نومبر ۱۹۹۲ء حیدرآباد

محمد منظور احمد منظور نمبر

ایڈیٹر : محمد قمرالدین صابری

جائنٹ ایڈیٹر : رشید الدین   منیجنگ ایڈیٹر محمد نہال احمد صدیقی

فون ۔ 229161

زرِ تعاون

ہندوستان	65 روپے	۲ سال کیلئے 120 روپے	تاحیات 1500 روپے
بیرونی ممالک	200 "	" 360 "	" 3700 "
امریکہ	40 ڈالر	" 70 ڈالر	" 700 ڈالر
انگلستان	25 پونڈ	" 45 پونڈ	" 400 پونڈ
پاکستان	175 پاکستانی روپے	" 300 پاکستانی روپے	3000 پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ ' ماہنامہ 147-5-11 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004

ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے پبلک پرنٹرس چھتہ بازار میں چھپوا کر دفتر "شاداب" ریڈ ہلز حیدرآباد ۴ سے جاری کیا۔

فہرست

حرفِ شوق کا پیش لفظ

پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم سابق صدر شعبۂ اردو فارسی کشمیر یونیورسٹی

محمد منظور احمد سے میں عرصہ دراز سے متعارف ہوں جب وہ اسکول میں اردو پڑھاتے تھے۔ ان کے ساتھ مختلف مجالس میں کام کرنے کے مواقع ملے۔ ابتدا سے وہ اردو ادب کے سنجیدہ متعلم رہے اور اپنی ادبی دلچسپی کی بدولت اردو مجلس حیدر آباد کے معتمد منتخب ہوئے اور اس کام کو انہوں نے بڑے حسن و خوبی سے انجام دیا مجلس کے رسالے کے کچھ شمارے بھی ان کی ادارت میں شائع ہوئے جن میں عبدالحق نمبر بہت سلیقے سے مرتب کیا ہوا رسالہ تھا جس کے سبب منظور صاحب کی صلاحیتیں منظر عام پر آئیں اور رسالے کی ترتیب پر ملک کے مختلف گوشوں سے ان کی قدردانی ہوئی۔ اس وقت تک ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہوا تھا پھر یکایک اشعر کہنے اور محفلوں میں کلام سنانے لگے تو شاعر کی حیثیت سے بھی ان کا خیر مقدم مختلف گوشوں سے ہونے لگا۔

ایسا اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگوں کی طبیعت کے جوہر دیر میں آتے ہیں اور یہ اداکار بڑے خوش گوار ہوتے ہیں۔ یہی واقعہ منظور صاحب کی صورت میں ہوا

پیش آیا۔ جب وہ شعر کہنے لگے تو پختہ کار شاعر بن کر ہمارے سامنے آگئے اور نہ صرف مجھے بلکہ اکثر لوگوں کو اچنبھے میں ڈال دیا۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہمارا دور غزل کے لیے زیادہ ساز گار نہیں ہے ہمارے شعرا کی فکر کا سلسلہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ محمد قلی سے لے کر ولی، میر اور پھر غالب تک غزل نے ہر نئے دور میں نئی کروٹ لی۔ آزاد اور حالی کو غزل میں مضامین کی یکسانیت اور تکرار پر اکتاہٹ سی پیدا ہوئی۔ پھر حسرت، فانی اور جگر نے غزل سے اکھڑتے ہوئے ایقانوں کو سہارا دیا۔ غزل کے نیم وحشی صنف ہونے کا الزام بھی تھوپا گیا لیکن کچھ صاحب دل نقادوں نے اسے شاعری کی آبرو بھی بتایا ترقی پسند تحریک نے بھی غزل کو بھلانا چاہا لیکن غزل اس تحریک کے بعض علم برداروں پر بھی مسلط ہو گئی۔ ان کی فکر کے بطن سے بھی کچھ باقی رہنے والے نمونوں نے جنم لیا اب جدیدیت کی تحریک کے کچھ علم بردار پھر غزل کو پس پشت ڈال دینے کے درپے ہیں لیکن یہ صنف بڑی سخت جان ہے۔ توقع نہیں کہ غزل کہنے کا سلسلہ کبھی بند ہو سکے گا۔ اصل میں دوش غزل کا نہیں بلکہ غزل گو کا ہوتا ہے، اس کی فکر کی مجہولیت کا ہوتا ہے جسے روایت کو دہرانے سے ہٹ کر اس وسیع کائنات سے کوئی تحریک نصیب نہیں ہوتی۔ غزل ایک روپ، ایک صنف ہی نہیں بلکہ ایک ضابطہ، ایک مخصوص آرٹ بھی ہے جس پر قدرت ہی اچھی غزل کہلا سکتی ہے۔ اچھی غزل سے مراد وہ غزل ہے جو اپنے عہد کی فکر اور فن کے ردعمل کی حامل ہو اور غزل میں جب یہ وصف پیدا ہو جاتا ہے تو وہ نظم کے لیے بھی باعث رشک بن جاتی ہے غزل کا آرٹ تفصیل کا آرٹ نہیں بلکہ ایجاز کا آرٹ ہے۔

منظور صاحب کی فکر کا بیشتر سرمایہ اسی تغزلی صنف میں ہے ا

غزل کا ضبط ان کی فکر پر پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ غزل کے رمزیہ پیرایہ میں وہ بہت کچھ سمو سکتے ہیں اور سمو دیتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے مشاہدے اور تجربے سے ہٹ کر کوئی واردات بیان کرنا نہیں چاہتے اسی لیے غزل اثر کی حامل ہوتی ہے۔

منظور صاحب کی غزل کی ایک اور اہم خصوصیت اس کی سادگی ہے وہ گہرے اور پیچیدہ تجربوں کو بیان کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرتے یا اپنے آپ کو کرتب دکھانا نہیں چاہتے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ایسے تجربات بھی ایسی سیدھی سادی زبان میں بیان ہوتے ہیں کہ وہ ہمارے اپنے قریب کے تجربے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ان کی غزل اپنے عہد کے نشوونما پائے ہوئے سارے رمزیہ اسالیب سے بیگانہ نہیں اور یہی بات ان کی غزل کو ہمارے اپنے عہد کی غزل بنا رہی ہے

مجھے خوشی ہے کہ ان کا مجموعہ شائع ہو رہا ہے اور اس کا یقین ہے کہ اپنی خصوصیات کے بل بوتے پر اردو کے نئے دور کی شاعری میں اپنے لیے جگہ پیدا کرے گا

حیدرآباد
۲ مارچ ۱۹۷۸ء (پروفیسر) عبدالقادر سروری

(سلسلہ ۲۳) جن کو دُھن ہو منزل کی تیز چلنا آتا ہے
اس کو وہ کا ہر ذرّہ راستہ دکھاتا ہے
وقت کے تقاضے پر جب نظر نہیں ہوتی
آدمی بس ایسے میں ٹھوکریں ہی کھاتا ہے
شور و غل کی دنیا میں کون کس کی سنتا ہے
جس کو دیکھیے صاحب اپنی ہی سناتا ہے
اپنا دُھن کے دیوانے آگے بڑھتے رہتے ہیں
آ ... رہا ہے

حرفِ شوق پر رائے

ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ پروفیسر و صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ

منظور احمد صاحب ادب کے استاد بھی ہیں اور حیدرآباد کے جانے پہچانے ش
بھی ہیں۔ شاعری اور "مدرسہ" کے تعلق سے مولانا رومی نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ
ع شعر را مدرسہ کے نہ برد ! مولانا روم نے کسی وجہ سے کہا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ "مد
شعر کو قتل کر دیتا ہے۔ اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ تعلیمی اداروں کا ماحول انسان
"جبر پسند" کر دیتا ہے۔ وہ جو کہنا چاہتا ہے کھل کر نہیں کہہ سکتا۔ یہی "سہم
ہوئی فضا" منظور صاحب کی شاعری میں ملتی ہے اور اسی نے انہیں غزل گو شعرا
ایک گونہ انفرادیت بخشی ہے۔ وہ "کہا ہے" اور "چاہے جانے" کی شدید خواہش
کے باوجود اس کا کھل کر اظہار نہیں کر پاتے۔ سماج کی کئی خرابیاں، دنیا اور
دنیا والوں کی کئی برائیاں انہیں ناگوار گزرتی ہیں لیکن ان کو بدلنے یا سنوارنے
ہمت ان میں نہیں۔ وہ صرف ان کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ منظور صاحب کا شعر

دل بے تاب سمجھ کر کہو
مصلحت کہتی ہے خاموش رہو

ان کی شاعری کی پوری فضا کو اپنے میں سموئے ہوئے ہے۔ پھر ان کے ہاں محبت بھی خالص " افلاطونی " ہے جو محبوب کے " قرب " سے نہیں، محبوب کے " خیال " سے وجود میں آتی ہے. چنانچہ ان کے کلام میں تجربے کی گہرائی اور احساس کی گرمی کم ہے ایک نقاد نے اس قسم کی شاعری کو " مزے دار شاعری " سے تعبیر کیا تھا۔
منظور صاحب کی شاعری " مزے دار " نہیں " طرح دار " ہے انہوں نے غزل میں دو طرحیں ڈالی ہیں ایک تو روزمرّہ کا استعمال اور زبان کی صفائی و سلاست جو اردو غزل کو داغ کی دین ہے (اگرچہ کہ داغ کے کلام کا تیکھا پن اور بانکپن تیر بہدف ان کے ہاں نہیں ہے) اس کا سبب جس کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکی ہوں، شاعر کا " محتاط رویّہ " ہے۔ دوسری طرح یہ ڈالی کہ " غزل " اور نظم " کے تفاوت کو بڑی حد تک مٹا دیا۔ غالباً یہ اقبال کا فیضان ہے جس کے وہ اچھے متعلم رہے ہوں گے۔ انہوں نے غزل کے فارم میں نظم کے تجربے کیے ہیں۔ آپ چاہیں تو اسے " غزلِ مسلسل " کہہ لیجئے لیکن یہ غزلِ مسلسل سے الگ شے ہے۔ ملاحظہ کیجئے ان کی غزل نما نظمیں :-

بیانِ درد پر کیوں آپ گہری سوچ میں ڈوبے
اداسی جب کسی چہرے پہ چھائی آپ کیوں روئے

یہ سچ ہے ہم تو بس یوں ہی ملا کرتے رہے برسوں
جدائی کی گھڑی جب سر پہ آئی آپ کیوں روئے

اور

سہتے رہے ہم ظلم و ستم آپ کی خاطر
سمجھے اسے اندازِ کرم آپ کی خاطر
ہم کو تو گوارا نہیں اعلانِ محبت
اقرار کریں گے جو قسم آپ کی خاطر

اور

جتنا ہم طالبِ دیدار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے
تڑپ اٹھتی لبِ اظہار کیوں ہے، ہم نہیں سمجھے

ہر شعر میں "آپ کیوں روٹھے" "آپ کی خاطر" "ہم انہیں سمجھے" کی تکرار قدیم ترجیع بند کی یاد دلاتی ہے لیکن فرق اتنا ہے کہ ترجیع بند کا ہر بند ایک شعر کی طرف رجوع کرتا ہے اور یہاں تمام اشعار صرف ایک فقرے پر ختم ہو رہے ہیں۔

ان کے کلام میں بعض اشعار ایسے ہیں جن میں ایک خاص کیفیت ہے جس کی تشریح مشکل ہے جس سے صرف لطف لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً

۱۔ جب وہ غم سے دوچار ہوتا ہے — دل بھی سرمایہ دار ہوتا ہے

۲۔ وقت دیتا جو ساتھ تو کچھ لوگ — خاتمِ دہر کے نگیں ہوتے

۳۔ سائے کی طرح جو میرے ہمراہ چلا ہے — وہ شخص بھی اب میرا پتہ پوچھ رہا ہے

۴۔ رہا باقی نہ تار پیرہن بھی — خودی سے بے خودی ہنگی پڑی ہے

۵۔ ناخنِ عقلِ رسا عقدہ کشا ہے جب ہی — عمل و جہدِ مسلسل کا صلا آج بھی ہے

۶۔ کل ان کی بزم میں روشن بہت سی شمعیں تھیں
بجھی بجھی سی مگر روشنی نظر آئی

مطالعہ کے دوران، مجھے منظور صاحب کی شاعری میں ایک اور خصوصیت نظر آئی وہ ہے ان کا مکالماتی ڈھنگ۔ ان کی اکثر غزلوں میں یہ رنگ موجود ہے مشتے نمونہ از خروارے ہے:-

۔ میں ہی اب تم سے خفا رہتا ہوں — کیا یہ سچ ہے، تمہیں انصاف کرو

۔ تند خوئی سے کچھ نہیں ملتا — بات کیجے گا دل لبھانے کی

رشید الدین

منظور احمد منظور

شخصیت اور تحریرات

منظور احمد منظور صاحب کی شخصیت گوناگوں خصوصیات کی حامل ہے۔ وہ ایک شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ صحافی بھی ہیں اور اُردو کے عملی سپاہی بھی۔ وہ اتنی اُردو انجمنوں اور رسائل سے وابستہ رہے ہیں کہ غور کریں تو حیرت سی ہوتی ہے۔ پھر ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی ساری زندگی اُردو پڑھنے اور پڑھانے میں گزاری۔ جامعہ عثمانیہ سے ایم۔ اے کرنے تک نصابی کتابوں کے علاوہ انہوں نے اساتذہ کے سارے دیوان کھنگال ڈالے تھے اور نثر کی بھی سب اہم کتابیں پڑھ لی تھیں۔۔

خوش قسمتی سے انہیں روزگار بھی ملا تو اُردو پڑھانے کا اس طرح انہوں نے اُردو میں جو کچھ ایم۔ اے کرنے تک پڑھا تھا اسے اُردو کے استاد کی حیثیت سے نئی نسل کو منتقل کرتے رہے اور یہ سلسلہ کوئی ۳۰ سال تک چلتا رہا۔ انہوں نے اپنی تدریسی زندگی اردو کے لکچرر کی حیثیت سے شروع کی تھی اور ختم ڈگری کالج سے ایک پرنسپل کی حیثیت سے کی۔

شیکسپیر نے ایک جگہ لکھا ہے WORLD IS FULLY OF MISFITS
یعنی دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے جنہیں جہاں ہونا تھا وہ وہاں نہیں ہوتے
لیکن بعض خوش قسمت ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جنہیں اپنی پسند کا روزگار مل جاتا ہے
منظور صاحب ان ہی خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں۔ چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں کہ
"معلمی کا پیشہ میں نے اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق پسند اور منتخب کیا تھا۔
پڑھنے اور پڑھانے سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اس کام میں عجیب طرح کا
ناقابل بیان لطف اور مزہ پاتا ہوں۔ اس سے مجھے بے پایاں مسرت حاصل ہوتی
ہے اور میں دنیا و ما فیہا سے بے خبر خیالوں کی دنیا میں کھو سا جاتا ہوں۔"

اس کی گواہی میں خود دوں گا کیوں کہ میں تاملی ہائی اسکول میں ۱۹۵۰ء
میں منظور صاحب کا شاگرد رہ چکا ہوں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ میں ان کا اردو کا
شاگرد نہیں رہا بلکہ انگریزی کا رہا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ ہمیں انگریزی
سرسری مطالعہ میں " علاؤالدین اور جادوئی چراغ" پڑھاتے تھے لیکن چونکہ میڈیم
اردو تھا اس لیے وہ انگریزی کا ایک جملہ پڑھ کر اس کا اردو میں ترجمہ اور تشریح
کرتے تھے اور پڑھاتے وقت کھو سے جاتے تھے۔ ان کی جماعت میں ہمیشہ سکون اور
خاموشی رہتی اور طلبا ہمہ تن گوش ہوتے۔

کہتے ہیں زحمت میں رحمت بھی پوشیدہ رہتی ہے۔ منظور صاحب کے
ساتھ بھی ایسا ہی ہے۔ وہ زندگی بھر مجرد رہے اور انھوں نے ان کی ادبی اور
علمی زندگی میں اس تجردی سے بہت کام لیے ورنہ اکثر لوگ بیوی بچوں کے
بکھیڑوں اور ان کے مسائل میں الجھ کر رہ جاتے ہیں اور علمی و ادبی کام چھوڑ
دیتے ہیں یا اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے پاتے۔

بہت سے لوگوں کو آپ نے ہم نے دیکھا ہے کہ پہلے بہت دھوم دھڑا کے سے لکھنا شروع کیا۔ بڑے بڑے جلسوں میں شریک ہوئے۔ مشہور رسائل میں لکھا اور اس کے بعد دنیا کے گورکھ دھندوں میں ایسے گم ہوئے کہ پھر نہ مل سکے۔

دنیا میں بہت سے مجرد ہوں گے اور ہیں لیکن اُردو دنیا میں میں نے دو مجرد ایسے دیکھے جنھوں نے محض اپنی مجردگی کی بنا پر اُردو دنیا کو بہت کچھ دیا۔ ایک بابائے اُردو مولوی عبدالحق اور دوسرے منظور احمد منظور۔ یہاں آپ یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ میں خدانخواستہ منظور صاحب کا عبدالحق صاحب سے تقابل کر رہا ہوں۔ منظور صاحب تو خود ان کے مرید تھے اور پیر سے مرید کا کیا مقابلہ لیکن منظور صاحب نے اپنی سطح پر اُردو کی بہت خدمت کی اور آج بھی کر رہے ہیں

میں نے انھیں عبدالحق صاحب کا مرید کہا ہے اور یہ یوں ہی نہیں کہا ہے بلکہ انہوں نے اس کا حق بھی ادا کیا اور عملی مظاہرہ بھی۔ جب وہ اُردو مجلس کے معتمد تھے تو انہوں نے اس کے سہ ماہی رسالے "مجلس" کے اکتوبر ۱۹۶۰ء تا جنوری ۱۹۶۱ء کے شمارہ کا مولوی عبدالحق نمبر نکالا اور مولوی صاحب کی زندگی میں نکالا۔ غالباً ان کی نودویں سالگرہ پر اہل حیدرآباد نے منظور صاحب کے توسط سے انہیں یہ تحفہ دیا تھا جو آج بھی یاد گار ہے۔ یہ رسالہ اتنا اچھا تھا خود عبدالحق صاحب نے اس کی تعریف کی ورنہ جو لوگ مولوی صاحب کی طبیعت سے واقف تھے وہ جانتے ہیں کہ وہ اپنی تعریف پر کبھی خوش نہیں ہوتے تھے بلکہ اظہار ناپسندیدگی فرماتے۔ ان کا یہ خط ماہنامہ "ماہِ نو" (کراچی) کے اکتوبر ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔

میں نے منظور صاحب کو ایک صحافی بھی کہا ہے اور بجا کہا ہے کیوں کہ [illegible] اُردو کی بعض تنظیموں سے وابستہ [illegible] کی ایک طویل فہرست ہے۔ آج بھی

وہ آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کے ادبی ترجمان ماہنامہ "قومی زبان" کے جائنٹ ایڈیٹر ہو
"شاداب" کی مجلس مشاورت میں بھی آپ ان کا نام ہر ماہ دیکھتے ہیں ان دنوں میں
صلاح الدین نیر صاحب کے ساتھ "شاداب" کا ایک خصوصی نمبر "حیدرآباد کے شاعر" مرتب
کرنے میں مصروف ہیں جو حیدرآباد کے ۴۰۰ سالہ جشن کے موقع پر شائع کیا جا
اور جس میں سابق ریاست حیدرآباد کے اردو شاعروں کو بھی نمائندگی دی گئی ہے

ابھی تک میں نے منظور صاحب کی شخصیت کے سب سے نمایاں پہلو کا آپ سے
ذکر نہیں کیا اور وہ ہے شرافت۔ منظور صاحب اتنے شریف آدمی ہیں کہ آپ ان
شرافت کی قسم کھا سکتے ہیں۔ انکار کا لفظ تو ان کی لغت میں ہے ہی نہیں۔ میں نے
انہیں کسی بھی معاملہ میں "نہیں" کہتے نہیں سنا۔ پھر یہ کہ وہ جو کام قبول کرتے ہیں
پوری دلچسپی اور تندہی سے کرتے ہیں۔ اگر کوئی ان کی شرافت کا تذکرہ کرنا
بیٹھے تو غالب کا یہ مصرعہ دہرا کر بیان ختم کرنا پڑے گا۔

پھر یہ بھی مولوی عبدالحق کی طرح اپنی تعریف پسند نہیں کرتے اور جب بھی کوئی
ان کے سامنے ان کی تعریف شروع کر دیتا ہے تو وہ پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں۔
شاید بہت سے لوگوں نے ان کی اس شرافت کا ناجائز فائدہ بھی اٹھایا ہوگا لیکن
اس کا مجھے علم نہیں اور نہ منظور صاحب اپنی زبان سے کبھی اس کا تذکرہ کریں گے

اب جبکہ منظور صاحب ستر کے پیٹے میں ہیں لیکن اب بھی ان کی علمی پیاس نہیں
بجھی۔ وہ برابر علمی اور ادبی کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ انہوں نے نئی
جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا لیکن ہر بار کچھ نہ کچھ
صورت حال پیدا ہو گئی کہ وہ اسے مکمل نہ کر پائے۔ سب سے بڑی رکاوٹ
ان کی اضلاع میں ملازمت تھی لیکن اب انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے

م اراده کیا ہے اور اردو کے مشہور غزل گو شاعر اصغر گونڈوی پر کافی کام بھی
ا ہے۔

شاید منظور صاحب کی شخصیت کا ذکر کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے اس لیے اب
ان کی ادبی زندگی اور تحریرات کی طرف آتا ہوں۔ میں یہاں فن کا لفظ بھی استعمال
سکتا تھا لیکن شاید منظور صاحب اسے پسند نہیں کریں گے کیوں کہ وہ ہمیشہ غالب
، مصرعہ صیغے کی تبدیلی کے ساتھ دہراتے رہتے ہیں ع

ہم کہاں کے دانا ہیں کس ہنر میں یکتا ہیں

غالب نے جب یہ مصرعہ کہا تھا تو انہیں معلوم تھا کہ یہ بات خلاف حقیقت ہے
منظور صاحب کے بارے میں بھی یہی کہوں گا۔

منظور صاحب نے بہت دیر سے لکھنا شروع کیا وہ ایک طویل عرصے تک حرف پڑھتے
ہے۔ ان کی تحریر کی عمر بمشکل ۲۵ سال ہو گی لیکن اس عرصہ میں انہوں نے تحریر
ل جو دولت حاصل کی اس کی جھلکیاں آپ کو ان کے کلام اور نثر میں جا بجا ملیں گی۔
ا حال ان کا ایک ہی شعری مجموعہ "حرف شوق" اور ایک ہی نثر کا مضامین
مجموعہ مضامین "منظورنامہ" ہے عنقریب نثر میں ان کا ایک اور مجموعہ آپ کے
ارے سامنے آئے گا اور شاید اس عیسوی سال کے ختم تک ہی آجائے۔ اس
لے بہر حال انہیں پھر ایک شعری مجموعہ شائع کرنا پڑے گا تاکہ توازن برقرار رہے

منظور صاحب کا پہلا شعری مجموعہ [illegible] ۱۹ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ تمام
غزلوں پر مشتمل ہے اور اس میں کوئی ۴۲ غزلیں شامل ہیں جب یہ شائع ہوا
غالباً تو انہوں نے میرے دفتر آکر از راہ کرم مجھ سے اس پر تبصرہ کی خواہش کی تھی۔
ں نے کہا " منظور صاحب! بھلا میں آپ کے مجموعہ کلام پر تبصرہ کرنے کی جسارت

کر سکتا ہوں" لیکن اسے انہوں نے میری انکساری پر محمول کر کے سنی ان سنی
کر دی اور تبصرہ لکھوا کر ہی رہے۔ افسوس کہ اس وقت وہ تبصرہ میرے پیشِ نظر نہیں
ان کی شاعری کا جائزہ لینے میں اس سے بہت مدد مل جاتی۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ منظور صاحب نے بہت دیر سے شاعری
شروع کی ہے اس کے بارے میں پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کہتے ہیں "ایسا
اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض لوگوں کی طبیعت کے ثمر دیر میں آتے ہیں اور یہ دیر
ثمر بڑے خوشگوار ہوتے ہیں۔ یہی واقعہ منظور صاحب کی صورت میں بھی پیش
جب وہ شعر کہنے لگے تو پختہ کار شاعر بن کر ہمارے سامنے آئے اور نہ صرف مجھے بلکہ
اکثر لوگوں کو اچنبھے میں ڈال دیا۔"

جیسا کہ پروفیسر مرحوم نے کہا ہے منظور صاحب ایک پختہ کار شاعر کے طور پر
ادبی میدان میں اترے اور نئے شاعروں کو جن دقتوں اور اپنے آپ کو منوانے
کی جدوجہد میں سرگرداں رہنا پڑتا ہے وہ اس سے بچ گئے۔ ان کی غزلیں
چھوٹی زمین میں ہوں یا بڑی سیدھی سادی ہوتی ہیں۔ یہ سہل ممتنع کی بڑی اچھی مثالیں
ہیں اور جیسا کہ مولوی عبدالحق نے کہا ہے نثر ہو یا نظم آسان زبان میں لکھنا
بہت مشکل ہوتا ہے ان کے یہ شعر دیکھئے ان میں کتنی سلاست، روانی اور بے ساختگی

سائے کی طرح جو میرے ہمراہ چلا ہے
وہ شخص بھی اب میرا پتہ پوچھ رہا ہے

رہا باقی نہ تار پیرہن بھی
خودی سے بے خودی تک آ گئی ہے

کل ان کی بزم میں روشن بہت سی شمعیں تھیں
بجھی بجھی سی مگر روشنی نظر آئی

عشق میں ایسی بھی منزل آئے گی
لطف سے اس کے گزر جائیں گے ہم

کتنی سادہ تھی داستان حیات
کتنی رنگین بنا گیا کوئی

یونہی اترے گا خمارِ ہستی — اور ایک جام پیئے تلخ پیو

عمر دو روزہ یوں گزرتی ہے — دل میں جیسے خیال آتا ہے

منظور صاحب کی غزلیں نہ صرف تاثیر کی دولت سے مالامال ہیں بلکہ یہ فن کی کسوٹی پر بھی پوری اترتی ہیں۔ عروض و بحر اور قواعد و ضوابط پر انہیں مکمل عبور حاصل ہے جہاں تک ان کی نثر کا تعلق ہے وہ بھی ان کی شاعری کی طرح بہت آسان اور سہل ہے اور ان کا ہر جام سیدھا پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتا ہے

مضامین منظور احمد ان کے چند مضامین، انٹرویوز، ان کی مختصر سوانح حیات اور ادبی معروفیات کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ منظور صاحب دو بار امریکہ کا سفر کر چکے ہیں اور طویل عرصہ وہاں رہے ہیں وہ وہاں کی بہت سی ریاستوں اور شہروں کا دورہ بھی کر چکے ہیں۔ ان کی بات چیت بھی ان کی غزلوں اور نثر کی طرح بہت سیدھی سادی زبان میں ہوتی ہے اور تصنع سے پُر لہجہ اور پیچ دار زبان وہ استعمال نہیں کرتے۔ وہ مجسم انکساری ہیں اور کبھی سامنے والے کو اپنے سے کمتر نہیں سمجھتے حتیٰ کہ اپنے شاگردوں کو بھی۔ منظور صاحب معلومات کا خزانہ ہیں۔ عام طور پر وہ خاموش رہتے ہیں اور کم سخن لوگوں میں ان کا شمار ہوتا ہے لیکن وہ جن سے کھلتے ہیں خوب کھلتے ہیں۔ ان میں مزاح کی حس بھی بلا کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے حلقہ میں بھی ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں اور ایک طویل عرصہ تک ماہنامہ "شگوفہ" کی مجلس مشاورت میں شامل رہے۔ آخر میں ان کی ساری خوبیوں کے بیان کے باوجود ان کی شرافت کا ایک بار اور تذکرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان سے ملنے کے بعد بے ساختہ حالی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر — ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

(مرکزِ ادب حیدرآباد کے ماہانہ ادبی اجلاس میں پڑھا گیا۔)

صادق نوید
ایم اے (عثمانیہ)

حرفِ شوق کے شاعرِ اردو کے سفیر

محمد منظور احمد منظورؔ

دلّی اور لکھنؤ کے بعد حیدرآباد اردو کا بڑا مرکز مانا گیا۔ شاہانِ دلّی اور لکھنؤ پر زوال آیا تو اردو زبان وادب کو والیانِ ریاست حیدرآباد کی سرپرستی حاصل رہی جسکے نتیجے میں درباری آداب، علم مجلس، آدابِ محفل، مخصوص لباس کی پابندی نشت و برخاست کے طور پر طریقوں نے حیدرآبادیوں کو ایک خاص تہذیب میں ڈھال دیا اور یہی تمدن چاردانگ عالم میں حیدرآبادی تہذیب و تمدن کے نام مشہور ہوگیا۔ حیدرآبادی اپنے ملک میں یا بیرونِ ملک جہاں کہیں جائیں اپنی شناخت بھی اپنے ساتھ لیجاتے ہیں انکی رگ رگ میں خلوص، پیار و محبت، وفا اور یگانگت کے جذبات خون کی طرح رواں ہیں۔

حیدرآبادی تہذیب میں ڈھلی ہوئی ایک ایسی ہی پاکیزہ، ملنسار، باکردار وضع دار شخصیت کا نام محمد منظور احمد منظورؔ ہے۔ انہوں نے اپنے ۔۔ رکنی نام محمد منظور احمد کے آخر میں بطورِ تخلص مکرر منظورؔ کا اضافہ کر کے اپنے نام کی توسیع ہے اور یہ چہار رکنی نام دو تاموں کا مرکب بھی لگتا ہے اور معنی خیز بھی۔ انکے ا...

نام کے دو حصے کیے جائیں تو یہ نام اقرار رسالت بن جاتے ہیں۔ محمد منظور، احمد منظور۔ لیکن عام طور پر ادبی دنیا انہیں منظور احمد منظور کے نام سے ہی جانتی ہے۔ غالباً اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے منظور احمد منظور صاحب عثمانیہ یونیورسٹی تشریف لایا کرتے تھے اسی زمانے میں، میں ایم۔ اے (فائنل) کا طالب علم تھا اور "پروفیسر ہارون خاں شروانی کی اردو خدمات" کے عنوان سے مقالے کی تیاری میں مصروف تھا۔ میں نے اپنی گائیڈ پروفیسر رفیعہ سلطانہ سے دریافت کیا کہ منظور احمد صاحب یہاں کیسے تشریف لایا کرتے ہیں؟ تو انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دوبارہ پری۔ پی ایچ ڈی کا امتحان پاس کر چکے ہیں۔ پہلی کامیابی پر تو وہ کچھ بھی نہ کر سکے لیکن دوسری کامیابی کے بعد کی مدت ابھی باقی ہے اور انہیں اصغر گونڈوی پر کام کرنا ہے۔ لیکن اردو سے وابستہ ان کی گوناگوں مصروفیات انہیں دم نہیں لینے دیتیں جس کے سبب ان کا پی۔ ایچ ڈی کا خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ یوں تو پہلے بھی ان سے میری سرسری ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں لیکن اردو ہال کے جلسوں، مشاعروں اور دیگر محفلوں میں ان سے قربت کے مواقع فراہم ہوتے گئے ان کو سننے اور سنانے کا سلسلہ اس دم سے اس دم تک جاری ہے۔ منظور احمد صاحب نے شاعری کا آغاز پختہ عمر میں کیا ہے ان کے اندر چھپے ہوئے شاعر کو باہر آتے آتے برسوں بیت گئے چونکہ انہوں نے لڑکپن میں شاعری کا آغاز نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ابتداً ہی سے ایک پختہ شاعر کے روپ میں نمودار ہوئے۔ بقول پروفیسر عبد القادر سروری "ایسا لگتا ہے کہ بعض لوگوں کی طبیعت کے ثمر دیر میں آتے ہیں اور یہ دیر رس ثمر

بڑے خوشگوار ہوتے ہیں۔ یہی واقعہ منظور صاحب کی صورت میں بھی پیش آیا۔
منظور صاحب۔ اُردو ادب کے اُستاد بھی ہیں اور ادب کے دلدادہ بھی
برسوں اُردو پڑھاتے رہتے۔ اسکولوں میں بھی اور کالجوں میں بھی۔ جب
چوک ہائی اسکول میں اُردو کے اُستاد تھے تب اسکول میگزین "نورس"
کے مُشیر رہے۔ انکے ادبی ذوق اور ادارت کے شوق نے "نورس" کا شاندار
نمبر ترتیب دیا اس غزل نمبر کے وسیلے سے ادبی حلقوں میں انکی اعلیٰ ادبی
صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں۔

منظور احمد منظور کے بارے میں ڈاکٹر مغنی تبسم کے تحریر کردہ "چمن"
سے ایک تراشہ ملاحظہ فرمائیے۔ "وہ اُردو کے ممتاز ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ
کی بنا کردہ "ادارہ ادبیات اُردو" کے معتمد انتظامی منتخب ہوئے تو اس مجلس کے معتمد
کی حیثیت سے مجھے منظور صاحب کے ساتھ کام کرنے اور انہیں قریب سے
دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ہم نے ایک سہ ماہی جریدہ "مجلس" کے نام سے جاری کیا تھا
جسکو عام طور پر قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس مجلے کی دو یادگار اشاعتیں
"غالب نمبر" اور "عبد الحق" نمبر دستاویزی حیثیت رکھتی ہیں۔ انکی ترتیب
تدوین میں تمام تر منظور صاحب کی کاوشوں کو دخل تھا۔ ادبی رسائل و جرائد
ترتیب اور ادارت کے سلسلے میں پروفیسر مغنی تبسم کا یہ تراشہ منظور صاحب
کام کی سند ہے۔ منظور احمد منظور صاحب کی گوناگوں ادبی صلاحیتیں انکے خو
قدرت کا ایک عطیہ ہیں۔ وظیفہ پر سبکدوشی کے باوجود وہ برسر کار نظر آ
ہیں انکی بغل میں ہر وقت اُردو کا ایک چھوٹا سا دفتر رہتا ہے جو پامردی کے
انکی ہمہ وقت اردو کی خدمت کا شاہد ہے۔ اُردو کے عنوان سے منعقدہ ہر محفل

محفل میں اسی طرح خندہ پیشانی سے شرکت کرتے ہوئے وہ اُردو کے سفیر لگتے ہیں صلے اور ستائش کی تمنا سے بے نیاز مختلف انداز میں اُردو کی خدمت کیلئے وقف ہو گئے ہیں۔ "شگوفہ" کی مجلس اِدارت میں ہیں تو "شاداب" کی مجلس مشاورت میں، "سب رس" اور قومی زبان کے جوائنٹ ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ادارۂ ادبیات اُردو اور اُردو اکیڈمی کے سرگرم کارکن بھی۔ اسکے علاوہ دیگر علمی ادبی مصروفیات میں وہ صبح تا شام گھرے رہتے ہیں۔ اُن کی جستجو کا ایک قدم مشرق میں ہے تو دوسرا مغرب میں، دو بار امریکہ بھی ہو آئے ہیں اور بالاقساط اپنی عمر عزیز کے ڈھائی برس مغرب کی نذر کر چکے ہیں۔ یہ جہاں کہیں جاتے ہیں اپنا اثر وہاں چھوڑ آتے ہیں۔ دوسروں کا اثر بہت کم قبول کرتے ہیں۔

بلاشبہ وہ اُردو کے ایک مثالی اُستاد ہیں لیکن کسر نفسی کی شان یہ ہے کہ خود کو اُردو کا طالب علم ہی تصور کرتے ہیں۔ بعض اُردو الفاظ کا املا ملا کر لکھنے کے سخت مخالف ہیں۔ مثلاً "اس قدر" لکھنا ہو تو اس کو علاحدہ اور قدر کو علحدہ لکھیں گے۔ اور "جس قدر" بھی علاحدہ ہی لکھا جائے گا۔ اگر کسی مطبوعہ کتاب میں بھی اس قبیل کے الفاظ ملا کر لکھے گئے ہوں تو وہ فوراً حاشیہ پر اپنے قلم سے ایسے الفاظ کو الگ الگ کر کے املے کی اصلاح کئے بغیر نہیں رہیں گے۔ منظور احمد منظور صاحب بہر صورت مشرقی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ وقت کے پابند اور قول کے پکے ہیں وعدہ کرتے ہیں تو پورا بھی کرتے ہیں اپنے بڑوں کا ادب، اور چھوٹوں پر شفقت کرنا کوئی ان سے سیکھے اپنے سے کم عمر ادیبوں اور شاعروں کو اپنے برابر سمجھتے ہیں۔ سب کا لحاظ رکھتے ہیں کسی ادبی یا علمی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہیں تو سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے نہ کسی سے اُلجھتے ہیں۔ - - ہیں۔

بلکہ معاملہ فہمی اور غور و فکر سے مسائل کو سلجھاتے ہیں۔ نکتہ سنج اور صلح کل طبیعت کے مالک ہیں۔ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو ہیں۔ "گفتار کے غازی" تو بہت مل جائیں گے لیکن یہ کردار کے بھی غازی ہیں۔ ان کی شاعری انکی شخصیت کی آئینہ دار ہے۔ غزل کے رسیا ہیں۔ انکے ہاں جذبات کی دھیمی دھیمی آنچ زندگی کے تلخ و شیریں تجربات اور مشاہدات سے گزر کر اشعار کا روپ دھار لیتی ہے جو راست سامع یا قاری کے دل میں جاگزیں ہو کر داد پاتی ہے منظور صاحب کی شاعری نہ تو جدید ہے نہ قدیم بلکہ دونوں کا سنگم ہے۔ جہاں ان کے کلام میں کلاسکی روایات کی پابندی عام ہے وہیں عصری حسیت کا احساس بھی پایا جاتا ہے سادگی اور سلاست ان کی شاعری کا خاص وصف ہے۔ سادگی و پرکاری کا یہ ہنر دبستانِ دلی کے نامور شعرا کی دین ہے۔ منظور صاحب نے اسی حسنِ سادہ کو اپنا کر اپنے لہجے کی تازگی سے کلام کو پُر تاثیر بنا دیا ہے ان کی عشقیہ شاعری بھی تہذیب، شائستگی اور لطافت سے مملو ہے ان کی شاعری میں بھی ان کا محتاط رویہ کار فرما ہے۔ کبھی انھوں نے اپنے اشعار کو نامانوس تراکیب اور ثقیل الفاظ کے استعمال سے "چیستاں" ہونے نہیں دیا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بآسانی کہہ جاتے ہیں۔ خیال آئینے کی طرح ترشا ہوا ہوتا ہے۔ زندگی کے بارے میں وہ مثبت اندازِ فکر رکھتے ہیں۔ قنوطیت کو کبھی ذہن پر چھانے نہیں دیتے۔ انسانیت اور محبت پر یقینِ کامل رکھتے ہیں۔ اور اپنی شاعری کے ذریعے اس کا پرچار بھی کرتے ہیں وہ صرف اچھے شاعر ہی نہیں عمدہ مقرر، مضمون نگار اور تبصرہ نگار بھی ہیں۔ شخصیات اور دیگر ادبی موضوعات پر انکے پُر مغز مضامین کا مجموعہ کتابی شکل میں "مضامین محمد منظور احمد" کے عنوان سے شائع ہو کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکا ہے۔ ان کی نثر میں ڈاکٹر زور کی تحقیق کا

اور بابائے اردو مولوی عبدالحق کی سی سادگی سلاست اور روانی ہے۔
منظور احمد منظور صاحب کے علمی، ادبی کارناموں اور عملی خدمات کا مکمل جائزہ ایک مبسوط مقالے کی صورت ہی میں لیا جا سکتا ہے ایک نشست کے مختصر مضمون میں انکی شخصیت اور فن کا احاطہ ممکن نہیں۔ تو چلئے پھر ہم شاعر منظور احمد منظور کی شاعری کی طرف لوٹتے ہوئے اپنی بات ختم کرتے ہیں کہ منظور صاحب کی شاعری میں جذبۂ عشق بھی ہے اور حسنِ صداقت بھی، زندگی بھی ہے اور زندگی کی رنگا رنگی بھی۔ ہمارے اس قول کے ثبوت میں انہیں کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

فیصلہ ترکِ محبت کا بڑی حیرت ہے
آپ از راہِ کرم غور دوبارہ کر لیں

نظر ملتی ہے دل ملتے ہیں اور نہ ساتھ ہو پھر بھی
ہمارے درمیاں دیوار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

نیم وا آنکھیں کسی کی مست مست
صبح دم غنچہ کوئی کھلتا ہوا

وہم ہے خواب ہے خواہش ہے نہ جانے کیا ہے
مجھ سے باتیں کوئی کرتا ہے بہت رات گئے

زندگی کی وہ پُر کیف منزل
دُور سے کر رہی ہے اشارہ

زندگی تیری محبت میں تری ہی دُھن میں
کتنے دیوانے گرفتار نظر آتے ہیں

اور کیا چاہیئے تمہیں منظور
[illegible]

محمد منظور احمد
1/T32-1-22 دار الشفا حیدر آباد

ڈاکٹر زور
چند یادیں

ایک رات انگریزی نظموں کے کسی مجموعہ کا مطالعہ کر رہا تھا۔ لانگ فیلو (LONG FELLOW) کی مشہور نظم (PSALM OF LIFE) کے ان اشعار پر نظر پڑی۔

TRUST NO FUTURE HOWEVER PLEASANT,
LET THE DEAD PAST BURY ITS DEAD,
ACT, ACT IN THE LIVING PRESENT,
HEART WITHIN AND GOD "OR HEAD"
(OVER HEAD)

ان اشعار میں (KARMA YOGA) پر زور دیا گیا ہے اور لمحہ اس وقت قبضہ و اختیار میں ہے اُسے بہتر طور پر استعمال کرنے کی اہمیت بیان کی گئی ہے معاً اقبال کا یہ شعر میرے ذہن کی سطح پر اُبھرا ہے

وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

زور کا عمل بھی ہمیشہ اس شعر کی تفسیر و تشریح تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ایک
ڈ کا جو ان کے اختیار میں تھا، بہتر طور پر استعمال کیا۔ وقت کی قدر و قیمت
ں کی اہمیت و افادیت کا احساس انہیں نوجوانی کے دور ہی سے تھا اور
لیے طالب علمانہ زندگی ہی سے ان میں رکھ رکھاؤ، سلیقہ سنجیدگی اور باقاعدگی
نے ۲۱ سال کی عمر میں "روح تنقید" جیسی کتاب ادبی دنیا کو دی۔ ۱۹۲۷ء میں
ں مقالات اور محمود غزنوی کی بزم ادب اور ۱۹۲۹ء میں اردو شہ پارے جیسی
پ، معلومات آفریں اور فکر انگیز کتابیں شائع کیں۔ ۱۹۳۰ء میں ان کی تحقیقی کتاب
دستانی صوتیات (انگریزی) زیور طبع سے آراستہ ہوئی اور ۱۹۳۱ء میں ان کی
وں کوششوں سے حیدرآباد میں ادارہ ادبیات اردو کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۹۳۲ء
ہندوستانی لسانیات ۱۹۳۴ء میں عہد عثمانی میں اردو کی ترقی اور ۱۹۳۵ء میں
ں انشا پردازی اور ۱۹۳۷ء میں مرقع سخن جلد اول، مرقع سخن جلد دوم، متاع سخن،
ن سخن، بادہ سخن اور سیر گولکنڈہ شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر زور نے ۱۹۳۸ء میں ماہنامہ
ب رس جاری کیا ۱۹۴۰ء میں کلیات محمد قلی قطب شاہ کو مرتب اور شائع کیا
اس محمد قلی کے لیے انہوں نے ایک عالمانہ اور محققانہ مقدمہ سپرد قلم کیا۔ ۱۹۴۲ء
ں تاریخ ادب اردو کی اشاعت عمل میں آئی۔ اردو زبان و ادب کی ترویج و
شاعت اور اسکی مقبولیت میں اضافہ کے لیے ۱۹۴۴ء میں انہوں نے کل ہند اردو
نگریس کے انعقاد کا اہتمام کیا۔ تذکرہ مخطوطات کی انمول جلدیں ۱۹۵۱ء میں اور دکنی ادب
ں تاریخ ۱۹۶۰ء میں شائع کر کے ڈاکٹر زور نے اردو ادب کے قیمتی ذخیرہ میں
ں بہا اضافہ کیا۔

۱۹۵۸ء میں پہلی مرتبہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب کا انتظام نہایت سلیقہ سے

کیا۔ ان تقاریب کے اہتمام سے ان کی غیر معمولی تنظیمی صلاحیتیں منظر عام پر آئیں۔

اس عرصے میں ان کی کئی گراں قدر تصانیف شائع ہوئیں۔ انہوں نے اردو زبان و ادب کے ایک پرخلوص خدمت گزار، انشاء پرداز، افسانہ نگار، نقاد، محقق، شاعر اور ... کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔

ڈاکٹر زور نے بارہا کہا تھا کہ جو کچھ کرنا ہو آج ہی کر ڈالو۔ کسی کام کو کل پر کبھی نہ ٹالو۔ کیوں کہ صرف آج پر ہمارا اختیار ہے۔ کل پر کسی کو اختیار نہیں ان کی گفتگو سے مجھے بے اختیار انگریزی کی ضرب المثل یاد آئی۔

PROCRASTINATION IS THE THIEF OF TIME)

اور ہندی کا یہ دوہا بھی یاد آیا کہ کال کرے سو آج کر، آج کرے سو اب۔ پل میں پرلے ہوئے گی بہر کرے گا کب۔

مولانا حالی نے بھی آج کی اہمیت پر اپنے اس شعر میں زور دیا ہے ؎

کل یہاں کاروبار ہیں سب بند
کرلو جو کچھ کہ ہے کرنا آج

ایک سہانی شام مجھے یاد آرہی ہے۔ اس روز میں "تہنیت منزل" میں ۵ شام زور صاحب کی نشست گاہ میں، اُن کے تخت کے روبرو ایک کرسی پر بیٹھا تو کسی قدر فاصلے پر ایک گھڑی رکھی ہوئی تھی۔ زور صاحب مجھ سے باتیں بھی کررہے تھے اور اپنے کام میں بھی مصروف و منہمک تھے۔ دولت خانہ پر روزانہ اُن کے کام کرنے کا انداز یہی تھا۔ اُن کی نظر اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذات پر جمی ہوئی تھی۔ اسی روز آیا ہوا ایک ٹیلی گرام بتاتے ہوئے مجھ سے فرمایا کہ دیکھا آپ نے! نواب ہدی نواز جنگ نے مرا، اور ادارہ ادبیات اردو کا کس قدر خیال رکھا ہے۔ وہ

دہلی جا رہے تھے تو میں نے انہیں ایک کام کے سلسلے میں زحمت دی تھی۔ چنانچہ ٹیلی گرام کے ذریعہ انھوں نے اپنی ہر باقی سے دہلی سے مجھے اس کام کی تکمیل کی اطلاع دی ہے
ڈاکٹر زورؔ کا یہ جملہ ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ ادارہ کے دفتر کے ایک قدیم کارکن کمرے میں داخل ہوئے اور نہایت ادب کے ساتھ زور صاحب کے روبرو خاموش کھڑے ہو گئے۔ ڈاکٹر زورؔ نے ان کی طرف دیکھے بغیر اپنا ہاتھ آگے کی طرف بڑھایا اور سامنے رکھی ہوئی گھڑی کا رُخ پلٹا دیا اور پھر اُن سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے کہ میرے ہاں گھڑی میں پانچ اسی وقت بجینگے جب دفتر کا آج کا کام پایۂ تکمیل کو پہونچ جائے۔ اس لیے اس وقت تک آپ اس گھڑی یا خود اپنے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی کی طرف نظر مت ڈالیے۔ زور صاحب انتہائی سنجیدگی کے ساتھ تعلمی لہجہ میں فرما رہے تھے۔ اِدھر ادارہ ادبیات اردو کے دفتر کے کارکن صاحب، نہایت خاموشی کے ساتھ یہ کلمات سنتے رہے۔ اور پھر نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ اس روز تکمیل پائے ہوئے کام کی تفصیل پیش کرنے لگے۔

انٹرمیڈیٹ کا امتحان، آرٹس کالج، عثمانیہ یونیورسٹی کے گراونڈ فلور پر ہو رہا تھا۔ یہ ۱۹۴۳ء یعنی آج سے کوئی (۴۹) سال پہلے کی بات ہے اس زمانے میں امتحان کے امیدواروں کی نشستوں کے درمیان کافی فاصلہ ہوا کرتا تھا۔ ہر امیدوار اپنی نشست سے بلا کسی معقول سبب کے اور ہال میں موجود نگران کار صاحب کی اجازت کے بغیر اٹھ نہیں سکتا تھا۔ ہال میں ایک نگران کار (INVIGILATOR) ان کا کام بحسن و خوبی انجام دے لیا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ امتحان دینے والے طلبا ڈرے سہمے، سانس روکے صرف سوالات کے پرچہ اور اپنی جوابی بیاض پر
[illegible]

پیشاب کے بہانے دو تین گھنٹے کے دوران کئی بار امتحان ہال سے باہر جانے کے بارے میں سوچ سکتے تھے۔ پرچہ سوالات کی تقسیم کے بعد امتحان گاہ میں مکمل سناٹا چھاجاتا اور مقررہ وقت کے ختم ہونے تک صرف جوابی بیاضوں کے صفحات کے الٹنے کی آوازیں خاموش فضا میں بلند ہوا کرتی تھیں۔

اس امتحان کا دوسرا یا تیسرا دن تھا اور ہم سب امیدوار اپنی اپنی جوابی بیاضوں پر جوابات لکھنے میں مصروف تھے اچانک ایک امیدوار نے ڈاکٹر زور کو ہال میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا اور نہایت دبی آواز میں بے ساختہ کہا "ڈاکٹر زور" مجھے اس سے پہلے ڈاکٹر زور کو دیکھنے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا البتہ ان کی بعض کتابیں پڑھ چکا تھا اور اپنے بعض بزرگ رشتہ داروں کو ساتھ دیکھا تھا۔ اسلئے اشتیاق کے ساتھ میری نگاہیں بھی اٹھیں۔ ڈاکٹر زور تیز قدموں کے ساتھ میری دائیں طرف بیٹھے ہوئے ایک طالب علم کے قریب آئے اور اس کی جوابی بیاض کے صفحے الٹنے لگے۔ طالب علم ادب و احترام کے ساتھ خاموش کھڑا رہا۔ زور صاحب نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا لیکن اسے ان کے اس ارشاد کی تکمیل میں تکلف ہو رہا تھا۔ دو تین منٹ کے بعد زور صاحب ہال سے باہر تشریف لے گئے۔ وہ برہنہ سر اور دیدہ زیب خوبصورت شیروانی زیب تن کئے ہوئے تھے ان کی بارعب اور جامہ زیب شخصیت سے ہال میں موجود تمام طلبا متاثر ہوئے اور اس روز امتحان ہال سے باہر نکلنے کے بعد تھوڑی دیر تک، زور صاحب کے ہال میں تشریف لانے، جوابی بیاضوں کے اوراق، الٹ کر دیکھنے اور پھر ہال سے باہر جانے کا، ایک دوسرے سے تذکرہ کرتے رہے۔

آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں بی۔اے۔ اور اس کے بعد ایم اے (اردو) کی تعلیم کے دوران یعنی چار سال تک، مجھے ڈاکٹر زور کی شاگردی کا شرف حاصل رہا۔

ے میں وہ ہم طالب علموں کو تاریخ ادب اُردو پڑھاتے تھے اور ایم۔ اے۔ میں
ستانی لسانیات اور کلیات محمد قلی قطب شاہ۔ ان کے پڑھانے کا انداز بڑا دل نشین
ما۔ ذہن میں ایک ایک بات اُترتی چلی جاتی تھی۔ وہ اپنے لیکچر انتہائی انہماک اور
توجہ سے دیا کرتے تھے۔ یہ لیکچر کچھ اس قدر تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ہوا کرتے
کہ بہت کم کبھی کوئی بات تشنہ رہ جاتی۔ زور صاحب اپنی کلاس میں، وقت کی پابندی
کے ساتھ تشریف لایا کرتے تھے۔ ہم طالب علموں کو کبھی ان کا انتظار نہیں کرنا پڑا۔

ڈاکٹر زور، نواب رفعت یار جنگ کے داماد تھے۔ خوشحالی اُن کے قدم چوم رہی
لیکن اس کے باوجود چونکہ اُن کے پیش نظر، ہمیشہ ایک اعلیٰ مقصد زندگی رہا، اس لئے
انتھک محنت کرتے اور وسیع اور گہرے مطالعہ کے ذریعہ صلاحیت کے نکھارنے
اور قابلیت میں اضافہ کرنے کی مسلسل کوشش کرتے رہے۔ وہ زندگی کو ایک
نعمت غیر مترقبہ اور قدرت کا گراں بہا عطیہ سمجھتے اور اسی لحاظ سے اس کی بے حد
قدر کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی ایک لمحہ بھی بیکار ضائع نہیں جانے دیا۔ ایک باشعور
صاحب بصیرت شخص کی طرح، انہوں نے وقت کا بہترین استعمال کیا۔ وہ بہت کم
سوتے تھے۔ رات دیر گئے تک مطالعہ اور لکھنے کے کام میں مصروف رہتے اور علی الصبح
بیدار ہو جاتے تھے۔ ان کے سامنے مسائل اور مشکلات کی دیواریں، ہمیشہ کھڑی رہیں
ان تھک کوشش سے ان میں خود اعتمادی پیدا ہوتی اور ثابت قدمی، استقلال، حوصلہ
اور ہمت کے ساتھ انہوں نے ان دیواروں کو ڈھا دیا اور اپنی منزل کی طرف جوش،
ارادہ اور استقلال کے ساتھ رواں دواں بڑھتے رہے۔ انہوں نے زبان و ادب کی پُرخلوص
خدمت کے دوران کسی فرد یا انجمن کی مخالفت کی کبھی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کی بلکہ ایسی
باتوں کو کبھی خاطر میں ہی نہیں لایا اور اُسے اہمیت ہی نہیں دی اور اپنے خوابوں

اور منصوبوں کی صورت گری میں منہمک رہتے۔ وہ نہ صرف خود کام کرتے بلکہ لکھنے کی صلاحیت رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور انہیں لکھنے پر مجبور کرتے تھے۔ انہوں نے انجمن اور ادارہ ادبیات اردو کی بقا اور ترقی کے لیے اپنی زندگی کی آخری سانس تک کوشش کی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا رہا انجمن اور ادارہ ادبیات اردو سے ان کی وابستگی میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ وہ LUCK AND PLUCK کے قائل، یعنی تقدیر کے ساتھ" وہ بقول اصغر گونڈوی

ع " جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے"

کے بھی قائل تھے۔ اردو کے ایک اور شاعر نے کہا تھا ؎

جو ہچکچا کے رہ گیا وہ پیچھے رہ گیا
جس نے لگائی جست وہ خندق کے پار تھا

پروفیسر عبدالقادر سروری نے ڈاکٹر زور کے انتقال پر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے اپنے تعزیتی نشریے میں ڈاکٹر زور کی اس خصوصیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہم دونوں (ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری) نے زبان و ادب کی خدمت کا کام ایک ساتھ اور ایک ہی زمانے میں شروع کیا تھا لیکن اس دوڑ میں وہ مجھ سے بہت آگے نکل گئے۔

گفتگو میں الجھن پیدا کرنے والوں اور بغیر سوچے سمجھے بحث مباحثہ یا حجت کرنے والوں سے وہ کبھی کبھی خفا ہو جاتے تھے۔ ورنہ سچ پوچھیے تو وہ مفاہمت، مصالحت، تعاون، موقع شناسی، معاملہ فہمی اور اعتدال پسندی کے دل سے قائل تھے۔ ان کا مسلک صلح کل تھا۔ وہ نزاع پسند کبھی نہیں رہے۔ تصادم اور ٹکراؤ سے بچنے کی انہوں نے ہمیشہ صدق دلی کے ساتھ کوشش کی۔ اس لیے ان کے دوستوں، قدردانوں

چاہنے والوں کا حلقہ نہایت وسیع تھا۔ اور اس حلقہ میں ہر مذہب و ملت اور ہر مسلک کے لوگ شامل تھے۔ انہیں ہمیشہ اپنے کام سے کام رہا۔ وہ مسکراتے ہوئے کہا کرتے تھے۔

عاشقاں آپ بھلے اپنا ملا رام بھلا

۱۲ مارچ ۱۹۶۰ء کو بخشی غلام محمد وزیر اعظم جموں و کشمیر نے ایوان اردو کا افتتاح فرمایا تھا۔ جناب بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش نے افتتاحی جلسے کی صدارت فرمائی حسن اتفاق سے میں بھی اس خوشگوار اور یادگار تقریب میں موجود تھا۔ زور صاحب نے اپنا خطبہ پڑھا جس میں کسی تعلّی کے بغیر مختصراً ادارہ ادبیات اردو کی سرگزشت نہایت سلجھے ہوئے اور سنجیدہ انداز میں بیان فرمائی۔ اس تقریب کے اختتام پر لوگ ان سے مل رہے تھے اور انہیں مبارکباد دے رہے تھے میں جلسہ گاہ میں ایک جگہ کھڑا ہوا تھا۔ زور صاحب ملاقاتیں اور مصافحہ کرتے ہوئے میری طرف بھی تشریف لائے اور آہستہ سے پوچھا "آپ نے میری تقریر سنی؟ کیسی تھی؟" اور پھر ایک منٹ کے وقفہ سے کہنے لگے "میں نے صرف ادارہ ادبیات اردو کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے! کسی شخص یا انجمن یا ادارہ کی شکایت یا کسی پر اعتراض یا نکتہ چینی نہیں کی۔ اور ان خطوط پر میں نے کبھی سوچا ہی نہیں۔ مجھے ہمیشہ اپنے کام سے کام رہا۔ نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پروا" اور زور صاحب کے اس کہنے میں صدق و صداقت تھی۔ جس شخص نے بھی زور صاحب کو قریب سے دیکھا ہے، وہ بلا تامل اس کی تصدیق کرے گا۔

ان کے والد حضرت سید شاہ غلام محمد قادری رحمۃ ایک صوفی منش بزرگ تھے۔ ان کے فرزند زور صاحب بھی صوفیوں کی طرح بے نیاز، ایک متوازن ذہن و دماغ رکھتے تھے وہ ہر سبب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے پیش نظر ایک اعلیٰ مقصد تھا۔ اس مشن اور مقصد کے آگے وہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی بلکہ حقیر باتوں کی طرف ان کا متوجہ ہونا ناممکن تھا۔

زورؔ صاحب کا ضمیر پاک تھا۔ مخاطب سے وہ ہمیشہ مہذب و شائستہ پیرایہ میں گفتگو کرتے اور اگر کسی بزرگ شخص سے مل رہے ہوں تو اس کا دل سے احترام کرتے تھے اور اداروں کے کام کی دل کھول کر تعریف کرتے تھے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ شوق و دلچسپی کے ساتھ اردو زبان و ادب کی رفتارِ ترقی میں اضافہ کے لیے جوش و خروش سے حصہ لے سکیں۔ نوجوان شاعروں اور ادیبوں کی ہمت افزائی کا انہوں نے ہمیشہ خیال رکھا۔ کبھی عصری ادب پر مضمون لکھتے تو انہیں اس بات کا خیال ضرور رہتا کہ کسی اہم شاعر، ادیب یا اردو کے خدمت گزار کا نام سہواً بھی چھوٹنے نہ پائے۔ کوئی تنقید کرتا، کسی مضمون میں ان پر اعتراضات ہوتے تو وہ کبھی دل شکستہ نہ ہوتے زورؔ صاحب قلندرانہ مزاج کے حامل تھے۔ وہ قوموں کے عروج و زوال کو ڈھلتی پھرتی چھاؤں سمجھتے تھے۔ اسی لیے پولیس ایکشن کے بعد بدلے ہوئے حالات میں بھی وہ پست ہمت نہیں ہوئے بلکہ ان کی ادبی اور علمی سرگرمیوں کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ کہا کرتے تھے کہ کام کرنے کا وقت تو یہی ہے۔ ان کے اس قول کی اہمیت آج بھی یعنی اُن کے انتقال کے بائیس سال بعد بھی اتنی ہی باقی ہے جتنی خود ان کے دور میں تھی اس لیے میں اس قول کو دہراتے ہوئے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ "کام کرنے کا وقت تو یہی ہے"۔ ●●

(سلسلہ ص ۵۴) احمد رضا۔ پاتھری (ضلع پربھنی)

پربھنی ایک کام سے گیا تھا جہاں ایک لائبریری میں آپ کا پرچہ نظر سے گزرا۔ یہ غالباً اکتوبر کا شمارہ تھا۔ تمام مندرجات نظم و نثر مجھے پسند آئے خصوصاً مرزا ظفرالحسن کا طویل خط بہت پسند آیا۔ مشاہیر کے خطوط کا یہ سلسلہ جاری رکھیے۔ آپ نے اس خط میں حاشیہ میں جو نوٹ دیے ہیں وہ خوب ہیں اور مطالعہ میں ہماری بہت مدد کرتے ہیں۔

محمد منظور احمد منظور

شاعر کے منتخبہ چند اشعار

کہیں رکتا نہیں یہ تا دمِ مرگ ؛ تمنا کا انوکھا سلسلہ ہے

دل یہ کہتا ہے میرا کچھ تو کہو ؛ مصلحت کہتی ہے خاموش رہو

یہ سچ ہے ہم تو بس یوں ہی ملا کرتے رہے برسوں

جدائی کی گھڑی جب سر پہ آئی آپ کیوں روئے

وقت دیتا جو ساتھ تو کچھ لوگ ؛ حاتمِ دہر کے نگیں ہوتے

سائے کی طرح جو میرے ہمراہ چلا ہے ؛ وہ شخص بھی اب میرا پتہ پوچھ رہا ہے

تندخوئی سے کچھ نہیں ملتا ؛ بات کیجے گا دل لبھانے کی

کتنی سادہ تھی داستانِ حیات ؛ کتنی رنگیں بنا گیا کوئی

عمرِ دو روزہ یوں گزرتی ہے ؛ دل میں جیسے خیال آتا ہے

دھوپ ہے جتنی تیز اتنے ہی ؛ گہرے ہیں دیوار کے سائے

ایک مدت ہوئی منصور کو گزرے لیکن ؛ ان فضاؤں میں انا الحق کی صدا آج بھی ہے

کتنے دن بیت گئے کتنی ہی راتیں گزریں ؛ ختم فرقت کی سیہ رات نہ ہونے پائی

وہ جو اپنی شناخت میں گم ہیں ؛ خود انہی کو شعورِ ذات نہیں

زخم کھا کر بھی مسکرا دینا ؛ ایسے ویسوں کے بس کی بات نہیں

رفتارِ ترقی میں تو ہے برق کی تیزی ؛ کچھ روح کی تسکین کے ساماں بھی تو ہوتے

یوں ایسے ہیں جیسے گم ہوں دیوانے ؛ یہی گھڑی ہے کہ ہم حوصلوں کو منوالیں

وقت کی کتنی کڑی دھوپ سہے جاتے ہیں

آفریں باد! کہ ہم لوگ جیے جاتے ہیں

درو دیوار سے آئے گا جواب

کبھی آواز لگا کر دیکھو

اُس کے جلووں میں کھو گئے ہم بھی ؛ یعنی دیوانے ہو گئے ہم بھی

بوجھ اور زندگی کا اے منظور ؛ کس قرینے سے ڈھو گئے ہم بھی

جانے کس منزل پہ پہونچی زندگی ؛ آج کیوں انسان ہے سہما ہوا

پڑھتا ہو کوئی تو پڑھ لے ہم کو ؛ اب ہم بھی کتاب ہو گئے ہیں

کوئی کیا جانے لذّت تشنگی کی ؛ سمندر میں بھی میں پیاسا رہا ہوں

کہانی میری بس اتنی ہے منظور ؛ میں حرفِ شوق کا مارا ہوا ہوں

خواب سرمایہ تھے لیکن یہہ کبھی سوچا نہ تھا

یہہ ہمارے خواب اک دن چیستاں ہو جائینگے

اُف یہہ یادیں! انہی یادوں کے جھروکے سے کبھی

ایک سایہ سا اُبھرتا ہے بہت رات گئے

وہم ہے، خواب ہے، خواہش ہے نہ جانے کیا ہے

مجھ سے باتیں کوئی کرتا ہے بہت رات گئے

میرے غمخوار! میرے غم کے سمجھنے والو!

جاؤ اُس شخص کو سمجھاؤ تو کچھ بات بھی ہے۔

(باقی صفحہ پر)

مومن خاں شوق
اشرف ولا 11-3-723
ملے پلی - حیدرآباد

ہماری ادبی سرگرمیاں

۲۷ راگست ۱۹۹۲ء بر ۶-۳۰ بجے شام مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ باغ عامہ میں "میرا شہر میرے لوگ" کے زیر اہتمام کویتا کرن کے دوسرے مجموعہ کلام "سوغات" کی رسم اجرا تقریب منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان صدر انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے صدارت کی ممتاز دانشور جناب سید ہاشم علی اختر سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے "سوغات" کی رسم اجرا انجام دی اور کہا مجھے فخر ہے کہ مجھے کویتا جیسی عمدہ شاعرہ کے کلام کو پڑھنے سمجھنے اور داد تحسین ادا کرنے کا موقع ملا۔ اردو ایک جیتی جاگتی زبان کا نام ہے جس کے پڑھنے والے کم ہوتے جارہے ہیں لیکن الیکٹرانک میڈیا کی وجہ سے سننے اور بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے کویتا کرن نے عام فہم زبان استعمال کی ہے ان کی شاعری میں جذبات کی سچائی اور تہذیبی روایات کی گہری چھاپ ہے۔ جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے سابق چیف جسٹس آندھرا پردیش ہائی کورٹ نے کویتا کرن کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ "سوغات" کے ذریعہ اردو والوں کو کویتا کرن

نے ایک خوبصورت و حسین تحفہ دیا ہے۔ مادری زبان نہ ہوتے ہوئے بھی کویتا کا اُردو زبان میں شعر کہنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمارے ملک میں تقریباً ڈیڑھ ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں یہ ضروری نہیں ہے کہ اپنی مادری زبان میں ادب تخلیق کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان دنوں میں اردو زبان پڑھ رہا اور پاکستان کے ادب سے بھی مجھے بے حد دلچسپی ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کویتا کے کلام میں جمالیاتی کیفیات بھی ملیں گی اور انسانی رشتوں کی ترجمانی ایک اعلیٰ پولیس آفیسر ڈی امباجی راؤ ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیٹی ہوتے ہوئے کویتا نے اپنے آپ کو شعر و ادب سے [illegible] نہیں کیا بلکہ والد کی والہانہ سرپرستی کی وجہ سے انہیں اُردو شاعری میں اپنی صلاحیتوں کو نکھار کا اچھا موقع ملا۔ کویتا کی شاعری پڑھنے اور سننے والوں دونوں کو متاثر کرتی ہے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے کویتا کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آج زندگی کے ہر شعبہ میں خواتین اپنے وجود کا احساس دلا رہی ہیں۔ ڈاکٹر موہن لال نگم نے کہا کہ شہر حیدرآباد ایک مشترکہ تہذیب کا برسوں یاد رکھا جانے والا شہر ہے۔ ہمارے شہر میں کبھی بھی زبانوں کا مسئلہ نہیں رہا۔ صدر اجلاس ڈاکٹر سید عبد المنان نے کہا کہ کویتا کرن باد صبا کی طرح گلشن اُردو شعر و ادب میں داخل ہوتی ہے جس کی خوشبو سے دامانِ شعر و ادب مہک رہا ہے۔ اس تقریب کو محترمہ سلطانہ شرف الدین اور جناب نہپال سنگھ ورما نے بھی مخاطب کیا۔ کویتا کرن نے اپنی ایک منتخب غزل سُنا کر دادِ تحسین حاصل کی۔ رسمِ اجرا تقریب کے بعد محفلِ موسیقی کی کارروائی جناب ونیس اختر نے چلائی۔ محفلِ موسیقی میں وٹھل راؤ اور جگدیش کمار نے کویتا کرن کا کلام ساز پر پیش کر کے دادِ تحسین حاصل کی۔

۲۸ راگست ۱۹۹۲ء ۶ بجے شام اُردو گھر مغلپورہ میں ممتاز استاد شاعر
جناب منوہر لعل بہار کے اعترافِ خدمات کے سلسلہ میں ایک تہنیتی تقریب منعقد ہوئی
جسکی صدارت ڈاکٹر سید عبدالمنان نے کی۔ انہوں نے رائے منوہر لعل بہار کی خدمات کا
اعتراف کرتے ہوئے شال اوڑھائی اور کیسہ زر پیش کیا اور کہا کہ ادبی حلقوں میں
رائے منوہر لعل بہار اُردو کی غزل کے لیے ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں اور مہاراجہ
کشن پرشاد کے دور سے منوہر لعل بہار تک حیدرآباد میں غزل نے نمایاں ترقی کی ہے
جناب جلیل پاشاہ صدر اردو اکیڈیمی نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے
کہا کہ اردو اکیڈیمی شاعروں اور ادیبوں کے لیے فنڈ قائم کرنا چاہتی ہے جو گرانٹ
سرکار کی جانب سے منظور ہوتی ہے وہ وقت پر ریلیز نہ ہونے کی وجہ سے اکیڈیمی
اپنے منصوبوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ جناب علی احمد جلیلی نے بہار کے فن اور
شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ منوہر لعل بہار نے اس وقت شاعری شروع
کی جب شاعروں کے لیے ایک استاد کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی انہوں نے حضرت
جلیل مانکپوری کو اپنا استاد بنا کر اپنا غزل کا سفر شروع کیا اور غزل کی نفاست
اور معیار کو بلند کیا۔ ان کی شاعری میں ترقی پسندانہ رجحان بھی موجود ہے۔ جناب
منوہر راج سکینہ ایڈوکیٹ نے بہار صاحب کو گنگا جمنی تہذیب کا نمائندہ قرار دیا اور
کہا کہ ہمارے ادب کو ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے سماج ہونا
چاہیئے اور سماج کو بھی شاعر کی رہنمائی قبول کرنا چاہیئے۔ پروفیسر مغنی تبسم نے
اپنی تقریر میں کہا کہ بہار ایک روایت پسند شاعر ضرور ہے مگر ان کے کلام میں
ترقی پسندی اور انقلابی عنصر بھی موجود ہیں وہ ایک عظیم شاعر اور فنکار ہیں۔
[illegible] اور اردو کے انقلابی شاعر ... نے کہا کہ بہار کی شاعری معاشی و سماجی مسائل کو

بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کہا کہ بہار کی غزل پاکیزگی کے اس مقام تک پہنچی ہے جہاں غزل کو نئی روح عطا ہوتی ہے۔ بہار ایک ہی وقت میں روایت پسند اور انقلابی شاعر ہیں۔ ابتداً میں جلسہ کے کنوینر جناب نہال سنگھ ورما نے کہا کہ اس جلسہ کا مقصد حیدرآبادی تہذیب اور اقدار ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کو پیش کرنا ہے جسکی مثال بہار صاحب کی پچاس سالہ شعری خدمات میں موجود ہے۔ جناب صلاح الدین نیر نے بہار کی شخصیت کے بارے میں کہا کہ حیدرآباد کبھی بھی تعصب اور کم ذہنی کا شکار نہیں رہا منوہر لال بہار جیسی شخصیت نے پچھلے پچاس سالوں میں اس تہذیب کی نمائندگی کی ہے وہ ایک بہت ہی کامیاب نعت گو شاعر بھی ہیں جن کے نعتیہ کلام کو پڑھکر یقین نہیں ہوتا کہ یہ کسی ہندو شاعر کا کلام ہے۔ حیدرآباد کی مختلف ادبی انجمنوں کی جانب سے کثرت سے گلپوشی کی گئی جلسہ کے فوری بعد مشہور گلوکار جناب وٹھل راؤ نے بہار کی غزلوں کو ساز پر پیش کر کے سماں باندھ دیا۔

۲۳ راگست ۱۹۹۲ء ۳ بجے دن ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں ادارہ عصری ادب کا ادبی اجلاس و غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا جسکی صدارت ممتاز شاعر جناب راشد آتش نے کی۔ جناب نہال سنگھ ورما مہمان خصوصی تھے۔ ادبی اجلاس سے قبل جناب صادق نوید صدر ادارہ نے تعارفی تقریر کرتے ہوئے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ جناب شفیع اقبال معتمد ادارہ نے ادبی اجلاس و مشاعرے کی نظامت کی۔ ادبی اجلاس میں محترمہ خورشید انور صاحبہ نے افسانہ "بلندیاں" پیش کیا۔ جناب نہال سنگھ ورما نے محترمہ خورشید انور کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ آج کل محفلوں میں سنانے اور سننے کا رواج بہت کم ہوتا جارہا ہے عشق و محبت کے مضا

کی تسکین کے لیے افسانہ ایک موثر صنف ہے۔ مہاراشٹرا میں دیر گئے رات تک افسانہ گوئی "کتھا کتھن" کے نام سے رائج ہے جسے لوگ کثیر تعداد میں بڑے انہماک سے سنتے ہیں صدر ادبی اجلاس جناب راشد آزر نے افسانے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا اس افسانے نے شفیق الرحمٰن کے افسانوں کی یاد تازہ کر دی۔ محبت ایک اہم انسانی جذبہ ہے اور رہے گا ہے۔ افسانوں کے ذریعہ اس کا اظہار بھی فطری ہے۔ افسانہ "بلند دیواریں" کے کردار معصوم محبت کے جذبے سے سرشار ہیں لیکن ان کے بیچ سماج اور مذہب کی بلند دیواریں حائل ہیں جن کو پھلانگنا ہندوستانی روایات کے پس منظر میں کچھ آسان نہیں۔ ادبی اجلاس کے اختتام پر غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ اور صادق نوید صدر ادارہ کے شکریہ پر ادبی اجلاس و مشاعرہ اختتام کو پہنچے۔

۴/ ستمبر ۱۹۹۲ء ۳۰-۶ بجے شام انجمن ترقی پسند مصنفین کا ادبی اجلاس بمقام نہرو ماڈرن انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد، زیر صدارت ڈاکٹر راج بہادر گوڑ منعقد کیا گیا جس میں "کہاں گئے وہ لوگ" کے زیر عنوان جناب سروجنی نائیڈو کی ادبی تہذیبی فلاحی و سماجی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جناب سروجنی نائیڈو کی شخصیت اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر صدر محفل کے علاوہ مسرز عاتق شاہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، انجم نکہت، فاطمہ عالم علی، راشد آزر، رئیس اختر، تحی الدین، صلاح الدین نیر اور حسن فرخ نے روشنی ڈالتے ہوئے بھرپور خراج پیش کیا۔

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے کہا کہ مسز سروجنی نائیڈو کی اصول پسندی، انصاف پسندی تھی ان کی ذہنی تربیت کی آبیاری میں قاضی عبدالغفار اور مرزا ہادی وغیرہ کو بہت زیادہ دخل رہا ہے۔ محترمہ فاطمہ عالم علی نے کہا کہ وہ ان کی [illegible]

عبدالغفار صاحب بیٹے کی طرح چاہتے تھے لاہوتی بھی قاضی صاحب سے والہانہ وابستگی رکھتے تھے جناب عاتق شاہ نے کہا کہ لاہوتی نے زندگی کے آخری لمحوں تک اپنے نظریہ حیات کو نہیں بدلا بلکہ وہ ان کے کردار کا ایک اہم حصہ تھا۔ جناب راشد آزر نے کہا کہ لاہوتی کا ظاہر و باطن یکساں تھا۔ دوستوں کی محبت کو استعمال کرنے میں بڑے سخی واقع ہوتے تھے۔ جناب نصرت محی الدین نے کہا کہ انجمن ترقی اردو کے کاموں میں وہ پیش پیش رہتے تھے باہر سے آنے والے شاعر ادیب شہر آتے ہی لاہوتی صاحب کے بارے میں پوچھتے۔ محترمہ بانو طاہرہ سعید، نجمہ نکہت، مسرز رئیس اختر، صلاح الدین نیر اور حسن فرخ نے بھی مخاطب کیا۔ جناب صلاح الدین نیر شریک معتمد انجمن نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

۱۸ ستمبر ۹۲ء جناب مرزا عصمت اللہ بیگ مرحوم کی اہم تصنیف "ندائے رومی" کی رسم اجرا تقریب "موہنی ہال" رائل ہوٹل میں منعقد ہوئی۔ اس موقع پر جناب محبوب حسین جگر شریک مدیر "سیاست" نے کہا کہ حیدرآباد کے سابق نائب وزیر اعلیٰ آنجہانی کے وی رنگا ریڈی اور آنجہانی سے وی نرسنگ راؤ صاحبان نے حیدرآباد میں اردو کے فروغ اور استحکام کی جدوجہد میں اہم حصہ ادا کیا تھا۔ جناب سجاد مرزا نے سب سے پہلے یہاں اردو ٹائپ ایجاد کیا۔ جناب مصطفیٰ شروانی صدر نشین عصمت میموریل پبلیکشنز کمیٹی نے اردو ادب میں حضرت جلال الدین رومی کی مثنوی اور حکایات پر مبنی "ندائے رومی" کے ذریعہ جناب مرزا عصمت اللہ بیگ مرحوم کی اس علمی کوشش کو ایک منفرد کارنامہ قرار دیا۔ اردو شاعری پر فارسی شعر وادب کے اثرات حضرت شیخ سعدی، حضرت حافظ شیرازی اور فردوسی طوسی کی شاعری سے ماخوذ ہونے اور ہندوستان میں اردو، فارسی اور سنسکرت

ہندی شاعری کے امتزاج کو سب سے پہلے امیر خسرو کی دین قرار دیا۔ "نداے روحی"
کی طباعت کے سلسلہ میں اُردو تصانیف میں کتابت اور طباعت کی دشواریوں
کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ابھی تک اُردو مصنفین کی عصری طباعت کی بہتر اور
جاذب توجہ ٹکنالوجی بوجہ کثیر اخراجات اُردو مصنفین کی دسترس سے باہر ہے
اس کا ایک حل یہ بھی ممکن ہے کہ آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی جو بعض مصنفین
کی گاہ بگاہ رسمی امداد کرتی ہے ایک اُردو کمپیوٹر کمپوزنگ کا شعبہ قائم کرے
اور بجائے رقمی امداد کے جو بھی اُردو تصنیف بغرض اعانت موصول ہو اس کی
کمپیوٹر کمپوزنگ کا اہتمام کر کے ایک طرح مصنفین کو کتابت کی دشواریوں سے
ایک حد تک نجات دلائے۔ جناب محبوب حسین جگر نے اس کے جواب میں بتلایا کہ
بجائے آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی میں جداگانہ شعبہ قائم کرنے کے اُردو تصانیف
کی کمپیوٹر کمپوزنگ اور طباعت دیگر مراکز جہاں یہ سہولت فراہم ہے۔ وہاں بھی
ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں موصوف نے انتخاب پریس کے تعاون کا وعدہ فرمایا۔
جناب عاتق شاہ نے حضرت جلال الدین رومی کی مثنوی اور حکایات کو فارسی
شاعری کا سنگ میل قرار دیا۔ رائل ہوٹل میں موہنی ہال کو اُردو اداروں کی
سماجی اور یکجہتی کوششوں کے لیے پیش کرتے ہوئے جناب لائن شنکر داس نے
اپنے منفرد انداز میں جناب مرزا صبغت اللہ بیگ فکر حیدرآبادی کا اپنے والد مرحوم
مرحوم جناب مرزا عصمت اللہ بیگ کی تصانیف یکے بعد دیگرے منظر عام پر لانے
پر انہیں تحسین و آفرین کا مستحق قرار دیا اور چند برجستہ اشعار سے حاضرین کو
محظوظ فرمایا۔ جناب سردار راجندر سنگھ اور جناب ٹھاکر مردے ناتھ سنگھ صدر
فلاح و بہبود اجرت بورڈ نے بھی مخاطب کیا۔ محترمہ صالحہ الطاف حسین نے عصمت میموریل

پشپا ورما، جاں نشتر، بھگوان داس چوپٹ، پرسورام ڈالمیا نے کلام سنایا۔
جناب نہپال سنگھ ورما نے کارروائی چلائی جناب جی آر روشن نے شکریہ ادا کیا۔

۱۶ ستمبر کو ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں جناب راشد آذر کی زیر صدارت انجمن ترقی پسند مصنفین کا ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ علامہ اقبال کی شاہکار نظم "مسجد قرطبہ" پر ماہرین اقبالیات نے گہری نظر ڈالی جس کے پس منظر میں جناب علی ظہیر نے معلومات آفرین تجزیہ پیش کیا۔ ابتدائی حصہ نظم میں روز و شب کا سلسلہ اور فلسفہ زماں کے متن میں یوروپی فلسفی برگساں کا حوالہ مناسب تھا۔ موجودات کی بے ثباتی کے بعد ثبات دوام اک فلسفیانہ موڑ ہے۔ جہاں عشق اور مرد مومن کا جذبہ کارگر ہے مسجد قرطبہ تاریخی اہمیت رکھنے کے علاوہ مرد مومن کی روحانی تہذیبی اور کئی اعلیٰ اقدار کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کے ساتھ علامہ اقبال کے پیش نظر خود اندلس کا یا ہسپانیہ کی جمالیاتی حیثیت نمایاں ہے۔ نظم کا اختتام عالم نو کی سحر کے انتظار اور پیغام انقلاب کا ترجمان ہے۔ علی ظہیر نے اپنے مضمون کو انفرادیت بخشی۔ مبصرین میں جناب رحمٰن جامی نے زبان کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے مضمون نگار کے مطالعہ کو سراہا۔ ذکی شاداب نے واضح کہا کہ کلام اقبال کی مخصوص علامتوں کی معنویت کے تحت دعوت اجتہاد بھی باعث اہمیت ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر جمال الدین افغانی اور خود سرسید نے بھی زور دیا جو اسلامی زندگی کی تجدید کے زیر عنوان اک ادبی حصہ ہے۔ جناب گیان سنگھ شاطر نے اس نظم میں مرثیے کا سوز و گداز پایا۔ سلطان زاہد اور باقر محسن نے تبصرہ میں حصہ لیا۔ جناب سعید آرکیٹکٹ نے خود عینی مشاہدے کی بدولت مسجد قرطبہ کی مختصر الفاظ میں تصویر کھینچ دی۔ جناب نصرت محی الدین نے ۳ رباع
اور ۲ نظمیں سنائیں۔ مبصرین کا اجتماعی احساس یہ تھا کہ کلام میں روانی اور وا

پبلکیشنز کی جانب سے جناب محبوب حسین جگر کی خدمت میں قیوم حیدرآبادی مرحوم کی ایک متاثر کرنے والی پینٹنگ کا عکس پیش کیا۔ آخر میں جناب مرزا صبغت اللہ بیگ فکر حیدرآبادی نے شکریہ ادا کیا۔

۱۲ ستمبر ۱۹۹۲ء گیت چاندنی شعری سفر کا ۱۵۵ واں اجلاس و مشاعرہ گاندھی میموریل لائبریری ہال میں منعقد ہوا۔ مسٹر نریندر رائے نے صدارت کی۔ سکریٹری گیت چاندنی جناب ہنپال سنگھ ورما نے استقبال کرتے ہوئے کہا کہ گیت چاندنی بلا ناغہ ہر پونم کی رات اپنا شعری اجلاس مختلف مقامات پر منعقد کرتی رہی ہے۔ یہ ۱۵۵ واں اجلاس ایک تاریخی اجلاس ہے اور گیت چاندنی نے ابھی تک تین ہندی شعراء کے مجموعہ کلام شائع کئے ہیں۔ مہمان خصوصی مسٹر مسند رجی ایڈیٹر دکشن سماچار نے کہا کہ ملک میں گیت چاندنی واحد ادارہ ہے جس نے ہندی اردو کو نزدیک لانے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے۔ مسٹر نارائن داس اگروال نے کہا کہ گیت چاندنی نے حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے یقین دلایا کہ ہندی اردو زبان کی خدمت کے لیے ان کی خدمات حاصل رہیں گی۔ ہری کشن دوجانیاں نے کہا کہ گیت چاندنی نے مختلف مقامات پر اپنی ادبی محفلوں کا انعقاد کر کے حیدرآباد میں ادبی وشعری ذوق کو پروان چڑھایا ہے۔ اس مشاعرہ میں ہندی اردو کے شعرا ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، اگر۔ بچاشرما، گریش، ہنپال سنگھ ورما، صلاح الدین نیر، رحمن جامی، نریندرائے، مومن خاں شوق، منان منظور، قدیر انصاری، اکبر یدحسن، ثاقب بنارسی، اشفع اقبال، مسند رجی شرما، دنیش راج شرما، بی آر دوشن، اے سمیع، ایم۔ یمی کرشنا، چوبی گیتا، پیچھن لال روی، استریمتی مینا گپتا، ہم۔ یمی، عمر ادا، روف الدین شاکر، پرشوتم پرشانت، تلجاپرشاد وملی، سدرشن لکھنہ

جناب سود حسن نے اس کلام میں ہندی شاعری کا بھی رنگ محسوس کیا۔ جناب صادق نوید نے شاعر کو مشاعرے میں حصّہ لینے کا مشورہ دیا۔ جناب صلاح الدین نیر نے نصرت محی الدین کی شاعری پر اظہار خیال کیا اور جلسے کی کارروائی چلائی۔

۱۸ ستمبر ۹۲ء اُردو مجلس کا ادبی اجلاس بمقام اُردو ہال حمایت نگر منعقد ہوا جناب ریاست علی تاج نے جلسہ کی صدارت کی۔ جناب قدیر انصاری نے معتمدی کے فرائض انجام دیے۔ جناب شیخ سلیم لکچرر اُردو انوارالعلوم کالج نے میر تقی میر کی شاعری پر مضمون پڑھا۔ جناب عزیز بھارتی نے اپنا منتخب کلام پیش کیا۔ ابتدا میں صدر اُردو مجلس جناب رحمٰن جامی نے تعارفی اور خیر مقدمی تقریر کی۔ جناب شیخ سلیم نے میر کی شاعری کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ میر کو فن غزل گوئی کا پہلا اُستاد شاعر مانا گیا ہے میر ان چند مایہ ناز شعراء میں سے ہیں جن کو مقبولیت دوام حاصل ہوئی اور انہیں خدائے سخن قرار دیا گیا مضمون "میر کی شاعری" پر جناب رحمٰن جامی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ میر کو جیسے جیسے پڑھتے جاتے ہیں ویسے ویسے مطالب کھلتے جاتے ہیں میر کا اعتراف غالب نے بھی کیا ہے۔ میر مختلف زاویہ کی وجہ سے خدائے سخن ہے۔ مضمون نگار کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ کم وقت میں بہت اچھا مضمون لکھا گیا ہے۔ جناب راشد آذر نے کہا کہ میر پر بڑی بڑی کتابیں الگ الگ انداز میں لکھی گئی ہیں۔ مزید اگر کچھ لکھنا ہو تو اس ہنج سے ہٹ کر لکھنا چاہیئے۔ میر نے اُردو اور فارسی کو توازن بخشا ہے اور یہ اجتہادی شاعر ہے۔ جناب رحمٰن جامی نے کہا کہ عزیز بھارتی کے پاس اردو والوں اور اقلیتوں کے مسائل بھی ہیں۔ جناب ریاست علی تاج نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ میر پر لکھنے کے لیے خاص زاویہ نظر کی ضرورت ہے۔ معتمد اردو مجلس جناب قدیر انصاری کے شکریہ پر یہ محفل اختتام کو پہنچی۔

۱۹ ستمبر ۹۲ء مرکز ادب حیدرآباد کا خصوصی ادبی اجلاس و غیر طرحی مشاعرہ بمکان جناب محمد قمرالدین صابری (مدیر شاداب) ریڈ ہلز منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے کی۔ مہمانِ خصوصی مسرز صلاح الدین نیر، منظور احمد منظور اور مسرز غفار بیگ اثر گلشن آبادی تھے۔ ابتدا میں محمد قمرالدین صابری نائب صدر ادارہ نے مہمانوں کا استقبال اور خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر علی احمد جلیلی، جناب صلاح الدین نیر چیرمین آف حیدرآباد ایوارڈ یافتگان کے بارے میں تعریفی کلمات کہے۔ اور ان کی گلپوشی بھی کی گئی۔ ان کے علاوہ مسرز منظور احمد منظور اور مرزا غفار بیگ اثر کی بھی گل پوشی عمل میں آئی۔ ادبی اجلاس میں جناب رشید الدین ڈپٹی ڈائرکٹر دارالترجمہ نے جناب منظور احمد منظور پر سیر حاصل مضمون سناتے ہوئے کہا کہ یہ ایک شاعر، ادیب، صحافی اور استادِ ادب ہیں۔ مجسم شرافت اور انکساری ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ پختہ کار شاعر ہیں سیدھی، سادھی اور چھوٹی زمین میں اچھے شعر کہتے ہیں۔ کئی انجمنوں اور ادبی جرائد سے وابستہ ہیں اور ادبی علمی خدمات میں مصروف رہتے ہیں۔ جناب صادق نوید نے اردو ادب کی تاریخ اور حیدرآباد کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے جامع مضمون میں کہا کہ حیدرآبادی تہذیب میں ڈھلی پاکیزہ، ملنسار، باکردار، وضع دار شخصیت کا نام محمد منظور احمد منظور ہے۔ ان کی بغل میں ہر وقت اردو کا ایک چھوٹا دفتر رہتا ہے۔ صلے اور ستائش کی تمنا سے بے نیاز مختلف انداز میں اردو کی خدمت کے لیے وقف ہو گئے ہیں بہرصورت مشرقی تہذیب کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔ جناب منظور احمد منظور نے مرکز ادب کے ارباب مجاز اور مضمون نگار حضرات اور شعرا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے زندگی کی آخری سانس تک اردو کی خدمت کرتے رہنے کی توفیق کے لئے

خدا سے دعا کی۔ اس موقع پر جناب صلاح الدین نیر نے کہا کہ مرکز ادب قابل مبارکباد ہے کہ مشاعروں کے ساتھ ساتھ اس ادارہ کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً حیدرآباد کے اہم و ممتاز شعراء کا خیر مقدم اور تہنیتی جلسہ کرتے رہتے۔ اب اپنے ادبی اجلاس میں حیدرآباد کے زندہ ادیبوں شاعروں پر مضامین کے ایک نئے سلسلے کی شروعات کی ہے جو دوسری انجمنوں کے لیے بھی قابل تقلید ہے اس کے بعد غیر طرحی مشاعرہ میں صدر محفل ڈاکٹر علی احمد جلیلی، مہمان خصوصی مسرز صلاح الدین نیر، منظور احمد منظور اور مرزا غفار بیگ اثر کے علاوہ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید مسرز صادق نوید، قمر الدین صابری، عزیز بھارتی، شفیع اقبال، مومن خاں شوق، مناں منظور، عزیز ناگپوری، محمود شریف محمود، ابوالفاروق شعور، ڈاکٹر سید رشید الحسن، قدیر انصاری اور ڈاکٹر سید حسن نے اپنا منتخب کلام سنایا اور دادِ تحسین پائی۔ اس خوشگوار اور کامیاب محفل کا اختتام جناب محمود شریف محمود شریک معتمد کے شکریہ پر ہوا۔ مومن خاں شوق نے مشاعرہ کی کارروائی چلائی۔

۲۵ ستمبر ۹۲ء نائب صدر نشین راجیہ سبھا محترمہ نجمہ ہبت اللہ نے کہا ہے کہ اُردو زبان یا اقلیتوں کے تعلق سے وزیر اعظم مسٹر پی وی نرسمہا راؤ کا ذہن بالکل واضح ہے وہ دن دور نہیں ہے جب کہ اُردو اور اقلیتوں سے مکمل انصاف کیا جائے گا۔ محترمہ نجمہ ہبت اللہ آج یہاں آل انڈیا اردو تعلیمی کمیٹی کے زیر اہتمام منعقدہ دو روزہ کل ہند اردو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کر رہی تھیں۔ انہوں نے سائم کا کہا کہ سوال پالیسی کا نہیں ہے بلکہ نیت کا ہے وہ دو ٹوک انداز میں کہہ گئی کہ وزیر اعظم کی نیت بالکل صاف ہے اور انہوں نے مرکزی اقلیتی کمیشن کو عاملانہ اختیارات دے کر وعدہ پورا کر دیا۔ صدر نشین تعلیمی کمیٹی جناب محمد جلیل پاشا

نے صدارت کی۔ ڈاکٹر طیب انصاری نے کارروائی چلائی۔ محترمہ نجمہ ہبت اللہ نے اردو والوں پر زور دیتے ہوئے کہ "یقین محکم عمل پیہم" پر گامزن ہوں تو میں یقین دلانا چاہتی ہوں کہ اردو کا چراغ کبھی گل ہو نہیں سکتا۔ یہ شمع روشن ہی رہے گی۔ کیوں کہ اب اردو ہندوستانی سرحدات سے پار نکل چکی ہے اس زبان میں وسعت بہت ہے اس کے دامن میں ہر زبان کے الفاظ سمیٹنے کی صلاحیت ہے۔ یہ زبان ترکی، فارسی، عربی، ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں کے خوبصورت الفاظ کا مرکب ہے لیکن اسے کیا کہا جائے کہ بعض لوگوں کے ذہن و فکر میں آزادی کے ۴۳ برس بعد بھی تنگ نظری ہے۔ اردو کا سب سے اہم مسئلہ ابتدائی سطح پر اس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ یہ بات اردو یونیورسٹی کا مطالبہ کرنے والوں کے لیے بھی قابل توجہ ہے انہوں نے حیرت ظاہر کی ہے کہ آج طلبہ اردو پڑھائی جاتی ہیں اور انہیں ہندی کا سرٹیفکٹ دیا جاتا ہے یہ بڑی نا انصافی ہے۔ محترمہ نجمہ ہبت اللہ نے جناب جلیل پاشاہ کو اردو کا میر کارواں قرار دیا۔ انہوں نے شرکا کو یقین دلایا کہ اردو کا کام کاز کے لیے وہ ہمیشہ تعاون دیں گی۔ بزرگ شاعر ظہیر الدین بابر نے تہنیتی نظم سنائی۔ پروفیسر آفاق احمد (بھوپال) ڈاکٹر شمیم نکہت (دہلی یونیورسٹی) پروفیسر نظام الدین گوریکر، محترمہ ریحانہ جاوید (ناگپور) آر پارتھا سارتھی پرنسپل سکریٹری حکومت آندھرا پردیش ڈاکٹر صادقہ جاوید (جامعہ ملیہ) اور جناب سید منظور احمد قاسمی نے بھی خطاب کیا۔

۲۵ ستمبر ۹۲ء اردو شاعری جہاں ذہنی تھکن دور کرتی ہے وہیں پر نے مختلف النوع مضامین سے شعبہ حیات کے مختلف گوشوں میں رنگ بھرتی ہے حیدرآباد میں اردو شاعری کا ایک معیار ہے۔ یہاں سے شہر کے شاعروں نے حیدرآبادی تہذیب کی اور نمائندگی کرتے ہوئے منفرد و دلکش انداز میں اپنا شعری سفر جاری رکھا ہے۔ اردو

کانفرنس کے انعقاد پر مشاعرہ کا انعقاد ہمیشہ کی طرح ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار جناب جلیل پاشاہ صدر کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی نے ریٹز ہوٹل کے پرنسس ہال میں منعقدہ مشاعرہ کے موقع پر کیا۔ جو ۲۵ ستمبر کی شب نہایت پر اثر انداز میں جاری رہا۔ اس مشاعرہ کی صدارت ممتاز غزل گو شاعر جناب سعید شہیدی نے کی۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد مشاعرہ تھے۔ کانفرنس میں مختلف جامعات سے آئے ہوئے دانشوروں جن میں قابل ذکر پروفیسر شمیم نکہت دلی یونیورسٹی، پروفیسر آفاق احمد بھوپال یونیورسٹی، پروفیسر ریحانہ جاوید ناگپور یونیورسٹی، پروفیسر نظام الدین گوریکر صدر انجمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی ہیں۔ محترمہ سعیدہ زکی (جامعہ ملیہ) کے علاوہ پروفیسر یوسف سرمست صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ ڈاکٹر طیب انصاری صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج گلبرگہ شرکت کی۔ صدر مشاعرہ جناب سعید شہیدی کے علاوہ ممتاز شعراء سرز راشد آذر، صلاح الدین نیر، ڈاکٹر صادق نقوی، اکمل حیدرآبادی، فیض الحسن خیال، صادق نوید، عزیز صادق، علی الدین نوید، منظور احمد منظور، مومن خاں شوق، اشرف اقبال، سلیم عابد (محبوب نگر) منان منظور تاثیر انصاری اور کانفرنس میں آئے ہوئے شعراء سرز سید مجیب الرحمن سیکریٹری (اتر پردیش اردو اکیڈیمی) کریم ارمانی اور محبوب پاشاہ امیر نے اپنا منتخب کلام سنا کر داد تحسین حاصل کی۔

۲۷ ستمبر کو ۳۰ء۵ بجے شام ایوان اردو میں یوم زودنہ کا انعقاد عمل آیا۔ "دکنی ادبیات کی دریافت اور ترتیب میں غیر دکنی ادیبوں کا حصہ" کے عنوان محترمہ نجم السحر، ڈاکٹر فاطمہ پروین ڈاکٹر محمد علی اثر، ڈاکٹر افضل اقبال، ڈاکٹر عقیل ہاشمی اور ڈاکٹر محمد مجیب اللہ صدیقی نے سیر حاصل مقالے پڑھے۔ ابتداً میں معتمد ادارہ ادبیات اردو جناب منوراج سکسینہ نے تعارفی تقریر کی۔ ڈاکٹر نقد کے بعد سے

سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ جناب سید ہاشم علی اختر صدر ادارہ ادبیات اردو و سابق وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ نے اپنے صدارتی ارشادات میں کہا کہ ڈاکٹر زور ایک ایسے ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے جنہوں نے ادارہ ادبیات اردو کے قیام کے بعد کئی لکھنے والوں کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع فراہم کیا۔ نوجوان اہل قلم حیدرآبادیوں سے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھوائیں۔ ڈاکٹر زور کو ہم سے جدا ہوئے ۳۰ سال ہو چکے ہیں لیکن ان کے ادارہ کی علمی، ادبی و تہذیبی سرگرمیاں جاری ہیں۔ جناب منظور احمد منظور نے جلسہ کی کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

۲۸ ستمبر ۱۹۹۲ء حیدرآباد میں اپنی نوعیت کے پہلے اور بامقصد اردو، ہندی کے نوجوان شاعروں کے مشاعرے کے انعقاد نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اردو ہندی کے نوجوان شاعر بھی ایک پلیٹ فارم پر اپنے اپنے تخلیقات پیش کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتے ہیں آج تقریباً تمام بڑے شاعروں غالب، میر، اقبال، ساحر فیض وغیرہ کا کلام ہندی رسم الخط میں منتقل ہو چکا ہے۔ زبان اردو ہی ہے صرف رسم الخط ہندی ہے ان خیالات کا اظہار ممتاز دانشور جناب سید ہاشم علی اختر نے ادارہ "میرا شہر میرے لوگ" کی جانب سے منعقدہ اردو ہندی کے نوجوان شاعروں کے مشاعرہ میں کیا جو ۲۸ ستمبر کو ۷ بجے شام مولانا ابوالکلام آزاد اورینٹل اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا۔ جناب امیر احمد خسرو نے صدارت کی مہمان خصوصی کی حیثیت جناب سید ہاشم علی اختر، جناب کیشو راؤ سابق پرنسپل ہندی آرٹس کالج ہیرالال سنگھ سابق صدر شعبہ اتحاد العلوم نے شرکت کی۔ جناب صلاح الدین نیر نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ بات محسوس کی جا رہی تھی کہ نوجوان اردو ہندی کے لیے سینئر اردو ہندی شاعروں کی [illegible]

عمل میں لایا جانے۔ جہاں تک اردو، ہندی زبان کی بات ہے میں صرف رسم الخط کے فرق کے سوا کوئی فرق محسوس نہیں کرتا۔

جناب نہال سنگھ ورما نے کہا کہ ہماری ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ہم نہ صرف تہذیبی رشتوں کا سنگم چاہتے ہیں بلکہ سارے ملک کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حیدرآباد میں اردو، ہندی کس طرح ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ صدر مشاعرہ جناب امیر احمد خسرو نے نوجوان شاعروں کو مشورہ دیا کہ اپنے بزرگوں کا احترام کریں۔ تہذیبی اقدار کا دامن نہ چھوڑیں۔ اس مشاعرے میں اردو کے نوجوان شاعروں میں ڈاکٹر منیر الزماں منیر، نصرت محی الدین، الطاف ہمدانی، رشید شہیدی، قدیر انصاری، طاہر گلشن آبادی محمد علی وفا، تجمل اظہر، فاروق صادقی، آغا سروش، عباس متقی، ظفر فاروقی، ڈاکٹر سعید نواز، جلال الدین اکبر، اعجاز نسیم اعجاز، نسیم الدین فریس، الہام داوری نقیب پاشا اور ہندی کے شاعروں میں ششی نارائن سوادھین، پرشوتم پرشانت، اجیت کمار رؤف الدین بیباکر، چمن لال روی، ڈاکٹر راجندر پرکاش چوہان اور راجندر کمار نے کلام سنا کر داد تحسین حاصل کی۔ معتمد مشاعرہ جناب رئیس اختر نے نہایت عمدگی کے ساتھ مشاعرے کی کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

۱۷/ اکتوبر سنہ ۹۲ء انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس ہندی ماڈرن انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا جس کی صدارت نامور افسانہ نگار محترمہ نجمہ نکہت نے کی اس اجلاس میں محترمہ سکینہ وسیم عباس نے شفق کی سرخی کے عنوان کے تحت افسانہ پیش کیا اور ڈاکٹر صادق نقوی ریڈر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ نے چار غزلیں پیش کیں محترمہ قمر جمالی نے افسانہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ افسانہ اچھا ہے جو سماج کے خلاف آواز اٹھانا ایک سچے انسان کا فرض ہے جناب عاتق شاہ نے کہا کہ نغمگی کے

نیقت پسندانہ کردار کو افسانہ کے کینوس پر پیش کر دیا ہے۔ جناب حامد محمود نے کہا کہ
انی میں کہیں جھول تو نہیں ہے ڈاکٹر مسید حسن نے کہا کہ افسانہ کا انجام اگر ٹریجڈی
دیا جاتا ہے تو کہانی اور متاثر کن ہو جاتی۔ جناب صلاح الدین نیر نے ڈاکٹر صادق نقوی
ے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ صادق نقوی تیس سال سے شعری سفر طے کر رہے
ں۔ بڑے مضبوط شعر کہتے ہیں کیوں کہ شاعر کے ساتھ ساتھ وہ ادیب بھی ہیں ڈاکٹر بھی ہیں
ر نقاد بھی۔ جناب رئیس اختر نے کہا کہ کسی دوست کی شاعری پر تبصرہ کرنا بڑا مشکل
رلہ ہوتا ہے لیکن ایمانداری کا بھی کچھ تقاضہ ہوتا ہے صادق نقوی کے کلام میں تاریخ
ر کربلا کے استعاروں کا حسین امتزاج ملتا ہے جناب رحمٰن جامی نے کہا کہ صادق نقوی
، عصری ہیئت اور کلاسکیت دونوں کو اپنے کلام میں سمو رکھا ہے جناب راشد آذر
کہا کہ صادق نقوی کے کلام میں تصوف بھی کار فرما ہے اور وہ کربلا کے کینوس کو
زیادہ تر پیش نظر رکھتے ہیں بڑے سلیقہ سے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں آخر میں
صدر جلسہ محترمہ نجمہ نکہت نے مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ سکینہ وسیم عباس نے ایک بار پھر پور
افسانہ پیش کیا صادق نقوی شعوری طور پر شعر کہتے ہیں سکینہ عباس اور ڈاکٹر صادق نقوی
نے مبصرین کے تسلی بخش جوابات دیئے جناب صلاح الدین نیر نے جلسہ کی کارروائی چلائی
اور شکریہ ادا کیا۔

۱۰ اکتوبر ۹۲ء محفل خواتین کا ماہانہ اجلاس بصدارت محترمہ خورشید حمید پاشاہ
صاحبہ منعقد ہوا محترمہ ڈاکٹر شریف النساء صاحبہ نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ محفل کا
آغاز محترمہ رضیہ تنا یمن صاحبہ کے مضمون "اقبال فن و شخصیت" سے ہوا۔ فاطمہ تاج صاحبہ
نے چھوٹا سا افسانہ پیش کیا۔ محترمہ آریا نو صاحبہ نے "غبار خاطر سے چند اقتباسات" کے
عنوان سے مضمون پیش کر کے مولانا ابوالکلام آزاد کے انداز تحریر پر روشنی ڈالی اور خوب داد پائی۔

محترمہ شریف النساء صاحبہ نے "سعدی شیرازی" کی شخصیت اور شاعری پر روشنی ڈالتے ہوئے
ان کے کلام کے ناصحانہ پہلو کو اجاگر کیا۔ مضمون پوری دلچسپی اور توجہ سے سنا گیا۔ محفل
میں رفیعہ شاہین، اقبال جہاں، قدیر عصمت عظیم، فاطمہ تاج، حنا شہیدی، خورشید حمید
ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید، سلطانہ شرف الدین، نایاب سلطانہ اور انیس فاطمہ نے حصہ لیا۔
آخر میں صدر جلسہ نے اس محفل کو کامیاب محفل قرار دیتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں ان
مضامین کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ اردو کے قاری کو ادب عالیہ سے استفادہ کر
چاہیئے۔ محفل کے اختتام پر شکریہ ادا کرتے ہوئے معتمد محفل خواتین نے اعلان کیا کہ ۱۴ر نومبر
کو محفل خواتین کی طرف سے ایک سمپوزیم بہ عنوان "حیدرآباد کے چار سو سال خواتین کی
نظر میں" کا اہتمام کیا جا رہا ہے امید ظاہر کی کہ با ذوق خواتین زیادہ سے زیادہ حصہ لیں
اور سمپوزیم کو کامیاب بنائیں گی۔

۱۰ر اکٹوبر ۹۲ء بروز ہفتہ ۶½ بجے شام مرکز ادب حیدرآباد کا ادبی اجلا
و طرحی مشاعرہ بمکان جناب محمد قمر الدین صابری مدیر "شاداب" ریڈ ہلز منعقد ہوا جس کی صد
ڈاکٹر صادق نقوی صاحب نے کی ناگپور سے آئے ہوئے ڈاکٹر محمد منصور خاں منصور پروفیسر
انگریزی مہمان خصوصی تھے۔ ابتداء میں جناب محمد قمر الدین صابری نائب صدر ادارہ نے مہمانو
کا استقبال خیر مقدم کیا اور ادبی اجلاس کی کارروائی چلائی۔ اس ادبی اجلاس میں ڈاکٹر
بانو طاہرہ سعید صاحبہ پر مضمون سناتے ہوئے ڈاکٹر رضیہ سلطانہ شاہین نے کہا کہ ستارہ دا
ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید محفل خواتین کی جان اور علمی ادبی و شعری محفلوں کی روح رواں ہیں
یہ حیدرآباد اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی شہرت کی حامل ہیں۔ جنا
محمد قمر الدین صابری صاحب نے کہا کہ بقول ڈاکٹر زور ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کو حیدرآ
چمنستان ادب میں گل صد رنگ کی حیثیت حاصل ہے اور ان کی اردو، فارسی، انگری

شاعری پر سیر حاصل مضمون پیش کرتے ہوئے کہا کہ "ڈاکٹر صاحبہ کی شاعری اور فکر میں کارفرما خاتون کے خد و خال مشرقی ہیں۔ روحانی تغزل بانو کے انگریزی اور اردو دونوں ہی زبانوں کے کلام میں نقطۂ ارتکاز ہے۔ غرض ڈاکٹر صاحبہ نے ادب کی دنیا اپنا ایک خاص اور ممتاز مقام بنا لیا ہے۔ ان کی شہرت قومی سرحدوں کو پار کر چکی ہے۔ ڈاکٹر صادق نقوی صدر ادبی اجلاس نے مرکز ادب کو ایسی محفلوں کے انعقاد پر مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ بانو طاہرہ سعید صاحبہ بین الاقوامی شہرت کی حامل ہیں فارسی، اردو اور انگریزی زبان میں نظم و نثر میں طبع آزمائی کرتی ہیں ان کے اظہار فن میں صداقت اور نسوانیت موجود ہیں ان کی شخصیت کے کئی رخ ہیں۔ ان کے "فن اور شخصیت" کا احاطہ کرنے کے لیے کافی وقت درکار ہے۔ پھر بھی کم وقت میں دونوں مضمون نگاروں نے اچھے مضمون لکھے ہیں۔ اور دونوں قابل مبارکباد ہیں۔ ادبی اجلاس کے فوری بعد طرحی مشاعرہ منعقد ہوا جسکی کاروائی مومن خاں شوق نے چلائی۔ مشاعرہ کا آغاز جناب عابد قادری کی طرحی نعت شریف سے ہوا۔ اس طرحی مشاعرہ میں ڈاکٹر صادق نقوی (صدر مشاعرہ) جناب محمد منصور خاں منصور (مہمان خصوصی) ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کے علاوہ مسرز صلاح الدین نیر، ابراہیم علی حامی، منظور احمد منظور، راحت عزمی، عزیز بھارتی، بشیر امجد، صادق نوید، سوز عابدی، قمر الدین صابری، مومن خاں شوق، طالب اسدی، شفیع اقبال، منان منظور، سرور عابدی، ابو الفاروق شعور، ساقی ایوبی، محمد شریف محمود، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، تمانائی، عزیز ناگپوری، حلیم رضا، ڈاکٹر سید حسن نے اپنا منتخب طرحی کلام سنایا اور داد تحسین پائی۔ جناب عزیز بھارتی صدر ادارہ کے شکریہ پر اس خوشگوار اور کامیاب محفل کا اختتام عمل میں آیا۔

۱۰ اکتوبر ۹۲ء ہندی لیکھک سنگھ حیدرآباد کا ۲۴۲ واں ماہانہ ادبی اجلاس

گاندھی درشن ہندپ نمائش میدان میں منعقد ہوا۔ شری شیام سندر منوہرا نے صدارت کی سکریٹری شری ایم اپندر نے استقبال کیا اور کارروائی چلائی شری کنہیال سنگھ ورما نے حصّہ لینے والے ادیبوں کا تعارف کرایا۔ شری نصرت محی الدین نے ادبی اجلاس میں اپنی نظمیں سنائیں ان نظموں پر ہوئی بحث میں اظہار خیال کیا گیا۔ انکی نظموں میں نعرہ بازی کے بجائے ایک جستجو اور سنگھرش کی وہ آواز ہے جو ضمیر میں پیدا ہوتی ہے۔ اور قوموں کو ترک کرتا ہے۔ شریمتی ارملا ورما نے ایک کہانی "گودڑ کا لعل" پیش کی۔ کہانی پر ہوئی بحث میں یہ عام خیال تھا کہ کہانی ایک مکمل سندیس دیتی ہے۔ کہانی میں سماج کی ناانصافی نوکر مزدور کا تعلق، اور سماجی مساوات کے جذبات کو ایک عام آدمی کی زندگی کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے کہانی پوری طرح اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ اور اس کے کردار حقائق کی زمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ افسانہ نگار خاتون نے ایمانداری سے کردار سازی کا اپنا فرض پورا کیا ہے۔ مسٹر ایم اپندر کے شکریہ پر اجلاس اختتام کو پہنچا۔

اار اکتوبر ۹۲ء۔ پدم شری ڈاکٹر شریف النسا انصاری سابق صدر شعبہ فارسی عثمانیہ یونیورسٹی نے اُردو والوں سے کہا ہے کہ وہ اپنی تہذیب و تاریخ کے تحفظ کے لئے نئی نسل کو اُردو تعلیم سے لیس کریں۔ کیوں کہ اردو ہندوستانی تہذیب و تاریخ کا قیمتی ورثہ ہے۔ ڈاکٹر شریف النسا نے اُردو گھر مغلپورہ میں تنظیم نوجوانان حیدرآباد کے زیر اہتمام منعقدہ ادبی اجلاس سے صدارتی خطاب کر رہی تھیں۔ ابتدا میں صدر اسے بانی و صدر تنظیم مسٹر محمد نجم الدین نجم نے تعارفی و خیر مقدمی تقریر کی۔ مسٹر تجمل اظہر اجلاس کی معتمدی کے فرائض انجام دیے۔ رائے منوہر راج سکسینہ ایڈوکیٹ، محمد فیاض الدین صابری اور الہام واعدی مہمانان خصوصی تھے پدم شری شریف النسا نے کہا ہمارا تہذیبی و تاریخی سرمایہ استاد کی شکل اور کتابوں کی صورت میں ہنوز محفوظ ہے

نئی نسل کا اردو، فارسی، عربی سے لگاؤ بھی ضروری ہے۔ ورنہ یہ ورثہ تباہ ہو جائے گا۔ انہوں نے اردو گھر کے انتظامیہ سے کہا کہ وہ مفت عربی و فارسی کلاسس کے لیے اپنی خدمات دیں۔ رائے منوہر راج سکسینہ نے کہا کہ اردو سے انصاف کے بغیر جمہوریت سے انصاف نہیں ہو سکتا۔ اور کہا کہ اردو نے تحریک آزادی ہند کو ولولے سے ہمکنار کیا اور قومی یکجہتی کو استحکام بخشا۔ مسرز صاحبزادہ الحاج جہاں دار افسر، فیاض صابری، الہام واصری نے بھی خطاب کیا۔ ادبی اجلاس میں مسز سری نواس لاہوٹی اور عزیز قلیبی کی وفات پر تعزیتی قراردادیں منظور کی گئیں۔ ادبی اجلاس کے بعد غیر طرحی مشاعرہ کا انعقاد سعید الشعرا حضرت سعید شہیدی کی صدارت میں منتخب و مدعو شعرا، عمل میں آیا۔ معتمدی کے فرائض خوش اسلوبی کے ساتھ جواں سال ممتاز شاعر معین فیاضی نے انجام دیے۔ جس میں مسرز جہاں دار افسر حضرت نظیر علی عدیل، حضرت سعید شہیدی، اثر غوری، رشید شہیدی، آغا سروش، ابوالفاروق شعور، صاحبزادہ ساغر رومانی، تجمل اظہر، معین فیاضی، شریمتی پشپا ورما، باسط نقوی، داؤد مومنی، ڈاکٹر سید حسن کے علاوہ مشہور گلوکار محمد تقی نے کلام سنایا۔ داعی محفل محمد نجم الدین نجم کے شکریہ پر اس خوبصورت محفل مشاعرہ کا اختتام ہوا۔

(سلسلہ ص ۵۴)

★ محمد امتیاز۔ ملک پیٹ حیدرآباد

سوال:- میں پابندی سے نماز پڑھتا ہوں لیکن اکثر و بیشتر صبح کی نماز قضا ہو جاتی ہے اس کیلئے مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

جواب:- بار بار اللہ تعالیٰ کی یاد فرمائیے اور اسی سے مدد کیلئے درخواست کیجئے سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے۔

آپ کے خطوط

ہم ہر ماہ "شاداب" کے لیے آئے ہوئے چند خطوط شائع کر رہے ہیں تاکہ آپ کو قارئین کی پسند اور ناپسند کا پتہ چلتا رہے اس شمارہ میں بھی چند خطوط شامل ہیں۔ آپ سے التماس ہے کہ آپ بھی "شاداب" پڑھنے کے بعد اپنی رائے سے ہمیں آگاہ کریں تاکہ اسے مزید دلچسپ اور مفید بنایا جا سکے (ایڈیٹر)

عزت محمد ۔ مغل پورہ حیدرآباد ۔

"شاداب" کا "ثقلین نمبر" جو آپ نے ۱۲ ربیع الاول کو حضورؐ کی پیدائش مبارک یعنی میلادالنبیؐ پر شائع کیا تھا مجھے پسند آیا۔ اس میں آپ نے نثر کے بڑے معلوماتی مضامین مشہور علمائے دین کے شائع کئے ہیں جو غالباً ڈائجسٹ کئے گئے ہیں نثر کے علاوہ مختلف شعرا کی نعتیں بھی مجھے پسند آئیں۔ آپ اس طرح کے دینی مضامین عام شماروں میں بھی دیتے رہتے ہیں جو ایک احسن اقدام ہے۔

نورالدین ۔ املنیر (مہاراشٹرا)

ایک دوست جو جلگاؤں سے آئے تھے اپنے ساتھ "شاداب" کا ایک پرچہ بھی لائے تھے۔ میں کچھ ادبی ذوق رکھتا ہوں اس لیے پرچہ مجھے پسند آیا۔ یہ اگست کا شمارہ تھا۔ جامعہ عثمانیہ اور اردو (ہاشم علی اختر) امراض قلب (ڈاکٹر عبدالـ...) اور مسز سیمیں اصغر کے نام مرزا ظفر الحسن کا طویل خط مجھے پسند آئے۔ آپ کے یہاں سوال و جواب کا سلسلہ اچھا اور معلوماتی ہے۔ آپ کے نام آئے ہوئے چند خطوط بھی آپ ہر ماہ دیتے ہیں۔ توقع کرتا ہوں کہ میرا یہ خط بھی شائع ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی سالانہ چندہ ۶۵ روپیہ بھی ارسال کر رہا ہوں۔ براہ کرم آئندہ شمارہ سے پرچہ ایک سال کیلئے میرے پتہ پر جاری فرما دیجئے۔

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

سوال آپ کے
جواب ہمارے

محمد نہال احمد صدیقی
پی ایچ ڈی اسکالر، سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد،

☆ محمد شوکت، مرادنگر ــــ سوال: ہمارے سماج سے جہیز کو کیسے مٹایا جاسکتا ہے؟
جواب:۔ لڑکے اور لڑکی ہر دو گھرانوں سے لین دین کی اس بدترین رسم (جہیز) کو مکمل طور پر لینا دینا بند کرنے کا جب عہد کیا جائے گا تبھی اس رسم کو مٹایا جاسکتا ہے۔ اس کار خیر میں نوجوانوں ہی کو آگے آنا ہوگا۔

☆ توقیر عالم سعید۔ علی گڑھ۔ سوال:۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے بانی کون تھے اور اس کے موجودہ وائس چانسلر کا نام کیا ہے؟
جواب:۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے بانی نظام ہفتم نواب میر عثمان علی خان تھے اور موجودہ وائس چانسلر پروفیسر ملا ریڈی ہیں جن کا حال ہی میں تقرر عمل میں لایا گیا ہے۔

☆ محمد ناظم یعل پورہ حیدرآباد۔ سوال:۔ اردو پڑھنے سے ملازمت تو نہیں ملتی پھر بھی ہم اپنے بچوں کو اردو پڑھا رہے ہیں اس سلسلہ میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں!
جواب:۔ اردو ہو یا کسی اور زبان کسی میں رزق دینے کی قدرت نہیں ہے بلکہ رزق کا دینے والا تو اللہ تبارک و تعالیٰ ہے چنانچہ اردو پڑھنے سے ملازمت نہیں ملتی کہنا درست نہ ہوگا۔ دیکھئے اردو تو ہماری مادری زبان ہے، ہم سب پر فرض ہے کہ ہم اردو کو

عام کریں۔ ہاں اُردو کے ساتھ ساتھ دیگر زبانیں جیسے انگریزی، تلگو، ہندی وغیرہ سے واقفیت رکھنا بھی آج کے دور میں بے حد اہم ہے۔ یہ دور اُردو سے ملازمت حاصل کرنے سے ہٹ کر نہیں بلکہ اُردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لیے جدوجہد کرنے کا دور ہے۔

★ ڈاکٹر امجد علی خاں۔ اے سی گارڈز حیدرآباد

سوال :۔ مجھے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے میں لڑکی کو ڈاکٹر اور لڑکے کو انجینئر بنانا چاہتا ہوں لیکن میرے دوست احباب مجھے یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ لڑکی کو ڈاکٹر بنانے سے کیا فائدہ وہ تو پرائے گھر کی ہو گی اور لڑکے کو ڈاکٹر بننا پسند نہیں، میری اس الجھن کو دور کیجئے گا؟

جواب :۔ لڑکے کو ڈاکٹر بننا پسند نہیں ہے تو اسے ایم بی بی ایس کیلئے دباؤ نہ ڈالیں اور دوسری بات لڑکی تو ضرور پرائے گھر کی ہی ہو گی لیکن اسے ڈاکٹر بننا پسند ہے تو ضرور اسے ایم بی بی ایس کروائیے۔ وہ آپ کا نام ضرور روشن کرے گا۔

★ فرزانہ بیگم، نامپلی گرلز جونیر حیدرآباد

سوال :۔ کیا نماز و قرآن مجید کو عربی سے کسی دوسری زبان میں ترجمہ کر کے پڑھا جا سکتا ہے؟

جواب :۔ قرآن مجید عربی میں نازل ہوئی ہے اسلئے نماز میں قرآنی آیات کو صرف عربی ہی میں پڑھنا ہے۔ مسلمان چاہے اس کا تعلق کسی بھی زبان سے ہو عربی زبان ہی میں قرآن مجید پڑھنا اس پر فرض کیا گیا ہے۔ البتہ قرآن مجید کو سمجھنے کیلئے ہم کسی بھی زبان میں ترجمہ کیا ہوا قرآن پڑھ سکتے ہیں۔

(باقی ص ۵۳)

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید نمبر

شاداب

جلد [۹]

شمارہ [۱۲]

ڈسمبر ۱۹۹۲ء حیدرآباد

فون ـــــ 229161 قیمت =/20 روپے

ایڈیٹر : محمد قمرالدین صابری

جوائنٹ ایڈیٹر : رشید الدین مینجنگ ایڈیٹر : محمد نہال احمد صدیقی

○ زر تعاون

ہندوستان	65 روپے	۲ سال کیلئے 120 روپے	تاحیات 1500 روپے
خلیجی ممالک	200 "	360 "	3700 "
امریکہ	40 ڈالر	70 ڈالر	700 ڈالر
انگلستان	25 پونڈ	45 پونڈ	400 پونڈ
پاکستان	175 پاکستانی روپے	300 پاکستانی روپے	3000 پاکستانی روپے

ترسیل زر کا پتہ : ماہنامہ 11-5-147 ریڈ ہلز حیدرآباد 500004

○ ایڈیٹر پرنٹر پبلشر محمد قمرالدین صابری نے نیشنل فائن پرنٹنگ پریس کیلئے پبلک پرنٹرس بوستہ بازار میں چھپوا کر دفتر "شاداب" ریڈ ہلز حیدرآباد سے جاری کیا۔

فہرست

اداریہ

۱۱ر نومبر ۱۹۹۲ء اردو زبان و صحافت کی تاریخ میں ایک تاریک دن تھا جب صبح ہی صبح جناب میر عابد علی خاں مدیر روز نامہ "سیاست" کی روح نے ان کے جسد خاکی کو چھوڑا۔ مرحوم ایک اردو اخبار کے ایڈیٹر ہی نہیں تھے بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ انہوں نے اپنے اخبار سے ایک مشن کا کام لیا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے اس مشن میں کامیاب بھی کیا۔ اپنے اخبار کی اجرائی سے ۴۴ سال تک انہیں اس دنیا میں رکھا اور ان کے لگائے ہوئے ایک ننھے سے پودے کو ایک سایہ دار اور ثمر دار درخت میں تبدیل کر کے انہیں اس کی چھاؤں میں ستانے کا موقع فراہم کیا۔ اس زندگی میں انہیں جناب محبوب حسین جگر جیسا ساتھی اور دوست عطا کیا جنہوں نے ان کے اس مشن کو پورا کرنے میں ان کا ہر ہر قدم پر ساتھ دیا اور انشاء اللہ آئندہ بھی مرحوم کے اس مشن کو جاری رکھینگے۔

جناب عابد علی خاں نے سیاست سے وہی کام لیا جو سر سید احمد خاں نے "تہذیب الاخلاق" سے لیا تھا۔ غدر کے بعد سر سید نے ہندوستانی مسلمانوں کے حوصلے بلند کئے اور انہیں خود اعتمادی لائی۔ سقوط حیدرآباد کے بعد جناب عابد علی خاں نے بھی یہی کیا انہوں نے حکومت وقت سے مفاہمت کی پالیسی اختیار کرتے ہوئے مسلمانوں کی سماجی کی اقدار کو باقی رکھا اور انہیں سے قدم سے قدم ملا کر چلنے کا درس دیا۔

"سیاست" نے اردو صحافت میں نہ صرف ایک تاریخ بنائی بلکہ اس کے ذریعہ بامحاورہ اور عوامی اردو کے چلن کو بھی عام کیا جو مستقبل کی اردو ہوگی اور رہیگی۔

خاں مرحوم نے اردو زبان کے لیے صحافت کے علاوہ بھی بہت کچھ کیا انہوں نے مشاعروں کی بنیاد ڈالی اور ان کی آمدنی سے کئی ٹرسٹ قائم کئے۔

بدولت اردو ہال کا ٹرسٹ بنا، ادارہ ادبیات اردو کا ٹرسٹ بنا، اردو گھر کا ٹرسٹ بنا اور خود ان کا اپنا ادبی ٹرسٹ بنا، ان کی شخصیت نہ صرف حیدرآباد بلکہ سارے ہندوستان کی جانی پہچانی شخصیت تھی۔ حیدرآباد سے لے کر دلی تک ان کا اثر تھا۔

ان کے ہاتھ میں ایک اخبار تھا لیکن انہوں نے اپنے آپ کو نام و نمود سے ہمیشہ دور رکھا۔ کبھی ٹائٹل پر بطور ایڈیٹر اپنا نام نہیں دیا بلکہ پرنٹ لائن میں (جو ایک قانونی پابندی تھی) بطور ایڈیٹر اپنا نام دیتے تھے جو اخبار کے آخری صفحہ پر سب سے آخر میں ہوتا تھا ان کا اخبار روزنامہ "ہند سماچار" جالندھر کے بعد سب سے زیادہ چھپنے والا اردو اخبار تھا جس کے قارئین نہ صرف ریاست آندھرا پردیش بلکہ مرہٹواڑہ اور کرناٹک کے علاوہ مشرق وسطیٰ امریکہ، کینیڈا اور انگلستان میں بھی موجود تھے۔

آخر میں خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی روح کو جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو (جن میں سب سے نمایاں نام جناب محبوب حسین جگر کا ہے) صبر جمیل عطا فرمائے۔

حیدرآباد، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر سے بھی عابد علی خاں مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ہم صرف ایک تحریر پیش کر رہے ہیں جو ڈاکٹر کے بھکتہ وتسل راؤ نے مرحوم کے اعتراف شخصیت کے بارے میں لکھی ہے۔

موجودہ نمبر ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید سے متعلق ہے۔ عابد علی خاں مرحوم نے ۲۶ جولائی ۱۹۹۳ء کو بانو طاہرہ سعید کے قومی یک جہتی سے متعلق مجموعہ کلام "آشیاں ہمارا" پر پیش لفظ لکھا ہے۔ اور موصوفہ کی شاعرانہ عظمت کے بارے میں اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بانو سے متعلق اس تحریر کو بھی ہم نے اس شمارہ میں شریک کیا ہے۔

یہ خصوصی نمبر تیار ہو رہا تھا کہ ان دنوں بریگیڈیر سعید نے اپنے

چاہنے والوں کو داغ مفارقت دیا۔ بانو طاہرہ سعید پر تو غم و اندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اللہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور بانو اور دیگر پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ جناب ہاشم علی اختر نے مرحوم کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اسے اس شمارے میں نقل کیا جا رہا ہے۔

بانو طاہرہ سعید کی فکروفن کے بارے میں دیگر مضامین کے ساتھ موصوفہ کے کلام کا انتخاب بھی اس شمارہ میں شریک کیا جا رہا ہے۔

○

دسمبر ۹۲

ڈاکٹر کے۔ بھگت وتسل راو
2-2-1144/1/8
پوسٹ آفیس لین، نیو نلہ کنٹہ
حیدرآباد (اے پی)
500044

ممتاز صحافی و ادیب

عابد علی خاں مرحوم

میں ابھی چند دن کے لیے بیٹی کے ہاں گیا تھا ۱۳ ار نومبر ۱۹۹۲ء میں یکایک ایک افسوس ناک، المیہ خبر ٹائمز آف انڈیا میں دیکھا کہ "عابد صاحب اب ہم میں نہیں رہے"۔ نہایت ہی رنج وغم میں ڈوب گیا۔ تیس سال سے میری ملاقات رہی ہے ایک مضمون نگار کی حیثیت سے، بہی خواہ وقاری کی حیثیت سے عادل آباد میں جب میں لکچرار تھا تو حیدرآباد آنے پر ضرور ان سے اور جگر صاحب سے مل پاتا تھا۔ ایک پیالی چائے پر بات چیت ہوتی تھی۔ عادل آباد کے ادبی و تہذیبی امور پر تبادلہ خیال ہو پاتا تھا۔ غالب صدی تقاریب کے سلسلہ میں عادل آباد تشریف لائے تھے مینجنگ ایڈیٹر زاہد علی خاں صاحب کے ہمراہ ایک حد پورا ٹہر کر ادبی جلسہ میں خصوصی مہمان تھے جناب اللہ یار خاں صاحب کلکٹر ضلع تقریب کے صدر تھے۔ اردو کے فروغ کے لیے چند ہدایات دیے۔ جوش سے زیادہ صبر سے خدمت کرنے کے لیے کہا۔ اخبار سے میری رغبت تو مضامین سے رہی۔ میں نے ایک خیر خواہ، بہی خواہ، بزرگ شخصیت کو کھو لیا ہے۔ میری آخری ملاقات اُن سے تلگو یونیورسٹی میں اسایناری کمیٹی میٹنگ میں ہوئی تھی۔ تلگو میں دستخط کرنے کے سلسلہ میں ان سے گفتگو ہوئی

"شاداب"

دسمبر ۹۲

ڈاکٹر سی۔ نارائن ریڈی معین امیر جامعہ تلگو نے تلگو میں انکے نام کے حروف کو تحریر کیا تھا وہ نہایت ہی خوش ہوتے۔ ایسے ہر دلعزیز و مقبول شخصیت کا گذر جانا صحافت و ادبی دنیا کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ایک خلا سا ہو گیا ہے جسے پُر کرنا مشکل ہے "وہ ہنس مکھ چہرہ" بیدارانہ انداز" فکر میں گہرائی ملنساری کی کیفیت۔ اب بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے پُر خلوص انداز میں آداب کر رہے ہیں حیدرآباد کے لیے خصوصاً بدقسمتی ہے کہ ایک ایسا ہیرا۔ چلا گیا جسکی پرکھ ہندوستان بھر و بیرون ہندوستان میں تھی۔

عابد علی خان صاحب۔ میر محمود علی خان صاحب کے بیٹے تھے۔ ۱۹؍ مارچ ۱۹۲۰ء میں جاگیردار خاندان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ میں ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ سے ۱۹۴۴ء میں بی۔ اے کی سند حاصل کی۔ فلسفہ میں زیادہ دلچسپی لی۔ خلیفہ عبدالحکیم کے شاگرد تھے۔ اس زمانہ میں انکی دوستی مخدوم، وحید، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے تھی۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے معتمد بنے۔ اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوتے ہوئے دیکھنے کی تمنا انکے والد کی تھی۔ لیکن عابد صاحب عوام پسند بننا چاہتے تھے۔ عوام کی خدمت کرنے کی انہیں طلب سی تھی۔ انہوں نے صحافت کو ذریعہ بنایا۔ میدان چن لیا۔ کڑی محنت کرنی پڑی۔ مصرعہ عرض ہے ؎

مشکلیں اتنی پڑیں کہ آساں ہو گئیں

۱۵؍ اگست ۱۹۴۹ء کے دن "سیاست" اخبار کا پہلا پرچہ عابد صاحب نے نکالا۔ بزرگ شخصیت قاضی عبدالغفار کے مشورہ سے فیض یاب ہوئے۔ جمہوریت ہی نصب العین تھا۔ دکھ درد کو مٹانے کا ہی انکا مقصد تھا اردو ادب کے ذریعہ صحافت کے میدان میں۔ جواہر لال نہرو روڈ پر ٹن کے شیڈ میں یہ اخبار نکلا (۴۳) سال سے زیادہ مدت ہو پائی ہے۔ پختہ بلڈنگ ہے "سیاست" کی۔ کبوتر اسکی نشانی ہے۔ ہندوستانی کا پیامبر ہے۔ عوام کا ترجمان ہے۔ کثیر الاشاعت اردو روزنامہ ہے۔ اعتدال پسند

اور خوشحال "سیاست" کو عابد صاحب نے ہم پر چھوڑ دیا ہے۔ پرورش کرنے کے لیے، سرپرستی کے لیے، مقبولیت میں اضافہ کرنے کے لیے۔

"سیاست" کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے عابد صاحب نے کئی اقدامات کئے۔ سنہرے ایڈیشن خصوصی مضامین و تصاویر کے ساتھ شائع کرتے رہے۔ جدہ و امریکہ سے بھی مضامین وصول ہوتے رہے۔ اُردو ادب کی بقاء کے لیے جو بھی پروگرام ہوتے تھے انکا خلاصہ شائع کرتے تھے۔ مسلمانوں کے مسائل، غریبوں کی تکالیف کو "سیاست" میں جگہ رہی۔ ہر چھوٹا بڑا، امیر و غریب، لیڈر یا پلیڈر، عہدہ دار یا نوکر چاکر عابد علی خاں صاحب سے راست مل سکتا تھا۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی انکے پاس۔

کئی انجمنوں، اداروں، حکومت ہند اور بیرون ممالک کے دعوت ناموں پر سنگاپور ملایشیا، یوگوسلاویہ، روس، امریکہ، ہنگری، افغانستان و دیگر ممالک کا دورہ کیا اور وہاں کے حالات کی عکس کشی "سیاست" میں کی جس سے اس اخبار کی عظمت میں اضافہ ہوا

عابد صاحب کو کئی اداروں سے ذاتی لگاؤ تھا مثلاً ادبی ٹرسٹ "بدھ ویر ٹرسٹ" انجمن ترقی اُردو "ہند" اُردو اکیڈیمی، انوار العلوم کالج، اردو آرٹس کالج، اسکے علاوہ پریس کونسل پی، ٹی، آئی کے ممبر تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے رکن سنات تھے۔ ساہتیہ اکیڈیمی کے ممبر تھے قومی یکجہتی کونسل کے ممبر رہے۔ انجمن مدیران ہند کے چیرمن تھے۔

عابد علی خاں صاحب کو کئی اعزازات ملے مثلاً پدم شری (۱۹۸۱ء)
غالب ایوارڈ (۱۹۸۴ء) ڈاکٹریٹ اوپن یونیورسٹی آندھراپردیش (۱۹۸۶ء)

عابد صاحب عملی سیاست سے ہمیشہ دور رہے لیکن سیاست کے واقعات سے انکی پہچان تھی اور غیر جانبدارانہ انداز میں "سیاست" اخبار میں پیش کرنے کا انکا اپنا "تھا" طرز تحریر میں ایک نیا روپ تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے عملہ پر بھروسہ یقین رکھتے ہمت افزائی کرتے تھے۔ انکے دکھ درد میں ساتھ دیتے تھے، علاج بھی انہیں خیرخواہ سرپرستی

سمجھتے تھے۔ انکے جگری دوست محبوب حسین جگر "سیاست" کے روح رواں سمجھے جاتے ہیں جناب زاہد علی خاں صاحب کافی تجربہ حاصل کر چکے ہیں اور وہ اب "سیاست" کی کشتی کو سنبھال کر آگے لے جا رہے ہیں۔

عابد صاحب کا جلوس جنازہ ۱۲ ر نومبر ۱۹۹۲ء شام تین بجکر ۳۰ منٹ کو نکلا سوگواروں میں گورنر، چیف منسٹر، وزرا، وکلا، ماہرین تعلیم سیاسی قائدین کارکنان، عام لوگ شریک تھے باغ عامہ کی مسجد میں آخری دیدار کے لیے رکھا گیا۔ نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد جلوس کی شکل میں میّت نامپلی میں یکسنار مسجد پہنچی۔ نماز مغرب ادا کرنے کے بعد آخرت منزل میں تدفین شام کے ۶ بجکر ۳۰ منٹ کو عمل میں آئی۔ خدا انہیں جنت عطا کرے۔

انکی موت کی خبر سارے شہر میں یکایک پھیل گئی۔ رسل و رسائل سے بیرون ممالک میں بھی یہ خبر پھیل گئی۔ کئی تعزیتی پیامات وصول ہوئے۔ انجمن صدر جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ، وزیراعظم، وزیراعلیٰ، گورنرس، سیاسی پارٹیوں کے سربراہ، مذہبی پیشوا، سماجی کارکنان تعلیم کے میدان کے کرتا دھرتا، شامل ہیں۔

تعزیتی پیامات کی تعداد کو ہم تو گن نہیں سکتے۔ ایصالِ ثواب کے لیے مجالس کئی شہروں مثلاً اجمیر، دہلی، حیدرآباد، گلبرگہ میں کئے گئے۔ دعائے مغفرت مانگے۔ تعزیتی پیامات انکی زندگی کے خلاصے، انجمنوں، اداروں، اشخاص کے تعزیتی تحریریں ۲۲ ر نومبر ۱۹۹۲ء ایک ضمیمہ کے طور پر "سیاست" نے شائع کیا۔

عابد علی خاں صاحب کی ترقی کا راز انکی وضعداری، شفقت، انسانی ہمدردی، قومی لائی تصوف و چشتی تعلیمات سے وابستگی، خوش اخلاقی کیفیت و بھائی چارگی میں سچے قوم پرست تھے۔ ترقی پسند نظریات کے علمبردار، وعمل آور تھے۔ شریف النفس تھے۔

ہم خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ عابد صاحب کو جنت میں جگہ دیں اور اسکے صف میں ہم

۹۔ ۱۲۔ ۹۲ء

بانی سیاست عابد علی خانؒ (مرحوم)

"آشیاں ہمارا" کا پیش لفظ

بانو طاہرہ سعیدؔ کی قومی شاعری

بانو طاہرہ سعید کی شاعری کے بارے میں صاحبانِ فکر و نظر کی یہ رائے ہے کہ وہ اس شہر اردو حیدرآباد کی ایک ممتاز شاعرہ ہیں وہ فن پر گہرا عبور رکھتی ہیں حساس اور باشعور ہیں کہنہ مشق شعر گو ہیں۔ وہ روایتی شاعری نہیں کرتی ہیں۔ شاید خواتین شعراء میں سانیٹ اور نظم کے تجربے بانو طاہرہ سعید ہی نے سب سے زیادہ کئے ہیں وہ مسائلی موضوعات پر زیادہ لکھتی اور کہتی ہیں۔ بانو طاہرہ سعید نے غزل سے زیادہ نظمیں کہی ہیں۔ حالات حاضرہ اور اہم مسائل پر انہوں نے خوب ہی اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے شاعری کے میدان میں وہ اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ نقاد اِن فن کا یہ کام ہے کہ وہ بانو طاہرہ سعید کے کلام اور فن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کریں تاکہ ایک آرٹسٹ کو ایک طرف اپنے فن کا صحیح اندازہ ہو تو دوسری طرف قاری کی یہ ذہنی رہنمائی ہو سکے کہ بانو طاہرہ سعید نہ قدیم مکتبِ خیال سے تعلق رکھتی ہیں اور نہ انہیں کسی "ازم" سے کوئی واسطہ ہے انہوں نے تقریباً دو دہوں سے شعر کہتے ہوئے حیدرآباد کی شعری دنیا میں اپنا جو مقام بنایا ہے اس کا اساس کیا ہے ؟

آج کا نقاد شاعر کے کلام ہی کو نہیں بلکہ ان حالات کو بھی پیش نظر رکھتا ہے جس کے پس منظر میں شاعر نے شعر کہے ہیں اگر کلام کے جائزہ اور تجزیے کے لیے اس اصول کو بنیاد بنایا جائے تو یقیناً بڑے فخر سے یہ کہا جائے گا کہ بانو طاہرہ سعید نے جن موضوعات پر نظمیں کہی ہیں وہ ہمارے اہم قومی مسائل ہیں اور ان مسائل پر ان کا اندازِ فکر اپنی بالغ نظری

کے باعث ایک ایسے انسان کے حساس کا آئینہ دار ہے جو صالح و باشعور معاشرہ چاہتا ہے
شاید ہمارے ملک کی خواتین شعرا میں بانو طاہرہ سعید ان چند خواتین میں سے ایک ہیں
جنہوں نے مسائلی موضوع پر نظمیں زیادہ لکھی ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ بانو طاہرہ سعید
حیدرآباد کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے عصری موضوعات پر فی الفور اپنے خیالات
کا اظہار کیا ہے ان کا یہ وصف ان کے شعور اور فن کا آئینہ دار ہے ہمارے شہر کی خاتون
شعرا میں جن کا سلسلہ ماہ لقا بائی چندا جیسی ممتاز شاعرہ سے آغاز ہوتا ہے اور جس کا سلسلہ
بشیر النسا بیگم بشیر تک پہنچتا ہے بانو طاہرہ سعید نے اس میں نئے اضافے کئے ہیں انہوں نے
روایتی صنف شعر کے بجائے نئے اسلوب کو اختیار کیا۔ ان کا موضوع نیا ہے ان کے فکر
اور موضوع کا کینوس بہت کشادہ ہے اور وہ بلاشبہ نہ صرف شعر گوئی پر قادر ہیں بلکہ
موضوع سے انصاف بھی کرتی ہیں۔

بانو طاہرہ سعید کے ذہن اور فکر کو سمجھنے ان کا یہ مختصر مجموعہ اگرچہ کہ زیادہ ممد و معاون
نہیں لیکن یہ مجموعہ اس لحاظ سے ضرور اہم ہے کہ انہوں نے جن موضوعات پر نظمیں کہی ہیں
وہ ہمارے ملک پچھلے دو دہوں کی تاریخ ہیں۔ بعض اہم مسائل پر جس کا دائرہ "چین"
کے حملے سے شروع ہوتا ہے اور رقص بہاراں کی آرزو پر ختم ہوتا ہے ایک ایسے آرٹسٹ
کے دل کی دھڑکن ملتی ہے جو ملک کی ترقی و عظمت کا خواہاں ہے اور جو ایک نیک اور
سچے باشعور شہری اور فن کار کی حیثیت سے عوام کو ان مسائل سے واقف کروانا چاہتا
ہے ہمارے بعض ممتاز غزل گو شاعر اپنی غزل میں انہیں مسائل کو پیش کر رہے ہیں، مثلاً
مخدوم، شاہد صدیقی، ساحر، مجروح، سردار، کیفی، اور دوسرے کئی شاعروں کی غزلوں میں
اس دنیا کے موجودہ دور کے مسائل کا اظہار ہے بانو طاہرہ سعید کے اس مختصر مجموعہ
میں چین کا حملہ، وطن کی مدافعت، فوجی سپاہی کی ذمہ داریاں، ہمارے قومی تہوار اور بعض

ممتاز تاریخی شخصیتوں پر بڑی اچھی کامیاب اثر انگیز اور معیاری نظمیں ہیں ظاہر ہے کہ ان موضوعات پر کئی شعراء نے لکھا ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بانو طاہرہ سعید نے بھی معیار کے لحاظ سے بہت اچھا اور بلند ہی لکھا ہے۔

بانو طاہرہ سعید کی شاعری اور ان کے اس مجموعۂ کلام میں آپ حسن خیال اور احساس کو بہت زیادہ حاوی اور بھاری پائیں گے۔ وہ قومی یک جہتی۔ وطن کی عظمت و ناموس، دفاعِ وطن اور ہماری مشترکہ تہذیب اور روایات کا تحفظ ہے یقیناً احساس بجائے خود ایک محبتانہ شعور کی علامت ہے۔ یہ باکمال شاعرہ جو ایک سپاہی کی بیوی کی زبان سے یہ شعر کہلواتی ہو

محاذ سے فتح پاکر آؤ یہی دعا ہے یہی لگن ہے
غموں میں گرچہ گھری ہوئی ہے تمہاری دلہن مگر مگن ہے

اس کے کلام میں سماج اور عوام کے مسائل کی کمی محسوس ہوتی ہے اور اس کی ذمہ دار خود بانو طاہرہ سعید ہیں جنہوں نے اس مجموعے کو خود محدود کر دیا حالانکہ ان کے پاس "سراب" "صدا" اور "غول بیاباں" جیسی نظمیں ہیں انسان کے دکھ درد کے افسانے ہیں۔ لیکن چونکہ انہوں نے اپنے مجموعے کو صرف ایک مخصوص موضوع یعنی قومی یک جہتی تک محدود رکھا ہے۔ اس لیے حیدرآباد کی اس عظیم شاعرہ کے کلام کو پڑھنے والا تشنگی محسوس کرے گا اس تحدید کے باعث شاعرہ کے جوہر کے تمام پہلوؤں کو سمجھنے میں یقیناً مدد نہیں ملتی

جہاں تک مجموعہ کلام کا تعلق ہے شری نہرو اور شاستری جی کے انتقال پر ان کی نظمیں عوام کے دلوں کی دھڑکنیں ہیں۔

فسادات کے خلاف ان کے یہ شعر

نازک ہے وقت ہوش میں آنے کا وقت ہے
قدموں کو اور دل کو ملانے کا وقت ہے
آپس کے اتحاد میں عظمت ہے قوم کی
آپس کے تفرقوں کو مٹانے کا وقت ہے

نیا زمانہ اور نیا ادب اپنے ادیبوں و فن کاروں سے فکر آمیز تخلیقات مانگتا ہے بانو طاہرہ سعید نے ایک شاعرہ کی حیثیت سے اس نئے تقاضے کو بڑی دیانت سے پورا کیا ہے۔ قطع میں ایک سخن گسترانہ بات آن پڑی ہے قومی اور عوامی مسائل کے مجموعہ میں 'ہندو قوم' اور منصوبے جیسی نظمیں شعری لحاظ سے خواہ آمد کا کتنا ہی مؤثر اظہار کیوں نہ ہوں' ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوتی ہیں۔ اس پیش نظر میں اگر تنقید کے پہلو نظر آئیں تو وہ ـــ بانو طاہرہ سعید کی شاعری کا پر تعریض نہیں۔ خراج تحسین کے بیچ کلام کے تمام پہلوؤں کا یہ ایک مختصر جائزہ ہے۔

بانو طاہرہ سعید کے کلام پر ان کی تربیت اور شخصیت کی گہری چھاپ ہے۔ وہ ایران اور ہندوستان کے مشترکہ تمدن و تہذیب کی علمبردار ہیں پاکیزہ فکر حسّاس دل و دماغ اور شاعرانہ شعور کے علاوہ حالات و مسائل پر گہری نظر کے امتزاج سے بانو طاہرہ سعید نے شعر کہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سماج کے ہر طبقہ میں اور مختلف زبانوں' ادیبوں و شاعروں کے گرداب میں اپنی شاعرانہ صلاحیت اور تخلیقات سے نمایاں نظر آتی ہیں۔

عابد علی خاں
۲۶ رجولائی ۱۹۷۳ء
حیدرآباد

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
نائب صدر انجمن ترقی اردو ہند
نئی دہلی حیدرآباد ۔

"مہکتے ویرانے"

کا مقدمہ مورخہ ۳۰/۵ ۱۹۷۶

کیوں بلا بھیجا ہے پھولوں نے گلستانوں سے
بس گیا جو وہ پلٹتا نہیں ویرانوں سے

(بانو طاہرہ سعید)

طاہرہ حیدرآباد کی ایک مانوس اور محبوب شاعرہ ہیں۔ آپ اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی میں بھی طبع آزمائی کرتی ہیں آپ کے چار مجموعے تو میری ہی نظر سے گذر چکے ہیں سنہ ۱۹۶۲ء میں "برگِ سبز" شائع ہوا تھا۔ سنہ ۱۹۷۳ء میں ایک مجموعہ قومی نظموں کا "آشیاں ہمارا" کے نام سے چھپا تھا۔ سنہ ۱۹۷۴ء میں "گل خونچکاں" شائع ہوا۔ جو شہید کربلا حضرت امام حسین کی خدمت میں شاعرہ کا نذرانۂ عقیدت ہے۔ سنہ ۱۹۷۵ء میں آپ کے کچھ انگریزی کلام کا ایک مختصر مجموعہ "ڈالی کے نیچے" BENEATH THE BOUGH شائع ہوا تھا۔

طاہرہ ایرانی نژاد ہیں۔ اگرہ میں برج کے غنائی ماحول میں پیدا ہوئیں۔ لکھنؤ میں اودھی آغوش میں تعلیم حاصل کی اور لگتا ہے کہ "کرشن کنہیا کی مرلی کی دھن" اور "سیتا"

کی پاکیزگی کے ارتسامات ...... ان کی روح و ذہن پر اسی زمانے کی دین ہیں۔ "برگ سبز" کی نظمیں۔ "اردو زبان" "بکھرے سپنے" "مہتاب میں ڈوبا صحرا" "اندھیرا" "پدمنی" اور سیتا کے کئی اشعار ابھی تک آپ کے ذہن میں محفوظ ہوں گے۔

ے اس میں رادھا کے پائل کی جھنکار ہے
زلفِ زیب النسا کی بھی مہکار ہے
اس میں جھانسی کی رانی کی للکار ہے
ساز و نغمے کے ہمراہ تلوار ہے
اس کے دامن میں ہیں کتنی رنگینیاں
میری اردو زبان فخرِ ہندوستاں

(اردو زبان)

÷

نظمیں، غزلیں، آہیں، نغمے
خونِ جگر کچھ دل کے ٹکڑے
بھولی بسری بیتی باتیں
غم کی انوکھی سی سوغاتیں
یہ میرے بکھرے سپنے ہیں

(بکھرے سپنے)

÷

یاد کیوں آتی ہے ایسے میں غمِ دوراں کی
تلخیٔ زیست کی خونِ دلِ پُر ارماں کی

(مہتاب میں ڈوبا صحرا)

÷

رات ہی رات ہے راتوں کا اگر حسن نہیں
کوئی تارا نہیں جگنو نہیں مہتاب نہیں

ڈوب جاتے ہیں سفینے جہاں اُمیدوں کے
کتنا گمبھیر گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے یہاں (اندھیرا)

یا پھر علاء الدین خلجی پر یہ بھرپور وار سے

پیار کا اس کو بہانہ تھا مگر پیار نہ تھا
حسن کا صرف وہ بھوکا تھا پرستار نہ تھا
(پدمنی۔ چتوڑ کی رانی)

٭

جنت کی حور تھی کہ کرن آفتاب کی
دنیا تھی نور و رنگ و جمال و شباب کی (سیتا)

یا غزلوں کے یہ شعر سے

یہی کائنات میری، ہے۔یہی میرا سہارا
مجھے زندگی سے بڑھ کر غمِ زندگی ہے پیارا

٭

مجھے اپنے تڑپنے کا ذرا بھی غم نہیں لیکن
کہیں ان کا بھی دل میرے لیے تڑپا تو کیا ہوگا

٭

جلائیں تو دہی شمعیں میں نے اور خود ہی بجھا ڈالیں
کہیں جب یاد مجھ کو میرا خوابِ ناتمام آیا

٭

وہ قاتل ہیں ظالم ہیں اور بے وفا
مگر ان سے بدلہ لیا جائے نا

٭

جو ہوتا غمِ دل کے خالی تو پھر وہ دل کہاں ہوتا
غضب ہوتا جو کیفِ غم نصیبِ دشمناں ہوتا

٭

سونی پڑی ہے منزل دیوانگی عشق
کیا ہو گیا کہ کوئی سر دار بھی نہیں

کیا جانے اس راہ سے کب ان کا گذر ہو
مدت سے مگر راہ گذر دیکھ رہے ہیں
٭
میرے ہونٹوں پر تبسم دیکھ کر
کیوں سمجھتے ہو کہ دل میں غم نہیں
٭
زندگی نے نہ بخشی کبھی زندگی
موت بھی ہم سے آنکھیں چراتی رہی
٭
جس کو کہتے ہیں ہم بہار و خزاں
وہ تو ہے جیت ہار پھولوں کی

آشیاں ہمارا کی نظم "یومِ آزادی" میں پڑھیے گا ٭

کون کہتا ہے ہو گئی تکمیل
جنگِ آزادی اب بھی جاری ہے
یہ تلاطم یہ بھوک یہ افلاس
اپنے کندھوں پہ بوجھ بھاری ہے

یا پھر سپاہی کی بیوی پر گذرنے والی کیفیت جو ان کا اپنا غم ہے ؎

محاذ پر تم گئے ہو جب سے میں وہ نہیں ہوں جو تھی ہمیشہ
ہوں بکھری بکھری سی سیرتی اک بدل چکا ہے تمام نقشہ
٭
محاذ سے فتح پا کر آؤ یہی دعا ہے یہی لگن ہے
غموں میں گرچہ گھری ہوئی ہے تمہاری دلہن مگر مگن ہے
٭
گُل خونچکاں کے یہ شعر ؎

شکست فاش اندھیرے کو دی اجالے نے
یزید مر چکا، لیکن حسین زندہ ہے

مگر وہ تا دم آخر لڑا اندھیروں سے
چراغِ زیست نے بجھ کر بھی نور پھیلایا

طاہرہ نے حیدرآباد کی ادبی محفلوں پر اپنے اس کلام سے سکّہ جما ہی لیا ہے اور یوں بھی سطحِ مرتفعِ دکن کا یہ خوبصورت شہر ہمیشہ ہی سے عورتوں کے لیے سازگار و خوشگوار ماحول پیش کرتا رہا ہے۔ بھاگ متی ہی کی محبّت نے اسے "فرخندہ بنیاد" کا لقب عطا کیا۔ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر "قلی قطب شاہ" یہیں کا تھا تو اسی زمانے کی پہلی اور دوسری صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النساء امتیاز اور مہ لقا بائی چندا کے نغمے بھی یہیں گونجتے ہیں۔

اور آج بھی کئی خواتین شعر و نغمہ کی محفلوں کی روشنی بنی ہوئی ہے۔

طاہرہ، آگرہ، لکھنؤ، طہران نہ جانے کہاں کہاں سے گھوم پھر کر آخر کو حیدرآباد کی ہو رہیں۔ یہیں پر ان کو سسرال میں میکے کا لطف حاصل ہے۔ یہیں ان کو شعر کا ماحول بھی اور ان جیسے دوسرے شعلہ نواؤں کی محفل بھی۔ "جھلکتے دیرا مے" طاہرہ کی تازہ پیش کش ہے۔ اس میں بھی نظمیں ہیں سانیٹ ہیں قطعات ہیں۔ غزلیں ہیں نظموں میں آپ کو یہ کچھ ملے گا۔

قُرب نے اور بھی دوری کا دلایا احساس
کس قدر دور ہوں میں گرچہ ہوں سرحد کے قریب　　(سرحد کے قریب)

دل ہے اپنا اُجڑی بستی
ظلمت میں ڈوبی ہے ہستی

پھول میں رنگ نہ مئے میں ہستی
پریم ہے مہنگا نفرت سستی
اندھیاروں میں دیپ جلا جا (کرشن کنہیا)

پہلی خاتون خلائی مسافر ویلنٹینا سے شاعرہ یوں سرگوشیاں کرتی ہے ؎

ویلنٹینا بتا ہم کو بھی کیا کیا دیکھ آئی ہے
بشر کے واسطے مژدہ بھی کوئی ساتھ لائی ہے

ستاروں نے دیا بھی ہے کوئی پیغام تابندہ
کسی سورج نے تحفہ کوئی بھیجا ہے درخشندہ

فلک نے کیا سنایا ہے فسانہ بخت انساں کا
قمر نے کوئی ڈھونڈا ہے مداوا رنج دوراں کا

خلا سے کیا نظر آیا تجھے انساں کا مستقبل
کوئی کشتی کوئی ساحل کوئی جادہ کوئی منزل

پتہ کچھ مل سکا کب تک سویرا ہونے والا ہے
کبھی دنیا سے رخصت بھی اندھیرا ہونے والا ہے (ویلنٹینا)

کسی سورج کی ترکیب پر غور کیجئے کائنات کی وسعت اور نظام ہائے شمس کی تعداد کی طرف کس قدر بلیغ اشارہ ہے۔ نظم "چاند" میں کہا ہے ؎

کتنا خاموش کتنا ویراں ہے
. . .
غم دوراں نہ کچھ غم جاناں
چاند کے دل میں کوئی درد نہیں
. . .
اپنی دنیا ہی اپنی مونس ہے
قطرہ کیوں تیرے جادے میں (چاند)

فلسطینی خاتون مجاہدہ "لیلیٰ خالد" پر کہی گئی نظم کے تیور دیکھئے ؎

جیالی، سربکف، جھانسی کی رانی پھر ہوئی زندہ
بہت مدت کی اک بھولی کہانی پھر ہوئی زندہ

٭

الجیریا، مشرقِ وسطیٰ کی جنگ آزادی پر نظمیں ملیں گی، اس مجموعہ کے "قطعات" میں یہ قطعہ بھی ہے ؎

آئینہ دیکھ کر ہنسی آئی
ایک صورت نظر نئی آئی
کتنے فسانے کتنے ویرانے
سامنے بیتی زندگی آئی

٭

نظم تہمت کا یہ شعر سنئے ؎

مجھ پہ تہمت ہے "محبت کی تری"
میں نے کب تجھ سے محبت کی تھی

شدتِ محبت کے اظہار کا کیسا لطیف پیرایہ ہے۔ جنت کا یہ شعر کس قدر حسب حال ہے۔ لگتا ہے ہمارا اپنا تجربہ ہے ؎

میں جہنم سے خوب واقف ہوں
عمر ہی گذری آس پاس اس کے

چھلکتے ویرانے میں کئی غزلیں بھی شامل ہیں۔ غزل کے یہ اشعار آپ کو چونکا دیں گے ؎

غم سے سوزِ حیات باقی ہے
رونقِ کائنات باقی ہے
شبِ غم کی سحر نہ ہو جائے
چند تارے ہیں رات باقی ہے

وہ رہ گزر کہ جہاں سے کبھی وہ گزرے تھے
وہیں پہ طاہرہ پھر ان کا انتظار کریں

نوحہ خواں خاک بسر تشنہ لباں ہیں کچھ لوگ
نغمہ زن رقص کناں بادہ کشاں ہیں کچھ لوگ

آپ اور یہ پوچھتے ہیں میرا مزاج
کیوں مجھے شرمسار کرتے ہیں

"برگِ سبز" سے "چھلکتے ویرانے" تک طاہرہ نے لمبا سفر طے کیا ہے ؎

کیا جانیے اس راہ سے کب ان کا گزر ہو
مدت سے مگر راہ گزر دیکھ رہے ہیں

"برگِ سبز" کا زمانہ تھا اور اب شاعرہ کہتی ہیں ؎

"وہ رہ گزر کہ جہاں سے کبھی وہ گزرے تھے"
وہیں پہ طاہرہ پھر اُن کا انتظار کریں

"آشیاں ہمارا" میں عرضِ حال یوں کیا تھا ؎

کون کہتا ہے ہو گئی تکمیل
جنگِ آزادی اب بھی جاری ہے
یہ تلاطم یہ بھوک یہ افلاس
اپنے کاندھوں پہ بوجھ بھاری ہے

مگر "چھلکتے ویرانے" تک آتے آتے انداز بدل جاتے ہیں ایک لطیف طنز نے شعر کی لذت میں اضافہ کر دیا ؎

نوحہ خواں خاک بسر تشنہ لباں ہیں کچھ لوگ
نغمہ زن، رقص کناں، بادہ کشاں ہیں کچھ لوگ

آپ اور پوچھتے ہیں میرا مزاج
کیوں مجھے شرمسار کرتے ہیں

طاہرہ اپنے دل کی گہرائیوں میں ایک لطیف غم کی پرورش کر رہی ہیں اس ناقابلِ تسخیر کائنات کا کوئی گہرا راز ہے کوئی پہیلی یا شاعر کی کوئی تمنا ہے جو خوابیدہ بھی ہے اور عدمِ تکمیل بھی کوئی غم ہے جو شاعرہ کے اندر محوِ خواب ہے کہیں دور سے کوئی موسیقی کی دھن کانوں میں پڑتی ہے تو اسے چھیڑ ہوتی ہے اور وہ جاگ اٹھتا ہے (ملاحظہ ہو شاعرہ کی انگریزی نظمیں "تم" "خوابیدہ غم" وغیرہ)

ان کے باغ میں یاسمین بھی ہیں اور ان کا محبوب چمپا بھی۔ وہ یاسمین سے دامن بھرتی رہیں۔ لیکن چمپا کو کسی نے اڑا لیا۔ انہیں اس چمپا کا غم ہے۔
(ملاحظہ ہو شاعرہ کی انگریزی نظم "چمپا کا پھول")

شاعرہ کو ایک عجیب آدمی کی تلاش ہے، جو اس سے کہیں ایک بار ملا ہے اس کی قمیص سفید ہے۔ ایک بھورا کوٹ زیبِ تن کئے ہے۔ آنکھیں شب رنگ ہیں اور جو اپنے پیروں کے چھالوں پر ہنستا ہے۔!
(انگریزی نظم "عجیب آدمی" میں شاعرہ کو اس "عجیب آدمی" کی تلاش بھی ہے اور انتظار بھی۔

وہ رہ گزر کہ جہاں سے کبھی وہ گزرے تھے
وہیں پہ طاہرہ پھر ان کا انتظار کریں

محمد قمرالدین صابری
ایڈیٹر "شاداب"

بانو طاہرہ سعید

بقول ڈاکٹر زور بانو طاہرہ سعید کو حیدرآباد کے چمنستانِ ادب میں گلِ صد برگ کی حیثیت حاصل ہے۔ طوطیِ شیریں مقال، بلبلِ ہزار داستان بانو طاہرہ حیدرآباد کو ایران کی دین ہیں۔ ایرانی دانشوروں کے خاندان کی یہ نورِ نظر تاج محل کے شہر آگرہ میں پیدا ہوئیں ہندوستانی ملی جلی تہذیب کے مرکز لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی۔ بی۔ اے کیا اور اپنے والدین کے ساتھ تہران چلی گئیں، وہاں مختلف ثقافتی اداروں سے وابستہ رہیں۔ ادب اور جرنلزم میں نام پیدا کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے ختم پر حیدرآباد کے میجر جی ایم سعید سے شادی ہوئی اور حیدرآباد واپس آگئیں۔ میجر سعید بریگیڈیر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ دوسری اعلیٰ سیول خدمات بھی انجام دیں مگر حیدرآباد میں قیام پذیر ہو گئے اور بانو نے اردو، فارسی اور انگریزی کے ادبی اور ثقافتی اداروں میں دلچسپی لینی شروع کردی۔ محفلِ خواتین، بزمِ سعیدی، قرأت فیڈریشن آف انڈیا، فائن آرٹس انٹرنیشنل اردو اکاڈیمی، ورلڈ پوئٹری سوسائٹی، انٹرکانٹیننٹل، انڈو سوویٹ کلچرل سنٹر اور خواتین کی دیگر انجمنوں سے مختلف حیثیتوں میں وابستہ ہوگئیں۔ اردو فارسی اور انگریزی کا زبانوں میں تخلیقات موجود ہیں اور اب تک (۱۵) سے زیادہ کتب شائع ہو کر قبولِ عام سند حاصل کر چکی ہیں۔ اکثر و بیشتر نگارشات کو ہندوستان کی مختلف اردو اکیڈیمیوں

نے لائق ستائش قرار دیا، ایوارڈز عطا کئے۔ مقامی اعزازات میں آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈیمی اوارڈ، کلچرل افیرز اوارڈ، مخدوم امن اوارڈ، قومی یکجہتی اوارڈ، اے پی کلا سرسوتی اوارڈ شامل ہیں۔ فارسی میں ایران سے اور انگریزی میں کیمرج یونیورسٹی (انگلستان) اور ایریزونا یونیورسٹی (امریکہ) سے بین الاقوامی اعزازات اور اعزازی ڈاکٹریٹ عطا ہوئے۔ بعض انگریزی نظمیں کالج دیلیہ یونیورسٹی گریجویٹ کورس میں بھی داخل کی گئی ہیں۔

بانو نے اپنا تخلیقی سفر ہندوستان میں شروع کیا، ایران میں جاری رکھا۔ دنیا کی سیر کی اور بالآخر ہندوستان کے خطۂ دکن کو اپنا مسکن بنا لیا ہے، وہ کہتی ہیں۔

دلّی بہت حسین ہے دلکش ہے لکھنؤ
لیکن کچھ اور ہی ہے ہمارے دکن کی بات

ہمارے دکن کی بات تو کچھ اور ہے ہی مگر بانو کی پہلی محبت "اردو" ہے بانو نے اردو پر جو نظم لکھی ہے۔ اس کا ایک بند سنئے:

کتنی میٹھی زباں کیسی پیاری زبان — میری اردو زبان، فخر ہندوستان
اس میں رادھا کے پائل کی جھنکار ہے — زلفِ زیب النسا کی بھی مہکار ہے
اس میں جھانسی کی رانی کی للکار ہے — سازو نغمہ کے ہمراہ تلوار ہے
اس کے دامن میں ہیں کتنی رنگینیاں
میری اردو زبان، فخرِ ہندوستان

بانو پیدائشی شاعرہ ہیں، کسی کی شاگرد نہیں، تلمیذ الرحمٰن ہیں۔ تعرش گوئی اور خوش فکری فطرت کی دین ہیں۔ انہوں نے بچپن سے شاعری شروع کی۔ پہلا مجموعۂ کلام "برگِ سبز" جنوری ۱۹۶۲ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اگست ۱۹۸۹ء میں دوسرا

شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ "ہدیہ طاہرہ" نعتیہ اور منقبتی سلام کا مجموعہ ہے جو اتنا مقبول ہوا کہ چوتھا ایڈیشن ستمبر ۸۷ء میں شائع ہوا۔ نیز حضرت امام حسین اور کربلا کے المیہ سے متاثر ہو کر بانو نے نہایت اثر آفریں اور اثر انگیز شعر کہے اور "گلِ خونچکاں" کے نہایت موزوں اور دلکش نام سے ۸۶ء میں شائع کیا اور اگست ۸۷ء میں دوسرا ایڈیشن شائع کرنا پڑا۔ قومی یکجہتی، وطن کی عظمت اور ہماری مشترکہ تہذیب و روایات کے بارے میں بانو نے جو کچھ لکھا وہ ۱۹۸۳ء میں "آشیاں ہمارا" کے نام سے شائع کیا۔ اور جنوری ۸۵ء میں اس کے دوسرے ایڈیشن کی باری آئی۔ بانو کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "جھلکتے ویرانے" ۱۹۸۹ء میں ادارہ ادبیات اردو سے شائع کیا گیا۔ اور ۱۹۸۹ء میں نثری نظمیں "دور رہ کر" شائع کی گئیں۔ بانو کا انگریزی کلام Beneath The Bough ۱۹۷۵ء میں طبع ہوا اور The Pale Rose مارچ ۱۹۸۹ء میں طباعت پذیر ہوا۔

نثری تخلیقات میں افسانوں کے دو مجموعے خونِ جگر اور پنچھی باورا اور بچوں کے بین الاقوامی سال کا تحفہ سات دوست موجود ہیں

غرض بانو نے ادب کی دنیا میں اپنا ایک خاص اور ممتاز مقام بنا لیا ہے۔ ان کی شہرت قومی سرحدوں کو پار کر چکی ہے۔ بانو نے نظم و نثر دونوں میں اپنی طبع آزمائی کی ہے بلکہ ان کے تخلیقی ذہن نے کسی ایک زبان کے "کاغذی پیرہن" کو اپنی "شوخیٔ تحریر" کے لئے ناکافی محسوس کر کے کم از کم تین زبانوں میں جولانیٔ طبع دکھائی ہے

مغرب میں خواتین کا تاریخ ادب میں ایک ممتاز مقام رہا ہے غالباً وہاں کی ہنسی فضاؤں کی آزادی نے خواتین کے ذوقِ تخلیق کو حیاتیاتی سطح سے ابھار کر ان کا ذہنی اور تخیلی صلاحیتوں کو بھی ابھارا اور نتیجتاً انگلستان میں

Jane Austen ' Mrs Gaskel اور ...onte Sisters جیسی ناول نگار، Elizabeth Barret Browning جیسی شاعرہ، Margaret Mitchel ' Edith Whatton اور دیگرہ جیسی ناول نگار اور ادبی تاریخ ساز خواتین نے آفاقی شہرت حاصل کی۔ مشرق میں عورت کے عائلی اور سماجی دائرہ کار کے متعلق ایک مخصوص نظریہ نے اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو پس پشت تو ڈالا ہی بلکہ انگریزی شاعر Gray کی مشہور نظم Elegy کی Mute Inglorious Milton کی طرح انہیں عالم وجود میں آنے سے روکا۔ مشرق کا عظیم شاعر جب یہ کہتا ہے کہ

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ = اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

مکالمات فلاطون نہ لکھ سکی لیکن

اور

اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرار افلاطون

تو شاعری کو یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہوتی عورت کی امومت (Motherhood) اپنی تمام اخلاقی اور سماجی مضمرات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اور اس کے چہرہ سے تقدس مترشح ہے۔ لیکن اس مقدس لاہوتی ڈرامہ میں عورت کا مرغ تخیل اپنے پروں کو سمیٹ کر اپنے مغموم چہرہ کو آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے اپنی نا رسائی پر نوحہ خواں ہے نظم "پرواز" میں بانو کہتی ہیں

پرندو ـــ بے بسی کا احساس کیوں دلا رہے ہو = میں تمہاری طرح پرواز نہیں کر سکتی

نغمہ بلبل کی یونانی ناویل کی طرح بانو کے کلام کے دو زاویے ہیں۔ نظم "غلط فہمی" میں وہ کہتی ہیں :

میں دکھی راگ ہوں لوگ اُسے خوشی کا نغمہ سمجھتے ہیں

اب یہ الگ بات ہے کہ بقول اقبال

غم نہیں غم روح کا اک نغمہ خاموش ہے
جو سرودِ بربطِ ہستی سے ہم آغوش ہے

روح میں غم کا انجذاب جہاں قلب میں وسعت پیدا کرتا ہے وہیں ایک فنکار کے لیے محرک تخلیق ہو کر سرچشمۂ سرخوشی بھی ہو جاتا ہے میرے خیال میں بانو کا فن خواہ وہ شاعری ہو یا افسانہ، غزل ہو یا نظم یا آزاد نظم۔ اسی سوتے سے پھوٹتا نظر آتا ہے۔ اپنے اندر کے فنکار کو پالینا اپنے تئیں ایک نفسیاتی اور عام انسانی عمل بھی ہے۔ جس سے بھرپور شخصیت کے تانے بانے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ فنکارہ بانو کہتی ہیں۔ میں نے / "میں" کو پالیا۔ (ٹکراؤ)

یعنی۔ بخود گم۔ بہر تحقیقِ خودی شو انا الحق گو و صدّیق خودی شو (اقبال)

عربی سے واقفیت رکھنے والوں سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اقبال نے انا الحق کے روایتی معنیٰ میں ندرت پیدا کی ہے۔ بانو کے کلام میں اپنی فنکارانہ ذات یا خودی کی دریافت پر معلوم ہوا کہ اُس ذات کی تاسیس "عذابِ روح" پر ہے۔
"مہکتے ویرانے" میں کہتی ہیں۔

عذابِ روح سے اب کیا شکایت مری قسمت کا سرمایہ تو ہو گا

اور
یہی حاصل محبت یہی لازوال نعمت
مری آہِ جگگاہی مرا نالہ شبانہ (مہکتے ویرانے)

بمصداق "مدیونِ برقِ خرمن کا سبب ہے خونِ گرم دہقاں کا" بانو انسانی وجود کے تضادِ معنوی کو شدت سے محسوس کرتی ہیں۔

یہ میرا نام تھا جس نے کیا گھایل
مرا وجود ہی وجہ زوال میرا تھا (مہکتے ویرانے)

اسی مشرقی خاتون کی بے بسی کی فریاد ہے لیکن اس سے یہ مطلب اخذ نہیں ہو سکتا کہ طاہرہ کی شاعری اور افسانوں کی خاتون تحریکِ نسوانیت کی حریت یافتہ مغربی خاتون ہے۔ برخلاف اس کے ان کی شاعری اور افسانوں میں سار، فرما خاتون کے خد و خال مشرقی ہیں۔ وہ مغربی خاتون کی طرح اپنی ہی جنسی آزادی کے عقیدے میں صنفِ مخالف یا مرد کے جنسی استحصال کا شکار نہیں بلکہ اپنی مشرقی صفات اور روایات سے آراستہ یہ خاتون زندگی میں، معاشرہ میں اور فن میں ایک وسیع تر دائرہ کار چاہتی ہے جسے بانی نے اس کو دینے سے انکار کیا ہے۔

باطنی وجود کی گہرائیوں کی یہ تلاش دنیا کے رومانی ادب کی ایک بیّن خاصیت رہی ہے لیکن بانو کی رومانیت دو جنگہائے عظیم کے بعد کی رومانیت سے تعلق رکھتی ہے۔ جس میں حقیقت کا شعور رومانیت کو باطن سے کھینچ کر ظاہری ماحول میں مدغم کر دیتا ہے اور شکستہ پا رومانیت کو پائے استقلال مل جاتا ہے۔ اگر اپنے اسلوبِ بیان کو فنکار ایک معیار پر قائم رکھنے میں کامیاب ہو جائے تو یہ نئی رومانیت زندگی کے مزاج سے زیادہ میل کھاتی ہے۔ ویسے جدائی کا شدید احساس قدیم و جدید دونوں ہی کی رومانی شاعری میں جذبات کی اساس ہے۔ بانو اپنی انگریزی نظم Do I love You! میں قوسِ قزح اور بچے کے رشتہ کو علامت بنا کر واحد متکلم نظم میں استفہام کرتی ہیں

Does a Child Love Th rainbow?

Do I love you?

اس طرح اپنی انعام یافتہ نظم Stop Your Tears میں ندا اور جدائی کی رمزیہ علامتیں اس طرح تشکیل پاتی ہیں

Let's Sing a note of love from heart
Since Like The Spring We soon depart

مشاہدہ

دسمبر ۱۹۹۲

کیٹس کی Ode to Nightingale میں شباب کی یہ تصویر

Where youth grows pale and spectre-thin and dies

کے بعد اسی نظم میں شباب کی یہ تصویر کشی youth fades away like candle light

اپنے اندر ندرت رکھتی ہے۔ نسائیت اور جمالی کے تانے بانے سے بنا یہ رومانی تغزل بانو کے انگریزی اور اردو دونوں ہی زبانوں کے کلام میں نقطۂ ارتکاز ہے۔ لیکن ان دو رجحانات کو یکجا کرنے والا وہ والہانہ جذبۂ محبت ہے جو آج کے امریکہ میں خواتین شعرا کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے کلام کی طرح بانو کے کلام میں بھی ایک والہانہ اور بے باکانہ اعترافِ عشق confession جابجا موجود ہے۔ یہ عشق خدا سے والہانہ محبت جو "درد و سوزِ آرزومندی" کی متاعِ بے بہا اور "مقامِ بندگی" کی حد میں رہ کر حبّ اللہ کا ایک ایسا اظہار ہو جائے کہ

لا الٰہ گوئی بگو از روئے جاں   تا ز اندامِ تو آید بوئے جاں   (اقبال)

یہ دیدۂ عشقِ حقیقی جو فارسی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے بانو کے کلام میں جاری و ساری ہے

My joys consist in your worship alone
And [illegible] and weep at your feet
[illegible] careless deity!

بانو نے اپنی آواز کی فسوں کاری سے اپنے کلام میں ایک ایسا جہاں پیدا کیا ہے کہ بقولِ اقبال

دلِ وابستہ آفریدی چہ جہانِ دلکشائی   کہ ارم بہ چشم آید چہ طلسمِ سیمیائی

یہ بیان نامکمل ہوگا جب تک بانو کے نعتیہ کلام اور گلِ تر نچکاں کے اشعار کا ذکر نہ کیا جائے۔ یہ اشعار دل سے نکلے ہیں دل پر اثر کرتے ہیں ان کے تاثر کا اندازہ پڑھنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

حضرت امام حسین کے بارے میں لکھتی ہیں

مگر وہ تا دمِ آخر لڑا اندھیروں سے
چراغِ زیست نے بجھ کر بھی نور پھیلایا

جذبات میں ڈوب کر پڑھتی ہیں۔ جذبات کا تغیر آپ کے چہرہ سے عیاں رہتا اور سننے والا تڑپ اٹھتا ہے اور داد پہ داد دیئے جاتا ہے۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ اردو، فارسی، انگریزی تینوں زبانوں پہ ادیبانہ دسترس رکھتی ہیں مزاج میں شگفتہ رنگینی، ملنساری ہے، گفتگو میں متانت، اطوار میں شائستگی چال میں وقار اور بشرہ پر ذہانت جو ہر محفل کو گرما دیتا ہے۔

یہ مایۂ ناز خاتون، مایۂ ناز پھول جو محو پرواز ہے ہر نگاہ کا مرکز بنا ہوا ہے بانو آپا کو اردو ادب سے خاص لگاؤ ہے۔ بے پناہ محبت ہے اردو کی خدمت گزاری وہ عین سعادت سمجھتی ہیں۔ اسلیے آپ اردو کی ہر تقریب اور اجتماع میں باوجود مصروفیات دیگر دل کھول کر حصہ لیتی ہیں۔ آپ نے ایک درد مند دل پایا ہے۔ آپ کہتی ہیں کہ میں فطری طور پر حساس واقع ہوئی ہوں۔ زندگی کے تلخ اور خوشگوار واقعات سے گزری ہوں اسلیے شاید میری داخلی کیفیات نے ہی مجھے لکھنے پر اکسایا ہے ان کی شخصیت کی طرح ان کی شاعری ... اپنے احساسات، تجربات اور جذبات کو بھٹی میں جلاکر اپنے تخیل کی پرواز سے دل کی گہرائی سے اشعار لکھتی ہیں ۔

طاہرہ تلخیٔ دوراں کی شراب رنگیں
تیری غزلوں میں رچی ہے تجھے معلوم نہیں

بانو آپا کے دردمند دل میں کوئی خوابیدہ غم ہے جو پرورش پارہا ہے یا ایسی تمنا جو عدم تکمیل ہے یا پھر دل کی گہرائیوں میں چھپا ہوا کوئی گہرا راز ہے جو ناقابل تسخیر ہے کہتی ہیں ۔

کب تلک رنج دوراں سے غمگین گیت گا گا کر
شکایت طاہرہ اب ہم بھی کم کرنے والے ہیں

؎ کیوں طاہرہ بڑھتا گیا قسمت کا اندھیرا
روشن کئے سو بار دیئے آپ کی خاطر

؎ طاہرہ! آمد ہنگام مسیحا تو نہیں
درد بڑھ جاتا ہے کچھ اور بھی درماں کے قریب

؎ تمہارے لطف سے دل طاہرہ کا روتا ہے
غموں کو اور بھی اس کے بڑھا رہے ہو تم

بانو آپا زندگی کی حقیقتوں، تلخیوں سے فرار نہیں چاہتیں بلکہ غم و خوشی کہ اس گوہر نایاب کو اپنے سینے میں چھپائے رکھنا چاہتی ہیں جو ہر انسان کی زندگی میں ندرت کی دین ہے کہتی ہیں ؎

یہی کائنات میری ہے یہی میرا سہارا
مجھے زندگی سے بڑھ کر غم زندگی ہے پیارا

؎ مجھے اپنے تڑپنے کا ذرا بھی غم نہیں لیکن
کہیں ان کا بھی دل میرے لیے تڑپا تو کیا ہوگا

...ں کہتی ہیں ؎ جلائیں تو دہی شمعیں میں نے اور خود ہی بجھا ڈالیں
کہیں جب یاد مجھ کو میرا خواب نا تمام آیا

...جس کو کہتے ہیں ہم بہار و خزاں
...ہ تو ہے جیت ہار پھولوں کی

؎ یاد کیوں آتی ہے ایسے میں غم دوراں کی
تلخی زیست کی خون دل پر ارماں کی

...ندگی نے نہ بخشی کبھی زندگی
...بت بھی ہم سے آنکھیں چراتی رہی

محاذ پر جانے والے سپاہی کی بیوی پر گذرنے والی غم کی کیفیت کا اظہار۔

محاذ پر تم گئے ہو جب سے میں وہ نہیں ہوں جو تھی ہمیشہ
ہوں بیھری بیھری سی شیرنی اک یدل چکا ہے تمام نقشہ
محاذ سے فتح پاکر آؤ یہی دعا ہے ۔یہی لگن ہے
غموں سے گرچہ گھری ہوئی ہے تمہاری دلہن مگر مگن ہے

بانو آپا اپنی نظموں، غزلوں، قطعات اور افسانوں میں زندگی کو خوابوں کو یادوں کو اور غم سے معمور زندگی کو حاصل حیات سمجھتی ہیں۔ بانو آپا نے جن موضوعات طبع آزمائی کی ہے اور لکھی ہیں وہ ہیں۔ ہمارے اہم قومی مسائل قومی یک جہتی وطن کی عظمت و ناموس، دفاع وطن اور ہندوستان کے مشترکہ تہذیب و تمدن و روایات کے تمام پہلو پر لکھتی ہیں۔

طاہرہ زیور و زر لعل و گہر تن من دھن
ہند کی دلکش و آزاد فضاؤں پہ نثار

"آشیاں ہمارا" کی نظم "یوم آزادی" پر لکھتی ہیں۔

کون کہتا ہے ہو گئی تکمیل
جنگ آزادی اب بھی جاری ہے
یہ کلا طم یہ بھوک یہ افلاس
اپنے کندھوں پہ بوجھ بھاری ہے

کسی عجیب آدمی کے انتظار میں

وہ رہ گزر کہ جہاں سے کبھی وہ گذرے
وہیں پہ طاہرہ پھران کا انتظار

بانو آپا نظم اور غزل دونوں کو جس خوبصورتی اور کمالِ فن سے آراستہ کرتی ہیں یہ اُردو کے شعری ادب میں گراں قدر اضافہ ہے ۔ حالانکہ بانو آپا کی مادری زبان فارسی ہے لیکن ان کی تربیت اُردو کے ماحول میں ہوتی ہے اسلئے بانو آپا کو اردو زبان سے خاص لگاؤ ہے اُردو زبان سے محبت ہے بانو آپا نے نعتیہ کلام بھی لکھا ہے نعتیہ کلام کے مجموعہ کا نام ہے "ہدیۂ طاہرہ" لکھتی ہیں ؎

اے مدینے کی زمیں تیری بہاروں کو سلام
تیری گلیوں کو تیری راہ گزاروں کو سلام

جذب و کیف میں لکھتی ہیں ؎

گنبدِ خضراء تصور میں جو اُبھرا طاہرہ
پھیکا پھیکا سا نظر آیا مہِ کامل مجھے

اور پھر "گلِ خونچکاں" میں لکھتی ہیں ؎

شکستِ فاش اندھیرے کو دی اُجالے نے
یزید مر چکا لیکن حسینؑ زندہ ہے
مگر وہ تا دمِ آخر لڑا اندھیروں سے
چراغِ زیست نے بجھ کر بھی نور پھیلایا

بانو آپا نے افسانے بھی لکھا ہے جو دل کو چھو لینے والے اور حقیقت سے قریب تر ہوتے ہیں ۔ افسانے نگاروں میں الفاظ کا خوبصورت انداز میں استعمال اور جاذبیت بیان خاص اہمیت رکھتی ہے ۔ آپ کہتی ہیں کہ میرے افسانے ترقی مزاج ہے

آپ کئی مغربی ممالک کی سیاحت کر چکی ہیں لیکن آپ کہتی ہیں کہ ...

خالص مشرقی ہے میں نے مشرقی ملکوں کو قریب سے دیکھا ہے اور قدرتی طور پر مشرقی باتیں زیادہ آسانی سے سمجھ میں آتی ہیں میں کسی "ازم" سے مربوط نہیں ہوں صرف اپنی خوشی کے لیے لکھتی ہوں۔

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید مختلف ادبی تنظیموں کی رکن اور بانی ہیں۔ آپکے کلام میں نظموں میں، افسانوں میں غم گساری، شرافتِ نفس صداقت پسندی، ایثار و انکسار کی حقیقت پسندانہ تخلیقات ملتی ہیں غم دوراں کا ذکر ہو یا غم جاناں کا، عورت کی مظلومیت ہو یا دورِ حاضر کی تہذیبی تناظر، عورت کے اخلاقی، تہذیبی اور جذباتی مسائل کی اچھی تصویریں پیش کرتی ہیں۔ اپنی کہانیوں میں انہوں نے بے جوڑ شادیوں، عورت کی زبردستی اور مرد کے احساس برتری اور اسی طرح بعض سماجی ناہمواریوں کی طرف اشارے کئے ہیں۔ سماج کے پسماندہ طبقات سے ہمدردی، احترام آدمیت انسان دوستی اور بھائی چارگی کا جذبہ اپنی کہانیوں، افسانوں میں پیش کیا ہے۔ آپکے کہانیوں اور افسانوں میں کردار نگاری، رومانیت کی چاشنی، سیاسی، سماجی شعور کی کارفرمائی، انسانی جذبات کا ادراک اخلاق و حکمت کی مفید باتیں اور دردمندی کا جذبہ ملتا ہے۔ انسانی نفسیات کا تجربہ، ماحول کی عکاسی اور فنی لوازمات بانو آپا کی تحریروں کی تخلیقات کی بنیادی خصوصیت ہے مشرقی تہذیب کی علمبردار اور کردار کی خوبی سے خود ادیبہ آراستہ ہے۔ اعلیٰ انسانی قدروں کی حامل ہیں۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کو کئی ایوارڈز ان کی کتابوں پر مل چکے ہیں۔ ان کی اردو شاعری پر عثمانیہ یونیورسٹی کی طالبہ نے ایم فل کیا ہے عالمی اردو ایوارڈ (دہلی) مل چکا ہے یعنی انگریزی نظمیں کامن ویلتھ پوسٹ گریجویٹ کورس میں شامل ہیں۔ آپکی مطبوعہ کتابیں "خونِ جگر" (افسانوں کا مجموعہ) "پنچھی باورا" یہ بھی افسانوں کا مجموعہ ہیں دوسرے

مطبوعہ اردو کتابیں انگریزی اور فارسی میں بھی لکھے گئے ہیں۔ "برگِ سبز" (مجموعۂ کلام) "آشیاں ہمارا" (قومی نظمیں) "مہکتے ویرانے" (کلام) "سات دوست" (بچوں کا ادب) "گل عذ نچکاں" (نظمیں، واقعات کربلا)، "دو دلہ کر" (نثری نظمیں) "مثبت و منفی" (نامین کی انگریزی نظموں کا منظوم ترجمہ) "بیتھ دی باؤ" (انگریزی نظمیں) اریبا (اردو نظموں کا منظوم ترجمہ تلگو میں) "بانوئے مصر" (فارسی افسانے) "ڈیپلی روز" (انگریزی نظمیں) ہیں ان کتابوں پر وقتاً فوقتاً جو ایوارڈز ملے ہیں وہ یہ ہیں۔

عالمی اردو ایوارڈ (دہلی)، اعزازات آندھرا پردیش ہیں ساہتیہ اکیڈمی، منسٹری آف کلچرل افیرز، قومی یکجہتی، سکالر سرتی اور مخدوم امن ایوارڈ، بہار، مغربی بنگال اور اتر پردیش نے بھی ایوارڈز دیئے ہیں۔

اعزازاتِ بیرونِ ہند میں ایران، کیمرج، اٹلی اور عالمی ادبی ایوارڈ (امریکہ) ہیں۔ ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید کو جو ایوارڈ ملے ہیں یہ ان ہی کی فن کمال کا نتیجہ ہیں آپ کہتی ہیں کہ شاعر اور افسانہ نگار اگر عام لوگوں سے زیادہ حساس نہ ہو تو تخلیق کار نہیں بن سکتا ہے۔ فن کار کی تخلیق ملک و ملت بلکہ ساری انسانی برادری کی ملکیت ہوتی ہے۔ آپ کا علمی، ادبی ثقافتی زندگی کا سفر جاری ہے۔ اپنے ادبی خلوص کے باعث اپنا منفرد کردار و وقار قائم رکھے ہوئے ہے۔ اللہ پاک سے آخر میں یہ ہی دعا ہے کہ اللہ پاک بانو آپا یعنی ہماری محبوب شاعرہ، ادیبہ کو ہمیشہ باصحت و بامراد رکھے (آمین) اور ہمارے سر پر ان کا سایہ ہمیشہ قائم دائم رکھے (آمین)

آپ (بانو آپا) ہی کے ایک شعر پر اپنا مضمون ختم کرتی ہوں۔

— سناتے طاہرہ ہم داستانِ زندگی لیکن
کوئی گر سننے والا ہم مذاقِ وہم زباں ہوتا

جناب ہاشم علی اختر ○

بریگیڈیر جی ایم سعید

A SOLDIER AND A GENTLEMAN

ایک سپاہی اور ایک شائستہ آدمی

کل حیدرآباد کی ایک ممتاز شخصیت بریگیڈیر جی ایم سعید صاحب کے انتقال پر ملال کی خبر دیکھی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ چند دن قبل مجھے بریگیڈیر سعید مسلسل یاد آنے لگے حالانکہ کئی سال سے ان سے شخصی ملاقات نہیں ہوئی تھی میں نے محترمہ یا تو طاہرہ سعید کو ٹیلی فون کیا تو پتہ چلا کہ وہ علیل ہیں اور ڈاکٹر سلطان کے نرسنگ ہوم میں شریک ہیں میں نے اسی شام ان سے ملاقات کی میرے تصور میں وہ ایک بے حد فعال جامہ زیب اور متاثر کن شخصیت والے بیٹر فوجی آفیسر رہے ہیں جن کی حیدرآبادی خوش اخلاقی اور خلوص اور فوجی مستعدی اور شکوہ تر کمانی سے میں متاثر رہ چکا تھا اور اب نرسنگ ہوم میں اولین تنفس کی تکلیف میں مبتلا اور بات کرنے میں تکلیف کی حالت میں دیکھ کر بڑا دکھ ہوا اور چار پانچ دن بعد اخبار نے بتایا کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہے۔ میں ان کی موت کو حیدرآباد کے لیے ایک اور نقصان شمار کرتا ہوں۔ کوئی (۲۵) سال قبل بریگیڈیر سعید آندھرا سب ایریا کے انڈی پنڈنٹ سب ایریا

کمانڈر تھے اور میں چیف سکریٹری کے نائب معتمد کی حیثیت سے پولیٹیکل پروٹوکول سیول ڈیفنس اور مہمان نوازی کے محکموں کا انچارج تھا اور تمام اسٹیٹ فنکشنز جیسے آزادی اور یوم جمہوریہ کی پریڈز اور صدور اور وزراء اعظم جن میں دوسرے ممالک کے صدور وزرائے اعظم بھی شامل تھے ان کے سارے انتظامات کا حکومت کی طرف سے ذمہ دار اور اس طرح میری ان سے ملاقاتیں رہیں اور بعد میں ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر ذاتی حیثیت سے بھی قائم رہیں حیدرآباد میں دوسرے فوجی افسر بھی اس عہدے پر رہے ہیں لیکن جس طرح کہ پبلک ریلیشنز PUBLIC RELATION بریگیڈیر سعید نے رکھے تھے گورنر، چیف منسٹر اور دوسرے سینئر سیول عہدیداروں سے وہ شاید کسی اور کے نہیں تھے حکومت کی طرف سے مجھے ان سے اکثر ربط پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی تھی اور تحریری مراسلوں کے بغیر ٹیلی فون پر بہت سے کام ہوجاتے تھے تو اسی رتبہ کے دوسرے فوجی افسران کے ساتھ ممکن نہیں تھے ۔ دریائے کرشنا کی طغیانی میں جس ناگرجنا ساگر ڈیم کے نیچے ماچرلا کا پل بہہ گیا تھا میرے ٹیلی فون پر انہوں نے برق رفتاری سے ساتھ فوجی کمک بھیجنے کا انتظام کیا اور مجھے دن میں کئی دفعہ ٹیلی فون کر کے تازہ ترین حالت سے مطلع کرتے رہتے تھے اور میں اس کی خبر چیف منسٹر اور چیف سکریٹری کو دے دیا کرتا تھا اس کے برعکس فضائی فوج کے لوکل کمانڈر نے جس طرح سستی سے کام لیا اور ہر چیز کے لئے تحریری حکموں پر اصرار کیا اس کی شکایت حکومت ہند کو کی گئی اور اس کا یہاں سے تبادلہ کر دیا گیا بریگیڈیر سعید ایک سیدھے سادے فوجی تھے اور ان کی اہلیہ محترمہ بانو طاہرہ سعید صاحبہ شاعرہ ادیبہ ہیں فوجی افسروں کی بیویوں کو سوشیل اور فوجی خاندانوں کی دیکھ بھال کی بہت سی خدمات ہوتی ہیں اور یہ دونوں اپنے ماتحت فوجی افسروں اور سپاہیوں میں بے حد مقبول بریگیڈیر سعید بظاہر غیر شاعرانہ ہونے کے باوجود بیگم صاحبہ کی ادبی اور سماجی مصروفیات میں طرح دلچسپی لیتے تھے ۔ اور ان کی ہمت افزائی کرتے رہتے تھے برسوں کی اس محنت

پوری زندگی کے بعد محترمہ بانو طاہرہ سعید کے لیے ایک بڑا جانکاہ سانحہ گذرا ہے خدا انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ میں اس نذرانہ عقیدت کو بریگیڈیر سعید کی غیر معمولی ہمدردی اور برق رفتار کارکرد کے صرف ایک واقعہ پر ختم کرتا ہوں جس سے ان کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے

یہ اسی زمانے کا واقعہ ہے۔ جب وہ سب ایریا کمانڈر تھے ایک نوجوان طالب علم نے مجھ سے کہا کہ وہ فوج کے کسی امتحان میں شریک ہونا چاہتا ہے لیکن مقامی فوجی دفتر میں اس کے درخواست فارمس ختم ہو گئے ہیں اور آخری تاریخ میں صرف دو دن باقی ہیں میں نے بریگیڈیر صاحب کو ٹیلی فون کیا اور اس کے بعد ہر دس پندرہ منٹ کے بعد ان کا ایک فون آتا گیا جو مختصراً اس طرح تھا "میں نے دفتر سے معلوم کیا کہ وہ فارمس واقعی ختم ہو گئے ہیں" میں نے پونا سے دریافت کیا فارمس وہاں بھی ختم ہو گئے ہیں"۔

میں ابھی دلی سے بات کر کے بتاؤں گا۔

میں نے دہلی سے معلوم کیا فارمس وہاں ہیں لیکن اتنے مختصر عرصہ میں وہ کیسے آئیں گے اور یہ لڑکا کیسے درخواست دے گا۔

میں نے ایرفورس کمانڈر سے بات کی کل ایک فوجی ہوائی جہاز یہاں صبح نو بجے آئے گا"۔ کوشش کروں گا کہ وہ فارمس اس کے ذریعہ آجائیں۔ میں نے انتظام کر لیا ہے کہ فارمس ایرفورس کے پائلٹ تک پہنچا دیے جائیں گے۔

... وہ ہوائی جہاز (۹) بجے پہنچ گیا ہے اور میرے موٹر سیکل سوار نے فارمس حاصل کر لیے ہیں وہ کوئی بیس منٹ میں آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔

... غرض میری ایک معمولی خواہش کے لیے جس کا عام جواب یہ ہو سکتا تھا کہ "فارمس نہیں اس لڑکے سے کہیئے کہ وہ آئندہ سال کوشش کرے" بریگیڈیر سعید صاحب نے کوئی دو دن میں صرف کئے اور ایک ناممکن چیز کو ممکن کر دکھایا۔ افسوس یہ ہے کہ جن پر خود یہ ساری مصیبت انہوں نے اٹھائی ان کو فارمس دیکھنے کے بعد پتہ چلا کہ وہ درخواست دینے کے اہل

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید

ہدیۂ طاہرہ [۱۴۱]

(ہدیۂ طاہرہ" بانو کے نعتیہ کلام کا مجموعہ ہے، مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں ہدیہ کی بابت نصیر الدین ہاشمی مرحوم نے لکھا تھا "عطائے نعت کا تحفہ بے بہا" چند اشعار ہدیہ قارئین ہیں۔

○ ——— مدینے والے

غیر اللہ پہ کرتے ہیں بھرہ سہ افسوس
وہ جو تھے صاحب قرآن مدینے والے

تجھ کو معلوم نہیں ہنستی ہے دنیا ہم پر
تنگ عالم ہیں مسلمان مدینے والے

تو بنا دے تو بنے اپنی بھی بگڑی قسمت
تیرے صدقے تیرے قربان مدینے والے

○ ——— پیارا نبیؐ

سب رسولوں کی آنکھوں کا تارا نبیؐ
آگیا آگیا حق کا پیارا نبیؐ

کوئی مشکل نہیں ایسی جو حل نہ ہو
آپ کا چاہیئے بس اشارہ نبیؐ

میری جانب بھی ہو اک کرم کی نظر
آپؐ ہی کا ہے مجھ کو سہارا نبیؐ

تیرا جلوہ جو دیکھا تو بس چھٹ کر
ہو گیا چاند فوراً دوپارہ نبیؐ

طاہرہ درد فرقت سے بیتاب ہے
سوئے یثرب بلا لو خدارا نبیؐ

○ یا محمدؐ یا محمدؐ یا محمدؐ المدد

ہم گنہگاروں کی دعا [illegible]

○

جس کو توحید کی امانت دی اُس بُت بت شکن کی بات کرو
ذکرِ خیر نبیؐ عبادت ہے اُن کے قول و سخن کی بات کرو

○

ہوں اس اُمید پر زندہ کہ اک دن حاضری دوں گی
درِ دولت پہ بلواؤ ـــــ محمدؐ یا رسول اللہؐ

○

سرکار بلالو مجھے سرکار بُلالو دربار میں اپنے شہِ ابرار بُلالو
تم رحمتِ کُل میں ہوں گنہگار سراپا رحمت کی قسم احمدِ مختار بُلالو

○

نبیؐ حبیب خدا اور علیؓ حبیبِ نبیؐ علیؓ کی عزّت و حرمت کسی کو کیا معلوم
جو کُھلی آنکھ تو دیکھا جمالِ روئے نبیؐ علیؓ کی چشمِ بصیرت کسی کو کیا معلوم

قطعہ

تیری یاد آرہی ہے پیارے خواجہؒ
عجم کے لال اور بھارت کے راجہ
تصور پھر ترا تڑپا رہا ہے
مجھے بُلوالے پھر اجمیری خواجہ

○

سلسلہ صفحہ ۴۱

انہیں ہمدردانہ خصوصیات کی بنا پر شاید وہ واحد سب ایریا کمانڈر تھے جن کے نام سے گورنمنٹ
بریا نے ایک سڑک "بریگیڈیر سعید روڈ" ان کے نام سے موسوم کی۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھی مرحوم میں

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید

گلِ خونچکاں

("گلِ خونچکاں" شہیدِ اعظم حضرت امام حسینؑ کی خدمت میں بانو کا نذرانۂ عقیدت ہے اس کا ہر شعر بانو کے دل سے نکلا ہے اور دل پر اثر کرتا ہے۔ ہر شعر بے ساختہ سادہ اور سلیس ہے لیکن بے حد دلکش، اثر آفریں اور اثر انگیز۔ ان اشعار میں عام روش سے ہٹ کر حضرت امام حسین کو ظلمتوں اور تاریکیوں سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے والے دلیر، جری سرفروش مردِ مجاہد کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ چند اشعار پیش ہیں۔)

اے گلِ خونچکاں شہیدِ حسینؑ
موجِ خوں سر سے تیرے گزری ہے
ہے کرشمہ یہ خون کا تیرے
سرخرو ہے جو آج تک اسلام
اے گلِ خونچکاں۔ حیات افروز
سینکڑوں، لاکھوں بار تجھ پہ سلام

پڑی ہے جب بھی مصیبت حسین یاد آئے
غموں کی جب ہوئی شدّت حسین یاد آئے
تا پایا راہ میں جب کوئی سایہ دار درخت
ہوئی جو دھوپ کی حدّت حسین یاد آئے

○

شخصیت

وہ ایک موہنی، دل کش عظیم شخصیت
رہے گا نام ہمیشہ ہی اس کا تابندہ
بھلا وہ کس طرح باطل سے کرتا سمجھوتا
اُسے جو کرنا تھا کر گزرا عاشقوں کی طرح
خود اپنے خون سے لکھ ڈالی داستانِ حق
خوشی سے کر دیا قربان اپنی ہر شئے کو
حسین شمع ہدایت ہے۔ فخر انساں ہے
زمانہ بھر کو محبت ہے نام سے اس کے
سلام اس پہ ہزاروں سلام لاکھوں سلام

○

تھا کڑا امتحاں اس میں کچھ شک نہیں
معرکہ سر یہ کیسے کیا آپ نے
بھوک میں پیاس میں دھوپ میں ریت میں
کس طرح جنگ کی راہ کے ثابت قدم
دنگ تھی دیکھ کر فوجِ اہلِ ستم
آپ کا حوصلہ ۔ الاماں یا حسینؑ
آپ کا دبدبہ ۔ الاماں یا حسینؑ
الاماں ۔ الاماں ۔ الاماں یا حسینؑ

○

پندرھویں صدی ہجری کا
پہلا محرم

اس صدی کا ہے پہلا محرم
اہلِ اسلام کچھ کر دکھاؤ
واقعہ کربلا کا
یاد ہے محمدؐ کے پیارے
راہِ حق پر
کر گئے اپنی جانیں نچھاور
دینِ اسلام کو یوں بچایا
ان کی قربانیوں ہی کے باعث
زندہ باقی ہے اسلام اب تک
لیکن افسوس ملت کی حالت
ایک مدت سے بگڑی ہوئی ہے
باہمی تفرقے، نفرتیں ہیں
اب کہاں وہ اخوت کے چرچے
درس ہم نے نبیؐ کا بھلایا
اپنے ہاتھوں سے سب کچھ گنوایا
ہو چکے ہیں بہت سخت رسوا
اس صدی میں تو کچھ ہوش آئے
ایک ہو جائیں سارے مسلماں
کاش مل جائیں سارے مسلماں

مجاہد

اندھیری رات میں سورج کی طرح وہ ابھرا
جہاں جہاں سے وہ گذرا ہزاروں شمعیں جلیں
ہر ایک نقش قدم پھول تھا بہاراں کا
خود اپنے خون سے صحرا کو لالہ زار کیا
یزید رہ گیا ارماں میں ایک بیعت کے
نہ تخت و تاج نہ طاقت نہ ظلم و جور نہ خوف
کسی بھی شئے سے مجاہد نہ ہو سکا مرعوب
وہ ذوالفقار تھا، برقِ تپاں تھا، شعلہ تھا
کٹا کے سر کو سرفرازئ ابد پائی!!
سلام تجھ پہ مسیحا نفس، درود و سلام
سلام تجھ پہ حسینِ شہید لاکھوں سلام

کون؟

حسین کون؟ وہی فخرِ کائنات ہے جو
حسین کون؟ وہی فاتحِ حیات ہے جو
حسین کون؟ وہی جو لڑا اندھیروں سے
حسین کون؟ وہی جس نے نور پھیلایا

باقی صدا

ڈاکٹر بانو طاہرہ سعید

بچے اور سماج

بچوں کے بین الاقوامی سال ۱۹۷۹ء کے دوران بانو طاہرہ سعید نے ایک کہانی "سات دوست" کی صورت میں بچوں کو ایک انوکھا تحفہ دیا۔ جس میں جن، پریوں اور چرند پرند کی کہانیوں کی بجائے قومی یک جہتی اور انسانی برادری کی طرف بچوں کی توجہ موڑنے کے لیے ان کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات پیش کئے گئے ہیں اور نشہ کی برائیاں، بیماریوں سے بچاؤ، صفائی ستھرائی، تعلیم، فیملی پلاننگ، ورک سنٹر، غریبی ہٹاؤ اقدامات، کے ذریعہ سماج سدھار کی کوشش کی ہے اس کہانی کے آخر میں ایک نظم "بچے اور سماج" شریک کی گئی ہے یہ نظم ہدیۂ قارئین ہے۔

ہے تندرست سا بچہ بھی کس قدر دلکش
چمکتی آنکھیں، دمکتا ہوا رُخِ معصوم
کبھی خفا تو کبھی شاد اپنی مرضی سے
ہر ایک شئے کا تجسس ہر اک سے دلچسپی
عجب عجب سے سوالات، عجب عجب سی اذیاں
نہ بھید بھاؤ ہے دل میں نہ مصلحت کوشی
نہ پوچھو کون سی دنیا کا ہے یہ باشندہ
ہر ایک قوم کا، ملت کا ہے یہ سرمایہ
اسی کے دم سے ہے مستقبلِ بشر کی امید

اسے اگر نہ ملے تندرستی۔ کیا ہوگا
ملے نہ اس کو مناسب غذا تو کیا ہوگا
اگر یہ پیار سے محروم ہو تو کیا ہوگا
اسے نصیب نہ تعلیم ہو تو کیا ہوگا
غلط ملے اسے ماحول گر تو کیا ہوگا
سماج پر نہیں ذمّہ تو کس پہ ذمّہ ہے
یہ بے گناہ یہ معصوم عمر بھر کے لیے
رہِ حیات کی تاریکیوں میں کھو جائے
سماج گر نہیں مجرم تو کون ہے مجرم؟
نہیں سماج پہ ذمّہ تو کس پہ ذمّہ ہے

سلسلہ ص ۶۴

حُسین۔ جس کا لقب سیدِ شہیداں ہے
حُسین۔ نام پہ تاریخ میں جس کے نازاں ہے
حُسین۔ پیار کا اوتار۔ امن کی مورت
حُسین۔ جرأت و ہمت کا ایک افسانہ

حُسین جس نے دیا راہِ حق نے سر اپنا
حُسین جس نے کیا سرفراز انساں کو
غرور توڑ دیا جس نے نقشِ باطل کا
حُسین کون؟ وہی جانِ بوتراب ہے جو
جگا کے سارے زمانے کو محوِ خواب ہے جو

ہماری ادبی سرگرمیاں

مومن خاں شوق
اشرف ولا 11-3-723
ملے پلی حیدرآباد-۱

۱۶ر اکٹوبر اُردو مجلس کی جانب سے اردو ہال میں صحافی جناب حمیدالدین محمود کے
کے انٹرویو کا اہتمام کیا گیا تھا جناب مسعودین سالم کارگزار صدر اُردو اکیڈیمی آندھراپردیش نے
تقریب کی صدارت کی جناب حمیدالدین محمود نے کہا کہ اُردو ہندوستان میں پھیلی جارہی ہے
جو اس کی جنم بھومی ہے اُردو مغربی ممالک میں عوام کی زبان بنتی جارہی ہے مغربی ممالک کے
کالجوں میں پڑھائی جاتی تھی اب اسکولوں میں بھی پڑھائی جارہی ہے مختلف سوالات کے
جواب میں معزز مہمان نے کہا کہ ادب سے ہٹ کر مسلمانوں کو سائنس اور ٹکنالوجی کی طرف توجہ
دینا چاہیئے انہوں نے کہا کہ اُردو شاعری بین الاقوامی حیثیت سے ربط کا مکمل اور بہترین ذریعہ
ہے۔ چنانچہ میں خود بھی اپنی تقریروں اور تحریروں میں اشعار کا استعمال کرتا ہوں۔ جناب
حمیدالدین محمود نے اُردو کلچرل میں مشاعرہ کو مصنوعی قرار دیا جبکہ صدر اُردو مجلس جناب رحمٰن جامی
نے اپنی تعارفی تقریر میں کہا کہ معزز مہمان جناب حمیدالدین محمود اردو شاعری سے نہ صرف متاثر
ہیں بلکہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں اشعار کا برجستہ استعمال کرتے ہیں۔ حمیدالدین محمود نے
مسلمانوں کو اپنی مرعوب ذہنیت فی الفور ختم کردینا چاہیئے اسلئے کہ یہ ذہنیت ہندوستان کی

مختلف سیاسی پارٹیوں کی پیدا کردہ ہے تاکہ مسلمانوں کو مرعوب اور محروم رکھ کر ان کے
ووٹ کا استحصال کیا جا سکے اُردو کے تعلق سے مختلف سوالات کا جواب دیتے ہوتے معزز
مہمان نے فرمایا کہ اُردو والوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے گھروں میں خود اُردو پڑھائیں ۔
اردو کو زندہ رکھنے کا بھی ایک اہم اور موثر طریقہ ہے اسکولوں اور حکومت کے ذرائع پر انحصار
ہرگز نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر ہندوستان میں ہر اُردو بولنے والا، زبان اور کلچر کو زندہ رکھنا
چاہتا ہے تو وہ اپنے طور پر اس کا اہتمام کرے۔ بازاروں میں سائن بورڈ پر لازمی طور پر
اُردو لکھوانے پر توجہ دلائی جانی چاہیئے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار
لائیں اور اپنی اہمیت کو منوائیں۔ حکومت پر انحصار کرنے کی پالیسی یک لخت ترک کر دیں۔
زبان دانی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہر مسلمان کو اپنے علاقہ
کی زبان لازمی طور پر سیکھنا چاہیئے۔ تلنگانہ کے مسلمان تلنگی، کرناٹک کے مسلمان کنڑی
اسی طرح جہاں جہاں مسلمان ہے اپنی علاقائی زبان لازمی طور پر سیکھے۔ جناب شجاعت علی شجیع
(آل انڈیا ریڈیو) نے انٹرویو لیا۔ سامعین کی جانب سے بھی سوالات کئے گئے۔ آخر میں معتمد اردو مجلس
جناب قدیر انصاری کے شکریہ اور جناب رحمن جامی کے فی البدیہہ شعر پر یہ محفل اختتام کو پہونچی۔

۱۹ر اکتوبر۔ نیشنل اکیڈیمی آف فائن آرٹس اینڈ فلم کی جانب سے "کل رات" ایک
شام قلی قطب شاہ کے نام" کے زیر عنوان تمثیل دکنی قطب شاہی شاعرہ اور پیلے رقص شہر
حیدرآباد کے ۴ سو سالہ تقاریب کے سلسلہ میں رویندرا بھارتی میں پیش کیا گیا۔ ریاستی وزیر
پنچایت راج شری سمر سمہا ریڈی نے کہا کہ قطب شاہی دور نے دکن میں مشترکہ تہذیب کی
داغ بیل ڈالی اور قومی یکجہتی کو پروان چڑھایا۔ جناب تجمل حسین نے اپنی صدارتی تقریر میں
پروگرام کی ترتیب اور تیاری کے سلسلے میں منتظمین تقریب کی شبانہ روز جدوجہد کی ستائش
کرتے ہوئے کہا کہ اس نوعیت کی تقاریب قومی یکجہتی کی فضا کو پروان چڑھانے میں مدد

ثابت ہوتی ہیں۔ ابتدا میں صدر اکیڈیمی ڈاکٹر غلام عباس خاں اور نائب صدر جناب ایس اے خاں نے خیر مقدم کیا۔ ٹھاکر ہردے ناتھ سنگھ صدر نشین اقل ترین اجرت بورڈ۔ شیخ بدرالدین ڈپٹی منیجر مارکٹنگ حیدرآباد "ملنگ کمپنی" الطاف حسین جنیدی اور دوسروں نے بھی اپنی تقریر میں حیدرآباد کی اس تہذیب کو سارے ملک کے لیے نمونہ بنا کر پیش کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس پروگرام کے رائٹر و ڈائرکٹر اعظم شفیق نے کارروائی چلائی۔ مشاعرہ میں تاآزاد خاں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ خان اطہر اور دوسرے فنکاروں نے بھی ساز کے ساتھ کلام سنایا۔

۲۰/ اکتوبر سنٹرل یونیورسٹی کی رضاکارانہ تنظیم وگیان ویدیکا کے زیر اہتمام پہلا ہمہ لسانی مشاعرہ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر رحمت یوسف زئی صدر ویدیکا نے استقبال کیا اور سکریٹری جی ایل این مورتی نے رپورٹ پیش کی۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر بی ایچ کرشنا مورتی نے مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹی میں مشاعرے ماحول کو خوشگوار بنانے اور طلبا میں ادبی ذوق پیدا کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں انہوں نے اردو مشاعروں کی کامیابی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو مشاعروں میں سامعین ٹکٹ کے ذریعہ داخلے کر رات بھر شاعری سے لطف اندوز ہوتے ہیں آڈیٹوریم سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا مگر سامعین میں اردو اور ہندی شعبوں کے لکچررس اور طلبہ کی غیر موجودگی کھٹک رہی تھی۔ ہمہ لسانی شاعرے میں ہندی، اردو، تلگو، کنڑی، اور انگریزی کے شعرا نے کلام سنایا۔ مسٹر ہی اسنگھ ورما نے معتمد کے فرائض انجام دیے۔ مشاعرے میں جن شعرا نے کلام سنایا ان قابل ذکر ہیں اردو کے مسز علی احمد جلیلی، صلاح الدین نیر، رحمٰن جامی، رحمت یوسف زئی، مسز ڈاکٹر اندو وششت، اپیل سنگھ ورما، زیندر رائے، سرادھین تلگو کے مسز نورتن رما۔ ترملی کرنسے یلی زبان، بجلا ھکی، انجلیشور، انگریزی کا شرمیلا اندا مرجی کا کرامی ایس نندا نکے علاوہ طلبہ شعرا مسٹر رام مرتیونجے، پرتاپ جیتا، اچی مرضا۔

چندر کانت پاٹل نے بھی کلام سنایا۔ شری کیشوراؤ جوائینٹ سکریٹری کے شکریہ پر شاعرہ کا اختتام ہوا۔

۱۲ر اکتوبر، انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس مسٹر رحمٰن جامی کی صدارت میں ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا۔ جناب صادق نوید نے "دو قطعات ۵، غزلیں اور ایک نظم تبصرہ کے لئے پیش کی۔ محترمہ قمر جمالی نے کھنڈر کے زیر عنوان افسانہ پیش کیا۔ جناب ذکی شاداب نے کہا کہ صادق نوید ارتقائی منزل کی طرف گامزن ہیں ان کے کلام میں پختگی ہے افسانہ کے تعلق سے انہوں نے کہا کہ افسانہ ہمارے معاشرہ پر بھرپور طنز ہے جناب رئیسہ اختر نے کہا کہ کسی بھی فنکار کو اپنی تخلیق عوام تک پہنچانا چاہیئے۔ جناب محمد نشتر نے کہا کہ صادق نوید کے کلام میں عصری حسیت جھلکتی ہے۔ محترمہ قمر جمالی کے افسانہ پر انہوں نے کہا کہ کہانی کا انجام پُر اثر ہے۔ جناب وسیم عباس نے کہا کہ کہانی عمدہ ہے۔ جناب اکمل حیدرآبادی نے کہا کہ صادق نوید تین دہوں سے شعر کہہ رہے ہیں ان کا مطالعہ گہرا اور وسیع ہے۔ جناب رحمت کوثر نے کہا کہ صادق نوید کو شاعری ورثہ میں ملی ہے۔ جناب صلاح الدین نیر نے کہا کہ صادق نوید ایک زمانہ سے شعر کہہ رہے ہیں۔ تراکیب اور الفاظ کے انتخاب میں کافی احتیاط روا رکھتے ہیں۔ جناب قمرالدین صابری نے کہا کہ افسانہ میں پُر اثر مکالمے ہیں۔ قمر جمالی تجربہ کار افسانہ نگار ہیں۔ جناب محمود حامد نے کہا کہ یہ ایک علامتی کہانی ہے۔ جناب بشیرالدین احمد اور جناب گیان سنگھ شاطر نے کہا کہ افسانہ اچھا تھا کہانیوں کو عام فہم ہونا چاہیئے۔ جناب عاشق شاہ نے کہا کہ یہ افسانہ زمینداری نظام اور سماج پر طنز ہے۔ جناب رحمٰن جامی صدر جلسہ نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ صادق نوید کہنہ مشق شاعر ہیں۔ قمر جمالی کے افسانہ کے تعلق سے انہوں نے کہا کہ موضوع پرانا ہے آج کل گاؤں بھی ترقی یافتہ ہو گئے ہیں انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کو مبارکباد دی۔ جناب صادق نوید اور محترمہ قمر جمالی نے مبصرین کے

تشفی بخش جوابات دیے۔ جناب صلاح الدین نیر نے جلسہ کی کارروائی چلائی۔

۲۴ر اکتوبر ۱۹۹۲ء لٹریری فورم دحلف کا اپنا اجلاس جمعہ سات بجے شام ہسٹری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا قمر جمال اور غلام جیلانی نے افسانے پیش کئے غیاث متین نے صدارت کی قمر جمال نے اپنا افسانہ "صنم" سنانے سے قبل کہا کہ یہ افسانہ انہوں نے مونولاگ کے طرز پر لکھا ہے اور ایک تجربہ کرنے کی کوشش کی ہے افسانہ پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر بیگ احساس نے کہا کہ یہ کہانی قمر جمال کی دوسری کہانیوں سے مختلف ہے یہ ایک خود کلامیہ ہے جس میں کہانی کی "دو سطحیں" نظر آتی ہیں ایک سطح پر تو یہ عشق کی ناکامی کی سیدھی سادھی کہانی ہے دوسری سطح پر اگر فلسفیانہ انداز میں غور کریں تو یہ کہانی زمین کی روداد ہے۔ جسے وقت ستا رہا ہے لیکن اس طرح بات بنتی نظر نہیں آتی انہوں نے قرۃ العین حیدر کے حوالے سے کہا کہ بعض تخلیقی اظہار ایسا ہوتا ہے جسے کسی خاص صنف کے آئینے میں دیکھنا ممکن نہیں ہوتا یہ ایسی ہی ایک تخلیق ہے انہوں نے زبان کی بعض کمزوریوں کی جانب اشارہ کیا پروفیسر مغنی تبسم نے کہا کہ قمر جمال نے ایک جست لگائی ہے ایک قطب سے نکل کر دوسرے قطب تک پہنچ گئے ہیں انہوں نے بیانیہ سے نکل کر تجرید اور علامت تک چھلانگ لگائی ہے یہ ایک خوش آئند بات ہے اس افسانے کی تکنیک عمدہ ہے اور سب سے قابل توجہ پہلو اس کا گریز ہے مجموعی طور پر یہ کہانی اظہار، لہجے اور ایمائیت سے متاثر کرتی ہے۔

مغنی تبسم نے بھی زبان کی دو ایک غلطیوں کی جانب اشارہ کیا قدیر زماں نے کہا کہ کہانی کی کوئی سمت نہیں یہ تکنیک نہ شعور کی رو ہے نہ سرریلزم، مونولاگ میں بھی اپنی ذات سے گفتگو ہوتی ہے جبکہ یہاں دوسرا کردار بھی ہے زبان خوبصورت اور مکالمے جاندار ہیں غلام جیلانی نے کہا اس کہانی کی تکنیک میں بڑی تازگی ہے اسے ویڈیو تکنیک بھی کہہ سکتا ہے جس میں جو شخص سن رہا ہے اس کی پوزیشن کیمرے کی طرف ہے۔ یہ کہانی ایک

کردار کی واردات غم ہے جو آگے جاکر زمانے کا دہ دین جاتا ہے۔ لشارت علی بشارت نے مونو لاگ تکنک پر تفصیلی بحث کی اور کہا کہ یہ کہانی تو انٹرنل مونو لاگ ہے اور نہ ڈرامیٹک مونو لاگ ہے بلکہ ہم اسے بیانیہ مونو لاگ کہیں گے اس میں بیان کرنے والے کا کردار تو ابھرتا ہے لیکن سننے والے کا کردار تو ابھرتا ہی نہیں جب کہ اس کردار کو ابھرنا چاہیئے کہانی کی کمزوری اس کا چاہتے ہیں قبول کرے یہ مشکل ہے افسانے کا عنوان اس کی تکنک کے اعتبار سے نامناسب لگتا ہے غلام جیلانی کے افسانے کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اس موضوع کے لئے سب سے بہتر تکنک داستانی ہی ہوسکتی ہے غلام جیلانی نے ایک مخصوص ڈکشن کو محفوظ کرنے کی قابل تعریف کوشش کی ہے اس افسانے میں صورت سیرت' اور آرسی کی تثلیث ہے آخر میں آرسی پھینکنے کے بجائے اسے سیقل کرنے کی بات کی جاتی تو زیادہ بہتر ہوتا ڈاکٹر بیگ احساس نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

۲۵ر اکتوبر ۹۲ء ہمارا سماج قلمکاروں کے لیے ایک ایسا آئیڈیل بن گیا ہے جس پر ہر رخ سے وار کیا جاسکتا ہے۔ ادارہ عصری ادب میں جناب عوض سعید کی کہانی "کوہ ندا" بھی سنی گئی اور محترمہ نجمہ نکہت کا فکر انگیز افسانہ بھی۔ افسانے دو طرح کے ہیں ایک تو اپنے آپ کی کھوج" جس میں کردار کی اس طرح تصویر کشی کی جائے کہ فرد کی اندرونی کیفیات کا اظہار علامتی انداز میں ہو آجکل کہانی یا افسانوں میں حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ فنی طور پر نئے نئے تجربے کئے جارہے ہیں جناب عوض سعید کی کہانی ایسی ہی کامیاب علامتی کہانی ہے۔ صدر اجلاس پروفیسر سراج الدین نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ حیدرآباد میں ایک عرصے سے خواتین افسانے لکھتی رہی ہیں پہلے وہ اپنی مظلومیت کے خلاف آواز بلند کرتی تھیں لیکن آج وہ اپنے آپ کو منوانے پر مائل ہیں۔ افسانہ ایک بھرپور صنف انسانی جسم کی طرح اسکے اعضا بھی ہیں۔ اور جسم بھی۔ لکھنے والوں کا مشاہدہ جتنا عم

اور اس کی صلاحیت جتنی عمدہ ہوگی وہ اتنا ہی عمدہ افسانہ لکھ سکے گا انگریزی زبان کے افسانوں سے اردو افسانوں کا تقابل کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو کے اکثر افسانوں کا المیہ یہ ہے کہ اس کے جسم میں رنگ بھرا نہیں جاتا زیادہ تر ادیب افسانہ لکھتے لکھتے فلسفیانہ مکالموں کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ مہمان خصوصی پروفیسر مغنی تبسم نے کہا کہ ادبی اجلاس میں کہانی، افسانہ اور خاکہ تینوں شامل تھے اس کے باوجود ہر تخلیق دلچسپی سے سنی جاتی رہی اور داد پاتی رہی ابتدا، جناب صادق نوید صدر ادارہ عصری ادب نے تعارفی اور خیر مقدمی تقریر کی۔ ادبی اجلاس کے بعد مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا۔ صدر اجلاس وہ شاعرہ پروفیسر سراج الدین اور مہمان خصوصی پروفیسر مغنی تبسم کے علاوہ محترمہ نایاب سلطانہ، مسرت اثر عمری، صادق نوید، اکمل حیدرآبادی، عزیز بھارتی، بنیال سنگھ ورما محسن جلگانوی، شفیع اقبال، منظور احمد منظور، رحمت کوثر، منان منظور، محمود نشتر، قمرالدین صابری، ذاکر حسن، مظفر علی عدیم اور محمود حامد نے کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی پروفیسر سراج الدین نے صدارتی کلام سے پہلے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ مجھے کسی اور محفل میں اتنے عمدہ شعر سخن کو نہیں ملے اس مشاعرے میں شریک تمام شعرا نے بہت اچھے اور خوبصورت شعر سنائے۔ جناب شفیع اقبال معتمد عمومی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے جناب محمود نشتر کے شکریے پر اس کامیاب محفل کا اختتام عمل میں آیا۔

ادارہ ادب اسلامی حیدرآباد کا ماہانہ مشاعرہ ۲۵ اکتوبر کو دفتر بازار میں ممتاز شاعر جناب رحمٰن جامی کی صدارت میں منعقد ہوا تلاوت و ترجمانی کے بعد جناب عابد قادری، مسعود جاوید ہاشمی اور ابوالفاروق شعور کے نعتیہ کلام سے مشاعرہ کا آغاز ہوا، ابوالفاروق شعور نے نظامت کے فرائض انجام دیئے صدر مشاعرہ کے علاوہ مسرس ذاکرہ علی، احمد جلیل، [illegible]

سید نظیر علی عدیل، راحت عزمی، داؤد نصیب، ابراہیم حامی، تیسیر بیا باقی، محمد بن جنید، نقیب، نذیر بشر، یوسف نظر، جری القادری، فیض الحسن خیال، مسعود جاوید ہاشمی، محمود شریف محمود، خواجہ منیر، سرفراز سحر، دلاور خرم، حلیم رعنا، رؤف رحیم، باسط تقوی، قدیر انصاری، رشید شہیدی، بے حس الہ آبادی، ساقی الیوبی، عزیز ناگپوری، اعظم خان اعظم، محی الدین مظہر، شاہد عدیلی، احمد شمس، محبوب علی منظر، ڈاکٹر سید حسن، مقبول ہما آبادی، باسط حیدرآبادی، نسیم اعجاز نسیم، امجد حیدرآبادی اور عزت ابرار نے کلام سنا کر داد پائی۔ صدر مشاعرہ کو "تحفتاً" ماہر القادری کے تبصرے" کتاب نذر کی گئی۔ صدر مشاعرہ نے کلام سنانے سے قبل کہا کہ اردو مشاعرے معنوی ہیں مسلم کلچر کی بنیاد ہیں شعر کی طاقت سے جو انکار کرتا ہے وہ اپنے وجود سے انکار کرتا ہے انہوں نے نئی نسل کو اردو پڑھانے کی جانب توجہ دلائی۔ جناب محمود شریف محمود کے شکریہ پر مشاعرہ اختتام کو پہنچا۔

۲۶ ر اکتوبر ۱۹۹۲ء تمام اصناف سخن میں رباعی کا فن منفرد حیثیت کا حامل ہے رباعی کا کہنا ہر ایک شاعر کے لیے آسان نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جو ریاضت چاہتا ہے اردو شعری ادب میں رباعی گو شعرا کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ حیدرآباد کے رباعی گو شعرا میں امجد حیدرآبادی، جذب عالم پوری، الہام سکینہ اور حضرت قدر عریضی کے نام اہم ہیں۔ راشد آذر ایک بہترین نظم نگار، غزل گو شاعر ہیں لیکن انہوں نے رباعیات بہت ہی محدود کہی ہیں ویسے تو رباعیات کے مختلف موضوعات ہیں لیکن راشد آذر کی عاشقانہ رباعیات زیادہ متاثر کرتی ہیں ان خیالات کا اظہار پروفیسر مغنی تبسم نے جناب راشد آذر کی رباعیات کے مجموعہ " منزل شوق" کی رسم رونمائی تقریب میں کیا جو زیر اہتمام ادارہ شعر و حکمت بہ مقام مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوئی تھی۔ اس تقریب کی صدارت جناب امیر احمد خسرو نے کی اور رسم رونمائی انجام دی جناب امیر احمد خسرو نے منظوم تاثرات پیش کئے ابتدا میں معتمد عمومی ادارہ شعر و

جناب صلاح الدین نیر نے خیر مقدمی تعارفی تقریر میں کہا کہ جناب راشد آزر کے تا حال ۵ مجموعہ کلام شائع ہو چکے ہیں۔ "منزل شوق" صرف رباعیات کا مجموعہ ہے۔ جناب راشد آزر کی نثری تصنیف "میر کی غزل گوئی" ایک جائزہ بھی شائع ہو چکی ہے۔ جناب نقی بلگرامی نے ادارہ کی جانب سے راشد آزر کی گلپوشی کی۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلی نے رباعی کے خد و خال پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ راشد آزر کی رباعیات میں پہلی بات جو ہمیں متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی رباعیوں میں پورے ۲۴ اوزان استعمال کئے ہیں۔ بیشتر شعرا زیادہ تر دو چار اوزان کے اطراف ہی گھومتے ہیں۔ ان کی رباعیوں کے مصرعے رواں دواں اور تعقید سے پاک ہیں۔ میں راشد آزر کا ایک بہترین رباعی گو شاعر کی حیثیت سے بھی خیر مقدم کرتا ہوں۔ جناب رحمٰن جامی نے اپنے طویل مضمون میں راشد آزر کے فن اور شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالی۔ جناب راشد آزر نے اظہار تشکر کے مرحلہ پر کہا کہ "منزل شوق" کی اشاعت کے تمام مرحلوں کو صلاح الدین نیر نے آسان تر بنا دیا اور جب میں امریکہ سے لوٹا تو "منزل شوق" کتابی شکل اختیار کر چکی تھی اس اجلاس میں دانشوروں شاعروں، ادیبوں کی شرکت میرے لیے باعث ممنونیت ہے۔

شرکائے محفل میں جناب سید ہاشم علی اختر سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، یوسف حسین اور ڈاکٹر سید عبدالمنان بھی قابل ذکر ہیں۔ معتمد ادارہ شعر و حکمت و محفل جناب صلاح الدین نیر نے کاروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔

۲۸ اکتوبر۔ مشہور و ممتاز عوامی شاعر حضرت سید شاہ نیر الدین بسمل ابوالعلائی غزل "کشکول میں سورج" کی حضرت مولانا الحاج شاہ غلام داؤد صاحب بالرسم اجرا عمل میں آئی۔ حضرت بسمل کا شمار مقبول ترین نعت گو شعرا میں ہوتا نعتیہ کلام کا ایک مجموعہ "پلکوں کی دستک" اور منتخب کلام کا ایک مجموعہ ہے۔ "پچھلے دنوں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں [illegible]

"کشکول میں سورج" میں کوئی 300 غیر مطبوعہ منتخب غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ 300 صفحات پر مشتمل بڑی سائز کی اس خوبصورت کتاب کو توقع ہے کہ حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں قدر و منزلت حاصل ہو گی۔ رسم اجرا کی تقریب میں ڈاکٹر عقیل ہاشمی ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ نے اپنی تقریر میں حضرت بسمل کے فن و شخصیت پر گہری روشنی ڈالی اور کہا کہ حضرت بسمل حمد و نعت، سلام اور منقبت ہی کے شاعر نہیں بلکہ وہ ایک کہنہ مشق غزل گو شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں "کشکول میں سورج" اس بات کا ثبوت ہے۔ انہیں قصیدہ، قطعات، مثنوی رباعیات اور دیگر اصناف شاعری پر بھی کامل عبور حاصل ہے جناب احمد معین الدین بزمی نے منظوم خراج تہنیت پیش کیا۔ جناب شفیع محمد نے بسمل کی ایک نعت پڑھی جلسہ کا آغاز حضرت مولانا محمد عبداللہ قریشی الازہری خطیب و امام مکہ مسجد کی قرآت کلام پاک سے ہوا۔ پروفیسر محمد احمد صدر شعبہ جغرافیہ جامعہ عثمانیہ نے شکریہ ادا کیا۔ بعد ازاں ساز پر کلام تہنیت پیش کیا گیا رات دیر گئے محفل اختتام کو پہونچی۔

۳۰/ اکتوبر ۹۲ء کہاں گئے وہ لوگ جو اپنی نرم گفتاری۔ متانت سنجیدگی اور شائستگی کو اپنا وسیلہ اظہار سمجھتے ہوئے سرکاری کاموں میں تعاون کرتے ہوئے حکومت کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ عہدہ داروں اور ماتحتین میں ایک غیر مرئی فاصلے کے باوجود قربت کا احساس ہوتا تھا۔ ان خیالات کا اظہار سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے سالانہ مشاعرہ میں جناب سید ہاشم علی اختر سابق وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ و مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اپنی صدارتی تقریر میں کیا۔ جو مولانا ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا جس میں مسرز غلام دستگیر قریشی (آئی اے ایس) ڈاکٹر موہن لال کم سابق ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم جناب صادق احمد سابق جوائنٹ سکریٹری ٹرانسپورٹ روڈ اینڈ بلڈنگ ڈپارٹمنٹ نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ جناب سید ہاشم علی اختر نے سکریٹریٹ کے علاوہ جامعہ عثمانیہ اور

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے کچھ واقعات کو مختلف شعراء کے اشعار کے ذریعہ پیش کیا۔ سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن سرگرمیوں کی ستائش کی۔ ابتدا میں سکریٹری سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن جناب صلاح الدین نیر نے خیر مقدمی و تعارفی تقریر میں کہا کہ گذشتہ زائد از 23 سال سے سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن بغیر کسی رکنیت فیس کے کام کر رہی ہے۔ صدر اسوسی ایشن جناب تراب الحسن (آئی اے ایس) نے کہا کہ بانی اسوسی ایشن جنرل سکریٹری جناب صلاح الدین نیر نے اپنی کارکردگی اور صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے اردو اسوسی ایشن کی سرگرمیوں کو فعال رکھا ہے۔ جناب صادق احمد نے کہا کہ میں تقریباً 5 سال تک سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کا صدر رہا۔ جناب غلام دستگیر قریشی نے دوران مطلب انگریزی کے مشہور شاعر لارڈ بائرن کی نظم اور جناب مظہر علی کا منظوم ترجمہ سنا کر داد تحسین حاصل کی۔ جناب خواجہ معین الدین نے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں بھی اسوسی ایشن کے قیام کے زمانے سے اسوسی ایشن سے وابستہ ہوں۔ ڈاکٹر موہن لال نگم نے کہا کہ اردو زبان ایسی زبان کا ایک خوشگوار اور لازوال حصہ ہے۔ نثری اجلاس کے مشاعرہ میں مسرز سعید شہیدی، امیر احمد خسرو، ڈاکٹر موہن لال نگم۔ راشد آزاد، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، اہلپال سنگھ ورما، ڈاکٹر صادق نقوی، فیض الحسن خیال، صادق نوید، عزیز صادق، قاضی انجم عارفی، حسن فرخ، مسان منظور، موہن خان شوق، منظور احمد منظور، نیان سنگھ شاطر، شفیع اقبال، اثر غوری، ڈاکٹر منیر الزماں منیر، مخدوم حسین کے علاوہ دیگر شعراء، مسرز قدیر انصاری، رشید شہیدی، محمد علی وفا، تجمل اظہر، الطاف صمدانی غاصر روشن، فاروق عارفی اور نسیم اعجاز نسیم نے کلام سنایا۔ مسرز منیر الزماں منیر اور شکیل احمد اور سلیم نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس ۱۶ر نومبر کو ۶-۳۰ بجے شام ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ

میں زیر صدارت جناب رئیس اختر منعقد ہوا۔ جناب گیان سنگھ شاطر نے "گیان سنگھ شاطر۔ ایک جائزہ" کے زیر عنوان اپنی خود نوشت سوانح کا ایک حصہ سنایا۔ جس میں انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کے نشیب و فراز کی دشواریوں، آسائشوں اور اذیتوں اور پنجاب کے صحیح ماحول کو اپنے ایک خاص طرز تحریر کے ذریعہ پیش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ میں اردو فارسی کی بصارت و سماعت کو ترستے دیدۂ گوش سے رہا ہوں، جناب گیان سنگھ شاطر نے زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے، جن پر بحث کی گنجائش ہے۔ مضمون سے پہلے جناب شاطر نے اپنے سوانحی حالات پر ایک پر اثر نظم سنائی معتمد عمومی انجمن جناب راشد آذر نے انجمن کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی، جناب ذکی شاداب نے کہا کہ ان کے مضمون میں پنجابی ماحول کی جھلکیاں واضح شکل میں ملتی ہیں۔ جناب صلاح الدین نیر نے کہا کہ شاطر نے جو کچھ کہا ہے اشاروں، کنایوں میں کہہ سکتے تھے۔

ڈاکٹر صادق نقوی نے کہا کہ پنجاب کی تہذیب اور حیدرآباد کی تہذیب میں فرق ہے۔ جناب راشد آذر نے کہا کہ شاطر کی خود نوشت میرے لئے نئی ایسی ہے شاطر نے جرأت کے ساتھ سوانح لکھی ہے۔ صدر جلسہ جناب رئیس اختر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ شاطر کی شاعری اردو نثر میں سماج اور معاشرہ پر گہرا اثر ہے انہوں نے کہا کہ ایسا ادب جو ہر سطح پر توجہ کے ساتھ پڑھا جاتا ہو۔ اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ میں بند کمروں میں پڑھے جانے والے ادب کو ناپسند کرتا ہوں۔ جناب صلاح الدین نیر نے جلسہ کی کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔ تقریب میں مرکزی وزیر سماجی بھلائی مسٹر یشارام کیسری ڈاکٹر گرودیال ویاس مرکزی نائب وزیر اطلاعات و نشریات، شریمتی شیلا جا مرکزی نائب وزیر فروغ انسانی وسائل، چیف منسٹر مسٹر کے وجے بھاسکر ریڈی، مسٹر پی راجم وزیر اعلیٰ تعلیم، شریمتی ایم لکشمی وزیر سماجی و بہبودی اطفال و خواتین، پروفیسر طا ریڈی

وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی، مسٹر دلجیت اروڑا چیف سکریٹری آف حکومت آندھرا پردیش کے علاوہ مسٹر چمن بھائی پٹیل نے اس پروگرام میں شرکت سے اتفاق کر لیا ہے۔

بسلسلۂ عرس شریف تقاریب حضرت مرزا سردار بیگ 6 رنومبر کی شب خانقاہ درگاہ شریف میں نہایت عقیدت واحترام کے ساتھ نعتیہ مشاعرہ زیر نگرانی الحاج مرزا شکور بیگ منعقد ہوا۔ جناب غلام محمد میر یٰسین علی سجادہ درگاہ شریف نے مرزا شکور بیگ کی گلپوشی کی۔ مسرز سلیم مرزائی اور سعید مرزائی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور مشاعرہ کے انتظامات کی نگرانی کی، جناب صلاح الدین نیر معتمد مشاعرہ اور جناب فاروق عارفی معاون معتمد مشاعرہ تھے۔ ابتدا میں جناب صلاح الدین نیر نے نعتیہ مشاعروں کے انعقاد کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے۔ کہا کہ نعتیہ مشاعرے نور و برکات کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ مسلسل کچھ گھنٹوں تک شعرا و حاضرین محفل عقیدت و احترام کے ساتھ دربار رسالت مآب میں رہتے ہوئے یاد سرور کائنات میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس مشاعرہ میں اساتذہ سخن حضرت سعید شہیدی ڈاکٹر علی احمد جلیلی امیر احمد خسرو، خواجہ شوق، راز عابدی اور صدر نگران مشاعرہ الحاج مسرز شکور بیگ کے علاوہ مسرز رئیس اختر، ڈاکٹر صادق نقوی، فیض الحسن خیال، صادق نوید، اکمل حیدرآبادی، صلاح الدین نیر، عزیز بھارتی، منظور احمد منظور، حبیب گوندیاوی، شفیع اقبال، مومن خاں شوق، سوز عابدی، جوہر ہاشمی، بے ہوش محبوب نگری، امان منظر، عبدالصمد مرزائی، ابوالفاروق شعور، ڈاکٹر راہی، قمرالدین صابری، سید حسن، میر آغائی اور نوجوان شعراء مسرز الطاف صداقی، قدیر انصاری، رشید شہیدی، تجمل اظہر، آغا سروش، فاروق عارفی، بیم اعجاز نسیم اور سجاد نظر نے اپنا منتخب کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ سامعین نے بہت عقیدت و احترام کے ساتھ مشاعرہ سنا، جناب صلاح الدین نیر نے مشاعرہ کی کارروائی کی۔ معاون معتمد مشاعرہ جناب فاروق عارفی نے شکریہ ادا کیا۔

۸ر نومبر

آج ہم اردو ہندی۔ ہندو مسلمان، مسجد مندر کی بات کرتے ہیں قطب شاہوں نے کبھی بھی علوم و فنون مذاہب اور عقاید اور شخصیتوں کو مخصوص خانوں میں بند نہیں کیا۔ ڈاکٹر طیب انصاری ایک اچھے نقاد، اچھے ادیب اور مورخ ہیں، میں مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے اپنی کتاب میں جو کچھ بھی لکھا ہے کافی تحقیق اور عرق ریزی ہی کے بعد لکھا ہے ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر موہن لال نگم سابق ڈائرکٹر سالار جنگ میوزیم نے دیار ادب کی جانب سے منعقدہ ایک ادبی اجلاس طیب انصاری کے ساتھ ایک شام میں کیا۔ جو 8 / نومبر کو 4-30 بجے شام ہیری مارٹن انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا تھا جس کی صدارت ڈاکٹر موہن لال نگم نے کی۔ ابتداء میں معتمد دیار ادب جناب صلاح الدین نیر نے تعارفی اور خیر مقدمی تقریر میں کہا کہ طیب انصاری کو علمی و ادبی کاموں سے غیر معمولی دلچسپی ہے۔ 13 کتابوں کے مصنف اور مولف نے اپنے ادبی سفر کو مسلسل جاری رکھا ہے۔ جناب رئیس اختر صدر دیار ادب اس تقریب کے کنوینر تھے۔ مہمان خصوصی پروفیسر یوسف سرمست نے کہا کہ طیب انصاری نے قطب مشتری پر مقدمہ لکھکر محققین کیلئے کچھ سوچنے کا موقعہ فراہم کیا ہے۔ انہوں نے ادب کے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں۔ انکی کتابیں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے مصلحت سے دور رہ کر لکھا ہے۔ صادق نقوی نے کہا کہ طیب انصاری کے پاس علمی دیانتداری ہے۔ حیدرآباد میں اردو صحافت ان کی یہ کتاب ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ادبی اجلاس کے فوری بعد مشاعرہ ہوا جس میں ممتاز شعرا ڈاکٹر موہن لال نگم، نہپال سنگھ ورما، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، ڈاکٹر صادق نقوی، ریاست علی تاج، صادق نوید، عزیز بھارتی، اثر غوری، شفیع اقبال، رحمت کوثر، حسن فرخ، قدیر انصاری، سید حسن، محمود تشنہ اور جناب خالد سعید (بیدر) نے کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی۔ جناب رئیس اختر نے شکریہ ادا کیا۔

آپ کے خطوط

سید مظفر - حیدرآباد

"شاداب" کا منظور احمد منظور نمبر نظر سے گزرا۔ منظور صاحب ہمارے شہر کے ایک بزرگ شاعر و ادیب ہیں اور کئی ادبی انجمنوں سے ان کا تعلق رہا ہے اور آج بھی ہے۔ آپ نے ان کا نمبر نکال کر ایک اچھا کام کیا کیونکہ وہ ان لوگوں میں شامل ہیں جنہیں نام و نمود کی خواہش نہیں ہوتی اور جو محض اردو ادب و زبان کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔

شاہد ومی - سکندرآباد

آپ کے رسالہ کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا جو ایک نسبتاً خاموش اور چپ چاپ کام کئے جانے والی شخصیت ہے۔ میرا اشارہ منظور احمد صاحب کی طرف ہے۔ جو بعد میں شاعر ہو کر منظور تخلص کرنے لگے ہیں۔ میں ان کا شاگرد رہا ہوں۔ اپنے آپ کو "شاگرد رشید" تو نہیں کہہ سکتا لیکن جو کچھ اردو زبان و ادب سے آج دلچسپی ہے اسے ان ہی کی دین سمجھتا ہوں

رضا شاہ، پرگی

آپ نے یہ فیصلہ بہت اچھا کیا کہ مرکز ادب کے ماہانہ اجلاس کو جو اب تک صرف شاعروں تک محدود تھا اسے ادبی اجلاس میں تبدیل کر دیا ہے جس میں ہر ماہ حیدرآباد کے ایک شاعر یا ادیب پر مضامین پڑھے جائیں گے جسے بعد میں "شاداب" کو اسی شخصیت کے نمبر سے موسوم کیا جائے گا۔ اس طرح سے ہمیں ہر ماہ ایک شاعر یا ادیب کے تفصیلی مطالعہ کا موقع مل جائے گا۔ اس بار منظور احمد منظور کا نمبر تھا۔ توقع ہے کہ آئندہ آپ دیگر ادیبوں اور شاعروں پر بھی ایسے ہی نمبر شائع کریں گے۔

اسمعیل محبوب نگری ۔ محبوب نگر

یہاں کے ایک کتب خانہ میں "شاداب" کا منظور احمد منظور پڑھنے کا اتفاق ہوا عبدالقادر سروری مرحوم اور پروفیسر رفیعہ سلطانہ کے مضامین توان کی کتاب "حرفِ شوق" میں شامل تھے اور خود منظور صاحب کا زور صاحب مرحوم پر بھی مضمون مطبوعہ ہے البتہ مجھے نئے مضامین رشید الدین کا مضمون پسند آیا جو تصنع اور بناوٹ سے پاک ہے اور جس میں بلا کی بے ساختگی ہے۔

غلام جیلانی ۔ سیلو (مہاراشٹرا)

ایک صاحب کے پاس (جو حیدرآباد سے آئے تھے) آپ کا ماہنامہ "شاداب" دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اتنے طویل عرصہ سے حیدرآباد سے اُردو کا ایک رسالہ نکل رہا ہے مجھے اب تک اس کی خبر نہیں تھی۔ کیونکہ میں بھی تھوڑا بہت ادبی ذوق رکھتا ہوں۔ آپ کا رسالہ جو منظور احمد منظور نمبر ہے مجھے پسند آیا۔ اسے مزید بہتر بنانے کی گنجائش موجود ہے

وسیم اختر ۔ تاپور (کرناٹک)

آج کے زمانہ میں کوئی ادبی رسالہ نکالنا سراسر گھاٹے کا سودا مول لینا ہے لیکن بعض آپ کے جیسے سرپھرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو جان بوجھ کر یہ سودا کرتے ہیں یہ بھی اُردو کی ایک خدمت ہے اور آپ جیسے لوگوں سے ہی اُردو زندہ ہے۔ اب ہر رسالہ نقوش نہیں اور نہ ہر رسالہ کلاسک نہیں ہوتا۔ اسے درمیانی درجہ کے رسالے بھی اردو کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ کے عزم و حوصلہ میں کمی نہ آنے دے۔ ایک غزل ارسال ہے۔ توقع ہے کہ پسند آئے گی اور شرف طباعت حاصل کرے گی۔

صفحہ (۹) "سیاست" کی ارتقاء و صحافت کی سیر چانی کے لیے ضمیمہ ہو جائیں۔ قومی یکجہتی کے لیے فضائے صحافت مبدأ سے ہی ہوتی ہے۔ تلگو ادب کے عظیم شاعر گروجا ڈا نے کیا خوب

ملک کے معنی مٹی نہیں ملک کے معنی انسان ہیں
دلیشہ منٹے مٹی کا دوئی دلیشہ منٹے منو جو لوئی

Telephone : 229161

37/979/84 Postal Regd No. H/HD593

Monthly SHADAAB Hyd.

11-5-147, RED HILLS, HYD-.. P.

9 No. 12 DECEMBER 1992



Dr. Bano Tahera Sayeed

NUMBER